ذرا عمرِ رفتہ کو آواز دینا

یادوں کی دنیا

یوسف حسین خان

فہرست مضامین

یادوں کی دنیا

انتساب

میں ان اوراق کو اپنے والد ماجد مولوی فدا حسین خاں صاحب مرحوم اور اپنی والدۂ مکرمہ نازنین بیگم صاحبہ مرحومہ کی یاد میں بطور نیازِ عقیدت پیش کرنے کی سعادت حاصل کرتا ہوں۔ ہر چند کہ دونوں کا سایہ بچپن ہی میں سر سے اُٹھ گیا تھا بایں ہمہ ان کے احسانوں کی یاد دل میں ہمیشہ زندہ رہی اور آج بھی وہ میری زندگی کا قیمتی سرمایہ ہے۔

یوسف

دیباچہ

میری عمر اب ۷۴ سال کی ہے۔ میں نے بزرگوں سے سنا ہے کہ ہمارے خاندان میں پرانے وقتوں میں عمریں طویل ہوا کرتی تھیں لیکن ہمارے چچا اور والد کی عمر زیادہ نہیں ہوئی۔ میری عمر اب ان کی عمر سے زیادہ ہے اس لئے آیندہ جتنا زندہ رہنے کو ملے اسے بونس سمجھنا چاہیئے۔ مجھے اپنی زندگی سے الفت رہی ہے اور اب بھی ہے۔ گذشتہ ۷۴ سال میں جہانِ رنگ و بو کی سیر کے جو مواقع ملے انھیں میں قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہوں۔

میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی پرو وائس چانسلری سے مستعفی ہو کر اکتوبر ۱۹۶۵ء میں دہلی آگیا اور دسمبر ۱۹۶۵ء میں میں نے "یادوں کی دنیا" لکھنا شروع کیا۔ اس خیال سے کہ ممکن ہے میری آپ بیتی میں دوسرے بھی کچھ دلچسپی لیں۔ تقریباً ایک سال کی مدت میں اسے ختم کیا اور طباعت و اشاعت کے لئے شبلی اکیڈیمی اعظم گڑھ بھیج دیا۔ اس آپ بیتی میں کچھ واقعات خاندانی بزرگوں سے منقول ہیں، کچھ میں نے حافظے سے لکھے ہیں اور کچھ وہ ہیں جن کی یادداشتیں میرے پاس موجود تھیں۔ مجھے روزنامچہ لکھنے کا شوق رہا ہے لیکن پابندی سے نہیں۔ تاہم اس سے بڑی مدد ملی۔ اقوال جہاں بھی نقل کئے ہیں ان کی

اصلی ماخذوں سے جانچ کرلی ہے۔ جہاں مطبوعہ کتابوں سے عبارتیں نقل کی ہیں، انکے حوالے دیدیئے ہیں۔ جہانتک ہوسکا واقعات کو بے کم وکاست بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ نہ کسی کو اچھالنا مقصود ہے اور نہ کسی کو خواہ مخواہ گرانا۔ اپنی ذاتی کوتاہیوں کو بھی نمایاں کر دیا ہے اسلئے کہ بغیر احتساب نفس کے حقیقت تک رسائی ممکن نہیں۔ انسان دوستی ادب کی دائمی قدر ہے۔ اس میں اپنے نفس اور اپنی کوتاہیوں کا تجزیہ شامل ہے۔ اس کے بغیر دوسروں کی زندگی کا تجزیہ کرنے کا کسی کو حق نہیں پہنچتا۔ دوسروں کے متعلق میں نے اگر کسی روایت پر اعتماد کیا ہے تو پوری چھان بین کے بعد۔ سنی سنائی باتوں پر یقین نہیں کیا۔ خاندانی حالات کے لکھنے میں برادر محترم ڈاکٹر ذاکرحسین صاحب کے صلاح ومشورے کو بھی دخل رہا ہے۔ انھوں نے ان ابواب کے مسودے پڑھا اور کیا اور ان کے فرمانے کے بموجب بعض جگہ میں نے ترمیم بھی کی۔

عالمی ادب میں آپ بیتی لکھنا ادیبوں کا دلچسپ مشغلہ رہا ہے۔ بیتے ہوئے زمانے کے واقعات و حالات جب حافظے میں ابھرتے ہیں تو اصلی نقوش میں وہ مبہم اثرات بھی شامل ہو جاتے ہیں جو زندگی کے مشاغل سے لازمی طور پر پیدا ہوتے ہیں۔ جب قوت ارادی حافظے کے دروازے کو کھٹکھٹاتی ہے تو یہ سب کے سب لبیک کہتے ہوئے حاضر ہو جاتے ہیں۔ آپ بیتی زندگی کی تاریخ بھی ہے اور ماورائے تاریخ بھی۔ حافظے کو کھنگالنے سے زندگی کی جو تصویر سامنے آتی ہے اس میں ایک طرح کی طلسمی خاصیت خود بخود پیدا ہو جاتی ہے بشرطیکہ کہانی کہنے والا اپنے فن کے آداب کو برتنا جانتا ہو۔ خیالی نقوش جب صفحۂ قرطاس پر اتارے جاتے ہیں تو جذبے کی رنگ آمیزی بھی کسی نہ کسی صورت میں راہ پا جاتی ہے اور خیالی پیکروں میں ایسی تحلیل ہو جاتی ہے کہ اسے ان سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ بلا شبہہ تخلیقی مسرت میں اس سے اضافہ ہوتا ہے۔ تاہم ادیب کے ہاتھ سے صداقت اور حقیقت

کا دامن کبھی نہیں چھوٹنا چاہیئے - اس کا سر نیاز سوائے ان کے اور کسی کے آگے خم نہیں ہو سکتا۔
جذبہ اور تخیل اگر صداقت سے بے گانہ ہیں تو وہ غیر متوازن ہو جائیں گے اور ان سے جو نقوش ابھریں گے وہ دھوکے میں ڈالنے والے ہوں گے۔ ان سے حقیقت تک پہنچنے میں رہنمائی نہیں ہو سکتی۔ ادیب کا فرض ہے کہ واقعات کے انتخاب اور ان کی توجیہ میں اس بات کا پورا لحاظ رکھے۔

جس طرح زبان خیال کی خدمت کے لئے ہے اسی طرح خیال صداقت کی خدمت کے لئے ہے، جو ادب کا مقصود و منتہا ہے۔ اس سے زندگی کے دائمی بہاؤ میں ایک طرح کا ٹھہراؤ پیدا ہو جاتا ہے اور شعور اور جذبہ دونوں اس سے قوت، گرمی اور تاثیر حاصل کرتے ہیں۔ آپ بیتی میں گذرے ہوئے زمانے کی صداقتوں کو ایک جگہ اکٹھا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ دوران کی کیفیت کو محفوظ کرنے کا واحد وسیلہ انسانی حافظہ ہے جو گذرے ہوئے لمحوں کی بہ یک وقت گرفت کر لیتا ہے۔ ان میں ہر لمحہ اپنی قدر و قیمت رکھتا ہے۔ اس کے علاوہ حافظہ گذری ہوئی یادوں کو ابھارتا ہے تاکہ ہمیں لزوم کی پابندی سے نجات ملے اور روحانی تخلیق کا دروازہ بند نہ ہو۔ خالص زمانے کا ادراک وجدانی طور پر ہی ممکن ہے جبکہ ہماری اندرونی کیفیتیں ہمارے سامنے جیتی جاگتی شکل میں آتی ہیں جن کی عملی پیمائش نہیں ہو سکتی کیونکہ یہ ایک دوسرے میں مدغم ہوتی ہیں۔ ان کا صرف لطیف احساس ہی ممکن ہے۔ دوران کی کیفیت کو صرف انسانی نفس محسوس کرتا ہے کیونکہ صرف وہی آزاد ہے۔ عقل و وجدان میں جو حافظے کو اپنا آلۂ کار بناتے ہیں یہ صلاحیت ہے کہ وہ گذشتہ زمانے کو اپنی بصیرت میں سمیٹ لیں اور اس کی صداقتوں کو ایک ایک کر کے ہمارے سامنے اُجاگر کر دیں۔ یہ صداقتیں حال سے بے تعلق نہیں ہوتیں اس لئے کہ

حال ہی زندگی کا اصل جوہر ہے۔ ماضی اور مستقبل کبھی اس سے بے نیاز نہیں ہو سکتے۔ تاریخ اور ادب دونوں میں ہمیں اس بات کی شہادت ملتی ہے۔

آپ بیتی میں تاریخ کے برخلاف فرد کی کہانی موضوع ہوتا ہے۔ اس کے دل کی، دماغ کی، عمل کی کہانی۔ لیکن یہ کہانی معمولی قسم کی کہانی سے الگ ہوتی ہے اس واسطے کہ اس میں جو کچھ پیش کیا جاتا ہے وہ حقیقت پر مبنی ہوتا ہے۔ اس میں افراد کی شخصیت کو از سرِ نو تخلیق کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ آپ بیتی لکھنے والے اور مورخ میں یہ بات مشترک ہے کہ دونوں صداقت کی روشنی میں اپنا قدم آگے بڑھاتے ہیں۔ آپ بیتی لکھنے والا ناول نویس کی طرح آرٹ کی تخلیق کرتا ہے۔ دونوں واقعات کی تصویر کشی کرتے ہیں۔ اگر کہیں زندگی کا بے تکا پن دکھانا مقصود ہے تو بھی اس سے تصویر کے رنگوں کی ہم آہنگی متاثر نہیں ہوتی۔ دونوں انسانی شخصیت کی پیچیدگی کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں اور سادہ اور من مانے اصول کے ذریعے سے اس کی توجیہ نہیں کرتے۔ دونوں ان صداقتوں کو زندہ رکھنا چاہتے ہیں جن کا علم سچی انسان دوستی کے لئے ضروری ہے۔ دونوں ادعا پسندی سے احتراز کرتے ہیں۔

شخصیت کا تجزیہ بڑا مشکل کام ہے اس لئے کہ اکثر لوگوں کی زندگی منقسم ہوتی ہے۔ چاہے وہ کتنی ہی تکمیل یافتہ کیوں نہ ہو اس میں اچھائی اور برائی، نیکی اور بدی پہلو بہ پہلو موجود رہتی ہیں۔ اس لئے کسی شخص کی زندگی کے متعلق حکم لگاتے وقت جزوی واقعات کے بجائے مجموعی کردار کو دیکھنا چاہئے۔ اگر کوئی چاہے کہ کسی غیر مستحق کو اپنے زورِ قلم سے بڑھا چڑھا کر پیش کرے تو خود لکھنے والے کا اسلوب اپنے موضوع کا ساتھ نہیں دیگا اور سخن سازی کی چغلی کھائے گا۔ محمد حسین آزاد نے غالب کے مقابلے میں ذوق کی عظمت جتانے کے لئے

ایڑی چوٹی کا زور لگایا لیکن ان کی ساری انشا پردازی دھری کی دھری رہ گئی کیونکہ وہ ایک غلط بات کو صحیح ثابت کرنا چاہتے تھے۔ بلاشبہ ان کے طرزِ تحریر میں بڑی تازگی اور قوت ہے لیکن ذوق کے متعلق انھوں نے جو کچھ بھی لکھا ہے وہ انتہا درجہ بے مزہ، بے اثر اور پھسپھسا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ان کے اسلوب نے ان کے خیالات کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا ہوا اور وہ لشتم پشتم اپنی بات کہے جاتے ہوں۔ میں نے اس کتاب میں جن لوگوں کی تعریف و تحسین کی ہے ان میں یا تو وہ ہیں جو کسی اعلیٰ قدر کی نمایندگی کرتے ہیں جو مجھے عزیز ہے یا وہ ہیں جن کی زندگی کے کسی انداز نے میرے تخیل کے تاروں کو چھیڑا ہے۔

آپ بیتی میں بڑے کرداروں کے ساتھ چھوٹے کرداروں کی بھی اہمیت ہے اس لئے کہ ان کے بغیر اس زمانے کی فضا نہیں پیدا ہوتی جس کی تصویر کشی مطلوب ہے۔ آپ بیتی لکھنے والے کو چھوٹے کردار اس لئے بھی عزیز ہیں کہ ان میں انسانی خوبو اپنے اصلی رنگ ڈھنگ میں نظر آتی ہے۔ بلاشبہ ان کا انتخاب کرنے میں بڑے سلیقے اور ضبط کی ضرورت ہے تاکہ ان کے سلسلے میں جو احوال پیش کئے جائیں وہ واقعات کی کھتونی نہ بن جائیں۔ دنیا کے ناہموار اور بے تکے پہلو بھی نظر انداز نہیں کئے جا سکتے کیونکہ ان کے بغیر حقیقت کی تصویر مکمل نہیں ہوتی۔

آپ بیتی لکھنے والے کے پیش نظر زندہ اور مرے ہوئے دونوں ہوتے ہیں۔ اس کی یادوں کی بستی میں دونوں پہلو بہ پہلو نظر آتے ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ اس کے نزدیک بعض زندہ مرے ہوؤں سے زیادہ بے حقیقت اور بعض مرے ہوئے زندوں سے زیادہ حقیقی ہوتے ہیں۔ وہ انھیں زندوں سے زیادہ اپنے قریب محسوس کرتا ہے۔ وہ ان کی خدمت میں فیضی کا یہ شعر تحفے کے طور پر پیش کرتا ہے ؎

اے ہم نفسانِ محفلِ ما

رفتید و لے نہ از دلِ ما

زندوں کے لئے حسرت کی یہ بشارت کافی ہے ؎

نہیں آتی تو یاد ان کی مہینوں تک نہیں آتی

مگر جب یاد آتے ہیں تو اکثر یاد آتے ہیں

میں مالک رام صاحب کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انھوں نے ٹائپ شدہ مسودہ پڑھا اور اپنے قیمتی مشورے سے مستفید فرمایا۔ نیز سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب شریک ناظم دارالمصنفین کا بھی ممنون ہوں کہ انھوں نے اس کتاب کی طباعت و اشاعت اپنے ذمے لی ہے۔ یہ اس بات کی ضمانت ہے کہ کتاب اچھی اور صحیح چھپے گی۔

آخر میں محمد اکرم صاحب کا شکریہ ادا کرتا ہوں جنھوں نے بڑی محنت اور دلچسپی سے اس کتاب کے مسودے کو ٹائپ کیا اور صحت کا پورا خیال رکھا۔

یوسف حسین خاں

۵ر جنوری ۱۹۷۶ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پہلا باب (۱)

پسِ منظر

محمد شاہ رنگیلے کا زمانہ ہے، جدھر دیکھو رنگ رلیاں ہیں، خوش وقتی کے مشاغل ہیں، ہر شخص عیشِ امروز میں ایسا مگن ہے کہ فکرِ فردا کا کسے خیال، خود بادشاہ کو اپنی عیاشی کے علاوہ دنیا میں کسی چیز سے دلچسپی نہیں، لال قلعے میں اربابِ نشاط کا جمگھٹا ہے، یہی بادشاہ کے ہم صحبت اور مشیر ہیں، اُن کی ہر طرح نازبرداری کی جاتی ہے، یہ بادشاہ کے ایسے منہ چڑھے ہیں کہ وزیروں اور امیروں پر کھلم کھلا پھبتیاں کستے ہیں، بھلا کسی کی مجال ہے کہ اُنھیں آنکھ اُٹھا کے دیکھے یا چوں تو کرے، کرے کیسے، دنیا جانتی ہے کہ بادشاہ اُن کے ہاتھ میں کٹھ پتلی ہے، وہ جو چاہیں، اس سے کروالیں جس کی چاہیں بے عزتی ہو جائے، جس کی چاہیں جاگیر ضبط ہو جائے، جسے چاہیں عہدے سے معزول کروا دیں، یہ حال دیکھ کر بھلے لوگ اُن سے کنّی کاٹتے تھے، اور جہاں تک بن پڑتا، اُن کے آڑے نہ آتے تھے،

ویسے اور دوسرے مغل بادشاہوں نے بھی شراب نوشی کی، اور دادِ عیش بھی دی لیکن ایسی نہیں کہ دنیا کی سدھ بدھ نہ رہے، شراب نوشی بھی کرتے تھے، اور مہمیں بھی سر کرتے تھے، بابر شراب کا

شوقین اور موسیقی کا دلدادہ تھا، خود گھنٹوں رباب بجاتا تھا، چنگ و رباب کی سامعہ نوازی کے کے ساتھ میدانِ جنگ میں فوجوں کی کمان کرتا تھا، جہانگیر بھی کبھی ایسا مدہوش نہ ہوا کہ ملکی نظم و ضبط درہم برہم ہو جاتا، محمد شاہ رنگیلے اپنے بزرگوں کے نقشِ قدم پر نہیں چلے، ہم جوئی سے تو انھیں دور کا بھی سروکار نہ تھا، اُن کی عیش پسندی خالص تھی، جسے کسی دوسرے مشغلے کی شرکت گوارا نہ تھی، جبھی تو دنیا نے اُنھیں "رنگیلے" کا لقب دیا، اُن کا رنگیلاپن بالآخر مغلوں کی تاریخ میں رنگ لایا، اور ان کے جانشینوں کی حکومت بازیچۂ اطفال بن کر رہ گئی،

جب بادشاہ کا یہ رنگ تھا تو امیر امرا بھلا کیسے پیچھے رہتے، انکے یہاں بھی رقص و سرود کی محلیں آراستہ رہنے لگیں، انکے یہاں بھی شاہی دربار کی طرح شاہدانِ بازاری کی گرم بازاری تھی، انکے یہاں بھی اربابِ نشاط کا اثر و رسوخ بڑھا، وہ امیروں کی ناک کے بال تھے، جسے دیکھو انکا توسل ڈھونڈ رہا ہے، جسے دیکھو انھیں خوش کرنے کی فکر میں ہے، بادشاہ کی دیکھا دیکھی امیروں اور عہدہ داروں نے بھی دل کھول کر دادِ عیش دی، جسے دیکھو اپنے دربار میں راجہ اندر بنا بیٹھا ہے،

امیروں کا تو بس ایک مشغلہ رہ گیا تھا، اور وہ یہ کہ کسی نہ کسی طرح اپنے ہم چشموں میں امتیاز اور برتری حاصل کریں، اس اکھاڑ پچھاڑ میں جو بھی زد میں آجائے، اگر دوست بھی ہے تو ہوا کرے، ان کی دوستی میں اخلاص اس طرح عنقا تھا، جیسے اُن کے عمل میں نیک نیتی، دوستوں کو دغا دینا ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا، اگر ایسا کرنے میں کوئی ذاتی فائدہ ہوتا ہو، رہا ملکی انتظام تو اُس کی طرف توجہ کرنے کی فرصت ہی کسے تھی، قاعدہ ہے کہ امیر اور غریب سب بادشاہ کی زندگی کے نمونے کو اپنے سامنے رکھتے ہیں، اگر بادشاہ نیک ہے تو اُس کی نیکی کا اثر دوسروں پر پڑنا لازمی ہے، اور اگر وہ بد ہے تو عام طور پر بدی کو فروغ ہوگا، محمد شاہی عہد میں بادشاہ کی طرح امیروں اور عہدہ داروں کی ساری صلاحیتیں عیش و عشرت اور نفس پرستی کے تقاضوں کو پورا کرنے کی نذر ہوگئی تھیں

خود غرضی کا یہ عالم تھا کہ سوائے اپنی ذات کے گویا دوسروں کا وجود ہی نہ تھا، عیاشی یونہی باتوں سے تھوڑا ہی ہوا کرتی ہے، اُس کے لئے دولت چاہیئے، دولت بھی اتنی کہ جس کی حد نہ ہو، اس کیلئے قارون کا خزانہ بھی کافی نہیں ہوتا، جس طرح بادشاہ کی کروڑوں کی آمدنی اُس کی فضول خرچی کی کفیل نہیں ہوتی تھی، اسی طرح امیر امراء بھی اسے اپنی شان سمجھتے تھے، کہ اُن کا خرچ آمدنی سے زیادہ ہو، چنانچہ اُن میں اکثر بنیوں بقالوں کے مقروض رہتے تھے، جیسا کہ فرانسیسی سیاح برنیئر نے اپنے سفرنامے میں تفصیل سے لکھا ہے، ویسے کہنے کو پنج ہزاری اور ہفت ہزاری تھے، اگر قرض نہ ملتا تو ساری ظاہری شان و شوکت اور ریل پیل دھری کی دھری رہ جاتی،

محمد شاہی دور میں شمالی ہند کی حالت

نظام الملک کے ایلچی درگاہ قلی خاں نے اس زمانے کے دہلی والوں کی معاشرت اور تہذیب کا جو نقشہ کھینچا ہے اُس سے پتہ چلتا ہے کہ عیش و عشرت ترقی پر تھے، مگر اچھی زندگی گذارنے کا فن کس مپرسی کے نذر ہو چکا تھا، ان حالات کے پڑھنے سے یہ یقین ہوتا ہے کہ اگر نادرشاہ اور بعد میں احمد شاہ ابدالی کے حملے نہ ہوتے، تو بھی دہلی تباہ ہو کر رہتی، تباہی کے جراثیم نے اس کے حسین جسم کو اندر سے کھوکھلا کر دیا تھا، باہر سے ایک دھکا تو ایسی صورت میں بس بہانہ ہوتا ہے۔ بادشاہ اور امیروں کی زندگی کا رنگ عام لوگوں پر بھی چڑھ گیا تھا معاشی بدحالی کے باوجود میلوں ٹھیلوں میں شہر کے اوباشوں کی محفلیں سجتی تھیں جن میں شوقین مزاج اور بانکی عورتیں بھی بن سنور کر پہنچتی تھیں، یہ میلے گویا بداخلاقی کے اڈے تھے، یہاں ہر طرح کی عیاشی کے لئے سامان اور سہولت بہم پہنچائی جاتی تھی مفلس ہیں، گھر میں فاقہ ہے، مگر میلے میں جانا ضرور ہے، سپاہی پیشہ ہیں، دو برس سے تنخواہ وصول نہیں ہوئی، مگر مونچھ پر تاؤ دیتے میلے میں ضرور شریک ہوں گے، چاہے اسلحہ بنیئے کے یہاں رہن رکھنے پڑیں، سپہ گری کا پیشہ کرنے والوں کی زبون حالی کا نقشہ اس زمانے کے تذکروں اور تاریخوں میں بڑی تفصیل سے ملتا ہے کچھ

عرصے بعد قائم اور سودا نے منصب داروں، سپاہیوں اور اہلِ حرفہ کی معاشی بدحالی کو اپنے شہر آشوبوں اور ہجوؤں میں شاعری کے آب و رنگ میں سمو کر پیش کیا، مگر اس طور پر کہ حقیقت کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوٹا، یہ شہر آشوب اور ہجویں اس زمانے کی معاشرتی تاریخ کا اہم ماخذ ہیں جن سے ہمارے مورخ پورا فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

محمد شاہ کے زمانے ہی میں لکھنؤ، مرشد آباد، حیدرآباد اور فرخ آباد کے درباروں کی رونق بڑھ گئی تھی، اور ہر قسم کے اہلِ کمال دلی سے کھنچ کھنچ کر وہاں سکونت اختیار کر رہے تھے۔ وہ علاقے جو براہِ راست مرکزی حکومت سے وابستہ تھے، بدامنی اور بدانتظامی کا شکار تھے، سرکشوں کی بن آئی تھی، وہ بھلا کسی کو شمار قطار میں کیوں لاتے، نہ کسی کی سنیں، نہ کسی کا حکم مانیں، نہ محصول اور مالگذاری ادا کریں، جس کا جی چاہے، ان کا کچھ بگاڑ لے، اگر بگاڑ سکتا ہو، وہ کسی کو خاطر میں لانے والے تھوڑی تھے، اپنے اپنے علاقوں میں امن و امان قائم رکھنے، اور مالگذاری وصول کرنے کے لئے نواب راجے، سپاہ بھرتی کرتے کہ بغیر اس کے اُن کے گماشتوں کی بڑی دُرگت بنتی تھی، یہی وجہ ہے کہ محمد شاہی عہد میں اچھے سپاہیوں کی بڑی قدر تھی، ملک میں جتنی بدامنی بڑھتی گئی، اُن کی مانگ میں اضافہ ہوتا گیا، جو گھٹو سپاہی تھے، منصب دار اُن کی تنخواہ کئی کئی برس نہیں ادا کرتے تھے، مگر ملک کے اندرونی حصوں میں جن سپاہیوں کی مدد سے امن و امان قائم رکھا جاتا تھا، اُن کی تنخواہ کی ادائگی میں بھلا مجال ہے کہ دیر ہو جائے، انھیں ماہ بماہ نقد تنخواہ ملتی تھی، اُس کی وجہ یہ تھی کہ نواب راجے اُن سے خائف رہتے تھے کہ کہیں بگڑ بیٹھے تو پھر سنبھالے نہ سنبھلیں گے، انھیں کے سہارے تو اُن کی حکومت چلتی تھی،

ہمارے آبا و اجداد نے اسی محمد شاہی عہد میں تلاش روزگار میں افغانستان کی سرحد سے ہندوستان کا رُخ کیا، ایسے موقع پر ہمیشہ اور ہر کہیں یہ ہوا ہے کہ قبیلے کے سب سے زیادہ من چلے اور حوصلہ مند لوگ اپنا وطن چھوڑنے اور نیا دیس بسانے پر آمادہ ہوتے ہیں، اس نقل و حرکت کا اصلی محرک معاش ہوتا ہے،

ہم جوئی کا حوصلہ اور بہتر زندگی کا خواب تخیل کے ذریعہ سے عمل کو اُکساتا ہے، ہندوستان جنت نشان کی طرف نقل وطن کرنا افغانستان اور اُس کی سرحد پر رہنے والوں کے لئے کوئی نئی بات تو نہ تھی، ہزارہا سال سے یوں ہی ہوتا چلا آیا تھا، اور یہ روایات ایک پیڑھی سے دوسری پیڑھی تک پہنچتی رہی ہوں گی،

کمپل کے قرب و جوار میں افغانوں کی آبادکاری

ہم لوگ قائم گنج ضلع فرخ آباد کے رہنے والے ہیں، اس بستی کی تاریخ بڑی دلچسپ ہے، یہاں کے حالات میں نے بچپن میں بعض بزرگوں سے سُنے تھے بعد میں میں نے تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ جو سُنا تھا اُس کا بیشتر حصہ صحیح ہے، اس علاقے میں دوآبے کے سب سے زیادہ سرکش لوگ آباد تھے، جو دہلی کی مرکزی حکومت کے لئے دردِ سر بنے رہتے تھے، ضیاء الدین برنی مُصنف تاریخ فیروز شاہی نے لکھا ہے، کہ اُن کی سرکشی کی روک تھام، اور امن و امان قائم کرنے کے لئے بادشاہ بلبن نے کمپل اور پٹیالی میں افغانوں کی بستیاں آباد کیں، افغانوں کے ساتھ کچھ ترک خاندان بھی تھے، خود چھ مہینے یہاں ٹھہر کر گڑھیاں تعمیر کرائیں، پٹیالی وہی جگہ ہے، جہاں امیر خسرو پیدا ہوئے، یہ اب ضلع ایٹہ میں واقع ہے، کمپل گنگا کے کنارے ضلع فرخ آباد میں ہے، یہاں گنگا کے کنارے کنارے موجودہ راے پور سے لے کر عطائی پور تک افغانوں کے خاندان آباد کئے گئے، تاکہ وہ کھیتی باڑی بھی کریں، اور ضرورت کے وقت دہلی کی مرکزی حکومت کی مدد پر آئیں اُن کی اولاد شاہی فوج میں بھرتی ہو کر ملک میں امن و امان قائم کرے، اور اگر ضرورت ہو، تو منگولوں کی روک تھام کے لئے ہندوستان کی سرحد پر اپنی بہادری اور وفاداری کے جوہر دکھائے اُن میں جو کھیتی باڑی کے کام میں لگیں، وہ شاہی فوجوں کو غذا فراہم کرنے میں سہولت بہم پہنچائیں، اس زمانہ میں فوج کے لئے ان علاقوں میں غذا فراہم کرنا، جہاں کی رعایا پوری طرح تعاون نہ کرے، بڑا دشوار کام تھا، بلبن کے پیش نظر افغانوں کی آبادکاری کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ شمالی ہند کی رعایا میں دہلی کی حکومت کی حمایت کرنے والا طبقہ مستقل طور پر موجود ہے،

جو اڑے وقت کام آتے، اس کا یہ مطلب نہیں کہ بلبن کو ملک کے اصلی باشندوں پر اعتبار نہ تھا، یقیناً تھا لیکن ایک حقیقت پسند حکمراں کی حیثیت سے اُس نے جو قدم اٹھایا، وہ ملک کے لئے مفید ثابت ہوا۔ التمش کے زمانہ میں بھی شمالی ہند میں افغانوں کی بستیاں آباد کی گئی تھیں جن کے نتائج مفید مطلب نکلے تھے، اس تجربے کو بلبن نے مغربی دوآبے کے علاقے میں دہرایا اور اُس کا یہ تجربہ ہر اعتبار سے کامیاب رہا،

کمپل وہی مقام ہے جس کا ذکر پُرانوں اور مہابھارت میں ملتا ہے، یہ پانچال خاندان کا پایۂ تخت تھا، راجہ درو پد یہاں کا مشہور حکمراں گذرا ہے، درو پدی کے سوئمبر کی تقریب کمپل ہی میں منائی گئی تھی، جب کہ ملک کے مختلف حصّوں کے راجکماروں نے یہاں آکر قسمت آزمائی کی تھی، یہیں ارجن نے راجہ درو پد کی کمان جھکا کر اُس کی چہیتی بیٹی درو پدی کو عقد میں لیا تھا، قدیم ہند کی تاریخ میں کمپل کی اہمیت عرصے تک برقرار رہی، مگر بعد میں یہ ایک چھوٹا سا گاؤں رہ گیا جس کے چاروں طرف ریت کے ٹیلے ہیں جن کے نیچے نہ معلوم قدیم ہند کے تاریخ کے کون کون سے راز پوشیدہ ہیں، اگرچہ ہمارے محکمۂ آثارِ قدیمہ نے اس طرف تھوڑی بہت توجہ دی ہے، مگر جتنی چاہئے اتنی نہیں، ان ٹیلوں کی کھدائی بڑے پیمانے پر ہونی چاہئے کمپل کے نواح کے علاوہ وہاں سے کچھ فاصلے پر بھی ریت کے ٹیلے بڑی تعداد میں ہیں، جن کی کھدائی کی جائے تو اُن کے نیچے ضرور ایسی چیزیں ملیں گی جن سے قدیم ہند کی تاریخ کے متعلق ہماری معلومات میں اضافہ ہوگا، میں خود کمپل گیا ہوں، اور ان ٹیلوں پر گھنٹوں گھوما ہوں، یہ مقام ہندوستان کی تاریخ کے قدیم ترین مرکزوں میں ہے، جہاں اہلِ ہند کی تہذیب کا نشو و نما ہوا، جب میں ان ریتیلے ٹیلوں پر گھوم رہا تھا، تو درو پدی کنڈ کے قریب سوئمبر کا پورا منظر میرے تخیل کے سامنے اس طرح سے آگیا، جیسے واقعی میں اُسے دیکھ رہا ہوں،

افغانوں کی آبادکاری کمپل کے قریب راے پور سے شروع ہو کر گنگا کے کنارے کنارے
پرانی ڈانگ اور پہاڑی سے ہوتی ہوئی عطائی پور تک پھیل گئی، افغانوں کی سب سے پرانی بستی
راے پور ہے، جس کا قدیم نام برقرار رکھا گیا، آبادکاری کا یہ سلسلہ صدیوں جاری رہا، مغلوں کی
فتوحات سے پہلے خلجیوں اور لودھیوں کے زمانے میں یہاں وقتاً فوقتاً افغان قبیلے آکر آباد ہوتے
رہے، جن میں غلزئی، خٹک اور بنگش خاص طور پر ذکر کے قابل ہیں، پہلے سے جو افغان آباد تھے اُن
کے ساتھ نئے آبادکاروں نے شادی بیاہ کو روا رکھا، اس لئے کہ وہ بھی انھیں کی طرح افغان
تھے جنھوں نے بڑی حد تک اپنی نسلی خصوصیات برقرار رکھی تھیں بعض افغانوں نے ہندوستانی
عورتوں سے شادی کر لی تھی، اُن کی ملوان نسل بھی دوش بہ دوش خدمت گذاری کے فرائض
انجام دے رہی تھی، اپنی نسلی فضیلت کو برقرار رکھنے کے لئے افغان اس ملوان نسل کے ساتھ رشتہ
جوڑنا کسرِ شان خیال کرتے تھے، ملوان نسل کے لوگ خلوار کہلاتے تھے، غالباً یہ "افغان آوردہ"
کا مخفف ہے، اور اب بھی قائم گنج میں مستعمل ہے،

مغلوں کی حکومت سے پہلے روہیل کھنڈ کو چھوڑ کر جہاں افغانوں کی آبادکاری کا سلسلہ التمش
کے زمانہ میں شروع ہوا تھا، کمپل کے آس پاس کا علاقہ افغانی قبائل کا شمالی ہند میں سب سے
بڑا مرکز بن گیا، پرگنہ کمپل کی افغان آبادی اور روہیل کھنڈ کے درمیان گنگا بہتی تھی، جسے کشتیوں
میں عبور کرنا دشوار نہ تھا، اس طرح افغان نوآبادکاروں کے دونوں مرکزوں میں تعلقات
قائم رہے، لین دین کے ذریعے، خرید و فروخت کے ذریعے، شادی بیاہ کے ذریعے، کبھی دوستی
کا زور زور رہا، اور کبھی دشمنی کا، فرخ آباد کی ریاست قائم ہو جانے کے بعد دوستی کم رہی اور دشمنی
زیادہ، روہیل کھنڈ اور پرگنہ کمپل کے نواح میں افغان قبائل تاریخ کے مختلف دوروں میں اتنی
بڑی تعداد میں نقل وطن کر کے آباد ہوئے، کہ ان میں سے بعض قبیلوں کے نام خود افغانستان اور سرحد

باقی نہیں رہے لیکن ہندوستان میں اُن کے اخلاف کی بدولت اُن کے ناموں کا پتہ چلتا ہے، اور ان میں سے بعض آج تک موجود ہیں،

افغانستان اور ہندوستان کے درمیان کا سرحدی علاقہ دراصل افغانوں کا اصلی وطن ہے، کابل اور غزنی میں تیرہویں صدی عیسوی سے قبل جو نسل آباد تھی، وہ ترکوں کی اولاد تھی، تیرہویں صدی میں سرحدی افغانوں کے قبیلے بڑی تعداد میں کابل، اور غزنی، اور افغانستان کے دوسرے حصوں میں جاکر آباد ہو گئے، یہ کم و بیش وہی زمانہ ہے جب کہ سلطان بلبن نے کمپل اور پٹیالی میں افغانوں کو آباد کیا تھا، اس زمانہ میں روہیل کھنڈ میں بھی وسیع پیمانے پر افغانوں کی آبادکاری ہوئی، دراصل بات یہ تھی کہ آئے دن کے منگولوں کے حملوں سے تنگ آکر سرحدی افغانوں نے نقلِ وطن کو ترجیح دی، ہندوستان کے حکمرانوں اور مغلوں کی اکثر لڑائیاں انکے علاقوں میں ہوتی تھیں، جن سے اُن کی زندگی میں سخت انتشار اور پراگندگی پیدا ہو گئی تھی، بعض قبیلے ہندوستان چلے آئے، اور بعض افغانستان کے مختلف حصوں میں پھیل گئے، اس طرح افغانوں اور ترکوں کی ملی جلی نسل پیدا ہوئی جو افغانستان کی موجودہ آبادی پر مشتمل ہے،

سرحدی افغانوں کی سیاسی اور معاشرتی تنظیم کی اکائی خیل کہلاتی ہے، ہر خیل آزاد ہوتا ہے، جرگے میں تمام اہم امور پر فیصلہ کیا جاتا ہے، سرحدی افغان مساوات کے اصول کو مانتے ہیں، روزمرہ کی زندگی میں بھی اس اصول پر عمل ہوتا ہے، امیر اور غریب کا فرق بھی مساوات کے منافی نہیں ہوتا، معمولی سے معمولی حیثیت کے افغان کو بھی اس کا حق ہے، کہ اگر کوئی مساوات کے اصول کی خلاف ورزی کرے، چاہے وہ کتنا ہی بلند مقام کیوں نہ ہو، تو وہ اُسے وہیں ٹوک دے، اور اپنے حق کو منوالے، جہاں جہاں سرحدی افغان نقل وطن کر کے گئے، مساوات کی یہ روایات اُن کے ساتھ گئیں، چنانچہ ہندوستان میں بھی جہاں اُن کی بستیاں ہیں، مساوات کے اصول کی

عمل ہوتا ہے، یہی وجہ ہے کہ افغانی نسل کے لوگوں میں آزادی اور غیرت کا جذبہ دوسروں کے مقابلے میں زیادہ نمایاں نظر آتا ہے، یہ صحیح ہے کہ صدیوں کی تاریخ کے ملبے نے اس پر اپنی تہیں جما دی ہیں، اور اس کی اصلی چمک دمک دھندلی پڑگئی ہے، ہندوستان کی معاشری زندگی کے گرد وپیش نے بھی اسے متاثر کیا، لیکن سرحد پر افغانوں کی زندگی کا یہ انداز اپنی اصلی حالت میں اب بھی موجود ہے، وہ آج بھی اسی طرح سے اپنی آزادی کے دلدادہ ہیں، جس طرح کہ صدیوں پیشتر تھے،

بلبن کے زمانے میں شاہی فوجوں کی بھرتی بڑے پیمانے پر ان افغانوں میں ہونے لگی تھی، جو شمالی ہندوستان میں آکر آباد ہو گئے تھے، ترکوں کا زور جتنا کم ہوتا گیا، ویسا افغانوں کا اثر بڑھتا گیا، محمد تغلق نے دکن میں ان کے سرداروں کو جاگیریں عطا کیں تاکہ وہ وہاں کا انتظام سنبھال لیں، اس طرح بنگال کی فتح اور وہاں کا ملکی نظم ونسق درست کرنے میں ہندی افغانوں نے خاص حصہ لیا، اس طرح افغان نسل کے جو شمالی ہند میں آباد تھے، آہستہ آہستہ سارے ملک میں پھیل گئے، اور ان کے اخلاف نے بنگال اور دکن جیسے دور افتادہ خطوں میں اپنی جڑیں مضبوط کر لیں، آج بھی ان کی اولاد وہاں موجود ہے، اگرچہ زمانے کے گرد وغبار نے ان کے چہروں کے اصلی خد وخال کو نظروں سے اوجھل کر دیا ہے، اور ان کے عادات واطوار بھی وہ نہیں رہے، جو ان کے آبا و اجداد کے تھے۔

گنگا کا دھارا صدیوں میں اپنا بہاؤ بدلتا ہے، لیکن جب بدلتا ہے، تو گاؤں کے گاؤں اس کے جلو میں دریا برد ہو جاتے ہیں، اور نئے نئے علاقے کھیتی باڑی کے لئے باہر نکل آتے ہیں، جن کی زرخیزی اور شادابی ضرب المثل ہے، یہ تخریب اور تعمیر لاکھوں برس سے یوں ہی ہوتی آئی ہے، جو بلند کنارہ لاکھوں برس سے قدرتی عمل سے بن گیا وہ اپنی جگہ مستقل

حیثیت سے قائم رہتا ہے، اس لئے کہ بہاؤ کا رخ اس کنارے کی طرف نہیں ہوتا، بلکہ نشیبی جانب رہتا ہے کمپل اور عطائی پور کے درمیان جو علاقہ ترائی سے اونچا ہے، وہاں رطوبت اتنی نہیں ہے جتنی دریا کے بہاؤ کے نشیبی علاقوں میں ہے، سرحدی افغان خشک پہاڑیوں پر رہنے کے عادی تھے، یہ دان میں بھی آبادی کے لئے ان حصوں کو منتخب کرتے تھے جو اونچائی پر واقع ہوں، پرانی ڈانگ میں انھوں نے جو بستی بسائی وہ پہاڑی کہلاتی ہے، برسات کے زمانے میں گنگا کا پانی پہاڑی کے سرے تک آجاتا ہے، اور برسات کے بعد پھر کئی میل پیچھے ہٹ جاتا ہے، جیسے قدرت نے اسے دھکے دے دے کر پیچھے ہٹنے پر مجبور کر دیا ہو، پرانی ڈانگ اور پہاڑی میں افغانوں کی آبادکاری جہانگیر اور شاہجہاں کے زمانے تک جاری رہی،

نواب رشید خاں جہانگیر کے عہد حکومت میں سرحدی آفریدیوں اور بنگشوں نے مغلیہ سلطنت کے خلاف زبردست شورش برپا کر دی تھی، مہابت خاں نے دیکھا کہ وہ زور زبردستی سے قابو میں نہیں آتے تو انھیں تالیف قلب کے ذریعہ رام کرنے کی کوشش کی، چنانچہ اس نے قبائلی سرداروں کو انعام واکرام سے نوازا، اور ان کی ہر طرح سے دلجوئی کی، ان سرداروں میں ایک اللہداد خاں بھی تھے، جو بعد میں تاریخ میں نواب رشید خاں کے نام سے مشہور ہوئے، وہ روشنائی فرقے کے بانی شیخ بایزید جلالہ کے پوتے تھے، جن کے مرید آفریدیوں اور بنگشوں میں بڑی تعداد میں تھے، مہابت خاں نے اللہداد خاں کی بڑی خاطر مدارات کی، اس نے انھیں سمجھا بجھا کر اس پر آمادہ کر لیا کہ وہ شاہی منصب و جاگیر قبول کر لیں، اللہداد خاں جہانگیر کے دربار میں پیش ہوئے، انھیں اختیار دیا گیا کہ شمالی ہندوستان میں جو افغان آبادیاں ہیں، ان میں جہاں بھی چاہیں

سکونت اختیار کریں، چنانچہ انھوں نے پرگنہ کمپل میں پرانی ڈانگ کے علاقے کو پسند کیا، یہاں انھوں نے ایک گڑھی تعمیر کرائی جس کے آثار اب بھی موجود ہیں، یہ بستی اس وقت سے مئو رشید آباد کے نام سے مشہور ہے، ان کے زمانے میں بعض آفریدی اور بنگش قبائل ترکِ وطن کر کے مئو رشید آباد اور اس کے نواح میں آکر آباد ہو گئے،

اس خاص علاقے کو نواب رشید خاں نے اپنی سکونت کے لئے کیوں منتخب کیا، اس کی نسبت ایک قصہ مشہور ہے، انھیں شکار کا شوق تھا، ایک دن صبح سویرے شکاری کتوں کو ساتھ لئے وہ گنگا کے کنارے ہوا خوری کو نکل گئے، اتفاق یہ کہ گیدڑوں نے ان کے سرحد کے شکاری کتوں کو مقابلہ کر کے بھگا دیا، نواب رشید خاں نے جب یہ ماجرا دیکھا تو ہکے بکے رہ گئے، اپنے ساتھیوں سے کہا کہ یہاں کے پانی میں بڑی قوت ہے، یہ جگہ اس لائق ہے کہ یہاں مستقل سکونت اختیار کی جائے،

شاہجہاں نے اللہ داد خاں کو نواب رشید خاں کا خطاب عطا کیا، انھیں تلنگانے کے صوبے کا ناظم (گورنر) مقرر کیا، اور چار ہزار ذات اور تین ہزار سوار کے منصب سے نوازا، نواب رشید خاں بڑے علم دوست اور امیر تھے، جہاں جاتے وہاں عالموں اور مشائخ کا جمگھٹا لگ جاتا، وہ شاہجہانی عہد کے نہایت کامیاب گورنروں میں تھے، ان کے عہد کے انتظامی کاغذات آج بھی حیدرآباد آرکائز میں محفوظ ہیں، جن میں سے بعض کو میں نے اپنی تالیف "منتخب کاغذات عہد شاہجہاں" میں شامل کیا ہے،

نواب رشید خاں گورنر کی حیثیت سے دکن میں بہت دنوں رہے، لیکن گنگا کے کنارے کی یاد ان کے دل کو مسوستی رہی، چنانچہ انتقال سے قبل انھوں نے وصیت کی کہ مجھے گنگا کے کنارے دفن کرنا، جہاں انھوں نے اپنے محل کے ساتھ نہایت عمدہ باغ لگوایا تھا، بعض

کا خیال ہے کہ انھوں نے اپنی زندگی ہی میں اس باغ میں اپنا مقبرہ بنوا لیا تھا، اس وصیت پر ان کے فرزند الہام اللہ خاں نے عمل کیا اور ان کی لاش کو دکن سے مئو رشید آباد لائے، ان کا مقبرہ اپنے طرز تعمیر کے لحاظ سے خصوصیت رکھتا ہے، اگرچہ اس کی تعمیر شاہجہاں کے عہد میں ہوئی، جبکہ مغلیہ فن تعمیر اپنے شباب پر تھا، اور اس میں بڑی نفاست اور نزاکت آگئی تھی لیکن نواب رشید خاں کے افغانی کردار کو دیکھتے ہوئے مقبرے کی تعمیر میں اس کا خیال رکھا گیا، کہ اس سے بجائے نزاکت کے قوت کا اظہار ہو جو مغلوں سے پہلے کے فن تعمیر کی خصوصیت تھی، اس لئے اس مقبرے کا طرز تعمیر لودھیوں اور تغلقوں کے عہد کے طرز تعمیر سے مشابہت رکھتا ہے، یہ مقبرہ حکومت ہند کے محکمۂ آثار قدیمہ کی نگرانی میں ہے، نواب رشید خاں کے چھوٹے بھائی ہادی داد خاں اور ان کے بیٹے الہام اللہ خاں کو بھی شاہجہاں نے منصب اور اعلیٰ عہدوں پر مامور کیا، وہ دونوں دکن میں رہے، اور وہیں پیوند خاک ہوئے، ان کے مزار ناندیڑ میں ہیں،

اورنگزیب کے عہد میں مئو رشید آباد میں بنگش لوگ بڑی تعداد میں آکر آباد ہوئے بنگش کے لفظی معنی ہیں پہاڑی ملک، یہی لفظ باشندوں کے لئے بھی استعمال ہونے لگا، بلند پہاڑوں پر رہنے والے بالا بنگش اور نیچے کے کوہستانی علاقوں میں رہنے والے پائیں بنگش کہلاتے ہیں، یہ اپنی جفاکشی اور دلیری کے لئے مشہور ہیں،

محمد خاں بنگش: مئو رشید آباد کے محلہ لال باغ میں ایک لڑکا پیدا ہوا، جس نے اپنی قابلیت، دلیری اور حوصلہ مندی سے بڑی ترقی کی، اس کا نام محمد خاں بنگش تھا، وہ نوجوان ہی تھا کہ اس کے منچلے پن کی شہرت دور دور پہنچ گئی، وہ اپنے ہم عمر نوجوانوں کا قائد بن گیا، جو وہ کہتا وہی وہ کرتے، بلا کسی کی مجال تھی کہ کوئی سرتابی کرتا، اس نے مئو رشید آباد کے

افغانوں کو جن کا پیشہ عام طور پر سپہ گری تھا نظم و نسق کا پابند گیا، اور ان کے لئے روزگار فراہم کرنے کی صورتیں نکالیں جس کی انھیں ضرورت تھی، کاشتکاری کے صبر آزما اور ماریے کام میں سب کا دل نہیں لگتا، ضرورت تھی کہ ان کی مہم جوئی کے لئے کوئی راستہ نکالا جاتا،

محمد خاں بنگش نے ایک جماعت تیار کی جنھیں سواری اور اسلحہ کے استعمال کی باقاعدہ تعلیم دی، وسط ہند اور راجپوتانہ کے رجواڑوں میں اکثر اوقات آپس میں لڑائی رہتی تھی، ان کے یہاں شمالی ہند کے پٹھان سپاہیوں کی بڑی قدر تھی، چنانچہ محمد خاں بنگش کا معمول تھا کہ کبھی ایک راجا کی مدد پر وہ اپنی فوج لے جاتے اور کبھی دوسرے کی مدد پر، ان کی سپاہ نے مختلف لڑائیوں میں بہادری کے جوہر دکھائے، اس سے ان کی دھاک وسط ہند اور راجپوتانہ میں بیٹھ گئی، ہوتے ہوتے ان کی شہرت دہلی تک پہونچی کہ محمد خاں بنگش جس کی حمایت پر ہوں اسے ضرور کامیابی ہوتی ہے،

۱۷۱۳ء میں فرخ سیر اور جہاندار شاہ میں دہلی کے تخت و تاج کے لئے جو جنگ ہوئی اس میں فرخ سیر نے محمد خاں بنگش کو مدد کے لئے بلوایا ہمو گڈھ میں جو آگرہ کے قریب ہی بڑی گھمسان کی لڑائی ہوئی، ہونے والی بات کامیابی کا سہرا فرخ سیر کے سر رہا، اس موقع پر مئو رشید آباد کے پٹھانوں نے جو بہادری کے جوہر دکھائے اس سے اچھے اچھے ان کا لوہا مان گئے، دہلی کی حکومت ملنے پر فرخ سیر نے محمد خاں بنگش کو نواب کے خطاب اور چار ہزاری منصب سے سرفراز کیا، اور انکی فوج کی پرورش کیلئے بندیل کھنڈ میں جاگیر عطا کی، اب محمد خاں بنگش کا شمار سلطنت کے اہم امیروں میں ہونے لگا،

قائم گنج کا آباد ہونا | اسی سال یعنی ۱۷۱۳ء میں محمد خاں بنگش نے اپنے سب سے بڑے بیٹے قائم خاں کے نام پر قائم گنج آباد کیا، پھر اس خیال سے کہ کہیں فرخ سیر کو یہ بات ناگوار نہ گذرے اگلے ہی سال

۱۷۱۴ء میں اس کے نام پر فرخ آباد بسایا، اور اسے اپنا صدر مقام بنایا، محمد شاہ نے محمد خاں بنگش کو غضنفر جنگ کے خطاب اور ہفت ہزاری منصب سے نوازا، اور شمس آباد اور بھوج پور کے زرخیز علاقے جاگیر میں دیئے، اور انھیں الہ آباد کا ناظم (گورنر) مقرر کیا، بعد میں جب مرہٹوں کی یورشیں بڑھنے لگیں، تو انھیں مالوہ کا گورنر بنایا، وہاں انھوں نے نظام الملک آصف جاہ اوّل والی ریاست حیدرآباد سے مل کر ایسی تدبیریں کیں جن سے مرہٹوں کو قابو میں رکھا جا سکے، محمد خاں بنگش، اور نظام الملک آصف جاہ اوّل کی ملاقات کا ذکر تاریخوں میں موجود ہے،

محمد خاں بنگش نے ۸۰ سال کی عمر پائی، جب محمد شاہ بادشاہ کو ان کی بیماری کی اطلاع ملی تو شاہی طبیب علوی خاں کو ان کے علاج کے لئے فرخ آباد بھیجا، لیکن علاج سے کوئی فائدہ نہ ہوا، اور انھوں نے داعیِ اجل کو لبیک کہا، محمد خاں بنگش کے خاندان نے فرخ آباد میں سو سال سے زیادہ نوابی کی، انھوں نے اپنی سادہ وضع اور سپاہیانہ طور طریق کو نواب ہونے کے بعد بھی نہیں چھوڑا، ان کی مہمان نوازی کی دور دور شہرت تھی، کھانے کے معاملے میں پٹھانوں میں بڑے چھوٹے کی تمیز روا نہیں رکھی جاتی تھی، نواب ہونے کے بعد بھی محمد خاں بنگش معمولی سپاہیوں کے ساتھ کھانے میں اس طرح شریک ہوتے تھے جیسے کسی زمانہ میں وہ مئو رشید آباد میں اپنے بھائی بندوں کے ساتھ شریک ہوا کرتے تھے، ان کے لئے کوئی خاص کھانا علیحدہ نہیں تیار ہوتا تھا، جو سب کھاتے تھے، وہی وہ بھی کھاتے تھے، دہلی کے امیر امرا، جو مصنوعی آداب برتتے تھے، محمد خاں بنگش کی وضعداری اور سادگی کو سمجھنے سے قاصر تھے،

نواب ہو جانے کے بعد بھی محمد خاں بنگش اپنے وطن مئو رشید آباد آیا کرتے تھے، ایک دفعہ جب وہ ہاتھی پر سوار مئو کی گلیوں سے گذرے تو پٹھانوں کے لڑکوں نے غلیلوں سے غلے مارے، پٹھانوں کو اعتراض تھا کہ محمد خاں بنگش جب اپنے ہاتھی پر سوار ہو کر گذرے تو انکی

عورتوں کی بے پردگی ہوئی، محمد خاں بنگش کو پٹھانوں کی یہ ادا پسند آئی، چنانچہ انھوں نے آیندہ اپنا یہ معمول بنا لیا تھا کہ سورشید آباد میں داخل ہونے سے قبل ہاتھی کو چھوڑ، گھوڑے پر سوار ہو بستی میں داخل ہوتے تھے، وہ اپنے ہم قوم پٹھانوں کے مساوات کے اصول کی قدر کرتے تھے، کوئی اور نوو ولتیا ہوتا تو بُرا مانتا، اور اسے اپنی توہین سمجھتا،

محمد خاں بنگش کے غلام چیلے کہلاتے تھے، انھیں کے نام پر دہلی میں کوچہ چیلاں آج تک چلا آتا ہے، محمد خاں بنگش پٹھانوں کے لاوارث بچوں کی پرورش اور ان کی تعلیم و تربیت کا انتظام کرتے تھے، ان میں جو لائق نکلتے انھیں فوجوں کی سرداری تفویض کی جاتی، اور جاگیریں عطا کی جاتیں، ان میں سے جنھوں نے اپنی قابلیت سے اونچے رتبے پائے، ان کے محل فرخ آباد میں بنوائے گئے، محمد خاں بنگش اور ان کے بیٹوں اور چیلوں کو نئے گنج بسانے کا بڑا شوق تھا، جہاں ہفتہ اور منگل کے دن بازار لگتا تھا، جسے پینٹھ کہتے ہیں، ان گنجوں کی بدولت تجارت کو فروغ ہوا، دیہات کے لوگ اس قسم کی اشیا جیسے غلہ، گھی، کپاس ایک جگہ لاکر فروخت کرنے لگے، ورنہ پہلے یہ تھا کہ تاجروں کے گماشتے گاؤں گاؤں جاتے اور اونے پونے ان اشیاء کی خریداری کر کے منڈی میں فروخت کے لئے لاتے اور منافع حاصل کرتے تھے، اب گاؤں کے لوگ گنج میں اپنا مال لاکر براہ راست فروخت کرنے لگے اور وہ نفع جو دوسروں کی جیب میں جاتا تھا، خود انھیں ملنے لگا، قائم گنج کے علاوہ کاس گنج، علی گنج، کوڑیا گنج، بنی گنج، کمال گنج، اسلام گنج اور دلیر گنج کی منڈیاں اس زمانہ میں قائم ہوئیں، پچھلے ڈھائی سو برس سے آس پاس کے دیہاتی یہاں اپنا مال فروخت کرنے لاتے ہیں، اور اپنی محنت کے ثمرے سے بہرہ اندوز ہوتے ہیں،

محمد خاں بنگش نے ۱۷۱۳ء میں قائم گنج کی بنا ڈالی تھی، آیندہ پندرہ بیس سال تک یہاں

سرحدی پٹھانوں کی آبادی کا سلسلہ جاری رہا، خیبر اور کوہاٹ کے علاقوں سے آفریدی اور پشاور اور مردان سے خٹک قبائل بلائے گئے، انہیں بلانے کے لئے تنخواہ دار ایجنٹ مقرر تھے، جو سرحدی قبائل کے متعلق پوری واقفیت رکھتے تھے، خٹک لوگ رائے پور میں آباد ہوئے، جہاں پہلے سے ان کی برادری کے لوگ موجود تھے، آفریدیوں نے قائم گنج کی نئی بستی میں اپنے محلے بسائے، جو پرانی ڈانگ سے کچھ فاصلے پر تھے، اور جو نیا گنج قائم ہوا تھا، اس سے قریب تھے۔ آفریدیوں نے جو نئے محلے بسائے ان کے نام یہ ہیں جلولی، کوکی خیل، دمدمہ، کلاں خیل، کبیرپور، سرتایں، جلانکا، حسن خیل، گڑھی، اشکل خیل، مول خیل، پتورہ، سبحان پور، غلامی، اور یحییٰ پور، آفریدیوں نے ان علاقوں میں توئے لوگوں کو بے دخل کر کے ان کی زمینوں پر قبضہ کر لیا، توئے لوگوں نے آفریدیوں کا بہادری سے مقابلہ کیا لیکن انھیں شکست ہوئی، اور وہ بھاگ کر مراے اگھت میں آباد ہو گئے، جو ضلع ایٹہ میں ہے، توئے کون تھے، اس کی نسبت کوئی قطعی تاریخی شہادت نہیں ملتی، میرا خیال ہے کہ توئے ان قدیم پٹھانوں کی اولاد تھے، جنھوں نے ہندوستانی عورتوں سے شادیاں کر لی تھیں، جہاں اس قسم کی آبادکاری ہوتی ہے، وہاں لازمی طور پر نووارد مردوں کی تعداد اُن عورتوں کے مقابلے میں زیادہ ہوتی ہے، جو سفر کی صعوبتیں برداشت کر کے ان کے ساتھ وطن سے آتی ہیں، چنانچہ باہر سے آنے والے مرد یہیں کی عورتوں سے شادی کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں، ملایا میں عرب آبادکاروں نے یہی کیا، اور دوسرے ملکوں بھی جہاں آبادکاری ہوئی یہی ہوا ہے، ہرچند کہ افغان لوگ اکثر اوقات اپنے پورے قبیلے کے ساتھ نقل وطن کرتے تھے، لیکن اس کے باوجود مردوں کی تعداد عورتوں سے زیادہ رہی ہوگی، ویسے بھی عام طور پر مغربی ہندوستان اور خاص کر سرحدی علاقے میں مردوں کی آبادی عورتوں سے زیادہ رہتی

ہے۔آج بھی مردم شماری اس بات کی تصدیق کرتی ہے۔ پھر اس کے علاوہ تاریخ سے پتہ چلتا ہے
کہ دنیا میں ہر جگہ جنگجو قبائل میں مردوں کی تعداد عورتوں سے زیادہ ہوتی ہے۔ اگر
ایسا نہ ہو تو ان کی نسل مٹ جائے جو قدرت نہیں چاہتی۔ ترکوں کو مثال کے طور
پر پیش کیا جا سکتا ہے۔

قائم خاں جن کے نام پر قائم گنج آباد ہوا۔ روہیلوں کی جنگ میں شہید ہو گئے۔
۱۷۴۲ء میں محمد خاں بنگش کے انتقال پر ان کا دوسرا بیٹا احمد خاں بنگش ان کا جانشین ہوا۔
انھیں کے عہد میں سودا اور میر سوز نے کچھ روز فرخ آباد میں قیام کیا تھا۔ بعد میں مظفر جنگ
اور تجمل حسین خاں کو ایسٹ انڈیا کمپنی سے پنشن ملتی رہی۔ نواب تجمل حسین خاں ہی کی
مدح میں غالب نے کہا تھا۔

بنا ہے عیش تجمل حسین خاں کے لئے
دیا ہے خلق کو بھی تا کہ اسے نظر نہ لگے

۱۸۵۷ء کی شورش عظیم کے وقت فرخ آباد کے نواب تفضل حسین خاں پر قائم گنج
کے پٹھان پوری طرح حاوی تھے۔ ان کے مشورے کے بغیر نواب کچھ نہیں کرتے تھے
نواب کے خاص مشیر عشرت علی خاں اور محسن علی خاں تھے۔ دونوں انگریزوں کے
سخت مخالف تھے محسن علی خاں نے انگریزی فوجوں کا کئی جگہ بڑی بہادری سے مقابلہ
کیا لیکن انھیں کامیابی نہیں ہوئی۔ چنانچہ انھوں نے نیپال میں جا کر پناہ لی اور باقی عمر وہیں
گذار دی، وطن سے دور، عزیزوں سے دور، اجنبی لوگوں میں۔ انھوں نے عہد کیا تھا کہ
انگریز کی غلامی نہیں کریں گے۔ اسے انھوں نے بڑے استقلال اور ثابت قدمی سے
پورا کیا۔ شورش عظیم کے فرو ہونے کے بعد قائم گنج کے سیکڑوں پٹھانوں کو پھانسی پر چڑھا
دیا گیا۔ جس کے خلاف مخبری ہوئی، وہ پکڑا گیا، نہ داد نہ فریاد۔ اس لئے بعد میں عرصے تک

قائم گنج کے پٹھانوں میں انگریزوں کے خلاف نفرت کا جذبہ بیدار رہا۔ محسن علی خاں کی بہادری اور پامردی کے قصے میں نے اپنے بچپن میں مختلف لوگوں سے سنے تھے۔ خاص کر پٹیالی کے قریب انگریزوں سے جو جنگ ہوئی تھی، اس میں محسن علی خاں اور ان کے پٹھان سپاہیوں نے جو بہادری کے جوہر دکھائے انھیں طرح طرح سے بیان کیا گیا ہے چلولی کے ایک شاعر نے ان واقعات کو نظم کا جامہ پہنایا تھا۔ میں نے یہ نظم بھی سنی ہے جو رزمیہ کے انداز میں تھی جس میں قائم گنج کے پٹھانوں کی بہادری کو بڑھا چڑھا کے ساتھ پیش کیا گیا تھا۔ محسن علی خاں کی بیوہ کو جنھوں نے بہت طویل عمر پائی، انگریزی سرکار سے پنشن قبول کرنے کو کہا گیا تو انھوں نے اس کا یہ جواب دیا "محسن علی خاں کی بیوی اور فرنگی کے سامنے ہاتھ پھیلائے"۔ میں نے اپنے بچپن میں ان بڑی بی کو دیکھا تھا۔ اس وقت ان کی عمر ۹۰ کے لگ بھگ ہوگی، رنگ نہایت گورا تھا۔ کمر جھک گئی تھی۔ سہارے کے لئے لکڑی ہاتھ میں لیکر چلتی تھیں۔ چہرہ باوقار تھا جس پر جھریاں پڑ گئی تھیں۔ ہاتھوں کی جھریاں بھی نمایاں تھیں، جیسے کسی نے جامۂ ہستی کی آستینوں کو چنا ہو۔ وہ ہمارے خالو حسن الدین خاں کی قریبی عزیزہ تھیں۔ انہی کے مکان کے ایک حصے میں رہتی تھیں۔ جب کبھی میں خالو کے یہاں جاتا تو انھیں بھی سلام کرنے حاضر ہوتا تھا۔ ہاتھ اوپر اٹھا کر دعائیں دیتی تھیں۔ ایسی شاندار اور باوقار عورتیں میں نے کم دیکھی ہیں۔ آخر وقت تک ان کے ہوش و حواس ٹھیک رہے۔ ان کا زیادہ وقت عبادت میں گذرتا تھا۔ ان کا انتقال ۱۹۱۶ء میں ہوا۔ ان کے چہرے کا رعب جو نورانیت سے ہم آمیز تھا مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ اس وقت جب کہ میں یہ سطریں لکھ رہا ہوں ان کی نورانی صورت میری آنکھوں کے سامنے پھر رہی ہے۔

دوسرا باب (۲)

آبا رو اجداد

مدہ آخون کی شخصیت | ہمارے مورث اعلیٰ حسین خاں جو مدہ آخون (بڑے استاد) کے لقب سے مشہور تھے، محمد شاہ کے عہد میں ۱۷۱۵ء کے لگ بھگ قائم گنج آکر آباد ہوئے۔ ان کے ساتھ ان کے بڑے بھائی حسن خاں بھی تھے جن کے نام پر حسن خیل محلہ ہے۔ حسین خاں جب کوہاٹ کے علاقے سے قائم گنج آئے، تو اپنے علم و فضل کے سبب سے اپنے ہم مشربوں میں معزز خیال کئے جاتے تھے۔ سرحدی پٹھانوں نے انھیں مدہ آخون (بڑے استاد) کا لقب قائم گنج آنے سے قبل دیا تھا۔ بلاشبہ ان کے ابنائے وطن ان کی قدر و منزلت کرتے تھے، ورنہ انھیں یہ لقب حاصل نہ ہوتا پٹھانوں کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ کسی کی فضیلت اور عظمت کو بڑی مشکل سے مانتے ہیں اور جب ان لیتے ہیں تو پھر اسکی خاطر سب کچھ کرنے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ وہ کسی کی بڑائی کو اُس وقت تک تسلیم نہیں کرتے جب تک کہ وہ واقعی بڑا نہ ہو، اور انھوں نے اسے ہر لحاظ سے پرکھ نہ لیا ہو۔ یہ حقیقت پسندی پٹھانوں کے کردار میں اب بھی تھوڑی بہت نظر آتی ہے۔ زندگی کا یہ انداز نظر ہر اس گروہ میں ملتا ہے، جو آزادی اور مساوات کے اصول کو مانتا ہو اور اس پر عمل پیرا ہو۔

قائم گنج آنے سے قبل مدہ آخون کا مشغلہ درس و تدریس تھا۔ یہاں آنے کے بعد بھی انھوں نے اسے جاری رکھا۔ سرحد پر ان کے بہت سے شاگرد تھے، اور قائم گنج میں بھی ان کے شاگردوں کی تعداد سیکڑوں تک پہونچ گئی تھی۔ انھوں نے بہت طویل عمر پائی، اور عمر بھر درس و تدریس میں لگے رہے۔ میں نے اپنے بعض بزرگوں سے سنا ہے کہ وہ ایک سو بیس [120] سال کی عمر تک پہونچے۔ ممکن ہے، اس میں تھوڑا بہت مبالغہ ہو۔ اس میں شبہہ نہیں کہ وہ سو سال سے زیادہ زندہ رہے، اور آخر عمر تک پڑھنے پڑھانے میں مشغول رہے۔ ان کے قویٰ بہت اچھے تھے۔ وہ بڑے وجیہ و شکیل تھے۔ قدرت نے جسم اور دماغ دونوں کو قوی بنایا تھا۔ کہتے ہیں کہ آخر تک ان کے دانت سلامت رہے۔ اور نظر و سماعت میں بھی فرق نہیں آیا، یا اگر آیا تو بہت کم۔ وہ بچوں کو بڑی محبت سے پڑھاتے تھے۔ شریر سے شریر لڑکے ان کی محبت اور توجہ سے رام ہو جاتے تھے۔ ان بچوں کو جو طبعاً سرکش ہوتے ان کے والدین مدہ آخون کے حوالے کر دیتے تھے۔ انھیں پورا یقین تھا کہ وہ ان کی صحبت میں انسان بن جائیں گے۔

درسِ ادیب اگر بود زمزمۂ محبتے

جمعہ بمکتب آورد طفلِ گریز پاے را (نظیری نیشاپوری)

میں نے بزرگوں سے جو روایتیں سنی ہیں ان سے یہ بات مسلّم ہو جاتی ہے کہ مدہ آخون نے مئو کے پٹھانوں کی کئی پشتوں کو تعلیم و تربیت سے آراستہ کیا تھا جس کے باعث انھیں اپنے زمانے میں بڑی عزت اور مقبولیت حاصل تھی۔ وہ عالم ہونے کے ساتھ صوفیِ باصفا بھی تھے۔ بہت سے پٹھانوں نے ان کے ہاتھ پر بیعت کی تھی۔ ان کی بزرگی اور کرامات کے چرچے تھے۔ جتنی ان کی عمر بڑھتی گئی ان کے حلقۂ ارادت میں اضافہ ہوتا گیا۔ وہ بڑے با وقار اور بارعب تھے۔ جو چیز لوگوں کو ان کی طرف کھینچتی تھی وہ ان کا نورانی چہرہ اور سکون

چہرہ تھا۔ ان کا مزار قائم گنج کے سب سے قدیم قبرستان ننددو خاں میں ہے۔ آج بھی پٹھان یہاں عقیدت کے پھول چڑھاتے ہیں۔ مدہ آخون کی اولاد گڑھی، سرائیں، اور شکل خیل میں خوب پھلی پھولی۔ انھیں محلوں میں ہماری ددھیال کی عزیزداری تھی۔ مجھے اپنی ددھیال کے بعض بزرگ اچھی طرح یاد ہیں۔ ہم سب بھائی بچپن میں ناصر دادا (ناصر علی خاں) استاد دادا (اسد علی خاں) اور دادا دادا (دادا شاہ خاں) کے یہاں جایا کرتے تھے۔ جب ہمارے بھائی چھٹیوں میں قائم گنج آتے تو والدہ انھیں ددھیال کے عزیزوں کے یہاں ضرور بھجواتی تھیں۔ میں بھی اپنے بڑے بھائیوں کے ساتھ جاتا تھا۔ ننھیال کے عزیزوں میں ہم لوگ کلاں خیل کے سائیں داد خاں اور عبدالحافظ خاں اور پتورہ کے فضل امام خاں کے یہاں جایا کرتے تھے۔ والدہ کو اس بات پر اصرار رہتا تھا کہ ہم سبھوں کو اپنے بزرگوں کی دعا لینی چاہئے اور ان کی خدمت میں حاضر ہونا چاہئے۔ وہ کہتی تھیں کہ بزرگوں کی دعا سے بچوں پر برکتیں نازل ہوتی ہیں۔

ہماری ددھیال میں سب سے زیادہ سن رسیدہ ناصر دادا (ناصر علی خاں) تھے جن کا انتقال پچانوے سال کی عمر میں ہوا۔ مجھے وہ اچھی طرح یاد ہیں۔ ہماری والدہ ان کی بہت معتقد تھیں۔ انھیں بلا کر ہم بھائیوں کو ملاتی تھیں تاکہ وہ ہمارے سر پر ہاتھ پھیریں۔ بھائی جان اور منجھلے میاں کی شادی کے موقع پر انھیں نے ان کے سہرے باندھے تھے۔ ذاکر میاں کی شادی کے وقت وہ مرض الموت میں مبتلا اور عرصے سے فریش تھے، اس لئے ان کا سہرا استاد دادا اسد علی خاں نے باندھا تھا۔ اور جب دسمبر ۱۹۳۰ء میں میری شادی ہوئی تو میرا سہرا بھی انھیں نے باندھا تھا۔ اس وقت اسد علی خاں کی عمر بھی نوے کے لگ بھگ تھی۔ وہ اکبر یار جنگ (غلام اکبر خاں) کی والدہ منّی دادی کے بھائی تھے۔ مجھے

یاد ہے، ان کی آنکھیں شمالی یورپ کے لوگوں کی طرح نیلی تھیں۔ ایسی نیلی جس میں ہریاہٹ ملی ہوئی تھی۔ اسد علی خاں ہمارے دادا کے پھوپھی زاد بھائی تھے۔

ناصر دادا کے چہرے پر نور برستا تھا۔ ان کا حلیہ جو میرے حافظے میں ہے، یہ تھا: دراز قد، سفید بھک داڑھی، گورا رنگ، اونچی پیشانی، چمکتی ہوئی آنکھیں۔ ان کا اوپر کا دھڑ نیچے کے جسم سے نمایاں طور پر بڑا تھا۔ ہمارے چچا کا بھی اوپر کا دھڑ نیچے کے دھڑ سے بڑا تھا۔ ناصر دادا بڑے پرہیزگار اور تہجد گذار شخص تھے۔ قائم گنج کے پٹھانوں میں بہت لوگ ان سے عقیدت رکھتے تھے۔ راجپوتانہ کی ریاستوں میں خاص کر جھالا واڑ میں ان کے مریدوں کی بڑی تعداد تھی۔ یہ لوگ انھیں قائم گنج سے اپنے یہاں لے جاتے، اور کئی کئی مہینے مہمان رکھتے۔ ان کی صاحبزادی ننھی بیگم، والدہ کے پاس اکثر آیا کرتی تھیں۔ میں نے جب انھیں دیکھا تو وہ عرصہ سے بیوہ ہو چکی تھیں۔ نماز روزہ کی پابند تھیں۔ نعتیہ کلام سننے کا بڑا شوق تھا۔ جب وہ ہمارے یہاں آتیں تو والدہ کسی نہ کسی ڈومنی کو نعت گانے کے لئے بلوا بھیجتیں۔ ان ڈومنیوں کے گانے پر انھیں خوب حال آتا تھا۔ جب کیفیت طاری ہوتی تو ہاتھ اوپر کر کے کھڑی ہو جاتیں اور سر اس وقت تک زور زور سے ہلاتی رہتیں جب تک کہ کیفیت ختم نہ ہو جاتی۔ والدہ انھیں ہر جمعرات کو فاتحہ کے لئے بلایا کرتی تھیں۔ مشہور تھا کہ ہمارے مکان کی اٹاری پر شہید رہتے ہیں۔ انھیں راضی رکھنے کے لئے ان کی فاتحہ خاص طور پر کی جاتی تھی۔ اگر خاندان میں کوئی بچہ پیدا ہوتا تو شہیدوں کی فاتحہ ضروری سمجھی جاتی تھی، تاکہ ان کی برکت حاصل ہو۔

دہ آخون کی نسل

دہ آخون کے بیٹے احمد حسین خاں اور ان کے بیٹے محمد حسین خاں تھے جنھوں نے قلم چھوڑ کر تلوار ہاتھ میں لی، اور سپہ گری کو اپنا پیشہ بنایا۔ ان کی عمر کا بڑا

حصہ رجواڑوں میں گذرا، وہاں سے واپسی پر کھیتی باڑی اور باغات لگانے کا مشغلہ جاری رہا کچھ تھوڑی بہت زمینداری بھی تھی۔ محمد حسین خاں کے بیٹے ہمارے دادا غلام حسین خاں تھے، جو مئو میں اپنے عرف جھمن خاں کے نام سے مشہور تھے۔ انھوں نے دکنی کنٹنجنٹ میں فوجی ملازمت اختیار کی۔ وہ افسر الملک کے ساتھیوں میں تھے، اور ملازمت کے زمانہ میں اُن دونوں میں گہرے دوستانہ تعلقات تھے۔ ملازمت کے بعد ہمارے دادا قائم گنج چلے آئے۔ افسر الملک نے نواب میر محبوب علی خاں نظام دکن کی ملازمت میں بڑی ترقی کی۔ اور نظام کا اعتماد حاصل کیا۔ ان کا خاندان حیدرآباد میں خوب پھلا پھولا، اور ان کی اولاد ریاست میں اعلیٰ عہدوں پر فائز ہوئی۔ اب ان میں ایک خسرو جنگ زندہ رہ گئے ہیں۔

ہمارے دادا

ہمارے دادا غلام حسین خاں بڑے آزاد منش آدمی تھے۔ وہ جس طبیعت کے شخص تھے اس کا کسی مطلق العنان حکمراں کے دربار میں ترقی کرنا ممکن نہ تھا۔ اگرچہ افسر الملک سے ان کی دانت کاٹی دوستی تھی لیکن مزاج کے لحاظ سے دونوں ایک دوسرے کی ضد تھے۔ افسر الملک نے انھیں حیدرآباد میں رکھنا چاہا، لیکن وہ اس پر آمادہ نہیں ہوئے۔ حیدرآباد کی درباری زندگی کے مقابلے میں انھوں نے قائم گنج کی آزاد اور غیر مصنوعی زندگی کو ترجیح دی۔ وہ انتہا درجے حق پسند، صاف گو اور نڈر تھے۔ کوئی شخص چاہے دنیاوی اعتبار سے کتنا ہی اونچا مرتبہ کیوں نہ رکھتا ہو ان کے نزدیک بس ایک معمولی آدمی تھا، اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ ایسا انسان افسروں کی ماتحتی بھی بس ایک حد تک کر سکتا ہے۔ اس حد کے آگے خود افسر کو ان سے توقع رکھنے کی ہمت نہ ہوگی۔ فوج میں رہے تو بھی بڑی آن بان سے رہے۔ قائم گنج آئے تو کسی دولت مند کے سامنے اپنے کو ہیٹا نہیں سمجھا۔ اگرچہ خود دولت مند نہیں تھے لیکن دولت مندوں سے اپنا احترام کرانا جانتے تھے۔ اپنے زمانہ کے بڑے دلیر اور جری

لوگوں میں شمار ہوتے تھے۔ بڑے ذکی الحس اور غصہ ور تھے۔ آسانی سے کسی کی بڑائی نہیں مانتے تھے۔ مگر غریبوں اور مسکینوں کے ساتھ بڑی بردباری اور انکسار سے پیش آتے تھے۔ ان کے دروازے سے کوئی مانگنے والا خالی ہاتھ نہیں جاتا تھا۔ ان کا معمول تھا، روز صبح بازار جاتے، جانے سے پہلے محلے کی بیواؤں کے یہاں دریافت کرا لیتے کہ بازار سے کچھ سودا سلف تو نہیں منگانا ہے۔ اگر کسی دن خود نہ جا سکتے، تو بھی اس معمول پر عمل ہوتا اور سودا منگوا کر بھجوا دیتے۔ رات کو محلے میں چکر ضرور لگاتے تھے۔ گلیوں میں انکی پینچل دور تک سنائی دیتی تھی جس سے محلے کے غریبوں اور لاوارثوں کی ڈھارس بندھتی تھی کہ کوئی بدمعاش انھیں دق نہیں کر سکے گا۔ چور اور اُچکے اور محلوں میں چکر لگاتے تھے لیکن مول خیل میں جھمن خاں کے ڈر سے ان کے پر جلتے تھے۔ کیا مجال کہ ان کے ہوتے ان کے محلے میں کوئی کسی پر ظلم زیادتی کر سکے۔ جھمن خاں شکل صورت سے نہایت وجیہ اور باوقار تھے۔ قد اونچا جسم بھاری، فولاد کی طرح گٹھا ہوا اور مضبوط، رنگ سرخ و سفید، بھنویں اور داڑھی گھنی تھی، آخر تک آواز میں کرارہ پن تھا جس محفل میں بیٹھتے توجہ کا مرکز بن جاتے تھے۔ جس کے دوست ہوتے اس کے لئے اپنی جان خطرے میں ڈال دیتے تھے۔ انھیں دشمن بنانے کی بہت کم لوگوں میں ہمت تھی۔ مزاج میں سختی کے ساتھ رحم تھا۔

ہمارے دادا کو درویشوں سے بہت عقیدت تھی۔ اس زمانے میں قائم گنج میں ایک درویش تھے کرم علی شاہ میاں۔ وہ ان کی بڑی نازبرداری کرتے اور ان کی جو بھی خواہش ہوتی اسے خوشی سے پورا کرتے تھے۔ کرم علی شاہ میاں گنج میں رہتے تھے۔ جس دن وہ نہ آتے اس دن ہمارے دادا خود ان کے پاس جاتے اور گھنٹوں ان کے

پاس ٹھہرتے۔ ہمارے دادا کو بنس بہاری سے بھی عقیدت تھی جن کا مسلک کبیرداس کی طرح صلح کل تھا۔ وہ موحّد تھے۔ بت پرستی اور ذات پات کو نہیں مانتے تھے، مسلمانوں کے ہاتھ کا کھاتے تھے۔ اور ان کے ساتھ رہنے سہنے میں بھی انھیں عذر نہ تھا۔ اپنی رواداری اور وسیع مشربی کے باعث پٹھانوں میں مقبول تھے۔ ان کے متعلق عام طور پر مشہور تھا کہ وہ دل میں مسلمان ہیں۔ آج تک قائم گنج میں یہ مشہور ہے کہ ہمارے والد کو آیندہ حیدرآباد میں جو دنیاوی کامیابی ہوئی، وہ انہی دونوں بزرگوں کی دعا کا اثر تھا۔ ہمارے دادا کو تو اس بات کا پورا یقین تھا، اس لئے کہ وہ درویشوں کی دعا کو مانتے تھے، اور ان کے ہمیشہ طالب رہتے تھے۔ میں نے اپنے بچپن میں ان دونوں بزرگوں کی کرامات کے بہت سے قصے سنے تھے، خاص کر کرم علی شاہ میاں کے متعلق۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ ان میں کہاں تک اصلیت ہے۔ اور کہاں تک وہ خوش عقیدگی اور تخیل کی تخلیق ہیں۔ جن لوگوں نے مجھ سے ان بزرگوں کی کرامات بیان کیں ان کے نزدیک ان کے حقیقی ہونے میں کسی شک و شبہ کی گنجایش نہ تھی۔

ہمارے دادا کی شادی مول خیل میں ہوئی تھی۔ وہ شکل خیل سے مول خیل اپنی سسرال کے گھر آ گئے۔ اور یہیں رہے۔ حسن خاں ان میں ان کی شادی ہوتی تھی اس کے جد امجد تورکا کا تھے۔ جن کی قبر مول خیل کی قدیم مسجد کے متصل ہے۔ تورکا کا مول خیل کے محافظ ولی تھے۔ جن کے نام کی فاتحہ کی جاتی تھی۔ ہماری والدہ بھی ہر جمعرات کو تورکا کا کی قبر کے سرہانے چراغ رکھواتی تھیں اور فاتحہ کا جو کھانا ہوتا وہ غریب غربا کیلئے مسجد بھجوا دیا جاتا۔ میں نے بزرگوں سے سنا ہے کہ تورکا کا مدہ آخون کے ہمعصر تھے۔ ان کی قبر کے نزدیک مسجد کے پیچھے ایک قدیم باؤلی ہے۔ جہاں پرانے زمانے میں بنجاروں کا پڑاؤ پڑتا تھا۔ یہ باولی

بھی کم سے کم ڈیڑھ سو سال پہلے کی ہے لیکن اب تک اچھی حالت میں ہے۔ اب میرے برادر نسبتی قدوس عالم خاں نے اس میں نل لگوا لیا ہے اور آس پاس کے باغوں اور کھیتوں کو اس کا پانی سیراب کرتا ہے۔

ہمارے دادا کو شکار کا بہت شوق تھا۔ شیر کے شکار کے لئے بندیل کھنڈ جاتے تھے۔ ایک دفعہ شیر سے ان کی مڈبھیڑ ہو گئی تو تلوار سے اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے۔ شیر نے انھیں زخمی کر دیا تھا جس کے سبب سے کئی مہینے فرش رہے۔ جب ٹھیک ہو گئے تو پھر شکار کے لئے بندیل کھنڈ گئے، لوگ کہتے ہیں ان کے مزاج میں ضد تھی میں کہتا ہوں یہ ضد نہیں تھی۔ یہ ان کے کردار میں جرأت اور حوصلہ مندی کا جوہر تھا جو نمایاں ہوتا تھا۔ وہ اس کے ہاتھوں اس طرح مجبور تھے جیسے بزدل اپنے تھوڑ دلے پن کے لئے مجبور رہوتا ہے۔ ہمارے دادا کی جلالی طبیعت اپنی ایک شان رکھتی تھی۔ وہ دولت مندوں کے سامنے مغرور تھے لیکن غریبوں اور بے کسوں کے آگے متواضع اور منکسر مزاج تھے، ان کی طبیعت کا یہ رنگ اتنا راسخ تھا کہ دنیا کی کوئی چیز اسے بدل نہیں سکتی تھی۔ وہ بعض باتوں پر اڑ جاتے تھے، ایسے کہ پھر ہلائے نہ ہلیں اور ہٹائے نہ ہٹیں۔ یہ اس وقت تھا جب کہ ان کی غیرت ایسا کرنے کی متقاضی ہوتی تھی۔ وہ عمر بھر بات کے دھنی اور دل کے غنی رہے۔

بدھن خالہ مول خیل میں ایک خاتون تھیں جو بدھن خالہ کے نام سے مشہور تھیں۔ میں نے بچپن میں ان کے متعلق بہت کچھ سنا تھا۔ ہمارے دادا کی سسرال سے بدھن خالہ کا رشتہ تھا، وہ کسی فوجی افسر کی بیوہ تھیں اور صاحب ثروت خاتون تھیں، نہایت منتظم، جری اور عالی حوصلہ۔ شوہر نے جو روپیہ پیسہ چھوڑا اس سے انھوں نے گھوڑوں کی تجارت شروع کی۔ سارا کاروبار ملازم سنبھالتے تھے اور وہ خود عام نگرانی کرتی تھیں۔ ان کے ملازم مکھن پور اور

آس پاس کے دوسرے ہاٹوں اور میلوں سے گھوڑے خرید کر لاتے اور نوجوان فوجیوں کو اجرت پر دیتے۔ ۱۸۵۷ء کی شورش عظیم سے قبل نوابوں اور رجواڑوں کے یہاں فوجی خدمت کا جو طریقہ رائج تھا اس کے بموجب سپاہی کو اپنا گھوڑا خود رکھنا پڑتا تھا، یہ صلہ داری کا طریقہ کہلاتا تھا، بدھن خالہ کے گھوڑے، دکن، راجپوتانہ اور وسط ہند میں سپاہیوں کے پاس سیکڑوں کی تعداد میں تھے جن سے انھیں آمدنی ہوتی تھی۔ سارا معاملہ تھا انتظام کا۔ بدھن خالہ نچلی تھوڑی بیٹھتی تھیں۔ ملازموں سے روزانہ حساب کتاب چکانے میں کافی وقت صرف کرتیں۔ آیندہ کام کو فروغ دینے کے لئے ہدایات دیتیں۔ اور پھیلی ہوئی رقم کو سمیٹنے کی تدابیر بتاتیں۔ مئو کی عورتوں میں وہ مردانی عورت مشہور تھیں۔ بدھن خالہ کے مکان کے کھنڈر میرے بچپن تک مول خیل میں موجود تھے، بعد میں وہ کھیتوں اور باغوں کا حصہ بن گئے۔

قائم گنج کے پٹھانوں کا اصلی پیشہ سپہ گری ہے۔ ان کے بعض گھرانوں میں کاشتکاری بھی ہوتی تھی۔ باغ لگانے کا شوق تو پٹھانوں کو ہر زمانے میں تھا۔ شمالی ہند میں جہاں جہاں ان کی بستیاں آباد ہیں وہاں کوئی نہ کوئی لذیذ اور نفیس پھل ضرور دستیاب ہوگا۔ قائم گنج کے آم اور بیر بہت مزے دار ہوتے ہیں۔ میں نے اپنے بچپن میں جیسے لذیذ تخمی آم وہاں کھائے ویسے پھر کبھی نہ ملے، وہاں کے پیوندی بیروں میں جو خاص ذائقہ اور خوشبو ہے وہ کسی اور جگہ کے بیروں میں نہیں ہوتی۔ ضلع ایٹہ میں علی گنج کے بیر بھی مشہور ہیں یہاں کے بیر قائم گنج کے بیروں سے بڑے ہوتے ہیں لیکن ان میں وہ ذائقہ اور خوشبو اور کرکرا پن نہیں ہوتا، جو قائم گنج کے بیروں کی خصوصیت ہے۔ بلا مبالغہ ان کا ذائقہ عمدہ سے عمدہ سیب کے ذائقے سے کم نہیں ہوتا بلکہ بعض لحاظ سے بہتر ہوتا ہے۔ آپ دوسری جگہ کے بیروں میں قائم گنج کے تھوڑے سے بیر ملا دیجئے، میں انھیں چکھ کر فوراً بتا دوں گا کہ ان میں

قائم گنج کے بیر کون سے ہیں۔

میرا حافظہ ذائقے اور خوشبو کے معاملے میں بہت قوی ہے۔ ایک مرتبہ ہمارے ایک عزیز جب قائم گنج سے علی گڈھ آئے تو میرے لیے بیروں کا ایک ٹوکرا اپنے ساتھ لائے۔ ٹوکرا کچھ خالی تھا۔ علی گنج سے گذرے تو انھوں نے خیال کیا کہ کچھ بیر اور لے کر ٹوکرا بھر لیا جائے۔ چنانچہ انھوں نے نہایت عمدہ قسم کے بیر لے کر ٹوکرے میں ڈلوا دیئے۔ یہ بیر قائم گنج کے بیروں سے بڑے اور زیادہ شاداب تھے جب ٹوکرا کھولا گیا اور میں نے بیر کھائے تو میں نے بتا دیا کہ قائم گنج کے بیر کون سے اور علی گنج کے کون سے ہیں۔ اس پر سب کو تعجب ہوا۔ میں نے کہا کہ تعجب کی کوئی بات نہیں۔ میں نے بچپن میں قائم گنج کے بیر اس کثرت سے کھائے ہیں ۔ اور ان کا ذائقہ مجھے اس قدر پسند تھا کہ وہ میرے حافظے میں محفوظ رہ گیا۔ علی گنج کے بیر بھی کھانے کا اتفاق ہوا تھا۔ حافظے کا گہرا تعلق دل کی پسند اور ناپسند سے ہے۔ جو چیز ہمیں پسند ہے اسے ہم یاد رکھنا چاہتے ہیں اور جسے ہم ناپسند کرتے ہیں اسے بھلانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس طور پر فطرت ہمارے ذہنی توازن کو برقرار رکھتی ہے، قائم گنج کے بیروں کی خوشبو اور ان کا ذائقہ ایسی چیز نہیں جس کے نقوش میرے حافظے سے محو ہو سکیں۔ اس واقعہ سے میرا مقصد اپنے حافظہ کی تعریف کرنا نہیں بلکہ قائم گنج کے بیروں کی خوبی بتلانا ہے۔ میں نے ایسے خوش ذائقہ بیر کہیں نہیں کھائے۔ یہ لذت پذیری زبان اور ناک دونوں کے مشترک احساس سے عبارت ہے۔

گنگا کی ترائی کے خربوزوں میں جو تازگی ہوتی ہے۔ وہ دوسری جگہ کے خربوزوں میں نہیں ملتی۔ لکھنؤ میں گومتی کے کنارے کے خربوزے نفاست میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔ لیکن ان میں وہ تازگی نہیں جو گنگا کے کنارے کے خربوزوں میں ہوتی ہے۔ تربوز کا تو کیا

کہنا بعض تربوز اندر چھلکے تک سرخ ہوتے ہیں۔ ان میں ایک خاص قسم ہے جسے اشرفی کہتے ہیں۔
یہ بڑے رس دار اور میٹھے ہوتے ہیں۔ ایسے میٹھے کہ آدمی ہونٹ چاٹا کرے۔ کاٹو تو رس
اتنا نکلے کہ قاب بھر جائے۔ مئی جون کی لو میں انھیں کھاؤ تو دل ٹھنڈا ہو جائے۔ قائم گنج اور
فرخ آباد کے سے عمدہ تربوز بھی میں نے کہیں نہیں کھائے۔ گرمیوں کی چھٹیوں میں ہم لوگ کبھی
کبھی خربوزے اور تربوز کھانے ترائی جاتے تھے۔ پتورہ سے صبح سویرے چلے، پہاڑی
پہونچے، وہاں سے دو تین فرلانگ گنگا کی طرف بڑھے کہ خربوزوں کی فالیزیں شروع
ہو گئیں۔ خوب جی بھر کے خربوزے کھائے۔ ٹوکروں میں خربوزے اور تربوز رکھے اور
پھر گھر واپس۔ دوپہر تک گھر پہونچ جاتے تھے۔ دو ایک آدمی ساتھ ہوتے جو رہنمائی بھی کرتے اور واپسی پر
تربوز کے ٹوکروں کو بھی اٹھاتے تھے پہاڑی پر میرے ایک دوست فضل محمد خاں جو اٹاوہ کے اسلامیہ اسکول
میں میرے ہم جماعت تھے ہم لوگوں کے ساتھ آجاتے تھے۔ انکے ساتھ میں نے پرانی ڈانگ کی بھی سیر کی۔ انکا رنگ بہت
گورا تو نہ تھا لیکن آنکھیں یورپین لوگوں کی طرح نیلی تھیں۔ یورپ میں بھی صرف فارڈک لوگوں کی آنکھیں نیلی ہوتی
ہیں، جو خالص آریائی ہیں۔ دوسرے بیشتر لوگوں کی آنکھیں بھوری یا کالی ہوتی ہیں۔ ان کے
بڑے بھائی شفیق محمد خاں بھی ہم لوگوں کے ساتھ اٹاوہ میں تھے۔ بعد میں دونوں بھائی
جوناگڈھ میں ملازم ہو گئے تھے۔

ہمارے والد | ہمارے والد فدا حسین خاں قائم گنج کے تحصیلی اسکول میں تعلیم حاصل کرنے
کے بعد ۱۸۸۹ء میں حیدرآباد گئے۔ اس وقت ان کی عمر بیس سال تھی۔ شروع ہی سے
انھیں پڑھنے لکھنے کا شوق تھا۔ طبیعت میں نزاکت اور نفاست تھی۔ گھر سے ہزار بارہ سو
روپیے لے کر نکلے تھے کہ اس سے حیدرآباد میں کچھ کاروبار کریں گے۔ اس زمانے میں حیدرآباد
میں قائم گنج کے بعض لوگ پہلے سے موجود تھے۔ رائے پور کے محمد زماں خاں ناظم فوجداری

تھے، ہمارے والد نے بیگم بازار میں مراد آبادی برتنوں کا کاروبار شروع کیا۔ وہیں قریب میں شمالی ہند کے ایک وکیل صاحب رہتے تھے۔ ان کے یہاں ان کا اکثر آنا جانا رہتا تھا عام طور پر والد شام کا وقت انہی کے دیوان خانے میں صرف کرتے تھے۔ دیوان خانے ہی میں وکیل صاحب کا کتب خانہ بھی تھا۔ والد نے وکیل صاحب سے مطالعہ کے لئے چند کتابیں مستعار لیں۔ یہ کتابیں قانون کی تھیں۔ جو انھوں نے چند دنوں میں پڑھ ڈالیں۔ اور کتابیں لائے وہ بھی پڑھ ڈالیں۔ اب والد کا دل ان کتابوں کے مطالعہ میں لگنے لگا۔ بعض دوستوں نے مشورہ دیا کہ قانون سے اس قدر لگاؤ ہے تو وکالت کے امتحان میں کیوں نہیں شریک ہو جاتے۔ امتحان میں شریک ہوئے، اور اول درجہ میں کامیاب ہوئے۔ اب انھوں نے تجارت چھوڑ، وکالت کا پیشہ اختیار کیا۔ جس میں خدا نے بڑی برکت دی۔

حیدرآباد جیسے بڑے شہر میں کسی پردیسی نوجوان کا وکالت شروع کرنا آسان نہیں تھا۔ ہم پیشہ لوگوں سے مقابلے کا معاملہ تو رہا الگ بڑے شہر میں اجنبی آدمی جو پیشے میں نیا نیا داخل ہوا ہو، کھو سا جاتا ہے پیسہ کمانے کے لئے ساکھ ہونی چاہئے۔ جو آہستہ آہستہ قائم ہوتی ہے۔ ان حالات میں والد نے سوچا کہ بجائے حیدرآباد کے کسی چھوٹے مقام میں وکالت شروع کریں۔ چنانچہ انھوں نے اورنگ آباد کا رخ کیا۔ جہاں قائم گنج کے کچھ لوگوں کو وہ پہلے سے جانتے تھے۔ اورنگ آباد میں انھوں نے بڑی دیانت داری اور مشقت سے کام کیا۔ چند سال میں ان کی وکالت چمک نکلی۔ یہیں انھوں نے "آئین دکن" کے نام سے ایک قانونی رسالہ جاری کیا جس میں حیدرآباد ہائی کورٹ کے نظائر شائع ہوتے تھے۔ ریاست حیدرآباد کے وکیلوں کو حیدرآباد ہائی کورٹ کے فیصلوں کی فراہمی میں بڑی دشواری رہتی تھی۔ اب اس رسالے سے یہ دشواری دور ہو گئی۔ "آئین دکن" اب سے ساٹھ ستر برس پہلے

ریاست حیدرآباد کے آئین و قوانین کا اہم ماخذ خیال کیا جاتا تھا۔ بعد میں بھی وکالت کا پیشہ کرنے والے اسے قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے میں نے حیدرآباد کے سب بڑے وکیلوں کے کتب خانوں میں اس رسالے کی جلدیں دیکھی ہیں، جو دکن کے قوانین پر حوالے کا کام دیتی تھیں۔

"آئین دکن" کے شائع ہونے سے والد کی شہرت شہر حیدرآباد تک پہونچ گئی تو دوستوں نے مشورہ دیا کہ اب وکالت حیدرآباد آکر کیجئے۔ چنانچہ ۱۸۹۳ء میں وہ اورنگ آباد سے حیدرآباد آگئے۔ بیگم بازار میں جہاں چند سال پہلے اُنھوں نے اپنی زندگی شروع کی تھی اپنا دفتر قائم کرلیا، چند سال میں ان کی وکالت کو ایسا فروغ ہوا کہ لوگ تعجب کرنے لگے۔ ان کی غیر معمولی کامیابی کا راز ان کی محنت اور دیانت داری میں مضمر تھا۔ بیگم بازار ہی میں انھوں نے زمین کا ٹکڑا خرید کر ایک دو منزلہ مکان تعمیر کرایا۔ مکان کے نچلے حصے میں مطبع قائم کیا جس میں "آئین دکن" کے علاوہ دوسری قانونی کتابیں بھی چھپتی تھیں۔ ہمارا یہ مکان دولت خاں کی حویلی سے متصل تھا اوپر کے حصے میں خاندان کے سب لوگ رہتے تھے اور نیچے پریس، والد کا دفتر اور کتب خانہ تھا۔

والد نے قانونی مسائل پر بیس سے اوپر کتابیں تصنیف کیں، جو سب مطبع آئین دکن میں طبع ہوئیں، مطبع کے ساتھ ایک اشاعت گھر بھی قائم ہوگیا۔ ان کتابوں میں شرح قانون، فوجداری وکیلوں کے طبقے میں بہت مقبول ہوئی۔ ان کی دوسری اہم تصانیف یہ ہیں:

مجموعۂ ضابطۂ فوجداری مع شرح، مجموعہ فیصلہ جات مجلس عالیۂ عدالت، قانون اسٹامپ وصداقت نامہ و وراثت و رسوم عدالت، شرح ضابطۂ فوجداری، مجموعۂ ضابطۂ دیوانی علاقہ سرکار عالی مع شرح، مجموعۂ تعزیرات ممالک محروسۂ سرکار عالی، قانون مجوبیہ مع شرح بابت میعاد سماعت اور قانون رجسٹری وغیرہ۔

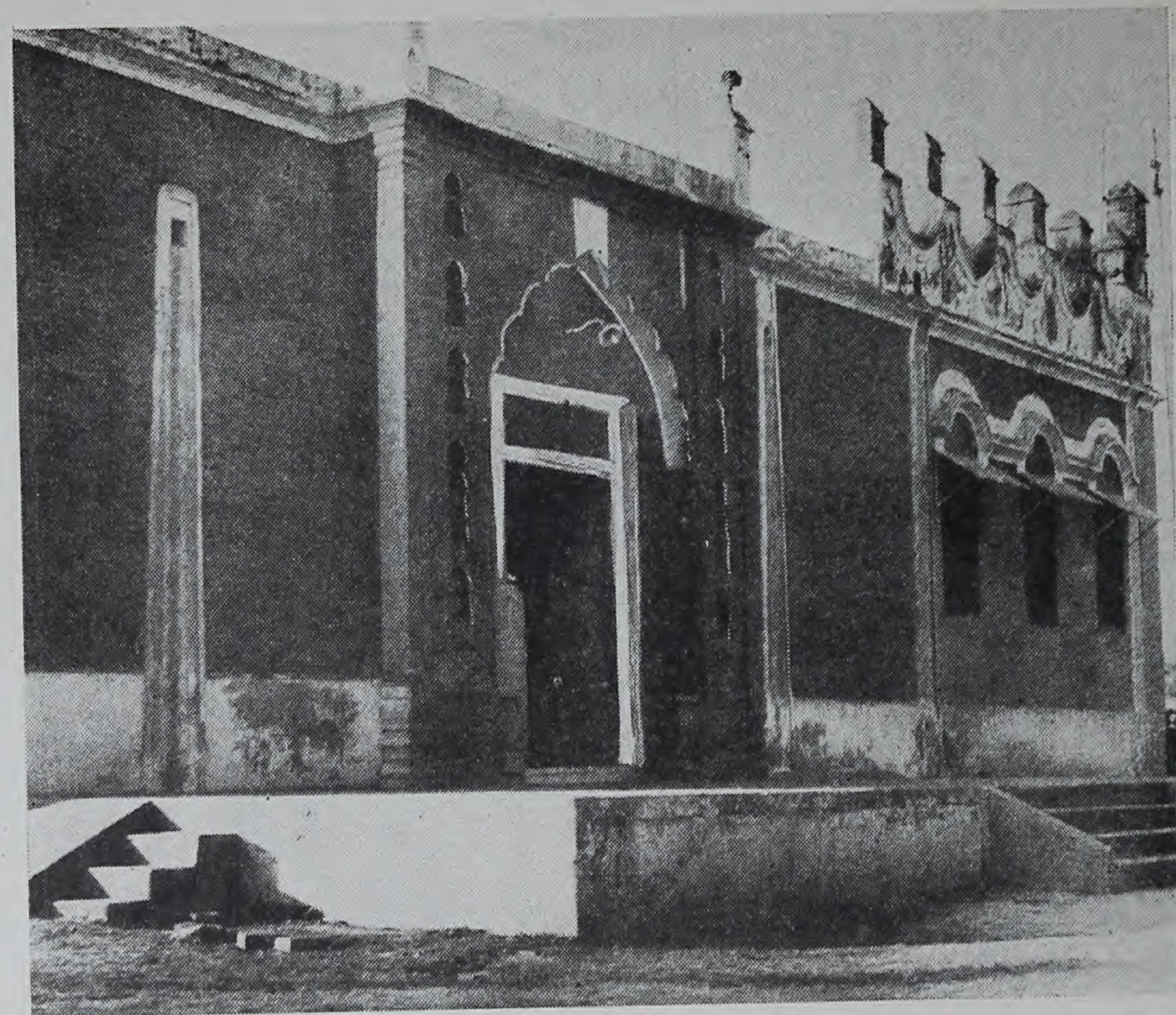
مطبع آئین دکن کے منیجر مولوی عبد الغنی خاں شاہجہاں پوری تھے۔ ایک نو مسلم انگریز جن کا نام بھی عبد الغنی تھا۔ انگریزی سے اردو میں ترجمہ کرنے پر مامور تھے، اس کے علاوہ وہ ہمارے بڑے بھائیوں کو انگریزی بھی پڑھاتے تھے میں جب ۱۹۳۰ء میں جامعہ عثمانیہ میں ملازم ہوا۔ تو اس وقت تک عبد الغنی شاہجہانپوری زندہ تھے، اور ہمارے بیگم بازار کے مکان کے نچلے حصے میں رہتے تھے۔ پریس میں چھپی ہوئی کتابوں کا جو ذخیرہ تھا، وہ انھیں فروخت کرتے تھے۔

والد مرحوم کی وکالت حیدر آباد میں ایسی کامیابی سے چلی کہ عرصے تک وہاں لوگ اس کا چرچا کرتے تھے۔ انھیں ہائی کورٹ کی ججی قبول کرنے کے لئے کہا گیا تھا لیکن انھوں نے اپنی معذوری ظاہر کی، وہ جانتے تھے کہ وکالت کے علاوہ وہ جو علمی کام کرتے ہیں، وہ جج ہونے کے بعد ترک کرنا پڑیگا، ان کی غیر معمولی کامیابی ان کی دیانت کا پھل تھا۔ وہ مقدمہ قبول کرتے وقت کافی چھان بین کرتے تھے اور صرف ان مقدموں کی پیروی کرنے پر آمادگی ظاہر کرتے تھے، جنھیں وہ پوری طرح حق بجانب خیال کرتے تھے۔ ممکن ہے، اس دیانت اور راست بازی کے سبب سے انھیں عارضی طور پر کچھ نقصان برداشت کرنا پڑا ہو لیکن بالآخر انھیں اس سے فائدہ ہوا جیسا کہ زندگی میں ہمیشہ ہوتا ہے۔ دیانت اور راست بازی اخلاقی خوبیاں ہیں اور عملی طور پر بھی دیکھا جائے تو ان سے انسان فائدہ ہی میں رہتا ہے، اور اگر فائدہ نہ ہو تو بھی اخلاقی اقدار کے حصول کی کوشش ہر انسان کا فرض ہے۔ انھیں سے ہماری زندگی میں معنی پیدا ہوتے ہیں۔

والد مرحوم نے کل سولہ سال وکالت کی۔ اس دوران میں انھوں نے بہت کچھ کمایا۔ ایک دو منزلہ مکان بیگم بازار حیدرآباد میں، اور دوسرا مکان قائم گنج میں تعمیر کرا دیا، مولوی خلیل



ہمارا حیدرآباد کا مکان



ہمارا پتھورہ (قائم گنج) کا مکان

میں جو ہمارا مکان ہے۔ وہ ہمارے دادا کی زندگی میں سنہ ۱۹۰۰ء میں تعمیر ہوا تھا۔ یہ چھوٹی اینٹ کا بنا ہوا ہے۔ جسے گگیا اینٹ کہتے ہیں۔ بڑی اینٹ گما کہلاتی ہے۔ مجھے معلوم نہیں کہ یہ لفظ اور جگہ بھی استعمال ہوتے ہیں یا نہیں۔ ہم سب بھائیوں کے قائم گنج سے باہر رہنے کے سبب سے مکان کی جو دیکھ بھال اور نگہداشت ہونی چاہیے وہ نہیں ہوئی لیکن وہ اپنی جگہ پر کھڑا ہے جیسے زمانے کے انقلابوں کو تماشائی کی حیثیت سے دیکھ رہا ہو۔ اسے بنے ہوئے اب پینسٹھ ۶۵ سال ہو چکے ہیں لیکن اس کی کوئی اینٹ اپنی جگہ سے نہیں کھسکی ہاں چھتیں ٹپکتی ہیں۔ اور ان کی مرمت برابر ہوتی رہتی ہے۔ میری بچپن کی بعض عزیز یادیں اس مکان سے وابستہ ہیں۔

ہم لوگ ددھیال اور ننھیال دونوں طرف سے قصباتی ہیں۔ ہمارے نانا نبی داد خاں کلاں خیل میں رہتے تھے۔ ان کا پیشہ بھی سپہ گری تھا، اور انھیں پنشن ملتی تھی طبیعت میں انتہا درجے حلم اور بردباری تھی۔ ہماری نانی حسینی بیگم کہا کرتی تھیں کہ ہمارے نانا نے کبھی کسی کا دل نہیں دکھایا نہ کبھی کوئی ان کا دشمن ہوا۔ نانی کہتی تھیں کہ کسی نے انھیں غصے ہوتے نہیں دیکھا۔ وہ جھگڑے فساد سے ہمیشہ دور رہتے تھے۔ اپنی سلامتی طبع اور بردباری کی وجہ سے عام طور پر اپنے ہمچشموں میں مقبول تھے۔

مجھے اپنی نانی حسینی بیگم جنھیں ہم سب جھینی کہتے تھے، اچھی طرح یاد ہیں۔ وہ پتورہ کے فضل امام خاں کی بڑی بہن تھیں جو قائم گنج کے رئیس تھے۔ وہ پشتو بول سکتی تھیں بعض پشتو لفظ ان کی زبان پر چڑھے ہوئے تھے۔ مثلاً عصر کی نماز کے لئے مزدگر، اور عشا کی نماز کے لئے ماسختن بولا کرتی تھیں پنج وقتہ نماز کی پابند تھیں سردیوں میں ایک چھوٹا اونی کوٹ پہنتی تھیں۔ ان کی نماز کی چوکی پر ہم لوگوں کو بیٹھنے کی اجازت نہ تھی، اس لئے کہ اس پر ان کی جانماز بچھی رہتی تھی۔ نانی کے کوئی لڑکا نہیں تھا۔ ان کی تین لڑکیاں تھیں جن میں سب سے چھوٹی ہماری

والدہ نازنین بیگم عرف دجو بیگم تھیں۔ نانی کہا کرتی تھیں کہ دجو صورت اور سیرت دونوں میں اپنے والد سے مشابہت رکھتی ہے۔ ہماری والدہ کی طبیعت میں بھی انتہائی سادگی اور بردباری تھی کبھی کسی کی بُرائی نہیں کرتی تھیں۔ اگر کوئی دوسرا ان کے سامنے کسی کی برائی کرتا تو خاموش ہو جاتیں، خود کچھ نہ کہتیں۔ وضع داری کا یہ عالم تھا کہ جس انداز سے جس سے ملتی تھیں اسے آخر تک قائم رکھا اس میں کبھی کوئی فرق نہیں آنے دیا۔ ان کے متواضع اور ملنسار ہونے کا ذکر میں نے قائم گنج کی متعدد خواتین سے سنا ہے، جو انھیں اچھی طرح جانتی تھیں اور خود میری یاد بھی اس کی تصدیق کرتی ہے۔

ہمارے دادا اور نانا کے کیرکٹر ایک دوسرے کی ضد تھے۔ دادا اگر جلال کا نمونہ تھے تو نانا جمال کا۔ دادا کا لوگ احترام کرتے تھے اور نانا سے محبت کرتے تھے۔ والد اور والدہ دونوں کی طبیعت میں انکسار اور بردباری تھی جس کا اثر کم و بیش ہم سب بھائیوں میں نظر آتا ہے لیکن بعض اوقات دادا اور نانا کے کیرکٹر کی جھلک بھی خلقی طبائع کے چوکھٹے میں ظاہر ہو جاتی ہے۔ ہماری نانی جس طرح ہماری والدہ کے متعلق کہا کرتی تھیں کہ وہ ہمارے نانا سے مشابہت رکھتی ہیں، صورت اور سیرت دونوں میں۔ اسی طرح ہمارے بھائیوں میں ذاکر میاں کے متعلق یہی بات دہراتی تھیں، کہتی تھیں کہ اور سب بھائی تو دادا پر گئے ہیں لیکن ذاکر نانا پر گیا ہے، واقعہ یہ ہے کہ ہم سب بھائیوں میں ددھیال اور ننھیال کی خصوصیات کا امتزاج ملتا ہے، کسی میں ددھیال کا پلّہ ذرا بھاری ہے اور کسی میں ننھیال کا۔

والد نے ۱۹۰۷ء میں انتالیس ۳۹ سال کی عمر میں وفات پائی۔ وہ بیس ۲۰ سال کی عمر میں قائم گنج سے حیدرآباد گئے تھے، بائیس ۲۲ سال کی عمر میں وکالت شروع کی۔ انھوں نے اپنے پیشے میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے سخت محنت اور مشقت کی اور اپنی صحت کی مطلق پروا نہیں

کی۔ وہ حیدرآباد میں دق کے موذی مرض میں مبتلا ہو گئے، جو جان لیوا ثابت ہوا۔ ۱۹۰۷ء میں وہ بیمار ہو کر حیدرآباد سے قائم گنج آگئے اور یہیں ان کا انتقال ہوا۔ وہ ہمارے مکان کے سامنے دادا کی قبر کے بازو میں دفن ہیں۔ والد کے انتقال پر ہمارے چچا عطا حسین خاں ہمارے ولی مقرر ہوئے، موت نے انھیں بھی مہلت نہ دی۔ ۱۹۱۰ء میں انھوں نے بھی داعیِ اجل کو لبیک کہا۔ والد کے انتقال کے بعد انھوں نے ہمارے چاروں بڑے بھائیوں کو اٹاوہ کے اسلامیہ اسکول میں داخل کرا دیا تھا۔ میں ۱۹۱۱ء میں اٹاوہ گیا۔ چچا کی وفات پر ہمارے خالو حسن الدین خاں ہمارے ولی مقرر ہوئے اور جائداد کا سارا انتظام ان کے سپرد ہوا جو انھوں نے خوش اسلوبی سے انجام دیا۔ ہماری خالہ نیازی بیگم (منی) تھیں، جو والدہ سے بڑی تھیں۔ دونوں بہنوں میں بہت محبت اور اخلاص تھا۔ ان کی تیسری بہن کا انتقال میرے ہوش سنبھالنے سے پہلے ہو چکا تھا۔ منی بڑی رعب دار اور عقلمند عورت تھیں۔ ان کا سر جسم کے تناسب سے بڑا تھا۔ جب بات کرتی تھیں تو اکثر اوقات سر ہلاتی تھیں۔ ان کی ہر بات میں وقار اور وزن تھا۔ ہماری چچی فریدن بیگم بھی باوقار خاتون تھیں۔ ان کی باتیں بڑی نپی تلی اور دانش مندی کی ہوتی تھیں۔ اپنے خاندان میں بڑے تحکمانہ انداز سے زندگی بسر کرتی تھیں۔ صفائی ستھرائی کا خاص خیال رکھتی تھیں۔ میں نے قائم گنج کے سب مکانوں میں جتنا صاف ان کا مکان دیکھا کسی اور کا نہیں دیکھا۔ ان کی ایک لونڈی تھی جس کا نام گلشن تھا۔ اسے انھوں نے حیدرآباد میں قحط کے زمانے میں خریدا تھا۔ وہ مرہٹواڑی کی رہنے والی تھی۔ میں سمجھتا ہوں وہ کسی غریب لیکن شریف خاندان کی لڑکی ہوگی جس کا اظہار اس کے چہرے بشرے سے ہوتا تھا۔ اس کی شادی انھوں نے ملا سے کر دی تھی جو ہماری چچی کا پروردہ تھا۔ گلشن بلا کی محنتی تھی۔ تھی تو وہ عورت، لیکن چار مردوں کا کام

کرتی تھی کتنی ہی محنت کرنا پڑے لیکن چہرے پر مسکراہٹ ہمیشہ کھیلتی رہتی تھی۔ ہم لوگ جب چچی سے ملنے جاتے تو کھانے کے لئے مٹھائی، پھل، تلن کچھ نہ کچھ ضرور لاتی تھی۔ خاطر مدارات میں بالکل بچھی جاتی تھی۔ بڑی وفادار عورت تھی۔ اس نے ہماری چچی کی ایسی خدمت کی کہ کوئی کیا کرے گا۔ چچی کے انتقال کے بعد وہ ہماری منجھلی بھاوج کے ساتھ رہنے لگی تھی اور آخر تک ان کی خدمت انجام دیتی رہی۔ اس کے ساتھ نوکروں کا سا برتاؤ نہیں ہوتا تھا بلکہ خاندان کے رکن کا سا۔ شادی بیاہ کے موقعوں پر اس کو ہماری چچی کی بیٹی کی حیثیت سے حصہ ملتا تھا۔ گلشن کی سی تیزی اور کارکردگی میں نے بہت کم ملازموں یا ملازماؤں میں دیکھی ہے۔ نچلا بیٹھنا اس کے لئے اجیرن تھا۔ اگر کام نہ ہو تو بھی وہ اپنے لئے کام نکال لیتی تھی۔ اس کی مسکراہٹ میں نیک اور باعصمت عورتوں کی معصومیت تھی۔ ہم سب بھائیوں کا بیحد خیال رکھتی تھی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب وہ میری خاطر کرنے کے لئے کوئی چیز لاتی اور میں کھانے سے انکار کرتا تو وہ پیچھے پڑ جاتی تھی اور کھلا کر چھوڑتی تھی۔ ہماری چچی اس کے اصرار پر کہتی تھیں کہ اگر جی نہ چاہتا ہو تب بھی گلشن کی خاطر کچھ کھا لو ورنہ وہ بہت رنجیدہ ہوگی۔



زاھد حسین خان　ذاکر حسین خان

عابد حسین خان　فدا حسین خان　عطا حسین خان　مظفر حسین خان

یوسف حسین خان

تیسرا باب (۳)

سات بھائی

ہماری والدہ کو ہمیشہ یہ آرزو رہی کہ کاش ان کے کوئی لڑکی ہوتی لیکن قضا وقدر نے ان کی یہ آرزو پوری نہ ہونے دی۔ ان کے ہاں سب بیٹے ہی بیٹے ہوئے۔ دو چار نہیں پورے سات۔ والدہ سے ان کی اولاد کی نسبت کوئی پوچھتا تو اپنے بیٹوں کی پوری تعداد کبھی نہیں بتاتی تھیں بلکہ بات کو یا تو ٹال جاتی تھیں یا گول مول جواب دیتی تھیں۔ کہتی تھیں کہ اگر پوری تعداد بتاؤں گی تو بچوں کو نظر لگ جائے گی لیکن یہ بات کوئی ایسی تھوڑی ہے کہ لوگوں سے چھپی رہے۔ سات بیٹے والی ماں کو اپنے بیٹوں پر بڑا ناز تھا۔ عورتیں کہا کرتی تھیں کہ ہر ماں کو اپنی اولاد سے محبت ہوتی ہے مگر دجو تو اپنی اولاد کی دیوانی ہے۔ میں نے یہ بات مختلف خواتین کی زبانی سنی جن میں بعض ہماری عزیز تھیں، اور بعض دوسری جن سے ہماری کوئی قرابتداری نہیں تھی۔

ہمارے سب سے بڑے بھائی مظفر حسین خاں تھے جن کی پیدائش ۱۸۹۳ء میں قائم گنج میں ہوئی۔ والدہ کی شادی کے دو برس بعد۔ والد کا کام جب اورنگ آباد میں جم گیا تو وہ شادی کے لئے اورنگ آباد سے قائم گنج آئے۔ والدہ اگلے سال اپنے فرزند کو لیکر

حیدر آباد گئیں۔ ہمارے سب سے بڑے بھائی اور سب سے چھوٹے بھائی محمود میاں کے علاوہ جو قائم گنج میں پیدا ہوئے، باقی سب نے حیدر آباد میں جنم لیا۔ اس لئے وہ ملکی کہلانے کے مستحق ہیں۔ لیکن حیدر آباد والے اس بات کو ماننے کو تیار نہ تھے۔ ان کے ملکی ہونے کے معیار کچھ اور تھے، جن پر شاید ہم لوگ پورے نہیں اترتے تھے۔

والد کے انتقال کے بعد مظفر حسین خاں کی تعلیم اٹاوہ کے اسلامیہ ہائی اسکول کے بعد علی گڈھ کے ایم۔اے۔او کالج میں ہوئی۔ تعلیم کی تکمیل کے بعد وہ حیدر آباد چلے گئے۔ کچھ دنوں اکبر یار جنگ کے جونیر کی حیثیت سے وکالت کی، پھر محکمۂ عدالت میں مجسٹریٹ کی حیثیت سے انکا تقرر عمل میں آیا۔ تین سال کے قریب کارگذار رہے ہونگے کہ دق کے موذی مرض میں مبتلا ہو گئے۔ یہ مرض ہمارے خاندان میں ایسا گھسا کہ اس نے تباہی بول دی۔ والد کا انتقال اسی میں ہوا، سب سے بڑے بھائی جنھیں ہم سب بھائی جان کہا کرتے تھے، اسی مرض کا شکار ہوئے۔ بہت کچھ علاج معالجہ ہوا لیکن موت کے آگے کسی کی آج تک چلی ہے جو چلتی۔ علاج کے لئے لکھنؤ بھی گئے تھے۔ وہاں میں ان کے ساتھ تھا۔ ڈاکٹر اسپراسن اور ڈاکٹر ککڑ کا علاج رہا لیکن بے نتیجہ۔ مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔

بھائی جان طبیعت کے نہایت خاموش اور کم سخن تھے۔ جو بات کرتے اس میں متانت اور سنجیدگی ہوتی۔ جب وہ بات کرتے تو سننے والے کو یہ محسوس ہوتا کہ ہر بات سوچ کے کر رہے ہیں۔ ہر لفظ نپا تلا، نہ کم نہ زیادہ۔ سوجھ بوجھ بہت اچھی تھی۔ وکالت کے زمانے میں گوکھلے کی زندگی پر ایک کتاب اردو میں تالیف کی تھی۔ سیاست میں اعتدال پسندوں اور خاص کر گوکھلے کے بڑے مداح تھے۔ خود ان کے مزاج میں اعتدال اور سلامت روی تھی۔ ذہن متوازن تھا، کسی بات میں انتہا پسندی نہ تھی۔ ان کے دو بیٹے

امتیاز اور مسعود ہوئے۔ امتیاز مرحوم عرصے تک عثمانیہ یونیورسٹی میں کامرس کے استاد رہے پھر سکندرہ آباد کالج میں پرنسپل ہو گئے، بڑے فرض شناس اور معاملہ فہم تھے۔ افسوس ہے کہ عمر نے وفا نہ کی۔ ۱۸ رمارچ ۱۹۶۶ء کو قلب کی حرکت بند ہونے سے ان کا انتقال ہو گیا۔ مسعود پہلے مسلم یونیورسٹی میں تھے اب عثمانیہ یونیورسٹی میں اردو زبان و ادب کے پروفیسر اور صدر شعبہ ہیں۔ ان میں علمی تحقیق کی صلاحیت ہے جس کا اظہار ان کی تصنیف "تاریخ زبان اردو" سے ہوتا ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے اردو کے ابتدائی نشو و نما پر ہریانی کے اثر کو ثابت کیا ہے۔ آج کل دکنی اردو کی کتابوں کو ایڈٹ کر رہے ہیں۔

ہمارے منجھلے بھائی عابد حسین خاں تھے جنھیں ہم سب منجھلے میاں کہا کرتے تھے۔ میں متعدد جاننے والوں سے سنا ہے کہ وہ ہم بھائیوں میں سب سے زیادہ ذہین اور ہونہار تھے۔ ان کی تعلیم بھی ٹاؤن اسلامیہ ہائی اسکول اور ایم۔ اے۔ او کالج میں ہوئی۔ ابھی پڑھتے ہی تھے کہ انھیں بھی دق نے آ دبوچا جس سے وہ جانبر نہ ہو سکے۔ پڑھنے لکھنے کے بیحد شوقین تھے۔ سوا اس کے اور کوئی دلچسپی نہ تھی۔ کاٹھی کمزور تھی، صحت اکثر خراب رہتی تھی، دبلے پتلے تھے لیکن قدرت نے بڑا قوی دماغ عطا کیا تھا، جس کی وجہ سے اپنے ہم عصروں میں ہمیشہ نمایاں رہے۔ پروفیسر حمید الدین خاں جو بھائی جان کے ہم جماعت تھے منجھلے میاں کی غیر معمولی ذہانت اور قابلیت کا اکثر مجھ سے ذکر کرتے تھے۔ پروفیسر حمید الدین خاں کسی کی قابلیت کو آسانی سے ماننے والے لوگوں میں نہیں ہیں۔ جب وہ اس قدر مداح ہیں تو یقیناً منجھلے میاں میں غیر معمولی صلاحیتیں ہوں گی جو قبل از وقت موت کے باعث اجاگر نہ ہو سکیں۔ ان کے ہم جماعتوں میں سید حسن برنی نے ان کی نسبت ایک مضمون لکھا تھا جو مجھے دیکھنے کو نہ مل سکا۔ ڈاکٹر خلیفہ عبد الحکیم بھی

ان کے ہم جماعت رہ چکے تھے۔ کہتے تھے کہ ایسے ذہین لوگ میں نے کم دیکھے ہیں۔ منجھلے میاں کی بے وقت موت کی خبر پاکر مولانا شرف الدین یاس ٹونکی نے جو ہم سب بھائیوں کے کسی نہ کسی وقت استاد رہ چکے تھے فی البدیہہ چند شعر کہے تھے جن میں سے صرف ایک مجھے یاد رہ گیا ہے :۔

ڈھونڈتی ہیں تمھیں اس بزم میں آنکھیں ہمدم
مٹ گئے تم بھی مرے دل کی تمنا ہو کر

ہمارے تیسرے بھائی ڈاکٹر ذاکر حسین خاں مدظلہ ہیں جنھیں ان کے چھوٹے بھائی ذاکر میاں کہہ کر خطاب کرتے ہیں، وہ ہمارے لئے فخر خاندان ہیں۔ ان کی پیدائش ۱۸۹۷ء میں حیدر آباد میں ہوئی۔ ماسٹر عبدالغنی جو ایک نو مسلم انگریز تھے ان کے سب سے پہلے استاد تھے۔ والد کے انتقال کے بعد وہ اٹاوہ کے اسلامیہ اسکول میں داخل ہوئے جہاں وہ ۱۹۱۲ء تک رہے۔ پھر اس کے بعد ایم۔ اے۔ او کالج میں شریک ہو گئے جہاں ہمارے دو بڑے بھائی پہلے سے موجود تھے۔ ۱۹۲۰ء میں ترک موالات کی تحریک میں شریک ہو کر مولانا محمد علی کے ساتھ جامعہ ملیہ اسلامیہ چلے آئے۔ یہ انکی زندگی کا فیصلہ کن موڑ تھا۔

طالب علمی کے زمانے میں ان کی ذہانت اور قابلیت کا سکہ اپنے ہم عصروں پر بیٹھا ہوا تھا۔ علمی قابلیت کے علاوہ ان کی سیرت کی چمک دمک اپنوں اور غیروں سب کیلئے جاذب نظر تھی۔ قدرت کو ان سے بڑے کام لینے تھے جس کی تیاری طالب علمی کے زمانے ہی میں شروع ہو گئی تھی۔ ایم۔ اے۔ او کالج کے یونین کے وائس پریسیڈنٹ منتخب ہوئے۔ جو کسی طالب علم کے لئے سب سے بڑا اعزاز تھا۔ ان کے زمانے میں یونین میں جو روایات قائم ہوئیں انھیں بعد میں بھی سند کے طور پر پیش کیا جاتا تھا۔ انکی زندگی کے حالات آئندہ باب میں

پیش کئے جائیں گے جس طرح کسی استاد کی غزل میں کوئی ایک شعر حاصلِ غزل سمجھا جاتا ہے اسی طرح ذاکر میاں ہمارے خاندان کے لئے حاصلِ خاندان ہیں جن پر ہم سب بجا طور پر فخر کرتے ہیں۔

چوتھے بھائی زاہد حسین خاں تھے۔ انکے متعلق میں نے بعض جاننے والے بزرگوں سے سنا ہے کہ وہ صورت اور سیرت میں دادا سے مشابہت رکھتے تھے۔ انھیں قدرت نے ہم بھائیوں میں سب سے زیادہ حسین، صحت مند اور قوی جسم عطا کیا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ انکی ہاتھ کی کلائی بلا مبالغہ میری کلائی سے ڈیڑھ گنی چوڑی تھی۔ یونانی مجسموں کا سا کھڑا اور سبک نقشہ، ستوان ناک، گٹھا ہوا جسم، قد و قامت میں کڑیل جوان تھے۔ انکے مردانہ حسن پر ہر کسی کی نظر ٹھہرتی تھی۔ رنگ بھی ہم سب بھائیوں سے زیادہ صاف تھا۔ ایسا گورا پن جو پھیکا نہ ہو بلکہ تھوڑی سی ملاحت لئے ہوئے ہو۔ طبیعت میں تحکمانہ شان تھی۔ جو چاہیں وہ ہو تو خوش ہیں، ورنہ نہیں۔ انکا غصہ بلا کا تھا۔ ناک پر مکھی نہیں بیٹھنے دیتے تھے۔ مزاج میں ضد تھی۔ ایک دفعہ جو بات دل میں بیٹھ جائے اسے پورا کرکے چھوڑیں، چاہے اِدھر کی دنیا اُدھر ہو جائے۔ ذاکر میاں سے تقریباً ڈیڑھ سال چھوٹے اور مجھ سے پونے تین سال بڑے تھے۔ میں ویسے ہی نحیف اور کمزور جسم کا تھا، انکے سامنے پدی معلوم ہوتا تھا۔ میں انکے غصے سے بے حد ڈرتا تھا۔ جو وہ کہتے وہ کرتا تھا۔ اسلئے وہ میرا بہت خیال کرتے تھے مجھے انھوں نے کبھی کبھی ڈانٹا تو ضرور لیکن مارا کبھی نہیں۔ شاید اس وجہ سے کہ میں ان سے چھوٹا اور کمزور تھا یا ممکن ہے اس وجہ سے کہ وہ مجھے اس لائق نہیں سمجھتے تھے کہ مجھ سے منھ لگیں۔ اس لئے جہاں تک میرا تعلق تھا، ان کے لئے کوئی مسئلہ پیدا نہیں ہوتا تھا۔

ان کا مقابلہ ذاکر میاں سے رہتا تھا جو اگرچہ عمر میں ان سے بڑے تھے لیکن جسمانی قوت میں کم تھے۔ ہر خاندان میں بیچ کے بھائیوں میں اکثر چلتی رہتی ہے۔ اس کے لئے یہ ضروری نہیں کہ کوئی بڑا مسئلہ درپیش ہو معمولی معمولی باتوں پر ان بن

ہو جاتی ہے۔ اس وقت یہ اور بھی ہوتا ہے جب بھائیوں کی عمر میں زیادہ فرق نہ ہو۔ جسمانی لحاظ سے زاہد میاں ذاکر میاں کو مار لیتے تھے اس لئے کہ ان میں قوت اور توانائی زیادہ تھی۔ اکثر اوقات مجھے اچھی طرح یاد ہے ذاکر میاں ان سے کتراتے اور منھ نہیں لگتے تھے۔ کبھی حکمت عملی سے انھیں قابو میں رکھتے تھے۔ بعض دفعہ جب دونوں میں کھٹ پٹ ہو جاتی تو کئی کئی دن تک بات چیت بند رہتی لیکن پھر خود ہی میل ہو جاتا تھا۔ ان دونوں کے جھگڑوں کو بھائی جان چکایا کرتے تھے جن کی ہم سب بھائی عزت کرتے تھے۔ ایک دفعہ ایسا ہوا کہ گرمیوں کی چھٹیوں میں دونوں اٹاوہ سے آئے ہوئے تھے۔ کسی بات پر بگڑ گئی۔ بھائی جان نے ذاکر میاں کی طرفداری کی اور زاہد میاں کو قصوروار ٹھہرایا اور شاید کچھ بُرا بھلا بھی کہا۔ زاہد میاں بھائی جان کے سامنے تو چپ رہے، جب وہ چلے گئے تو اس قدر برافروختہ اور برہم ہوئے کہ کوٹھے کے اندر زنجیر ڈال کے بیٹھ گئے۔ صبح سے شام ہو گئی بغیر کچھ کھائے پئے کوٹھے کے اندر بند رہے۔ ہم سبھوں نے اور بڑی بھاوج نے ہر چند سمجھایا کہ دروازہ کھول دو لیکن انھوں نے کسی کی ایک نہیں سنی۔ جب شام ہونے لگی تو بھائی جان نے خالو صاحب کو بلوا بھیجا، وہ آئے اور انھوں نے ہم سب سے کہا کہ "دالان سے چلے جاؤ۔ میں زاہد سے تنہا کچھ بات چیت کروں گا"۔ ہم سب وہاں سے ہٹ کر سامنے کے دالان میں چلے گئے لیکن نظریں کوٹھے کے دروازہ پر گڑی ہوئی تھیں کہ دیکھیں دروازہ کب کھلتا ہے، خالو نے بڑے شفقت کے لہجے میں زاہد میاں کو دروازے کے قریب بلایا اور ان سے کچھ باتیں کرتے رہے، بالآخر سمجھا بجھا کر کواڑ کھولنے پر راضی کر لیا۔ اب ہم لوگ بھی قریب آ گئے۔ باہر نکلے تو رو کر کہنے لگے کہ "اس گھر میں سب میرے مخالف

ہیں اور اُن (ذاکر میاں) کے ساتھ ہیں"۔ اس پر خالو نے سمجھایا کہ ایسا نہیں ہے۔ بھلا سب لوگ تمھارے مخالف کیوں ہونے لگے۔ بھائی جان نے بھی آکر سمجھایا بجھایا اور معاملہ رفع دفع ہوگیا۔ شام کا کھانا انھوں نے ہم سب کے ساتھ بڑے چبوترے پر کھایا۔ وہ دل میں کبھی کوئی بات نہیں رکھتے تھے۔ جب میل ہوگیا تو پچھلی باتیں سب بھول گئے۔

آج نصف صدی سے زیادہ گذرنے کے بعد جب میں ان بچکانی لڑائیوں اور ناچاقیوں کو یاد کرتا اور اپنے حافظے کو کھنگالتا ہوں تو اس میں مجھے عجیب و غریب بصیرتیں اور سبق پوشیدہ ملتے ہیں۔ مجھے اس وقت بھی اس بات کا یقین تھا اور اب بھی ہے کہ اس ان بن میں زیادتی زاہد میاں کی طرف سے ہوتی تھی۔ ان کی ذہنیت حاکمانہ تھی۔ جو چاہتے تھے اگر وہ پورا نہ ہو تو لڑنے مارنے پر تیار ہو جاتے تھے۔ ذاکر میاں ویسے دیکھنے میں دبلے پتلے نہیں تھے لیکن ان کا جسم پھسپھس اور نرم تھا۔ وہ زاہد میاں کے مضبوط اور گٹھے ہوئے جسم کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ ذاکر میاں کے مزاج میں بھی ان کے جسم کی طرح نرمی اور ملائمت تھی۔ وہ بچپن سے مرنجان مرنج اور صلح کل تھے۔ جسم سے زیادہ وہ دماغ کو استعمال کرنا جانتے تھے اور حکمت عملی سے معاملات کو سلجھانے کی کوشش کرتے تھے۔ وہ ہمیشہ زاہد میاں کی زیادتیوں کو بڑے صبر اور تحمل سے برداشت کرتے تھے۔ انھیں بردباری اور تحمل کی جو ٹریننگ بچپن میں اپنے چھوٹے بھائی کے ہاتھوں ملی وہ آیندہ ان کی سیرت کا جوہر بن کر نکھری اور چمکی اور اس سے انھوں نے قوم و ملت کے لئے بڑے کارہائے نمایاں انجام دیئے۔ ان کی سیرت میں نرمی اور بردباری کے علاوہ جو ننھیال کا تحفہ ہے، جرأت اور

حوصلہ مندی ددھیال سے ملی۔ جاننے والے کہتے ہیں کہ ہمارے دادا میں جرأت اور بہادری کے علاوہ جذب کی کیفیت تھی۔ ددھیال کے اس ورثہ نے ذاکر میاں میں ارادے کی پختگی اور مقاصد کی والہانہ لگن پیدا کی جس کے بغیر عمل، قوت اور تاثیر سے محروم رہتا ہے، اگر یہ نہ ہو تو نہ دل میں کچھ ہونے اور کچھ کرنے کا عزم پیدا ہو، نہ قیادت کی حوصلہ مندیاں اپنا جوہر دکھائیں، اور نہ مقاصد کے حصول کے لئے انسان ایثار و قربانی کے لئے آمادہ ہو۔

میں نے ددھیال اور ننھیال کے اثرات کا جو ذکر کیا تو اس سے میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ زندگی میں جو جسمانی اور نفسی خصوصیات توارث کے ذریعہ ملیں وہی سب کچھ ہیں دراصل انسان کے حیاتیاتی امکانات اور ماحول کے اثرات محدود ہیں اخلاقی عمل کی توجیہ انسانی ارادے کی کارفرمائی کے بغیر ممکن نہیں۔ یہ درست ہے کہ ہر انسان کی اندرونی فطرت اس کے لئے چند خطوط معین کر دیتی ہے جن کے اندر ہی اسے رہنا پڑتا ہے لیکن اس کے ساتھ یہ بھی ہے کہ نیت اور ارادہ ہمارے کردار کو بنانے میں مدد و معاون ہوتا ہے۔ کردار ہمارے ارادے کی عادتوں سے عبارت ہے، جن کے تحت ہم اپنی خواہشوں اور عمل کو شعوری طور پر منظم کرتے ہیں۔ ددھیال اور ننھیال کے جسمانی اور نفسی ورثے کے علاوہ ذاکر میاں کی آیندہ زندگی کی تشکیل میں ان کی نیت اور نیکی کو بڑا دخل ہے۔ ان کی سیرت کا جوہر بڑی ریاضت کے بعد چمکا ہے جس کی تہ میں زبردست قوت ارادی کی کارفرمائی رہی ہے۔

زاہد میاں کو قدرت نے قوی جسم دیا تھا لیکن اس میں بھی دق کے جراثیم نے راہ پالی اور اسے نحیف و زار کر دیا۔ وہ ایم اے۔ او کالج میں ایف۔ اے میں پڑھتے تھے

جب ان پر اس بیماری کا حملہ ہوا۔ قائم گنج میں انتقال ہوا اور وہیں آبائی قبرستان میں سپردِ خاک ہوئے۔ عمر اٹھارہ سال کے لگ بھگ تھی۔ کیسے حسین اور کڑیل جوان تھے ان کی بے وقت موت پر غیروں کے بھی آنسو نکل آئے۔

بھائیوں میں میرا نمبر پانچواں ہے۔ میں ۸ ار ستمبر ۱۹۰۲ء کو حیدرآباد میں بیگم بازار والے مکان میں پیدا ہوا۔ میری بسم اللہ کے کچھ عرصے بعد ہم سب والد کی علالت کی وجہ سے قائم گنج آگئے۔ مجھے حیدرآباد کی بعض باتیں جب کہ میری عمر ساڑھے چار پانچ سال کی تھی یاد رہیں۔ ہمارے مکان کے بالکل سامنے ہاتھی پانی پیتے تھے، بعد میں جب میں نے تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ یہ صحیح ہے۔ زمین کے اس کھلے ٹکڑے میں جو ہمارے مکان کے سامنے تھا کمال خاں کے ہاتھی جمع ہوا کرتے تھے۔ ہمارے مکان کی ڈیوڑھی کے باہر دونوں طرف بیٹھنے کے لئے پتھر کی کرسیاں عمارت میں چُنی ہوئی تھیں، میری یاد میں یہ بات محفوظ تھی کہ میں ان کرسیوں پر بیٹھا کرتا تھا۔ میری آیا میرے ساتھ ہوتی تھی۔ قائم گنج کی ایک ڈومنی جس کا نام سونیا تھا، جو پہلے زاہد میاں کی آیا رہ چکی تھی، وہی میری بھی آیا تھی، وہ کبھی کبھی چند روز کے لئے غائب ہو جاتی تھی، غالباً شہر میں اپنے کسی عزیز کے یہاں ملنے کو جاتی تھی۔ اس کی غیر موجودگی مجھ پر بہت شاق گذرتی تھی۔ میری منجھلی بھاوج نے جنھیں ہمارے چچا نے، جو لاولد تھے، اپنی بیٹی بنا لیا تھا مجھے بتایا کہ جب سونیا چلی جاتی تھی تو تم دن بھر یہ رٹ لگایا کرتے تھے "ہیں توسو تو ہونا"، یہ زبان کا دکنی انداز تھا جو ہم سبھوں پر بچپن میں اثر انداز رہا لیکن بعد میں شمالی ہند میں رہنے کی وجہ سے باقی نہ رہا۔ ہم لوگوں کے لب و لہجہ میں بھی شمالی ہند کا اثر نمایاں رہا، دکن کا نہیں۔

پندرہ سولہ سال کے بعد میں پھر حیدرآباد گیا تو میں نے دیکھا کہ پتھر کی کریاں ڈیوڑھی کے باہر موجود تھیں اور میری یاد صحیح تھی۔ ہاتھیوں کے متعلق بھی میں نے اکبر یار جنگ سے تصدیق کی۔ انھوں نے کہا کہ کمال خاں کے ہاتھی ہمارے مکان کے سامنے پانی پیا کرتے تھے۔ بگھی میں بیٹھ کر چچا کے یہاں بلارم جانا بھی مجھے یاد تھا۔ چچا پہلے مومن آباد کی چھاؤنی میں تھے بعد میں بلارم آگئے تھے۔ والد ہم سب بھائیوں کو ساتھ لے کر سکندرآباد کے کٹے پر سے ہوتے ہوئے بلارم جایا کرتے تھے۔ میری یہ یاد بھی بالکل درست تھی جس کی میں نے بعد میں تصدیق کی۔

بچپن کی یادیں | حیدرآباد سے آنے کے بعد میں چار سال قائم گنج میں رہا۔ ایک مولوی صاحب مجھے قرآن شریف اور اردو پڑھانے آیا کرتے تھے۔ میں نو سال کی عمر میں ۱۹۱۱ء میں اٹاوہ کے اسلامیہ ہائی اسکول میں داخل ہوا۔ قائم گنج کے چار سال کے قیام میں میرے حافظے میں جس چیز کا نقش سب سے زیادہ نمایاں ہے وہ والدہ کی شفقت اور محبت ہے۔ ہماری والدہ اپنے بچوں سے بے پناہ محبت کرتی تھیں۔ خاص کر والد کے انتقال کے بعد تو اس میں اور بھی اضافہ ہو گیا تھا۔ ایک دفعہ میں زنانہ خانہ کے ڈیوڑھی سے مردانے حصے میں، جسے ہم کوٹھی کہتے تھے، بھاگا جا رہا تھا کہ چوکھٹ کی ٹھوکر لگی اور میں وہیں بڑے زور سے منھ کے بل گرا۔ چوکھٹ کے پاس ہی شیشے کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا پڑا تھا جو میرے بائیں رخسار میں گھس گیا، میری الٹی آنکھ بال بال بچ گئی۔ اس چوٹ کا نشان آج بھی میری الٹی آنکھ کے نیچے رخسار کے اوپر کے حصے میں موجود ہے۔ میرے گرتے ہی سارے گھر میں کہرام مچ گیا، اور اسلامی اور عبداللہ جھٹ سے میرے پاس پہونچ گئے۔ میرے الٹے رخسار کے اوپر کے حصے سے خون کا

فوارہ نکل رہا تھا جس سے میں لہو لہان ہو گیا تھا۔ والدہ نے جو اس وقت دالان میں تھیں باہر آکر جو مجھے اس حالت میں دیکھا تو زور سے چیخ ماری اور جھپٹ کر مجھے آکر پکڑ لیا اور بڑے دالان میں لے گئیں۔ صاف کپڑا پانی میں بھگو کر خون صاف کیا اور کچھ چیز میرے گال پر لگا دی۔ مجھے معلوم نہیں وہ کیا تھا۔ غالباً چونا ہوگا جو ہمارے یہاں کی خواتین فوری ضرورت کے وقت اس قسم کی چوٹوں پر لگا دیتی ہیں جن سے خون نکلتا ہو۔ بعد میں اس زخم پر کچھ مرہم لگایا گیا ہفتے میں یہ زخم مندمل ہوا۔

کھیل: لڑکوں میں صدیق حسن میرے خاص دوست تھے۔ وہ ہمارے عزیز بھی ہوتے تھے۔ ان کی عمر کم و بیش وہی تھی جو میری تھی۔ والدہ نے ایک چھوٹا فٹ بال منگا دیا تھا۔ میں ان کے ساتھ آم کے باغ میں فٹ بال کھیلتا تھا۔ جہاں تک مجھے یاد ہے میں دوسرے لڑکوں کے مقابلہ میں اچھا کھیلتا تھا اور جتنے گول میں کرتا تھا اور کوئی اتنے نہیں کر پاتا تھا۔ صدیق حسن اپنے ساتھ پٹھانوں کے تین چار ہم عمر لڑکوں کو اپنے محلے سے لے آتے تھے۔ ان کا مکان سرائے میں ہمارے یہاں سے کوئی تین چار فرلانگ پر تھا۔ ان کے ساتھ میں نے پتنگ اڑانا بھی سیکھا۔ وہ مانجھا بہت اچھا سونتتے تھے۔ یہ فن بھی انھوں نے مجھے سکھایا۔ میں کبھی کبھی ان کے ساتھ پتنگ اڑانے جاتا تھا مگر میرا دل اس کھیل میں نہیں لگا شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ پتنگ اڑاتے وقت محلے کے جو لڑکے جمع ہو جاتے تھے انھیں میں پسند نہیں کرتا تھا۔ یہ کاچھیوں، چکوں اور دھوبیوں کے لڑکے ہوتے تھے اور دو ایک پٹھانوں کے بھی۔ صدیق حسن کے ساتھ میں نے گلی ڈنڈا بھی کھیلا۔ یہ کھیل مجھے پتنگ اڑانے کے مقابلے میں زیادہ اچھا لگتا تھا اور میں اچھا خاصا کھیل لیتا تھا۔

باغوں کا سناٹا ہمارا گھر چاروں طرف آموں اور نارنگیوں کے باغوں سے گھرا ہوا تھا۔ مارچ کے مہینے میں ان سے بھینی بھینی اور جاں فزا خوشبو کی لپٹیں نکلتیں جو جذبے اور تخیل کو اکساتی تھیں۔ خاص کر نارنگی اور میٹھے کے شگوفوں سے جو مہک نکلتی اسے میں آدھ آدھ گھنٹہ کھڑا سانس کے ذریعہ جذب کرتا۔ فضا میں سیاہ بھونروں اور شہد کی مکھیوں کی بھنبھناہٹ سے میرا دل سکون کی کیفیت محسوس کرتا تھا۔ یہاں چڑیوں کی چہچہاہٹ صبح سے شام تک ایک لمحے کو بند نہ ہوتی تھی۔ اس ماحول میں جنت نگاہ وگوش اور فردوس شامہ اکٹھا ہوگئی تھیں۔ گھر کے زنانے حصے کے آنگن میں چھوٹے نیم کی جڑ سے لیکر چبوترے کی بیچ کی سیڑھیوں تک بیلا، موتیا، چنبیلی کے پودے تھے جن میں پھول کھلتے تو سارا چبوترہ اور آنگن مہک اٹھتا۔ کوٹھی کے آنگن میں ہارسنگار کا درخت تھا جس کے ارغوانی پھولوں کی رنگت اور خوشبو دونوں دل کو بھاتے تھے۔ گرمیوں میں صبح سویرے محلے کی لڑکیاں پھول چننے آتیں اور پھر ان سے اپنی اوڑھنیاں رنگتیں۔ گرمیوں میں آم کے باغ میں پپیہے کی پیہو پیہو اور کوئل کی کوکو سے سارا باغ گونجا کرتا۔ انا کے گھر میں نیم کی شاخوں پر میں فاختہ کی "یاہو ہو" صبح سے شام تک سنتا۔ کوٹھی میں برآمدے کی کنگر پر کبوتروں نے اپنے گھونسلے بنا لئے تھے۔ میں نے جب سے ہوش سنبھالا اس وقت سے ان کی غٹر غوں غٹر غوں کانوں میں بس گئی تھی۔ کوٹھی کے دروازوں کے اوپر کے رنگین شیشے ٹوٹ جانے سے کبوتروں کے قافلے بڑے ہال کی کنگر پر جا دھمکے۔ ہر چند انھیں وہاں سے بے دخل کرنے کی کوشش کی گئی لیکن اب ان کا قبضہ مسلّم ہو چکا تھا۔ ایسے کیسے نکلتے۔ ان کی بیٹ سے سارا فرش خراب ہو رہا تھا لیکن اب تو گھر کے اصلی باشندے وہ تھے، وہ وہاں سے کیوں ہٹتے۔ ہماری

دھوبن جنکیا جو کوٹھی کے نچلے حصے میں رہتی تھی کہتی تھی کہ کبوتروں کو نہ چھیڑو یہ سید ہیں
وہ تھی تو ذات کی دھوبن، لیکن سادات کی عظمت کو مانتی تھی۔

گرمیوں کی رات میں گھر کے اندرونی آنگن میں جگنو منڈلاتے پھرتے۔ میں کبھی کبھی انھیں دوڑ کر پکڑ لیتا۔ ڈھیلی مٹھی میں بند کر کے تاریکی میں لیجاتا، ان کی روشنی کے چراغ کو دیکھتا اور چھوڑ دیتا۔ گرمیوں میں جب کالی پیلی آندھیاں آتیں تو ساری فضا اور زمین ان کے رنگ میں رنگ جاتی۔ گھر میں ایک تناور نیم کا درخت تھا جو ہمارے دادا نے اس وقت لگایا تھا جب گھر کی تعمیر ہو رہی تھی اور بعض نے بتایا کہ گھر کی تعمیر کے پہلے سے موجود تھا۔ میں سمجھتا ہوں دوسری رائے درست تھی۔ اس کا تنا موٹا، سیدھا، لمبا چلا گیا تھا۔ ایک مرتبہ ایسے زور کی آندھی آئی کہ جڑ ہلنے کی وجہ سے وہ ایک طرف جھک گیا۔ میں نے بعد میں اپنے یورپ کے دوران قیام میں جب پیزا کے خمیدہ مینار کو دیکھا تو مجھے اپنے گھر کا نیم کا درخت یاد آگیا۔ کہاں ایک تاریخی مینار اور کہاں ایک نیم۔ یادوں کی منطق بھی کچھ عجیب ہے۔ ایسی بھولی بسری باتیں بعض دفعہ کسی چیز کو دیکھ کر یاد آجاتی ہیں کہ جن کا سان گمان بھی نہیں ہوتا ورنہ جانے کب سے وہ حافظے کے کس کونے کھدرے میں دبی دبائی رہتی ہیں۔ اسی طرح جب کبھی میں بعد میں یورپ میں کسی چمن میں گیا جہاں خوشبو مشام جان کو معطر کرتی تو معاً مجھے اپنا قائم گنج کا گھر اور ارد گرد کے باغوں کی بھینی بھینی مہک یاد آجاتی۔ عرب مفکر جاحظ نے یاد کا فلسفہ بیان کرتے ہوئے ایک جگہ لکھا ہے کہ بعض باغبان پھول سونگھ کر ٹھیک وقت بتا دیتے ہیں۔ اس نے لکھا ہے کہ پھول کی خوشبو میں دن کے چڑھنے اور اترنے کا برابر اثر ہوتا رہتا ہے، جسے باغبان جانتے ہیں، برسوں کے تجربے سے ان میں خاص

بصیرت پیدا ہو جاتی ہے جو دوسروں میں نہیں ہوتی۔ خاص کر خوشبو سے بہت ساری یادیں برانگیختہ ہوتی ہیں۔ مہایان مسلک کی ایک مشہور کتاب "لنکا وتار سنو" میں یاد کے لئے وہی لفظ استعمال کیا گیا ہے جو خوشبو کے معنوں میں آتا ہے۔ بدھ مت کے مہایان مسلک میں چونکہ احساس ذات ایک لعنت ہے جس سے انسان کو نجات حاصل کرنی چاہئے، اسی لئے حافظہ اور یادیں بھی بری سمجھی گئی ہیں چونکہ وہ ہماری گذری ہوئی خودی کو موجودہ خودی سے وابستہ کرتی اور اسے بامعنی بناتی ہیں۔ برخلاف اس کے زندگی کا وہ فلسفہ ہے جو خودی یا احساس ذات کی نفی نہیں کرتا بلکہ اس کو قابل قدر سمجھتا ہے کہ بغیر اس کے شخصیت کی تعمیر نہیں ہوتی اور نہ اس میں معنی پیدا ہوتے ہیں۔

ہمارے گھر کے چاروں طرف باغ ہی باغ تھے اور اب بھی ہیں۔ مسجد کے قریب چند گھر آباد تھے وہ بھی بعد میں اجڑ گئے۔ گھر میں خاموشی کا جو سناٹا رہتا تھا اس کے نقوش میرے حافظے میں محفوظ ہیں۔ یہ خالص خاموشی تھی، بلا کسی ملاوٹ کے گھر کے سامنے کی قبروں سے اس خاموشی میں اور اضافہ ہو گیا تھا۔ چاروں طرف جھینگروں کی آواز بھی سناٹے کی سنسناہٹ کو بڑھا دیتی تھی۔ تاریکی اور روشنی کا تضاد قصباتی زندگی میں جیسا نمایاں رہتا ہے شہروں میں نہیں ہوتا۔ رات کو گھر سے قدم باہر نکالئے تو مکمل تاریکی کا سامنا ہوتا ہے جس میں روشنی کی آمیزش بالکل نہیں ہوتی۔ میں کبھی مغرب کے کچھ دیر بعد کوٹھی کے باہر چبوترے پر ٹہلنے نکلتا تو سناٹا اور تاریکی مل کر طلسمی فضا پیدا کر دیتے جس سے طبیعت گھبراتی نہیں تھی۔ بلکہ اس میں دل لگتا تھا۔ قائم گنج کے بعد مکمل سکوت اور مکمل تاریکی کا احساس پھر کبھی نہیں ہوا۔ بعد میں جہاں کہیں رہنا ہوا وہاں ایسا کبھی نہیں ہوا کہ دور سے آنے والی کوئی آواز نہ سنائی دیتی ہو یا کچھ فاصلے پر ٹمٹماتی

ہوئی روشنی نظر نہ آتی ہو۔ سکوت اور شور و غوغا اور روشنی اور تاریکی کا تضاد قائم گنج میں مجھے اس طرح محسوس ہوتا تھا جیسے گرمی اور سردی کا ایک دوسرے کے بعد قدرتی طور پر آنا اور جانا۔ وہاں انسانوں کے عمل کا تضاد بھی اسی نوعیت کا تھا جس کا اظہار کبھی انتہائی دشمنی اور تشدد کی صورت میں اور کبھی انتہائی محبت اور خلوص کی شکل میں ظاہر ہوتا تھا۔ محبت اور نفرت کی ایسی شدت بعد میں کبھی دیکھنے میں نہیں آئی مشابہ یہ پٹھانوں کی جبلت کا جُز ہے جسے قصباتی ماحول نے راسخ کر دیا ہے۔ عربوں میں جاہلیت کے زمانے میں جو قبائلی لڑائیاں ہوا کرتی تھیں اسی قسم کی لڑائیاں قائم گنج میں بھی کچھ عرصہ قبل تک دیکھنے میں آتی تھیں۔ منو خاں اور نبی عالم خاں کی لڑائی برسوں چلتی رہی جیسے وہ قصباتی زندگی کا جز ہو کہ اگر نہ ہو تو لوگ اس کمی کو محسوس کریں۔

ہمارے گھر میں ایک کتا اور ایک کتیا تھی۔ کتے کا نام باگا تھا اور کتیا کا بجلی۔ میں باگا اور بجلی دونوں کو بہت چاہتا تھا۔ وہ بھی مجھے دور سے دیکھ کر دم ہلاتے اور پاس آکر میرے پاؤں چاٹنے لگتے۔ جب کبھی میں باہر جاتا تو وہ دونوں اندر کی ڈیوڑھی میں بیٹھے میرا انتظار کرتے اور میرے ساتھ ساتھ گھر میں داخل ہوتے۔ ایک دو دفعہ نہیں ان دونوں کا یہ روزانہ کا معمول تھا۔ کتے محبت کرنا جانتے ہیں اور یہ بھی جانتے ہیں کہ کس سے انھیں محبت کرنی چاہئے۔ وہ انسانوں سے زیادہ مخلص اور وفادار ہوتے ہیں۔ ان کی جبلت کبھی غلطی نہیں کرتی، وہ اتنی تیز ہوتی ہے جتنی انسانوں کی نہیں ہوتی۔ وہ اچھے برے آدمی میں تمیز کر لیتے ہیں۔ چند سکنڈ میں وہ معلوم کر لیتے ہیں کہ جس شخص سے ان کا واسطہ ہے وہ اچھا ہے یا بُرا۔ شیخ سعدی نے ایک حکایت میں بیان کیا ہے کہ ایک کتا راستے پر بیٹھا رہتا تھا۔ کسی نے پوچھا تو کیوں بیٹھتا ہے۔ اس نے جواب دیا

اچھے برُے آدمی کو پہچاننے کے لئے۔ جو اچھا ہوتا ہے اپنا راستہ جاتا تھا اور جو برا ہوتا ہے، خواہ مخواہ مجھے چھیڑتا ہے، گھر کتا ہے یا ٹھوکر مارتا ہے۔ اس حکایت میں مبالغہ نہیں حقیقت بیان کی گئی ہے۔

ہمارے گھر میں کبھی کبھی ایک شخص کام کاج کے لئے آتا تھا جس کا نام راجا تھا۔ وہ ہمارے محلے ہی میں رہتا تھا۔ دن بھر بھینسیں چراتا تھا۔ ہماری بھینس بھی روز صبح کو لے جاتا اور شام کو باندھ جاتا تھا۔ کبھی کبھی باہر تالاب سے مٹی کھود کر لانے یا لکڑیاں چیرنے کے لئے بھی اسے بلا بھیجتے۔ وہ بڑا ہی جاہل اور اجڈ آدمی تھا۔ جب وہ ہمارے گھر میں قدم رکھتا تو باگا اور بجلی کہرام مچا دیتے۔ کبھی اس پر جھپٹتے اور کبھی دور ہی سے غراتے۔ وہ ہر روز ہمارے یہاں آتا تھا تاہم باگا اور بجلی اس سے کبھی مانوس نہیں ہوئے جب اسے دیکھتے بھونکتے اور نفرت کرتے۔ اس کی طرف دیکھ کر بھونکتے جاتے اور کبھی والدہ کو اور کبھی مجھے دیکھتے جاتے۔ گویا یہ کہہ رہے ہوں کہ اس نامعقول کو کیوں گھر میں آنے دیا۔ باگا اور بجلی دونوں والدہ کو بیحد چاہتے تھے۔ وہ روزانہ دونوں وقت اپنے ہاتھ سے انھیں کھانا ڈالتی تھیں۔ جس دن وہ نہ ہوتیں یا کوئی مصروفیت ہوتی، مہمان آجاتے یا اور کوئی کام لگ جاتا تو ہماری نوکرانی اسلامی انھیں کھانا دیتی تھی۔ مجھے پہلے تعجب ہوتا تھا کہ دونوں اسلامی پر کیوں غراتے ہیں اور کبھی محبت سے اس کی طرف نہیں بڑھتے۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ وہ انھیں کم کھانا دیتی تھی اور کھانا دیتے وقت کڑکڑاتی جاتی تھی کہ بیگم صاحبہ نے خواہ مخواہ کا خرچ ان کتوں کی وجہ سے اپنے سر لے رکھا ہے۔ ان کم بختوں کو کھلانے سے کیا فائدہ۔ شاید وہ سمجھتی تھی کہ باگا اور بجلی کو جو کھانا دیا جاتا ہے وہ خود اس کا پیٹ کاٹ کر دیا جاتا ہے۔ حالانکہ ایسا نہیں تھا۔ ہماری والدہ اسلامی اور عبداللہ کا جو ہمارے

گھر کا پالکڑہ تھا بہت خیال رکھتی تھیں۔ ان دونوں کو وہی کھانا دیا جاتا تھا جو ہم سب کھاتے تھے۔ پھر بھی نہ معلوم کیوں اسلامی کو باگا اور بجلی سے بیر تھا اور وہ دونوں اسے ایک آنکھ نہیں بھاتے تھے۔ باگا اور بجلی بھی اسلامی کی مطلق پروا نہیں کرتے تھے جیسے اس کے وجود کو بادل ناخواستہ گوارا کر رہے ہوں۔ ان کے نزدیک اسلامی کی کوئی اہمیت نہ تھی۔ وہ اسے بس گوارا کرتے تھے، بہ طیب خاطر نہیں بلکہ رسم اور عادت کے طور پر یا ہماری والدہ کی خاطر سے۔

والدہ کا انتقال | ۱۹۱۱ء میں قائم گنج میں طاعون کی وبا پھیل گئی۔ ایسی وبا پہلے کبھی نہ دیکھی تھی نہ سنی تھی۔ بستی کا کوئی گھر ایسا نہ تھا جو اس سے متاثر نہ ہوا ہو اور بعض گھروں کا تو سرے سے صفایا ہی ہوگیا۔ ہمارا گھر بھی ان گھروں میں تھا۔ ہمارے گھر میں جو لوگ تھے سب ایک ایک کر کے ختم ہوگئے۔ سب سے پہلے مجھ سے چھوٹا بھائی جعفر جس کی عمر اس وقت چھ سال کی تھی اس ظالم وبا کا نشانہ بنا۔ پھر ہماری نانی حسینی (چھپینن)، پھر خود ہماری والدہ اور آخر میں اسلامی اور عبداللہ جنھیں ہماری والدہ نے دکن میں قحط کے زمانے میں خریدا تھا جب کہ وہ بالکل بچے تھے۔ غرض کہ پورا گھر کا گھر صاف ہوگیا۔ سب سے چھوٹے بھائی محمود کو جن کی عمر چار سال کی تھی چچی اپنے ساتھ لے گئیں اور انھیں نے ان کی پرورش کی۔ اب گھر میں ہو کا عالم تھا، نہ آدم نہ آدم زاد۔ میں چند مہینے قبل اٹاوہ جا چکا تھا۔ وہاں والدہ کے انتقال کی خبر سنی تو دل دھک سے ہوگیا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے جب ہماری والدہ کے انتقال کی اطلاع اسلامیہ ہائی اسکول کے ہڈ ماسٹر سید الطاف حسین صاحب کو ملی تو انھوں نے اوپر کی منزل پر اپنے کمرے میں مجھے بلوایا۔ پہلے کچھ ادھر ادھر کی باتیں کیں اور پھر یہ دلگداز

خبر سنائی۔ میں سن کر رونے لگا۔ اتنا رویا کہ ہچکی بندھ گئی۔ تھوڑی دیر میں ذاکر میاں اور زاہد میاں بھی وہیں آگئے۔ سب نے مجھے تسلی دی اور بورڈنگ ہاؤس لے گئے۔ میں جاکر اپنی چارپائی پر لیٹ گیا اور چادر سے منھ چھپاکر روتا رہا۔ آخر صبر آگیا۔ اس زمانے میں ہم لوگ بڑے وارڈ میں رہتے تھے۔ میں جس کمرے میں رہا کرتا تھا وہ اب تک موجود ہے۔ چند سال ہوئے جب میں اسلامیہ کالج کے ایک جلسہ میں شرکت کیلئے اٹاوہ گیا تھا تو میں نے اپنا کمرہ جاکر دیکھا جس کے در و دیوار سے میری بچپن کی بہت سی یادیں وابستہ ہیں میں اس کمرے میں لالٹین کی پیلی روشنی میں اپنا سبق یاد کرنے کو رات میں پڑھا کرتا تھا بعض دفعہ لالٹین کی بتی بڑھ جانے کی وجہ سے دھواں نکلنے لگتا جس میں تیل کی بو ہوتی تھی جو میری سانس کے ساتھ سینے میں جاتی تھی۔ اور برسوں اسی طرح جاتی رہی میرا سینہ پہلے سے کمزور تھا۔ لالٹین کے دھوئیں نے بھی اپنا کام ضرور کیا ہوگا۔ مجھے مطلق اس کا احساس نہ تھا کہ یہ دھواں میرے لئے زہر ہے۔

والدہ کی ناگہانی موت نے میرے دل کو توڑ دیا اور میں نے محسوس کیا کہ اب میں دنیا میں تنہا رہ گیا ہوں میں شروع ہی سے بہت حساس ہوں۔ یہ سانحہ ایسا تھا جسے میں ہر چند بھلانے کی کوشش کرتا لیکن نہیں بھلا سکتا تھا۔ اسکول کی دلچسپیوں میں لاکھ دل بہلانے کی کوشش کرتا لیکن والدہ کی صورت رہ رہ کر نظروں کے سامنے آجاتی۔ کافی عرصے تک یہ کیفیت رہی۔ پھر آہستہ آہستہ اس کی شدت زائل ہونے لگی۔ زمانہ ہر زخم کو مندمل کر دیتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو دنیا کے کاروبار کیسے چلیں

جب بلقان کی لڑائی ہوئی تو اس وقت میں اٹاوہ میں تھا۔ اسکول کے لڑکوں میں بڑا جوش تھا۔ ہم نے کئی مہینوں تک گوشت نہیں کھایا تاکہ اس سے جو بچت ہو

وہ ترکوں کی مدد کے لئے چندے میں دی جائے۔ ہم سبھوں نے اپنے اردو کے استاد مولوی حامد حسن قادری کی نظم یاد کرلی تھی جسے ہم ہر جگہ مل کر گاتے پھرتے تھے۔ اس نظم کا ایک شعر مجھے اب تک یاد ہے۔

پھر ایڈریانوپل چھین لیا جو بیس ہزار کو قتل کیا
بلغاریہ کو وہ زخم دیا جو بھر نہ سکے گا تا محشر

جب ذاکر میاں اٹاوہ سے علی گڈھ آگئے تو ہم لوگ بھی علی گڈھ کے گورنمنٹ ہائی اسکول میں داخل ہو گئے زاہد میاں سے مجھے بڑی ڈھارس تھی۔ یہاں میرے چھوٹے بھائی محمود بھی آگئے۔ جب زاہد میاں میٹرک پاس کر کے ایم۔ اے۔ او کالج چلے گئے تو میں اور محمود وہ گئے گرمی کی تعطیل میں جب ہم قائم گنج جاتے تو بڑی بھاوج ہمارے کھانے کا انتظام کرتی تھیں۔ بڑی بھاوج بڑے والان میں اور منجھلی بھاوج سامنے کے چھوٹے دالان میں رہتی تھیں جو ٹین والا دالان کہلاتا تھا اس لئے کہ اس کا چھجا ٹین کا تھا۔ ہم لوگ باہر کوٹھی میں رہتے تھے۔ کھانے کے لئے اندر آتے تھے۔ بڑی بھاوج کا برتاؤ ہم لوگوں کے ساتھ شفقت آمیز اور مادرانہ تھا۔ وہ قائم گنج کے رئیس جان عالم خاں کی صاحبزادی تھیں۔ طبیعت میں غرور چھو کر نہیں گیا تھا ان کی بردباری کی ہر چھوٹا بڑا تعریف کرتا تھا۔ ان کی شفقت کو میں کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔

ہمارا مکان | ہمارا مکان ایک وسیع محل سرائے ہے۔ قائم گنج میں دو محل مشہور ہیں ایک پنج بھیتون کا محل جو غدر سے پہلے کا بنا ہوا ہے اور محلہ غلامی میں ہے، مجھے معلوم نہیں غلامی کی وجہ تسمیہ کیا ہے۔ یہاں کے پٹھان بڑے دلیر اور من چلے مشہور ہیں۔

ہماری پھوپھی کی شادی اسی محلے میں فضل احمد خاں کے ساتھ ہوئی تھی جن کے دو بیٹے منظور احمد خاں اور نثار احمد خاں تھے۔ منظور احمد خاں ہمارے والد کے ساتھ حیدرآباد چلے گئے تھے۔ وہاں عرصے تک محکمۂ پولیس میں رہے اور ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ کی حیثیت سے پنشن لے کر قائم گنج آگئے تھے اور ہمارے مکان کی دیکھ بھال اور جائداد کا انتظام انھوں نے اپنے ذمہ لے لیا تھا۔ میرے بھتیجے امتیاز مرحوم کی شادی ان کی صاحبزادی سے ہوئی تھی۔ چار ساڑھے چار سال ہوئے ان کا انتقال قائم گنج میں ہوا۔ دوسرا چمن خاں کا محل مشہور ہے۔ چونکہ دادا نے اسے بنوایا تھا، اس لئے وہ انھیں کے نام سے آج تک منسوب ہے۔ اس کے دو حصے ہیں۔ اندر زنانے میں ایک بڑا سہ دریا دالان ہے جس کے عقب میں کوٹھا ہے۔ کوٹھے کے دونوں طرف دو کمرے ہیں۔ بڑے دالان کے سامنے ٹین والا دالان ہے جس کے عقب میں اتنا ہی بڑا کوٹھا ہے۔ اس کے دالان کے آگے ٹین کا چوڑا چھجہ تھا اور اس کے در لکڑی کے تھے جن پر کٹاؤ کا کام تھا۔ چند سال ہوئے پختہ چھجہ اور پختہ در بنوا دیئے گئے ہیں۔ دونوں دالانوں کے سامنے وسیع چبوترے ہیں اور چبوتروں کے نیچے صحن ہے۔ مردانہ میں ایک بڑا ہال ہے جس کے بازوؤں میں کمرے ہیں۔ ایک طرف ایک دوسری طرف دو۔ سامنے برآمدہ اور چبوترہ ہے۔ چبوترہ کے بازو میں چھوٹا برآمدہ ہے۔ مردانہ حصے کا طرز تعمیر یونانی وضع کا ہے۔ خاص کر اس کے بڑے بڑے ستون۔ اندرونی حصے کے دالانوں میں شاہجہانی زنجیر دار محرابیں ہیں۔ مردانے کے ہال میں بہ یک وقت پچاس ساٹھ آدمی فرش پر بیٹھ سکتے ہیں۔

ہمارے پختہ مکان سے متصل ایک کچا مٹی کا مکان تھا۔ اب وہ گر کر برابر

ہوگیا۔ میرے بچپن میں اس میں حمید کی ماں رہا کرتی تھیں۔ میں نے جب انھیں دیکھا تو وہ بوڑھی تھیں۔ میں نے اپنے یہاں سنا تھا کہ انھیں بیوہ ہوئے عرصہ ہوا۔ ایک بیٹا تھا وہ بھی اللہ کو پیارا ہوگیا۔ ہماری والدہ انھیں کچھ مہینہ دیا کرتی تھیں جس پر ان کی گذر بسر تھی۔ اس کے علاوہ وہ دن بھر سلائی پڑائی کرتیں اور کبھی کبھی کناری بھی بنتیں۔ ان کی ایک بیوہ بہن چلولی میں رہتی تھیں جو بازار کے قریب واقع ہے۔ وہ کناری بازار لے جاکر گوٹے والے کے یہاں فروخت کر دیتیں اور کبھی ایسا بھی ہوتا کہ ہماری والدہ کے ملاقاتی حمید کی ماں کی کناری خرید لیتے۔ ہم لوگ حمید کی ماں کو نہ معلوم کیوں انا کہا کرتے تھے اور ان کے گھر کو بھی انا کا گھر کہتے تھے۔ والدہ کی تاکید تھی کہ انا کے گھر جب جائیں تو پہلے انھیں سلام کریں۔

چھٹیوں کے سفر گرمیوں کی چھٹیوں میں ہم لوگ اٹاوہ سے قائم گنج آجاتے تھے۔ راستے میں پہلے شکوہ آباد پر اور پھر فرخ آباد پر ٹرین بدلنی پڑتی تھی۔ گرمیوں کی جھلستی ہوئی دوپہر ٹین کی چھت کے نیچے پلیٹ فارم پر گذرتی تھی، اس لئے کہ دونوں جگہ کئی گھنٹے کے انتظار کے بعد دوسری ٹرین ملتی تھی۔ جب علی گڑھ سے قائم گنج آتے تو ہاتھرس اسٹیشن کے مسافر خانے میں ٹھہرتے جس کی چھت خاصی اونچی اور پختہ تھی، اس لئے گرمی اتنی نہیں محسوس ہوتی تھی جتنی کہ شکوہ آباد اور فرخ آباد کے اسٹیشنوں پر۔ ہم لوگ ہمیشہ تیسرے درجے میں سفر کرتے تھے۔ تہوار کے موقع پر اور شادیوں کے موسم میں تیسرا درجہ آدمیوں سے ٹھساٹھس بھرا ہوتا۔ ایسا کہ اگر اندر پہنچ جاؤ تو پھر باہر نکلنا مشکل ہو جائے اور اگر باہر ہو تو اندر آنا جوئے شیر لانے سے کم نہ تھا۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ اٹاوہ اور شکوہ آباد کے درمیان تیسرے درجے کے دروازے میں سے، جو بھیڑ کی وجہ سے بند نہیں ہو سکتا تھا، ایک شیر خوار

بچہ جس کی عمر ایک سال سے کم تھی چلتی گاڑی میں سے ایک دم دھکا لگنے سے ماں کی گود سے باہر جا پڑا۔ ماتا کی ماری ماں فوراً بغیر اِدھر اُدھر دیکھے ہوئے چلتی ریل سے کود پڑی۔ لوگوں نے زنجیر کھینچ کر ٹرین رکوائی۔ مسافر نیچے اتر آئے۔ میں بھی ڈبے میں سے اترا تو یہ دیکھ کر تعجب کی انتہا نہ رہی کہ بچہ ایک چھوٹی سی جھاڑی میں پڑا ہوا ہے۔ اس کے جسم پر خفیف سی خراش تھی جو غالباً جھاڑی کے چبھنے سے ہو گئی تھی۔ ایک شخص نے اسے گود میں اٹھا لیا تو کلکوریاں مارنے لگا۔ وہیں سے تھوڑے فاصلے پر اس کی ماں کی نعش پڑی ہوئی تھی۔ اس کے سر میں سے خون نکل رہا تھا۔ ریل میں ایک ڈاکٹر سفر کر رہے تھے انھوں نے دیکھ کر کہا کہ وہ عورت سر کے بل گری اور اس کے بھیجے پر اتنی سخت چوٹ آئی کہ وہ فوراً وہیں ختم ہو گئی۔ گارڈ نے نعش رکھنے کا انتظام کیا۔ جس گاؤں کی وہ عورت تھی اس گاؤں کا ایک شخص ہمارے ڈبہ میں سفر کر رہا تھا۔ اس نے بچے کو اپنے ذمہ لیا۔ گارڈ نے کہا کہ شکوہ آباد پہنچ کر پولیس لکھا پڑھی کرے گی اور بچہ اور نعش پولیس کے حوالے کر دیجائیگی۔ اس واقعہ کے نقوش میرے حافظے میں ایسے تازہ ہیں جیسے میں ابھی اسے اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھ رہا ہوں۔

کوؤں کا ماتم قائم گنج میں بھی ایک واقعہ پیش آیا جسے میں کبھی نہیں بھولتا۔ ہمارے زنانے صحن کے ایک کونے میں ہماری ملازمہ اسلامی کوڑا کرکٹ ڈال دیا کرتی تھی۔ اس میں بچی کھچی ہڈی گڈی بھی ہوتی تھی۔ نو دس بجے کے قریب بھنگن آتی اور کوڑا اٹھالے جاتی لیکن بھنگن کے آنے سے پہلے گھنٹہ بھر ہڈی گڈی کی لالچ میں روزانہ کوّے جمع ہو جاتے تھے۔ بڑے پہاڑی کوّے، چھوٹے میدانی کوّے جن کی گردن میں سفید حلقہ ہوتا ہے، ان سبھوں میں بڑی یکجہتی تھی۔ میں نے کبھی انھیں ایک دوسرے سے لڑتے نہیں دیکھا۔

اتفاق سے ایک دن ان میں سے ایک کوا مر گیا۔ میں نے دیکھا کہ پہلے سب کوے اس کے چاروں طرف جمع ہو کر بڑے زور زور سے کائیں کائیں کرنے لگے جیسے ماتم کر رہے ہوں۔ پھر جب خوب کائیں کائیں کر چکے تو ان میں سے کچھ اپنے ہم جنس کی نعش سے ہٹ کر ہڈی گدڑی سے شغل کرنے لگے لیکن کچھ وہیں موجود رہے۔ پھر وہ ادھر کوڑے کی طرف آ گئے اور دوسرے نعش کے قریب کائیں کائیں کرنے لگے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ کوؤں میں یہ معمول ہے یا یہ کہ جو منظر میں نے دیکھا تھا وہ محض اتفاقی تھا اس لئے کہ بعد میں کبھی اس قسم کا تجربہ نہیں ہوا۔ اس میں انسانی ہمدردی اور دل سوزی سے جو مشابہت تھی اس سے میں بہت متاثر ہوا تھا۔ میں نے کوؤں کا بیان پن تو سنا تھا لیکن پہلی بار یہ دیکھا کہ ان میں اپنے ہمجنسوں کے لئے دل سوزی کی صلاحیت بھی ہے۔

ہماری بڑی بھاوج کے پاس ایک طوطا تھا جو ایک بڑے پنجرے میں محرابی در میں لٹکا رہتا تھا۔ کبھی کبھی اسے باہر چھوٹے نیم کی شاخ میں ٹانگ دیتے تھے۔ میں نے کئی مرتبہ دیکھا کہ اس پنجرے پر جنگلی طوطے آ کر بیٹھ جاتے اور پنجرے والے طوطے کی چونچ سے چونچ ملاتے اور پھر خوب اپنی بولی میں ٹیں ٹیں کرتے۔ آیا وہ اپنے گرفتار ساتھی کو آزادی کا پیغام سناتے تھے یا یہ محض تفننِ طبع تھا۔ میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ کچھ بھی ہو، لیکن اس منظر سے بھی ہم جنس کی کشش صاف ظاہر ہوتی ہے۔ نہ معلوم مجھے یہ بات کیوں یاد رہ گئی۔ یقیناً اس منظر نے میرے تخیل کے تاروں کو چھیڑا ہو گا اور حافظے نے اس کی قدر و قیمت پہچان کر اپنے محافظ خانے میں جگہ دی ہو گی۔ اب جبکہ میں اپنے حافظے کو کھنگال رہا ہوں تو یہ سب تصویریں ایک ایک کر کے میری نظروں کے سامنے خود بخود آ رہی ہیں۔ جب وہ خود بلا کسی جھجک اور تصنع کے میرے سامنے آ رہی ہیں!

تو میرا فرض ہے کہ ان کا استقبال کروں اور ان کی قدر و قیمت کو پہچانوں۔

مردانہ حصے کے صحن میں بازو میں ایک کوٹھا تھا جس میں جنکیا دھوبن رہتی تھی۔ میں نے اسے ہمیشہ بڑھیا ہی دیکھا۔ اس کا لڑکا پنچا اور اس کے بیوی بچے بھی وہیں رہتے تھے۔ جنکیا کی عمر ستر سے یقیناً متجاوز ہوگی۔ اس کی کمر جھک گئی تھی لیکن وہ بڑی محنتی اور مستعد تھی۔ سردیوں میں صبح تڑکے کپڑے دھونے قریب کے تالاب میں گھنٹوں ٹھنڈے پانی میں کھڑی رہتی۔ اس کا لڑکا پنچا بھی چھیو رام چھیو رام کے نعرے لگاتا اور میلے کپڑوں کو لکڑی کے پٹلے پر مارتا جو تالاب کے کنارے اس طرح جمایا جاتا کہ کپڑوں کی مار پڑنے پائے نہیں ہم سب جنکیا کو جنکیا آیا کہتے تھے۔ ہمارے یہاں دیہات میں آیا کے لفظ سے معمر عورت کو خطاب کرتے ہیں۔ گھر کی ہر تقریب میں اس کو حصہ ملتا تھا۔

علی گڑھ کا گورنمنٹ اسکول | علی گڑھ کے گورنمنٹ اسکول میں ہم لوگ تین سال رہے۔ یہاں ہمارے ہڈ ماسٹر مسٹر ایف۔ اے کوپر ایک پنشن یافتہ فوجی تھے۔ انھوں نے اسکول میں بہت اچھا نظم و ضبط قائم کیا اور کھیلوں کی طرف خاص توجہ دی۔ ہم تینوں بھائی بورڈنگ میں رہتے تھے۔ بعد میں زاہد میاں ایم۔ اے۔ او کالج میں داخل ہو گئے تو میں اور محمود وہاں رہ گئے۔ مجھے کھیلوں میں ہاکی سب سے زیادہ پسند تھا اور میرا اسکول کے اچھے کھیلنے والوں میں شمار ہوتا تھا۔ ہمارے ہڈ ماسٹر کوپر صاحب کی لڑکی نہایت حسین تھی۔ چونکہ اس کے ماں باپ اینگلو انڈین تھے اس لئے اس کے رنگ میں وہ پھیکا پن نہیں تھا جو اکثر انگریز عورتوں میں نظر آتا ہے۔ وہ روزانہ گھوڑے پر دونوں پاؤں زین کے ایک طرف لٹکا کے سواری کیا کرتی تھی۔ اسکول کے لڑکوں میں مس کوپر کے حسن کا اکثر چرچا رہتا تھا۔ ہم لوگ جب گھنٹہ گھر والی سڑک سے کھیل کے میدان جاتے

تھے، جہاں اب جواہر پارک ہے، تو اکثر اوقات مس کوپر نظر آتی تھیں۔ ایک گھوڑے پر وہ خود اور دوسرے پر ایم۔ اے۔ او کالج کے ایک انگریز پروفیسر۔ لڑکے کہتے تھے ان دونوں کی شادی ہونے والی ہے۔ میں نے کبھی اس بات کی تحقیق نہیں کہ انکی یہ اطلاع صحیح تھی یا غلط۔

مسٹر کوپر کے بعد ہمارے سامنے ہی مسٹر ہیلٹن ان کے جانشین ہو کر آگئے۔ وہ بھی اینگلو انڈین تھے مگر ان میں مسٹر کوپر کی سی آن بان نہ تھی اور نہ ان کی کوئی لڑکی تھی جس کی نسبت لڑکے چرچا کرتے۔ ان کے دو لڑکے تھے جو فوج میں تھے۔ جب وہ کبھی علی گڑھ آتے تو ہم لوگ انھیں دور سے دیکھا کرتے۔ اس زمانے میں اینگلو انڈین نوجوان اپنے لئے یہ بات کسر شان سمجھتے تھے کہ دیسی نوجوانوں سے ملیں یا ان سے خلا ملا بڑھائیں۔ گورنمنٹ اسکول میں رحم علی اور احسن کاظمی ہمارے ساتھ بورڈنگ میں تھے۔ دونوں مجھ سے اونچی جماعت میں تھے۔ احسن کاظمی میرے کمرے میں رہتے تھے، اسلئے ان سے دوستانہ تعلقات پیدا ہو گئے تھے۔ یہ اسکول کے نہایت ذہین طالب علموں میں تھے اور امتحان میں اونچے نمبروں سے کامیاب ہوا کرتے تھے۔ انھیں شعر و شاعری سے بھی لگاؤ تھا۔ بعد میں انھوں نے ایم۔ اے۔ او کالج میں بھی نام پیدا کیا اور سرکاری ملازمت میں ان کا انتخاب ہو گیا۔ جب وہ قائم گنج میں منصف تھے تو عرصے کے بعد ان سے ملنے کا موقع ملا۔ آخر میں سیشن ججی سے پنشن لے کر علی گڑھ میں اپنے خاندان کے ساتھ قیام پذیر تھے۔ افسوس ہے کہ دو سال ہوئے قلب کی حرکت بند ہو جانے سے ان کا انتقال ہو گیا۔ ان کی لڑکیاں سب بڑی ذہین ہیں۔ ان میں سے ایک مسلم یونیورسٹی کے لڑکیوں کے کالج میں پولیٹیکل سائنس کی لکچرر ہیں۔ رحم علی اترولی کے رہنے والے تھے

بڑی محبت سے ملتے تھے۔ زاہد میاں کے ہم جماعت تھے۔ ان کے ایک صاحبزادے ہونہار ہیں اور علی گڑھ میں معاشیات کے شعبے میں ہیں۔

اٹاوہ | میں اور محمود میاں ۱۹۱۱ء میں دوبارہ علی گڑھ سے اٹاوہ چلے گئے۔ وہاں ہم سال بھر رہے ہوں گے کہ میں سخت بیمار ہو گیا اور ڈاکٹروں کے مشورے کے مطابق مجھے کچھ عرصے کے لئے تعلیم چھوڑ دینی پڑی۔ علی گڑھ کے گورنمنٹ ہائی اسکول کے استادوں میں کوئی ایسی شخصیت نہیں جسے میں ذکر کے قابل سمجھوں۔ ہاں اٹاوہ کے اسلامیہ ہائی اسکول کے بعض استادوں کی یاد میرے حافظے میں تازہ ہے۔ ان میں سب سے اوّل تو سید الطاف حسین ہیں جو ہمارے ہڈ ماسٹر تھے۔ وہ ایک غیر معمولی شخص تھے۔ وہ اسکول کی اونچی جماعتوں کو انگریزی اور ریاضی پڑھاتے تھے لیکن اس کے ساتھ چھوٹی جماعتوں کے چند کلاس بھی پڑھاتے تھے۔ مجھے بھی انھوں نے انگریزی پڑھائی تھی۔ ہم سب انکی قابلیت اور معلومات سے مرعوب تھے۔ وہ چھوٹے لڑکوں سے بڑی شفقت سے پیش آتے تھے۔ سید الطاف حسین ایک نیک سرشت انسان تھے۔ ایسا محسوس ہوتا تھا، جیسے ان کی شخصیت کے اندر سے نیکی کی شعاعیں باہر نکل رہی ہوں اور ان سبھوں کے دل و دماغ کو روشن کر رہی ہوں جو کسی حیثیت سے بھی ان سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کی نیکی اور شرافت ان کے سب شاگردوں کو یاد ہے۔ ہمارے دوسرے استادوں میں صابر صاحب، عبدالسلام صاحب سندھی اور مولوی فیاض خاں صاحب مجھے خوب یاد ہیں۔ یہ سب بڑی محنت اور محبت سے ہمیں پڑھاتے تھے۔ عبدالسلام صاحب سندھی نومسلم تھے۔ وہ بعد میں ایم۔ اے۔ او کالج اعلیٰ ڈگری حاصل کرنے کے لئے چلے گئے تھے۔ مولوی فیاض خاں صاحب ٹونک کے پٹھان تھے۔ کسرت کرنے کا بڑا شوق تھا۔ اچھا پڑھاتے

تھے۔ ابھی زندہ ہیں۔ علی گڑھ میں رہتے ہیں۔ مولانا شرف الدین جو بعد میں جامعہ ملیہ آ گئے تھے ہم سب بھائیوں کے اٹاوہ میں استاد رہے تھے۔ اعلیٰ درجے کے شاعر تھے۔ پہلے یاس اور پھر مومن تخلص کرتے تھے۔ ان کا علم نہایت مستحضر تھا۔ بڑے صاف گو انسان تھے لگی لپٹی نہیں رکھتے تھے۔ سچی بات کہنے میں بڑے سے بڑے شخص کی پروا نہیں کرتے تھے۔

۱۹۱۹ء میں جب میں اٹاوہ سے قائم گنج آیا تو میری صحت خراب تھی۔ محمود میاں تو جارج اسکول میں داخل ہو گئے۔ مجھے ڈاکٹروں نے کہا کہ مکمل آرام لو، اس لئے کہ مجھے مستقل طور پر خفیف حرارت رہا کرتی تھی۔ میں عرصے تک ڈاکٹر امیر کے زیر علاج رہا جو قائم گنج میں ٹنٹے ڈاکٹر کہلاتے تھے اس لئے کہ ان کے ہاتھ کی ایک انگلی ٹوٹی ہوئی تھی۔ وہ وہاں پہلے سرکاری اسپتال میں ڈاکٹر تھے پھر پنشن لے کر قائم گنج ہی میں سکونت اختیار کر لی تھی اور بازار کے قریب جامع مسجد کے علاقے میں ایک مکان بھی بنا لیا تھا جہاں وہ اپنا مطب کرتے تھے۔

ترک موالات کی تحریک اب ترک موالات کی تحریک شروع ہو چکی تھی۔ خلافت کمیٹی کے کارکن قائم گنج بھی آتے تھے۔ انھیں میں حفیظ الرحمٰن خاں مجیبی بھی تھے۔ جب میری صحت ذرا ٹھیک ہوئی تو میں نے کانگریس اور خلافت دونوں کے لئے کام شروع کر دیا۔ آزادی اور انقلاب کے رومانی تصورات نے مجھے مسحور کر لیا اور انگریزی حکومت کے خلاف میرے دل میں نفرت کے جذبات پیدا ہو گئے۔ بمبئی کی مرکزی خلافت کمیٹی کی ہدایات کے مطابق میں نے اور محمود میاں نے اپنے سب بدیسی کپڑے خلافت کمیٹی کے صدر دفتر کے پتے پر بھجوا دیئے اور شدھ کھدر کے کپڑے پہن لئے۔ قائم گنج میں جو جلسے ہوتے تھے میں ان میں شریک ہوتا تھا اور کبھی کبھی مجھے تقریر کرنے کو بھی کہا جاتا تھا۔

اس سے قبل میں نے پبلک میں کبھی تقریر نہیں کی تھی اس لئے جھجک اور تامل تھا۔ کچھ دنوں بعد یہ بات نہیں رہی اور مجھے جلسوں کو خطاب کرنے میں ایک خاص لطف محسوس ہونے لگا۔ نیاز مند خاں جو کوکی خیل میں رہتے تھے مقامی خلافت کمیٹی کے سکریٹری اور مولوی محمد یحییٰ صدر تھے۔ سودیشی اسٹور قائم کرنے کے لئے انھوں نے اور حفیظ الرحمٰن خاں مجلیبی نے ایک مہم شروع کی تھی۔ میں بھی اس میں ان کے ساتھ تھا۔ لیکن انتظام سب ان لوگوں کے ذمے تھا۔ یہ کام کچھ چلا نہیں۔ جن لوگوں سے خلافت کمیٹی نے حصوں کی رقم وصول کی تھی، وہ واپس کر دی گئی۔

میں صحت کی خرابی کی وجہ سے قائم گنج میں دو سال تک بیکار پڑا رہا۔ ان دو سال میں بعض دلچسپ لوگوں سے واسطہ رہا۔ یہاں میں ان میں سے صرف چند صاحبوں کی نسبت ذکر کروں گا۔ محمد مبین خاں، مشیر الدین خاں، اعجاز نور خاں، دیدار عالم خاں اور راندا خاں۔

قائم گنج کے چند اشخاص | محمد مبین خاں میری چچی کے چھوٹے بھائی تھے۔ جوانی میں ورزش کا شوق تھا۔ ساری توجہ جسم کو خوب سے خوب تر بنانے کی طرف رہی۔ بھوپال میں فوج میں ملازم ہو گئے۔ جوان صالح تھے، ایک بزرگ سے بیعت ہو گئے۔ ملازمت چھوڑ چھاڑ عبادت و ریاضت میں مشغول ہو گئے۔ کچھ دنوں بعد بہن کے پاس قائم گنج چلے آئے۔ گھر کی زمینداری میں ان کا اتنا حصہ تھا جس کی آمدنی سے ان کی گذر بسر ہو جاتی تھی۔ روزی کا مسئلہ اس طرح حل ہو گیا۔ صرف دوپہر کو ایک وقت کھانا کھاتے تھے جو ہماری چچی انھیں بھجوا دیا کرتی تھیں۔ عمر بھر مجرد رہے۔ جھتوپور میں بڑے بھائی کے آم کے باغ میں ایک حجرے میں ساری عمر کاٹ دی۔ میں سمجھتا ہوں، پچاس سال

تو وہاں رہے ہوں گے۔ چائے کے شوقین تھے۔ ہمیشہ نمک ڈال کر پیا کرتے تھے۔ باغ
میں کام کرنے والوں میں ایک شخص جو وہیں رہتا تھا ان کے لئے چائے بنا دیتا تھا اور
ان کا حقہ بھر دیتا تھا۔ میں جب چچی کے یہاں جاتا تو محمد مبین خاں سے کبھی کبھی ملاقات
ہو جاتی تھی۔ چچی نے ایک دن میری صحت کی خرابی کا ذکر کیا تو کہنے لگے "دوا زیادہ
مت کرو، ڈاکٹر لوگ بھلے چنگے آدمی کو بیمار کر دیتے ہیں۔" ہمارے یہاں آ جایا کرو
ہم بعض ایسی ورزشیں بتائیں گے کہ چند مہینے میں بالکل چاق و چوبند ہو جاؤ گے میں نے
دل میں سوچا کہ ان کے کہنے پر عمل کر کے دیکھوں۔ ان کا آموں کا باغ ہمارے مکان
سے میل بھر سے کچھ زیادہ فاصلے پر تھا۔ میں نے روزانہ صبح ناشتے کے بعد وہاں جانا
شروع کر دیا۔ میں وہاں کبھی ایک گھنٹہ اور کبھی ڈیڑھ گھنٹے ٹھہرتا تھا۔ محمد مبین خاں
کوئی عالم و فاضل شخص نہ تھے لیکن علم مجلسی سے واقف تھے۔ کبھی اپنے پیر اور دادا پیر شاہ
نیاز احمد صاحب بریلوی کے قصے سناتے اور شاہ نیاز احمد صاحب کا اردو فارسی
کا دیوان مجھے پڑھنے کو دیتے۔ کہتے تھے ذرا زور زور سے پڑھو۔ جب میں پڑھتا تو آنکھیں
بند کر کے ایک ایک لفظ بڑے غور سے سنتے۔ کبھی اشعار کو دہراتے۔ جو شعر وہ
دہرایا کرتے تھے اور جو مجھے بھی یاد ہو گئے یہ ہیں۔

یہ ہی تھی چین خوابِ عدم میں تھا نہ تھا زلفِ یار کا کچھ خیال

سو جگا کے شورِ نشور نے مجھے کس بلا میں پھنسا دیا

ابھی جا کے مکتبِ عشق میں سبق مقامِ فنا لیا

جو لکھا پڑھا تھا نیاز نے اسے صاف دل سے بھلا دیا

بل بے سمائی تری ادب سمندر کے چپڑ سینے میں قلزم کو بے قطرہ کا قطرہ ڈ

شاہ نیاز احمد صاحب بریلوی کا ایک معجون کا نسخہ ان کے پاس تھا۔ معجون خود بڑے اہتمام سے سردیوں میں تیار کرتے تھے۔ جب خود کھاتے تو مجھے مرتبان دیدیتے کہ اس میں سے ایک چمچہ تم بھی لے لو۔ معجون کا مزہ مجھے ابتک یاد ہے۔ بڑی لذیذ تھی۔ کہتے تھے یہ دل اور دماغ کی قوت کے لئے ہے۔ وہ برسوں سے سردی کے موسم میں اس کا استعمال کرتے تھے۔ معجون کے علاوہ انھوں نے مجھے جسمانی ورزش میں ڈنڈ اور بیٹھک کرنا بتایا۔ آہستہ آہستہ یہ مشقیں اور ورزش میرے معمولات میں شامل ہو گئی۔ چار پانچ مہینے بعد میں نے محسوس کیا کہ میری صحت پہلے کے مقابلے میں بہتر ہو گئی ہے۔ اتفاق سے اسی زمانے میں میں نے لوئی کوہنی کے طریق علاج پر اس کی کتاب کا اردو ترجمہ پڑھا۔ اس طریق علاج کا ایک مرکز مرادآباد میں تھا۔ میں وہاں گیا اور وہاں دو روز ٹھہر کر یانی کے اس علاج کے تمام سربستہ راز معلوم کئے۔ وہاں سے واپسی پر میں نے اس پر تقریباً ڈیڑھ سال بڑی پابندی سے عمل کیا۔ ویسے اس علاج کے کئی طریقے ہیں۔ میں نے صرف دو پر عمل کیا۔ ایک تو بھپارہ اور دوسرے ہپ باتھ، جس میں ٹب میں پانی میں بیٹھتے ہیں۔ پانی اتنا ہوتا ہے کہ بیٹھ کر جب ٹانگیں باہر رکھ لیں تو ناف سے اوپر نہ جائے۔ ٹھنڈے پانی میں شروع میں دس منٹ اور پھر پندرہ منٹ تک بیٹھ کر پیٹ کو چھوٹی تولیہ سے سہلاتے ہیں۔ سردیوں میں پندرہ منٹ ٹب میں بیٹھ کر جب میں باہر نکلتا تھا تو پیٹ اور رانوں کا اوپر کا حصہ، برف کی طرح ٹھنڈے ہو جاتے تھے۔ ٹب سے نکل کر تازہ ہوا میں ٹہلنے کی تاکید تھی تاکہ دورانِ خون معمول پر آجائے۔ مجھے اس علاج سے فائدہ ہوا۔ بعض ڈاکٹر دوستوں سے میں نے اس کا ذکر کیا تو ہنس کر

کہنے لگے کہ اعتقاد کی وجہ سے فائدہ ہوا ہوگا۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ڈاکٹروں کا یہ خیال قطعاً غیر معقول اور غیر علمی (ان سائنٹفک) ہے۔ علاج معالجہ خالص تجربی چیز ہے۔ اگر عملاً کسی کو کسی خاص طریقے سے فائدہ ہو تو اسے ہنس کر اڑانا نہیں چاہئے۔ اس قسم کی ادعا پسندی سائنس کی روح کے منافی ہے۔ بعد میں میں نے دیکھا کہ ہومیو پیتھک علاج کے متعلق بھی ڈاکٹر صاجان اسی قسم کی غیر سائنٹفک باتیں کہتے ہیں۔ حالانکہ اس کے فوائد سے سوائے ہٹ دھرمی کے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ غرض کہ مجھے لوئی کو ہنی کے پانی کے علاج، ہواخوری اور ورزش سے غیر معمولی فائدہ ہوا۔ میری بھوک کھل گئی اور وزن بھی کافی بڑھ گیا۔ حرارت بالکل غائب ہوگئی۔ میری صحت اتنی اچھی ہوگئی کہ اب میں پانچ چھ میل بلا کسی تکان کے چل سکتا تھا۔ کئی دفعہ شکار کے لئے گنگاپار گیا۔ وہاں غلام احمد خاں کے گاؤں میں ان کے ساتھ قیام رہا۔ اب مجھے ہر قسم کی جسمانی ورزش میں لطف آنے لگا۔ حالانکہ چھ سات مہینے قبل میری یہ حالت تھی کہ تھوڑا چلنے میں بھی میں تھک جاتا تھا۔ اس لئے جہاں تک ہو سکتا چلنے پھرنے سے بچتا تھا۔ دل ہر وقت نڈھال رہتا اور لیٹے رہنے کو جی چاہتا۔ دنیا میں بہت کم لوگوں سے فائدہ پہنچتا ہے اور بہت کم ایسے ہوتے ہیں جو بالکل بے غرضی سے دوسرے کو فائدہ پہنچانا چاہتے ہیں۔ مجھے محمد مبین خاں کی صحبت میں ان سے جو فیض ملا اس کا مجھے اعتراف ہے اور میں ان کے احسان کو کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔ میں جب ان کے یہاں جاتا تھا تو شاہ نیاز احمد صاحب بریلوی کے دیوان کے علاوہ وہ شاہ عبدالقادر دہلوی کا قرآن کا ترجمہ مجھ سے پڑھوا کر سنتے تھے۔ ویسے قرآن میں نے گھر پر پڑھا تھا لیکن اب پہلی مرتبہ میں نے اردو ترجمہ پڑھا۔ میں سمجھتا ہوں میں نے ڈیڑھ سال میں پورے قرآن کے ترجمے

کے دو دیا تین دور گئے۔ میں بعد میں بھی جب قائم گنج آتا تو محمد مبین خاں کی خدمت میں ضرور حاضری دیتا تھا۔ چار سال ہوئے ان کا ۸۰ سال کی عمر میں انتقال ہو گیا۔ آخری زمانے میں ان کی خدمت ہماری منجھلی بھاوجنے کی جو ان کی سگی بھتیجی ہیں۔

والد مرحوم نے جب حیدر آباد میں وکالت کے میدان میں اپنا سکہ بٹھایا تو دو نوجوانوں کو جو ہمارے عزیز تھے قائم گنج سے بلا کر اپنے یہاں رکھا۔ ان سے وکالت کا امتحان دلوایا اور ان کے امتحان میں کامیاب ہو جانے کے بعد اپنے ساتھ جونیر کی حیثیت سے کام سیکھنے کا موقع دیا۔ ایک غلام اکبر خاں تھے جو ددھیال کی طرف سے ہمارے والد کے عزیز تھے اور دوسرے ہمارے خالہ زاد بھائی مشیر الدین خاں تھے۔ والد کے انتقال کے بعد غلام اکبر خاں نے اپنا علاحدہ دفتر قائم کر لیا۔ محنت اور قابلیت کی بدولت چند سال میں ان کی وکالت چل نکلی اور انھیں غیر معمولی کامیابی حاصل ہوئی۔ بعد میں حیدر آباد ہائی کورٹ کے جج اور پھر ہوم سکریٹری ہوئے۔ اعلیٰ حضرت نظام نے انھیں اکبر یار جنگ کے خطاب سے نوازا۔ ان کی بڑی سلجھی ہوئی طبیعت تھی۔ بڑے فیّاض تھے۔ دسترخوان پر چار چھ مہمان ہمیشہ موجود رہتے تھے۔ مطالعہ کا شوق تھا۔ عربی اور فارسی میں اچھی استعداد تھی۔ انکے بڑے صاحبزادے غلام احمد خاں نے بھی وکالت کا پیشہ اختیار کیا۔ توپ بازار میں آبائی مکان میں ان کا دفتر ہے اور وہیں رہتے ہیں۔

مشیر الدین خاں کی پوری تعلیم حیدر آباد میں ہمارے والد مرحوم کی نگرانی میں ہوئی، انھوں نے وکالت کے امتحان میں امتیاز کے ساتھ کامیابی حاصل کی۔ والد کے انتقال پر ان کی وکالت کا اکثر و بیشتر کام انھیں مل گیا۔ وہ ہمارے بیگم بازار والے مکان میں رہتے تھے اور وہیں ان کا دفتر تھا۔ وہ بلا کے محنتی اور ذہین

تھے۔ ان کی وکالت خوب چمکی۔ چند سال کام کرنے کے بعد یکایک انھیں اعصابی دورے شروع ہوگئے اور دماغی توازن میں خلل پیدا ہوگیا۔ ۱۹۱۴ء میں ہمارے خالو حسن الدین خاں انھیں حیدرآباد سے قائم گنج لے آئے۔ بہت کچھ علاج معالجہ ہوا لیکن بے فائدہ۔ کچھ دنوں بعد وحشت میں کمی آگئی اور وہ اس قابل ہوگئے کہ اپنی ڈیوڑھی میں بیٹھ کر راہ چلتوں کو بلا کر پاس بٹھا لیتے اور ان سے دنیا جہان کی باتیں کرتے تھے۔ میں جب اسکول کی چھٹیوں میں قائم گنج آتا تو خالہ سے ملنے دوسرے تیسرے دن جاتا تھا۔ ان کی ڈیوڑھی خالہ کے مکان کی ڈیوڑھی سے پہلے پڑتی تھی اور بالکل راستے پر واقع تھی کہ ادھر سے کترا کے جانا ممکن نہ تھا۔ اگر صبح کے پہر میں جاتا تو بھی وہ سامنے موجود اور شام کو جاتا تو بھی موجود۔ شروع شروع میں میں ان سے ذرا گھبراتا تھا کہ نہ معلوم کس وقت انھیں جنون کا دورہ پڑ جائے لیکن تجربے سے معلوم ہوا کہ یہ خوف بے بنیاد تھا۔ وہ ہم سب بھائیوں سے بڑی محبت سے ملتے تھے۔ ان کی گفتگو بالکل ٹھیک آدمیوں کی سی ہوتی تھی اور یہ اندازہ کرنا دشوار تھا کہ ان کا دماغی توازن معمول سے ہٹا ہوا ہے۔ صرف دو باتیں ایسی تھیں جن سے پتہ چلتا تھا کہ وہ اپنی اصلی حالت میں نہیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ اگر کوئی نزدیک یا دور کھانستا یا کھنکارتا تو وہ فوراً دُت کہتے تھے جیسے کسی کتے کو کہتے ہیں۔ اگر ہم میں سے بھی کوئی باتیں کرتے وقت کھانس دیتا تو اپنا منھ پیچھے موڑ کر آہستہ سے دُت کہہ دیتے۔ انھیں اتنا ہوش تھا کہ اگر وہ یہ لفظ ہمارے سامنے زور سے کہیں گے تو شاید ہمیں ناگوار ہو۔ یہ رعایت صرف ہم بھائیوں کے ساتھ تھی۔ خود اپنے سگے بھائیوں کے ساتھ بھی نہ تھی بعض دفعہ میں نے دیکھا کہ کوئی راہ گیر اُدھر سے جا رہا ہے، جاتے جاتے اتفاق سے اسے کھانسی آگئی۔ کھانسی کی آواز سنتے ہی وہ باتیں کرتے

ادھر متوجہ ہو جاتے اور اتنے زور سے دُت کہتے کہ کھانسنے والا سن سکے اور اسے کوئی شبہہ نہ رہے کہ دُت کا مخاطب وہی ہے۔ مشیر الدین خاں میں یہ لٹکا آخر وقت تک قائم رہا۔ مرتے مر گئے مگر اس معاملے میں وضع داری نہ چھوڑی۔ ان کی والدہ جنھیں ہم منی کہتے تھے کہتی تھیں کہ حیدر آباد سے آنے کے بعد سے برابر یہ علت قائم ہے۔ اس کی شروعات کن نفسیاتی الجھنوں کا نتیجہ تھی میں نہیں کہہ سکتا۔ اس کا علم نہ ان کی والدہ اور والد کو تھا اور نہ کسی اور کو۔

مشیر الدین خاں کا دوسرا لٹکا یہ تھا کہ وہ یہ بات تسلیم کرنے سے انکار کرتے تھے کہ جنگ عظیم ہو رہی ہے جس کی لپیٹ میں یورپ کے بیشتر ممالک آگئے ہیں اور ایشیا والے بھی کسی نہ کسی حیثیت سے اس سے متاثر ہیں۔ ہم لوگ جب جنگ کا حال بیان کرتے تو کہتے تھے کہ بھئی کیا مجھے دیوانہ سمجھا ہے کہ ایسی باتیں کرتے ہو۔ قائم گنج کے جاہل لوگ ایسی باتیں کریں تو خیر لیکن آپ سب تو ماشاء اللہ تعلیم یافتہ ہو۔

قائم گنج کے لوگوں کا آبائی پیشہ سپہ گری رہا ہے۔ انگریزی فوج میں بھی یہاں کے نوجوان اچھی خاصی تعداد میں بھرتی ہوتے تھے۔ چنانچہ پہلی جنگ عظیم میں متعدد نوجوان مارے گئے۔ شوری خاں کے چار جوان کڑیل بیٹے یکے بعد دیگرے فرانس اور عراق کے میدانوں میں کام آئے۔ جب کسی نے مشیر الدین خاں سے اس کا تذکرہ کیا تو ہنسنے لگے۔ کہتے تھے یہ بوڑھیوں کی کہانیاں کسی اور کو سنانا۔ اطلاع دینے والے سے پوچھتے تھے کہ اچھا یہ بتاؤ شوری خاں زندہ ہیں اور ان کے ہوش وحواس ٹھکانے ہیں یا نہیں۔ وہ کہتا کہ شوری خاں زندہ ہیں اور ان کے ہوش وحواس درست ہیں لیکن اس واقعہ نے ان کی کمر توڑ دی ہے۔ اس پر کہتے کہ عقل سلیم یہ باور نہیں کر سکتی کہ شوری خاں کے چار جوان لڑکے مارے

جائیں اور یہ بوڑھا زندہ رہے اور اس کے ہوش وحواس سلامت رہیں۔ قاعدے سے اسے مرجانا چاہئے یا دیوانہ ہوجانا چاہئے۔ اس لئے مجھے جنگ کے متعلق جو بتایا جارہا ہے یہ سب من گھڑت ہے۔ غرض کہ ایسی منطقی بحث کرتے کہ ہم کوئی انھیں قائل نہیں کرسکتا تھا کہ دنیا ایک ہولناک جنگ کی مصیبت میں گرفتار ہے۔ پہلی جنگ عظیم ہوئی بھی اور ختم بھی ہوگئی لیکن انھوں نے یہ بات تسلیم نہیں کی کہ جنگ ہوسکتی ہے۔ جنگ کی ابتدا ان کے دماغی خلل شروع ہونے کے چند مہینے بعد ہوئی تھی اس لئے وہ اس کے وجود سے انکار کرتے تھے اور اس ضمن میں ہر قسم کے عقلی دلائل پیش کرتے تھے۔ اخباروں کی صداقت بھی نہیں مانتے تھے۔ ان کا دماغ ایسا مرتب تھا کہ اس حالت میں بھی جس میں وہ مبتلا تھے دلیل سے انھیں ہرانا آسان نہ تھا۔ ان کا حافظہ اب بھی بلا کا تھا۔ جب کبھی موج میں آتے تو حیدرآباد کے حالات بیان کرتے۔ خاص کر ہم لوگوں سے اپنی علمی دلچسپیوں کا تذکرہ کرتے۔ انھیں فارسی اور اردو کے بلا مبالغہ سیکڑوں شعر یاد تھے۔ خاقانی اور قاآنی کے قصیدے اور سعدی اور حافظ کی غزلیں مسلسل یاد تھیں۔ داغ اور امیر مینائی کی پوری کی پوری ہم طرح غزلیں سناتے اور دونوں استادوں کے اشعار کا موازنہ کرتے۔ داغ کے تغزل کے بڑے مداح تھے۔ تعجب ہے کہ ان کے حافظے پر ان کے دماغی عدم توازن کا کوئی اثر نہ تھا۔

مجھے دو شخصوں کے حافظے پر ہمیشہ رشک آیا۔ ایک تو مشیر الدین خاں کا حافظہ اور دوسرے ڈاکٹر ہادی حسن کا جو کچھ دن جامعہ میں ہم لوگوں کے استاد رہے تھے اور بعد میں مسلم یونیورسٹی میں فارسی زبان وادب کے پروفیسر تھے۔ افسوس ہے دو سال ہوئے علی گڑھ میں ان کا انتقال ہوگیا۔ انھیں سوائے اپنے علمی کام کے اور کسی

چیز سے دلچسپی نہ تھی۔ دونوں کا حافظہ ایسا تھا جیسے دماغ میں ہزاروں فوٹو کھنچے ہوئے موجود ہوں جن کے نقوش وہ جب چاہتے اجاگر کر لیتے۔ ماہر نفسیات کہتے ہیں کہ حافظے کی صلاحیت کسب و اکتساب کی رہین منت ہے اور جن معاملات اور مسائل میں گہری دلچسپی ہوتی ہے ان پر اسی کا انحصار ہے۔ لیکن ایسے حافظے، جیسے کہ میں نے مشیرالدین خاں اور ڈاکٹر ہادی حسن کے دیکھے، قدرت کا عطیہ ہیں۔ جن میں محنت اور ریاضت سے جلا ہوتی ہے۔ میں نے ایسے غیر معمولی حافظے کے لوگ کہیں نہیں دیکھے، نہ ہندوستان میں، نہ باہر۔

قائم گنج کے قیام کے دوران میں ہمارے ہاں جو لوگ شام کو روزانہ پابندی سے آتے تھے ان میں ایک اعجاز نور خاں تھے اور دوسرے دیدار عالم خاں۔ اعجاز نور خاں کا ہماری ددھیال سے تعلق تھا۔ شکل خیل میں بس ان کا اور ان کے چچا کا گھر باقی رہ گیا تھا اور باقی دوسروں نے اور محلے بسا لئے تھے۔ اعجاز نور خاں جنگ کے ختم ہونے پر پنشن لے کر قائم گنج آ گئے تھے۔ وہ تقریباً ساڑھے تین سال فرانس کے محاذ پر رہے اس لئے فرانسیسی زبان بولنے کی اچھی مشق ہو گئی تھی۔ جب وہ فرانسیسی جملے ہم لوگوں کے سامنے بولتے تو پہلے ہمارا یہ خیال تھا کہ شاید وہ ہمیں مرعوب کرنے کے لئے ایسا کرتے ہیں۔ انھیں فرانسیسی آتی واتی خاک نہیں۔ لیکن بعد میں جب میں خود فرانس سے تعلیم حاصل کر کے واپس آیا تو میں نے دیکھا کہ اعجاز نور خاں واقعی اچھی خاصی فرانسیسی بول لیتے تھے۔ ان کا حافظہ اچھا تھا۔ فرانسیسی سپاہیوں میں رہنے سے انھوں نے ان کی زبان سیکھ لی تھی۔ وہ انگریزی بالکل نہیں جانتے تھے اور اردو بھی بس واجبی ہی سی تھی۔ لیکن قدرت نے انھیں غیر زبان سیکھنے کا ملکہ عطا کیا تھا۔ وہ بڑے محنتی اور ذہین تھے۔ ذاتی اپج سے انھوں نے اپنی جائداد کو ترقی دی اور اینٹوں کا بھٹہ لگا کر اس سے خوب کمایا۔ ان کی

پنشن تو غالباً پندرہ بیس روپے تھی لیکن چند سال ہوا جب ان کا انتقال ہوا تو انھوں نے تقریباً ایک لاکھ روپیہ نقد چھوڑا۔ روپیہ سب گھر ہی میں رکھتے تھے اور مال عرب پیش عرب کے اصول کے قائل تھے۔ لاولد مرے اس لئے گورنمنٹ نے نقد رقم پر اپنا قبضہ جمایا۔ اب سنا ہے کہ ان کے عزیزوں میں اس روپیے اور ان کی جائداد کے لئے مقدمہ بازی ہو رہی ہے۔

دیدار عالم خاں ہمارے عزیز تھے۔ ان کا سود کا کاروبار تھا۔ کچھ تھوڑی سی کھیتی باڑی اور باغ باغیچے بھی تھے۔ اگرچہ ان پڑھ تھے لیکن علم مجلسی سے خوب واقف تھے۔ محفل میں جس موضوع پر بھی گفتگو ہو اس میں وہ اپنی رائے ضرور دیتے تھے۔ اس طرح نہیں جیسے بعض لوگ چلتا ؤ رائے دیتے ہیں جب پر انھیں کوئی اصرار نہیں ہوتا۔ اس کے برخلاف دیدار عالم خاں اپنی رائے پورے اعتماد کے ساتھ دیتے تھے۔ بعض لفظوں کے غلط استعمال یا ان کے غلط تلفظ سے تو ان کے ان پڑھ ہونے کا پتہ چل جاتا تھا مگر عام طور پر ان کی باتیں ایسی وزنی اور بچے دار ہوتی تھیں کہ کوئی انھیں جاہل یا ان پڑھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ ان کی گفتگو کے موضوع عام طور پر یہ ہوتے تھے۔ جنگ عظیم میں ترکوں کی شکست کے اسباب، انگریزوں کی فریب کاریاں، زمینداری کی حالت، تجارت وصنعت میں مسلمانوں کی پستی اور اولیاء اللہ کی کرامات فرخ آباد کے پھندن میاں کے بڑے معتقد تھے اور انھیں اس زمانے کا قطب خیال کرتے تھے اور اس پر اصرار تھا کہ دوسرے بھی انھیں اسی طرح مانیں جیسے وہ مانتے ہیں۔ کھانے کے بیحد شوقین تھے۔ شادی یا غمی کی دعوت میں وہ اکیلے کئی آدمیوں کے برابر نوش جان کر لیتے تھے۔ یہ بھی مشہور تھا کہ جوانی میں شرط لگا کر کھاتے تھے۔

انھوں نے ہمیشہ شرط جیتی۔

غلامی کے اندا خاں بھی جوانی میں شرط بد کر کھایا کرتے تھے۔ میں نے جب انھیں دیکھا تو ان کا بڑھاپا تھا۔ گورے چٹے تھے۔ قد چھ فٹ سے کچھ زیادہ ہوگا۔ ان کا گھر ریلوے اسٹیشن کے قریب تھا اس لیے تقریباً روزانہ ٹرینوں پر تماشا دیکھنے جایا کرتے تھے گرمی میں سفید ہیٹ اور جانگیا (نیکر) پہنتے تھے تاکہ ریل کے بابو لوگوں سے بات کریں تو لباس میں ہیٹے نہ رہیں۔ میں نے انھیں کرتا یا قمیص پہنے کبھی نہیں دیکھا۔ سردی میں روئی کی مرزئی، ہیٹ اور نیکر کے ساتھ پہنتے تھے اور گرمی میں اوپر کا جسم اکثر برہنہ رہتا تھا۔ ان کے متعلق مشہور تھا کہ ان کا پیٹ ٹخنوں تک پھیلا ہوا ہے اور چونکہ وہ ٹخنوں تک خالی تھے اس لیے غذا کی بڑی سے بڑی مقدار وہ نوش جان کر جاتے تھے۔

ایک عمر رسیدہ خاں صاحب نے مجھے بتایا کہ ایک دفعہ شرط ہوئی تھی کہ اندا خاں تین گھنٹے کے اندر پانچ چھ سیر کا بھنا ہوا بکرا کھا لیں گے۔ اور شرطوں کی طرح یہ شرط بھی انھوں نے جیت لی۔ اس کی پوری کیفیت خاں صاحب نے جو خود اس موقع پر موجود تھے یوں بیان کی:۔

بھنا ہوا بکرا اسٹینی میں اندا خاں کے سامنے رکھا گیا۔ تماشا دیکھنے والے چاروں طرف مونڈھوں پر بیٹھ گئے اور حقے کا دور چلنے لگا۔ اندا خاں نے اپنی تیز نظروں سے بکرے کے جحم اور وزن کا جائزہ لیا اور بسم اللہ کہہ کر کھلائی شروع کر دی۔ تماشائیوں کی نظریں ان کے دونوں جبڑوں کے اتار چڑھاؤ پر جمی ہوئی تھیں جن کا کام چکی کے پاٹوں کی طرح بلا توقف جاری تھا۔ جبڑوں کی متواتر حرکت، گالوں کی نکیلی ہڈیوں اور ٹھڈی کی اوپر نیچے مسلسل جنبش دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ کھاتے وقت بات مطلق نہ کرتے تھے منھ

لوہار کی دھونکنی کی طرح کھلتا مندتا تھا۔ تنفس کی اضطراری کیفیت کے باعث پھٹے ہوئے نتھنوں میں سے کبھی کبھی سیٹی کی سی آواز نکل جاتی اور گردن کی رگیں تن جاتی تھیں۔ لیجئے، مقررہ وقت سے پندرہ منٹ پہلے بگرا ختم ہو گیا اور اندا خاں نے اشارے سے حقہ طلب کیا۔ چند کش لگائے اور پھر ٹیکی دار مونڈھے پر آنکھیں بند کر کے بیٹھ گئے جیسے جگالی کر رہے ہوں۔

ایسے موقع پر جو ہڈیاں گڈیاں بچ جاتی ہیں وہ کتوں کا حصہ تھا جو تماشائیوں کی طرح پچھلے تین پونے تین گھنٹوں سے آس پاس چکر کاٹ رہے تھے۔ بظاہر معلوم ہوتا تھا کہ وہ بڑے صبر اور امن سے انتظار کر رہے ہیں لیکن پھر ایک دم سے ان کی تیوریاں چڑھ جاتیں۔ ایک دوسرے کو غضب آلود نگاہوں سے دیکھتا، جبڑا کھلتا، باچھیں چر کر کانوں سے باتیں کرنے لگتیں۔ ایک دوسرے پر غرا کر چڑھ بیٹھا، ایک نے دوسرے کو جھنجھوڑا اور دوسرے نے تیسرے کو بھنبھوڑا۔ ایک نے پاس والے کی ٹانگ پکڑی تو دوسرے نے اپنے ساتھی کا ٹینٹوا دبایا۔ جب بہت غل غپاڑہ ہوا تو تماشائیوں میں سے کسی نے اپنا ڈنڈا سنبھالا اور للکار کر ان کی طرف بڑھا۔ سب کتے تتر بتر ہو گئے۔ ایک اِدھر جا ایک اُدھر جا۔ وہ جو ایک خارش کا مارا دبلا سوکھا کتا ہے وہ بڑا ڈھیٹ ہے۔ اپنی جگہ سے ہٹنے کا نام نہیں لیتا۔ ذرا ہٹ گیا اور پھر اپنی جگہ پر آ گیا۔ امن و آشتی کے اظہار کے لئے اس کی دم مستقل طور پر پیچھے کی ٹانگوں کے بیچ میں دبی اٹکی رہتی تھی تاکہ قوی ساتھیوں کو اس کی دائمی مسکینی پر ترس آئے۔ اس کی یہ چال کامیاب رہی، کسی نے اسے نہیں چھیڑا۔

تھوڑی دیر گھوم گھام کے پھر وہیں سب کتوں کا جمگھٹا لگ گیا۔ ایسا محسوس

ہوتا تھا گویا اب کے آپس میں صلح صفائی کر کے آئے ہیں۔ خاموش بیٹھے ہیں۔ نظریں بکرے کی ہڈیوں کی طرف جمی ہوئی ہیں۔ وہاں سے نظر اٹھتی ہے تو ایک دوسرے پر پڑتی ہے۔ اچٹتی ہوئی، مغموم، صلح پسندانہ۔ اب تماشائی ایک ایک کر کے اٹھنے لگے۔ بعض نے اندا خاں کو ان کے کارنامے پر مبارکباد دی۔ بعض ایک دوسرے سے آہستہ سے کہتے ہوئے آگے بڑھے کہ کیا بلا کا ہیٹو ہے۔ صاحب خانہ کے نوکروں نے بکرے کی بچی کھچی ہڈیاں اور ان میں جو تھوڑا بہت گوشت لگا رہ گیا تھا کتوں کے سامنے ڈال دیا۔ اب پھر غراہٹ اور غفش شروع ہو گئی۔ غراتے جاتے اور ہڈیوں پر منھ مارتے جاتے۔ چند سکنڈ میں ہر کتا ایک ایک ہڈی منھ میں دبا پاس کے درختوں میں جا کر بیٹھ گیا اور اس وقت تک ہڈیوں کو چچوڑنے کا شغل جاری رکھا جب تک کہ ان پر گوشت کا ایک ریشہ چمٹا رہ گیا۔

قائم گنج کا قیام۔ محمود میاں اور میں قائم گنج میں دو سال کے لگ بھگ رہے۔ یہاں کا پانی اچھا ہے۔ خوب بھوک لگتا ہے۔ ہم دونوں کی صحت اچھی ہو گئی۔ اگرچہ آرام کرنے کی غرض سے مجھے تعلیم چھوڑنی پڑی تھی لیکن میں نے اس عرصے میں جتنا پڑھا پہلے کبھی نہیں پڑھا تھا۔ قائم گنج میں جو بے پیارے لال کا بہت اچھا کتب خانہ تھا۔ میں کبھی کبھی وہاں جا کر گھنٹوں پڑھتا۔ دوسرا کتبخانہ عبدالحافظ خاں کا کلاں خیل میں تھا۔ یہاں اردو اور فارسی کی کتابیں تھیں جنھیں میں پڑھنے کے لئے مستعار لے آتا۔ عبدالحافظ خاں کے صاحبزادے اسرائیل احمد خاں بھی میری طرح علالت کی وجہ سے تعلیم ترک کر کے قائم گنج آ گئے تھے۔ وہ نہایت ذہین نوجوان تھے۔ پاکیزہ ادبی ذوق رکھتے تھے۔ ان سے اس زمانے میں اکثر ملاقات رہتی تھی۔ کبھی وہ

ہمارے یہاں آتے اور کبھی میں ان کے مکان پر جاتا تھا۔ گفتگو کا موضوع ادب اور سیاست رہتا۔ اسلام کے مستقبل کے متعلق ہم دونوں ہم خیال تھے۔ وہ بھی مولانا ابو الکلام آزاد کے مداحوں میں تھے اور میں بھی۔ میں نے ان کے یہاں سے "الہلال" کی جلدیں لاکر پوری پڑھ ڈالیں۔ میں کبھی سوچتا ہوں کہ ذہانت اور لیاقت کے باوجود اسرائیل احمد خاں نے زندگی میں کوئی ترقی نہیں کی اس کا کیا سبب ہو۔ اس سوال کا جواب یہی ملتا ہے کہ ان میں توازن اور قوت ارادی کی کمی تھی طبیعت میں تھوڑی سی سنک بھی تھی۔ ان کی علالت بھی عجیب تھی۔ کسی کو پتہ نہ لگا کہ آخر ان کا مرض کیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ ان کے اعصاب کمزور ہو گئے تھے جس کی وجہ سے وہ جہاں تھے وہیں رہے۔ عرصے تک حیدرآباد میں ٹیوشن کے ذریعے سے بسر اوقات کرتے رہے۔ تقسیم ملک کے بعد پاکستان چلے گئے۔ وہاں بھی اس حال میں ہیں جس حال میں یہاں سے گئے تھے۔ ان کی ذہنی ترقی بھی جہاں رک گئی تھی وہیں رکی رہی بلکہ اس میں ادعا پسندی نے راہ پالی۔ جو ذہنی ترقی کی سب سے بڑی دشمن ہے۔

حسین بوڑھے | قائم گنج کے قیام سے میں قصباتی زندگی کے مسائل کو تھوڑا بہت سمجھنے لگا ورنہ اب تک میری معلومات اسکول کی چار دیواری تک محدود تھیں۔ محمود میاں کو مجھ سے زیادہ قائم گنج میں رہنے کا موقع ملا تھا۔ اس لئے وہ وہاں کے طور طریقوں رسم و رواج اور اشخاص کے متعلق زیادہ معلومات رکھتے تھے۔ قائم گنج میں رہ کر مجھے بھی یہاں کے مسائل کے متعلق کچھ سوجھ بوجھ پیدا ہو گئی۔ ہم دونوں شادی اور غمی کی محفلوں میں شریک ہوتے تھے، جہاں بہت سے ایسے پٹھانوں کو دیکھنے اور ملنے کا موقع ملا جن سے ہم پہلے واقف نہ تھے یا صرف انھیں نام سے جانتے تھے۔ اب

سے تقریباً نصف صدی قبل میں نے قائم گنج کی محفلوں میں ایسے بوڑھے اور جوان دیکھے جن کی صورتیں میرے حافظے میں ہو بہو بلا کم و کاست محفوظ ہیں۔ جس طرح جوانی اپنا حسن رکھتی ہے اسی طرح بڑھاپے کا بھی خاص حسن ہے۔ میں نے ان محفلوں میں ایسے شان دار، وجیہہ اور حسین بوڑھے دیکھے جن کی مثال مجھے کہیں اور نظر نہیں آئی۔ انھیں یا تو فوج سے پنشن مل رہی تھی یا زمینداری کی تھوڑی سی بہت آمدنی تھی۔ بال بچوں کی ذمہ داریاں پوری ہو چکی تھیں۔ اب سارا وقت گھر کے چھوٹے موٹے کام کاج میں یا یادِ الٰہی میں صرف ہوتا تھا۔ دلوں میں اطمینان تھا۔ چہروں پر بھی طمانیت اور سکون نمایاں تھا۔ حرکات و سکنات میں تمکین و وقار۔ مجال ہے کہ ان سے کوئی چھچھوری یا اوچھی بات ظہور میں آئے۔ ہر بات میں صداقت اور وزن تھا۔ ان میں بعض ایسے تھے جن کی داڑھی تو سفید براق تھی لیکن چہرہ سرخ و سفید تھا۔ عمر ستر سے اوپر تھی لیکن رخساروں پر چکنائی نظر آتی تھی۔ بعض ایسے بھی تھے جو بالکل پک گئے تھے۔ سماعت اور بصارت جواب دے چکی تھی۔ بشتم بشتم زندگی گذار رہے تھے جیسے اپنے اور دنیا کے لئے بوجھ ہوں۔

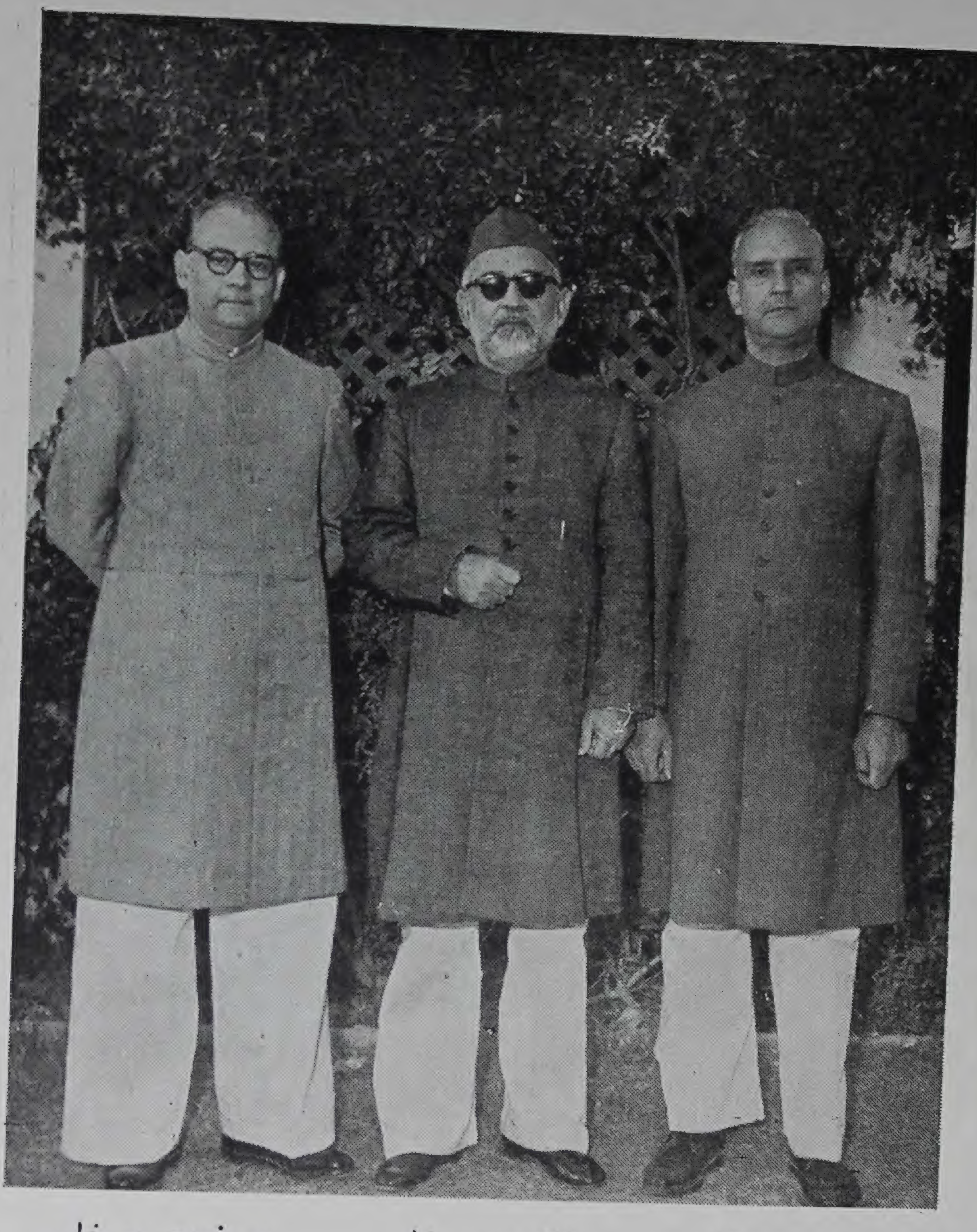
خوبصورت جوان ان محفلوں میں جو جوان نظر آتے تھے ویسے جوان پھر دیکھنے میں نہ آئے۔ اکثر و بیشتر زمینداروں کے لڑکے تھے۔ گھر میں خدا کا دیا سب کچھ تھا۔ ورزش کا شوق تھا۔ کسرت کر کے جسم کو خوبصورت بنانے کا شوق قائم گنج کے نوجوانوں کی قدیم روایات میں شامل تھا۔ اس طرح وہ محنت و مشقت کے عادی بنتے۔ ورزش انھیں بہت سی برائیوں سے بچاتی تھی۔ یہ بھی ہے کہ اس زمانے میں کھاتے پیتے نوجوانوں کو جو مواقع حاصل تھے وہ آج نصیب نہیں۔

خالص دودھ، خالص گھی، عمدہ گوشت سب میسر تھا۔ بھرپور بے فکری۔ گیہوں اور دالیں سال بھر کے لئے گھر کے کھیتوں میں ہو جاتی تھیں۔ دودھ گھی بھی گھر ہی کا ہوتا تھا۔ ہاں گوشت باہر سے خریدنا پڑتا تھا۔ میں کیا بتاؤں قائم گنج کے گوشت میں کیا مزہ تھا۔ میں نے اپنی عمر میں اتنا عمدہ اور لذیذ گوشت نہیں کھایا۔ معلوم نہیں گنگا کے کنارے کی گھاس میں ایسے کیمیاوی عناصر ہیں جو یہ مزہ پیدا کرتے ہیں یا اور کوئی وجہ ہے۔ اسی طرح گھی اور دہی میں جو مزہ تھا وہ بھی پھر کہیں نہ ملا۔ مزے اور خوشبو کی یاد بڑی دیرپا ہوتی ہے۔ سردی کی شروعات ہے۔ صبح ناشتے میں کھچڑی اور اس کے ساتھ دانے دار گھی اور روٹی جیسی موٹی بالائی والا دہی' اس کا مزہ میں کبھی نہیں بھول سکتا۔ اس کی اشتہا انگیز خوشبو، سوندھا پن کوئی کیسے بھول سکتا ہے۔ چکناہٹ سے اس کی اوپر کی تہہ پر گھی کی بوندیں تھوڑی تھوڑی دور پر ایسی لگتی تھیں جیسے جوش نمو میں جامے سے باہر نکلی پڑتی ہوں۔ گوشت کو بڑی ہنرمندی سے کاٹتے تھے۔ بوٹیاں برفی کی قاشیں معلوم ہوتی تھیں۔ اب سے چالیس پچاس سال پہلے نوجوانوں کو جو کھانے کو ملتا تھا وہ آج کسی کو میسر نہیں، چاہے کوئی کتنا خرچ کرے۔ نوجوانوں کی زندگی میں سادگی تھی۔ ان کی ضرورتیں محدود تھیں۔ طبائع میں قناعت تھی۔ غیرت تھی، جو انسان کو اپنی عزت کرنا سکھاتی ہے۔

قائم گنج کے نصف صدی قبل کے نوجوانوں کی ظاہری سج دھج اور وضع قطع بھی جاذب نظر تھی۔ سرخ و سفید رنگ، چوڑا سینہ، پتلی شیر کی سی کمر، بنے ہوئے ڈنڈ، سر پر رنگین صافہ۔ عام طور پر پاجامہ پہنتے تھے جو نہ تو تنگ چوڑی دار ہوتا نہ ڈھیلا ڈھالا غرارہ لکھنوی انداز کا۔ کہنا چاہئے کہ علیگڑھی پتلون نما پاجامے کو ذرا

تنگ مہری کر دیا جائے تو اس سے مشابہ ہوتا تھا۔ بعض کسرتی جسم والے نوجوان دھوتی پہنتے تھے تاکہ اس میں سے سڈول پنڈلیاں نظر آئیں۔ پنڈلیوں کی نمایش کے لیے ان کے بال مونڈتے تھے جس طرح گردن کی نمایش کے لئے سر کے بال مونڈے جاتے تھے۔ بعض تہمد باندھتے تھے۔ بانک، بنوٹ، لکڑی شاید ہی کوئی ہو جو نہ جانتا ہو۔ بچپن ہی میں یہ فن سکھائے جاتے تھے۔ تیتروں اور مرغوں کی پالیاں ہر محلے میں کسی نہ کسی آم کے باغ میں ہوتی تھیں۔ بعض شوقین ایسے تھے جنھوں نے گولکنڈہ کے اصیل مرغ منگوائے تھے۔ یہ مرغ پیلے رنگ کے، اونچے، لمبی لمبی ٹانگوں کے ہوتے تھے جن کے خار دور سے دکھائی دیتے تھے۔ ان میں گوشت کم اور پٹھے زیادہ نمایاں ہوتے تھے۔ میں نے دیکھا کہ ان کے سامنے خوب موٹے تازے، بھاری بھرکم مرغ چین بول جاتے تھے۔ ایک ٹنگڑی جھپٹ کر ماری کہ فَفرّو۔ ایسا لگتا جیسے پالی تھرتھرا اٹھی ہو۔ مالک ہیں کہ پیچھے پیچھے دوڑے پھر رہے ہیں۔ بڑی دور جا کر ہاتھ آئے۔ جو مقابلے پر آتے وہ لہولہان ہو جاتے اور بالآخر یا تو دم دبا کر بھاگ کھڑے ہوتے یا وہیں دبک کر بیٹھ جاتے کہ دشمن ان کی مسکینی اور عجز پر رحم کھائے۔ ایسی حالت میں اصیل مرغ اسے اپنی شان کے خلاف سمجھتا تھا کہ شکست کھائے ہوئے دشمن کو ٹونگیں مارے یا اسے چھیڑے۔ بڑی شان استغنا سے پٹا نکال کر ٹہلنے لگتا۔ نہ گھبراہٹ، نہ پریشانی، نہ جھنجھلاہٹ۔ مالک نے بلایا تو اس کی گود میں جا کر بیٹھ گیا۔

مجھ سے چھوٹے بھائی جعفر کا کم عمری ہی میں انتقال ہو گیا تھا۔ ہماری والدہ کو اپنے سات بیٹوں میں ایک جعفر کا داغ اپنی زندگی میں دیکھنا پڑا۔ چند سال میں اگر وہ تین جوان بیٹوں کو یکے بعد دیگرے نذرِ اجل ہوتے دیکھتیں تو میں نہیں کہہ سکتا کہ



محمود حسین خان　　ذاکر حسین خان　　یوسف حسین خان

۱۹۴۶ء

ان کی کیا حالت ہوتی۔

محمود میاں | ہمارے سب سے چھوٹے بھائی محمود حسین خاں ہیں۔ یہ والد کے انتقال کے چھ ماہ بعد قائم گنج میں پیدا ہوئے۔ قائم گنج میں ہمارے سب سے بڑے بھائی مظفر حسین خاں اور سب سے چھوٹے محمود میاں پیدا ہوئے، باقی ہم پانچ کی پیدایش حیدر آباد کی ہے، بیگم بازار والے مکان کی۔ والدہ کے انتقال کے بعد محمود میاں کی پرورش چچی نے کی۔ ۱۹۱۹ء میں جب میں بیمار ہو کر قائم گنج آگیا تو انھیں قائم گنج کے جارج اسکول میں داخل کرا دیا۔ پھر بعد میں وہ میرے ساتھ ۱۹۲۱ء میں جامعہ ملیہ میں آگئے۔ جب وہ جامعہ ملیہ کے اسکول میں تھے تو انھوں نے ایک دستی اخبار "جوہر" نکالا تھا جو کئی سال تک نکلتا رہا اور طالب علموں میں بہت مقبول ہوا۔ اس میں جامعہ کی خبروں کے علاوہ طلبا کے مضمون بھی شائع ہوتے تھے۔ جامعہ کالج سے ۱۹۲۸ء میں وہ جرمنی چلے گئے۔ ہائیڈل برگ میں ساڑھے تین سال رہ کر وہاں سے ڈاکٹریٹ کی سند حاصل کی۔ واپسی پر ۱۹۳۲ء میں ڈھاکہ یونیورسٹی میں ریڈر کی حیثیت سے ان کا تقرر ہوگیا۔ پھر وہیں وہ تاریخ کے پروفیسر اور صدر شعبہ مقرر ہوئے۔ ملک کی تقسیم کے بعد وہ ڈھاکہ سے کراچی چلے گئے اور کراچی یونیورسٹی میں تاریخ کے پروفیسر اور صدر شعبہ مقرر ہوئے۔ کراچی یونیورسٹی سے اپنا تعلق برقرار رکھتے ہوئے وہ تھوڑے عرصے کے لئے وزیر بھی رہے۔ انھوں نے اس عرصے میں ایک بڑا کام کیا، یعنی کراچی سے دس میل کے فاصلے پر انھوں نے جامعہ قائم کی جس میں اعلیٰ تعلیم کا پورا انتظام ہے۔ یہاں نصاب تعلیم وہی رکھا ہے جو کراچی یونیورسٹی میں ہے۔ مجھے تعجب ہے کہ اتنے تھوڑے عرصے میں انھوں نے اپنی جامعہ کے لئے اس قدر شاندار اور

وسیع عمارتیں کیسے بنوائیں جنھیں دیکھے بغیر اس کا اندازہ نہیں ہوتا کہ اتنا بڑا کام تکمیل کو پہنچا ہے۔ یہ ان کی نیک نیتی، ارادے کی مضبوطی اور حوصلہ مندی کا نتیجہ ہے۔

محمود میاں کئی سال تک ڈھاکہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر رہے۔ انھیں اساتذہ اور طلبا میں یکساں مقبولیت حاصل تھی۔ بعض پالیسی کے معاملات میں حکومت سے اختلاف کی بنا پر وہ ۲ دو سال ہوئے مستعفی ہو گئے اور کراچی یونیورسٹی میں تاریخ کے پروفیسر کی حیثیت سے واپس آگئے۔ محمود میاں مرنجاں مرنج شخصیت رکھتے ہیں ان کا علمی ذوق بھی اعلیٰ درجہ کا ہے۔ انھوں نے ٹیپو سلطان کے فوجی نظام پر ایک کتاب شائع کی ہے۔ وہابی تحریک پر بھی وہ عرصے سے کام کر رہے ہیں اور علمی رسالوں میں انھوں نے اپنی تحقیقات شائع کی ہیں۔ بعد میں ان مقالوں کو ملا کر مستقل تصنیف کی شکل دینے کا قصد ہے۔ محمود میاں کو سیاسی زندگی میں ترقی کے مواقع حاصل تھے لیکن انھوں نے تعلیمی میدان کو ترجیح دی جس سے ان کی سلامتی طبع اور علم دوستی ظاہر ہوتی ہے۔

چوتھا باب (۴)

فخرِ خاندان

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

پہلی جنگ عظیم خدا خدا کر کے ختم ہوئی۔ بڑی تباہ کاریوں اور بربادیوں کے بعد۔ انسانی تاریخ میں یہ جنگ بڑی ہی انقلاب آفریں ثابت ہوئی۔ پریسیڈنٹ ولسن نے معاہدۂ ورسائی میں قوموں کی خود اختیاری کے حق کو منوا لیا۔ سامراجی ملکوں کو بھی اتنی ہمت نہیں ہوئی کہ اس حق سے انکار کر دیں یا اسے ناحق ٹھہرائیں۔ انھوں نے اسے ماننے کو تو مان لیا لیکن اندر اندر اپنی ریشہ دوانیاں جاری رکھیں تاکہ جہاں تک بن پڑے سامراجی مفاد کو بچایا جائے۔ خود اختیاری کا یہ حق بظاہر وسط یورپ کی قوموں کے لئے تھا جو صدیوں سے آسٹریا ہنگری کی سامراجی قوت کے تلے دبی پڑی تھیں۔ عربوں کو بھی ترکوں کی شہنشاہی سے آزاد کرنا تھا، ان ملکوں کی دیکھا دیکھی ہندوستان، مصر اور دوسرے ایشیائی ملک بھی آزادی کے دعویدار ہو گئے اور قومیت کے جذبے کو ہر کہیں فروغ حاصل ہوا۔ ان سب

ملکوں میں سامراجی حکومتوں کے خلاف زبردست سیاسی تحریکیں شروع ہوگئیں جن کا نتیجہ ان ملکوں کی آزادی کی شکل میں کچھ عرصے بعد رونما ہوا۔

ترک موالات اور خلافت کی تحریکیں

ہندوستان میں جنگ عظیم کے دوران میں مسز اینی بسنٹ کی ہوم رول کی تحریک نے ملک کے تعلیم یافتہ طبقے میں آزادی کی خواہش پیدا کر دی تھی لیکن عوام ابھی بے حس و حرکت تھے۔ انگریزی حکومت کی بوکھلاہٹ نے ہندوستان کی سیاست میں وہ کام کر دیا جو معمولی حالات میں شاید صدیوں میں نہ ہوتا۔ جلیان والا باغ کے قتل عام نے پورے ملک میں آزادی کا صور پھونک دیا۔ بجھے ہوئے دلوں میں آزادی کی امنگ نے جنم لیا۔ جنگ کے خاتمے پر انگریزوں نے ترکوں کے ساتھ جو سلوک کیا اس سے ہندوستان کے مسلمانوں میں انگریزی سامراج کے خلاف نفرت کا جذبہ ابھر آیا اور خلافت کی تحریک نے ملک کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک مسلمانوں کو جھنجھوڑ کر غفلت کی نیند سے بیدار کر دیا۔ اس تحریک کے روح رواں مولانا محمد علی مولانا شوکت علی اور مولانا ابوالکلام آزاد تھے۔ حکیم اجمل خاں اور ڈاکٹر انصاری بھی اس تحریک کے لیڈروں میں تھے۔ مہاتما گاندھی نے ترک موالات کی آواز بلند کی تو خلافت کے تحریک کے سب حامی ان کے یار و مددگار بن گئے ان کی بدولت ملک کی آزادی کی تحریک میں جان پڑ گئی۔ یہ تحریک اب دستوری احتجاج کے دائرے سے باہر نکل انقلاب کی وسیع فضا میں پھیل گئی۔ لوگوں کے دلوں میں نیا جوش، نیا ولولہ اور نیا عزم پیدا ہو گیا جس کی مثال پہلے نہیں ملتی۔ اس تحریک کا ایک جز یہ تھا کہ طلبا اسکول اور کالج چھوڑ کر آزادی حاصل کرنے کے لئے قومی خدمت کو اپنا مقصد قرار دیں۔ مولانا محمد علی اور دوسرے لیڈروں نے ترک موالات کا

پیغام اکتوبر ۱۹۲۰ء میں علی گڈھ کے طلبار کو پہنچایا۔ ڈاکٹر ضیار الدین وائس چانسلر نے طلبار کے قائدوں کو ملانے کی پوری کوشش کی تاکہ وہ ترک موالات کے اثر سے محفوظ رہیں۔ ڈاکٹر ضیار الدین نے ذاکر میاں کو ولایت کے لئے اسکالرشپ کا لالچ دیا۔ یوپی کے صدر بورڈ آف ریونیو مسٹر فری منٹل نے سرکاری ملازمت کا سبز باغ دکھایا لیکن جب انھوں نے فیصلہ کر لیا کہ انھیں اس تحریک میں ملک و قوم کی خاطر حصہ لینا ہے تو پھر کسی کی کوئی تدبیر ان کی رائے بدلنے میں کامیاب نہ ہوئی۔ ذاکر میاں ان طلبار کے قائد تھے جو مولانا محمد علی کی سرکردگی میں اولڈ بوائیز لاج سے پولیس کی مدد سے نکلوائے گئے۔ ان طلبار کو اصرار تھا کہ انھیں آزاد فضا میں اپنی تعلیم جاری رکھنے کا موقع ملنا چاہیئے چنانچہ قوم کے سربرآوردہ اصحاب نے فیصلہ کیا کہ ایک قومی تعلیمی ادارہ قائم کیا جائے جس کا نام جامعہ ملیہ اسلامیہ (نیشنل مسلم یونیورسٹی) ہوگا۔ نیشنل اس اعتبار سے کہ اس کی جڑیں قومی زندگی کی گہرائیوں میں سرایت کئے ہوئے ہوں اور مسلم اس لحاظ سے کہ وہ اسلامی تعلیم و تمدن سے اپنی قوت اور تازگی حاصل کرے گا۔

جامعہ ملیہ کا قیام

۲۹ر اکتوبر ۱۹۲۰ء کو جامعہ ملیہ اسلامیہ کے قیام کا اعلان ایم۔اے۔او کالج کی جامع مسجد میں ہوا۔ مولانا محمود الحسن کے متبرک ہاتھوں سے اسکی تاسیس کی رسم ادا ہوئی۔ مولانا محمود الحسن علالت کی وجہ سے بہت کمزور اور ناتوان تھے۔ ان کے شاگرد رشید مولانا شبیر احمد عثمانی نے ان کا خطبہ پڑھا جس کے چند اقتباس یہاں درج کئے جاتے ہیں:۔

"اے نونہالانِ وطن۔ جب میں نے دیکھا کہ میرے درد کے غمخوار (جس سے میری ہڈیاں پگھلی جارہی ہیں) مدرسوں اور خانقاہوں میں کم اور اسکولوں اور کالجوں

میں زیادہ ہیں تو میں نے اور میرے چند مخلص احباب نے ایک قدم علی گڑھ کی طرف بڑھایا اور اس طرح ہم نے ہندوستان کے دو تاریخی مقاموں (دیوبند اور علی گڑھ) کا رشتہ جوڑا۔

کچھ بعید نہیں کہ بہت سے نیک نیت لوگ میرے اس نعرہ پر نکتہ چینی کریں اور مجھ کو اپنے مرحوم بزرگوں کے مسلک سے منحرف بتلائیں لیکن اہلِ نظر جانتے ہیں کہ جس قدر میں بظاہر علی گڑھ کی طرف آیا ہوں اس سے کہیں زیادہ علی گڑھ میری طرف آیا ہے..... مجھے لیڈروں سے زیادہ ان نونہالانِ وطن کی ہمت بلند پر آفریں اور شاباش کہنا چاہئے جنھوں نے اس نیک مقصد کی انجام دہی کے لئے اپنی ہزاروں امیدوں پر پانی پھیر دیا اور باوجود ہر قسم کی طمع اور خوف کے وہ موالاتِ نصاریٰ کے ترک پر نہایت مضبوطی اور استقلال کے ساتھ قائم رہے اور عزیز زندگیوں کو ملت اور قوم کے نام پر وقف کر دیا"

جامعہ کے مقاصد کی نسبت مولانا محمود الحسن نے ان الفاظ میں ذکر فرمایا:۔

"مسلمانوں کی تعلیم مسلمانوں کے ہاتھ میں ہو اور اغیار کے اثر سے مطلقاً آزاد۔ کیا باعتبار عقائد و خیالات اور کیا باعتبار اخلاق و اعمال، ہم غیروں کے اثرات سے پاک ہوں اور ہماری عظیم الشان قومیت کا اب یہ فیصلہ نہ ہونا چاہئے کہ ہم اپنے کالجوں سے بہت سستے غلام پیدا کرتے رہیں بلکہ ہمارے کالج نمونہ ہونے چاہئیں بغداد اور قرطبہ کی یونیورسٹیوں کے اور ان عظیم الشان مدارس کے جنھوں نے یورپ کو اپنا شاگرد بنایا اس سے پیشتر کہ ہم اس کو اپنا استاد بناتے"

مولانا محمود الحسن کا یہ خطبہ ہندوستان کے مسلمانوں کی تعلیمی تاریخ میں یادگار رہے گا۔

اس کی نسبت ذاکر میاں نے پچیس سال بعد جامعہ کی سلور جوبلی کے موقع پر ان الفاظ میں ذکر کیا:۔

"مجھے وہ وقت یاد ہے اور میرے متعدد ساتھیوں کو بھی، جب علی گڑھ کالج کی مسجد میں ایک وجود مقدس قید جلاوطنی، علالت اور تفکرات ملی نے جس کی ہڈیاں گھلادی تھیں جس کے چہرے کی زردی سے معلوم ہوتا تھا کہ غم کی آنچ نے خون کا ایک ایک قطرہ خشک کر دیا ہے، جس کی روشن آنکھیں اس یقین کی غمازی کر رہی تھیں کہ اگرچہ سب کچھ بگڑا ہوا دکھائی دیتا ہے لیکن مردوں کی طرح ہمت کی جائے تو مدد خداوندی سے بہت کچھ بن سکتا ہے۔ یہ وجود مقدس دیوار کا سہارا لئے بیٹھا ہے۔ ناتوانی کے باعث مجمع کو مخاطب بھی نہیں کر سکتا اور اس کا پیام اس کے شاگرد مولانا شبیر احمد عثمانی سناتے ہیں۔ صاحبو یاد رہے کہ وہ جس دیوار کا سہارا لئے بیٹھے تھے وہ خالی اینٹ پتھر کی دیوار نہ تھی۔ وہ ایمان محکم اور اس ایمان کے نتیجے یعنی ایک عظیم الشان ملی ماضی کی دیوار تھی اور وہ نہ صرف ان نوجوانوں کو مخاطب فرما رہے تھے جو ان کے سامنے تھے، ان کا روئے سخن قوم کی ساری آنے والی نسلوں کی طرف تھا۔ اس وقت کسی مکان کا سنگ بنیاد نہیں رکھا گیا تھا۔ کسی عمارت کا افتتاح نہ ہو سکا تھا۔ چندوں کا اعلان بھی نہ ہوا تھا کہ یہ قافلہ سر و سامان چھوڑ کر بے سروسامانی کی طرف رواں ہو رہا تھا۔ یہ وقتی فائدے کے بدلے وقتی نقصان کا سودا کر رہا تھا۔ اسے عاجلہ کے مقابلے میں آخرہ زیادہ عزیز تھی۔ وہ محنت اور مشقت کا عزم لیکر تعمیر نو کے لئے نکلا تھا اور اس کی کلفتوں اور محنتوں کو دوسری سہولتوں اور تن آسانیوں سے زیادہ عزیز رکھنا چاہتا تھا۔ یوں اور اس فضا میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کا کام شروع

ہوا تھا، ۲۹ر اکتوبر ۱۹۲۰ء کو۔"

مولانا محمد علی اور جامعہ | جامعہ کی ابتدا شدید دینی جذبے کے سایہ میں ہوئی۔ ایم اے۔ او کالج کے آسایش اور آرایش والے کمرے چھوڑکر نوجوانوں نے انتہائی بے سروسامانی کی حالت میں ایک دو دن نہیں مہینوں پر مہینے کاٹ دیئے۔ علی گڑھ کے طلبا رکو اپنی مادرِ علمی سے محبت نہیں، عشق تھا۔ یہاں کے درودیوار کو دیکھ دیکھ کر جن کی ہر اینٹ میں ماضی کی داستانیں اور حوصلہ مندیاں خوابیدہ تھیں، ان کے ذہن و تخیل کی پرورش ہوتی تھی۔ جب یہ درو دیوار روح کے لئے قیدخانہ بننے لگے تو خود علی گڑھ کے فرزندوں نے انھیں ڈھادینے کا قصد کیا۔ وہ اپنے دلوں کی بستی کو آباد کرنے کے لئے اسے ویران کرنے پر آمادہ ہوگئے۔ کرشنا آشرم کے صحن میں خیموں کی قطاریں لگی ہوئی ہیں مولانا محمد علی نے جو جامعہ کے پہلے پرنسپل تھے، انھیں خیموں میں اپنے درس کا سلسلہ شروع کیا۔ ان درسوں کا موضوع تھا "اسلام اور اسلامی زندگی" جب بولتے تو فصاحت و بلاغت کا دریا بہادیتے۔ گھنٹہ دو گھنٹے، چار چار گھنٹے متواتر تقریر کا سلسلہ جاری رہتا۔ سننے والے ہیں کہ کوئی اپنی جگہ پر ٹس سے مس نہیں ہوتا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے ان کے سننے سے سیری ہوتی ہی نہیں۔ صبح ناشتے کے بعد درس کا سلسلہ شروع ہوتا تو ڈیڑھ دو بج جاتے۔ لیکچر دینے والے اور لیکچر سننے والے ایسا لگتا جیسے کسی اور ہی دنیا میں ہوں۔ یہ دنیا بلند مقاصد کی دنیا تھی۔ مولانا محمد علی لکچر کے دوران میں اقبال کی اسرار خودی اور رموز بے خودی کے اشعار کی توضیح کرتے۔ لڑکے ہیں کہ نوٹ لکھ رہے ہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ مولانا نے جو فرمایا اس میں سے کچھ رہ جائے۔ لفظ بہ لفظ نقل کرنے کی کوشش کرتے۔ لکچر کے بعد آپس میں مقابلہ کرکے اپنے اپنے نوٹ مکمل کرلیتے۔ بعض طلبا زود نویس

تھے جن کی تحریروں کی بڑی مانگ ہوتی۔ ہر ایک کی یہ کوشش تھی کہ مولانا کی تقریر میں سے ایک لفظ بھی نہ چھوٹ جائے۔

مولانا محمد علی کا بولتے بولتے گلا پڑجاتا اور کبھی کبھی آنکھوں سے آنسو رواں ہوجاتے ان کے دینی جذبے کا اخلاص غیر مشتبہ تھا، اس لئے ان کی ہر بات دل پر اثر کرتی تھی۔ مولانا کی تعلیم و تربیت سے ہر نوجوان میں ایک نیا عزم، نیا ولولہ اور نیا دینی احساس بیدار ہوگیا۔ ان کی اندرونی زندگی میں اخلاقی نشو و نما کی ایک خاص لگن پیدا ہو گئی جس کی مثال ملنی دشوار ہے۔ مولانا کے درسوں کا ایک نتیجہ یہ نکلا کہ نوجوان قرآن کی طرف متوجہ ہو گئے، جیسے کوئی مدتوں سے بھولی ہوئی نعمت ہاتھ آگئی ہو۔ صبح فجر کی نماز کے بعد پابندی سے قرآن کی تلاوت ہوتی۔ ترجمے اور تفسیریں پڑھی جاتیں۔ نماز او روزے کی پابندی خوش دلی سے کی جاتی نہ کہ جرمانے کے ڈر سے۔ ان سب باتوں میں چاہے کسی کو رومانیت نظر آئے لیکن ان کا اخلاص غیر مشتبہ ہے جس سے نوجوانوں کی سیرت کی تشکیل ہوتی ہے۔ اس دینی جذبے کا مقصد نمائش نہ تھا بلکہ اپنی ذات کی اصلاح اسلامی تعلیم کے ذریعے۔ بعض نوجوان جو ایم۔ اے۔ او۔ کالج میں ہمہ غم کے اصول کے ماننے والے کھلنڈرے مشہور تھے راتوں کو اٹھ کر نمازیں پڑھتے اور مسجدوں میں گڑگڑاتے۔ یہ منظر مسلمان نوجوانوں کی اجتماعی زندگی میں بھلا کاہے کو پھر کبھی دیکھنے میں آئے گا۔

حکیم اجمل خاں اور جامعہ | جامعہ کے نصب العین میں ایسی جاذبیت تھی کہ مولانا محمد علی کے علاوہ ملت کے دوسرے زعمانے بھی اس ادارے کے لئے اپنی خدمات پیش کر دیں۔ حکیم اجمل خاں جامعہ کے پہلے امیر مقرر ہوئے۔ مزاج کے لحاظ سے وہ مولانا محمد علی

کی ضد تھے۔ خاموش، متوازن نہایت سنجیدہ اور متین۔ ان کی ہر بات نپی تلی ہوتی تھی۔ فاؤنڈیشن کمیٹی کے صدر کی حیثیت سے جامعہ کے اخراجات کی تکمیل ان کے ذمے تھی۔ ۱۹۲۱ء میں جو پہلا جلسۂ تقسیم اسناد ہوا اس کی صدارت کرتے ہوئے حکیم صاحب نے فرمایا:۔

"ہم نے اصولی حیثیت سے تعلیم کو صحیح شاہراہ پر ضرور ڈال دیا ہے اور جہاں ہم نے سچے مسلمان پیدا کرنے کی تدابیر اختیار کیں وہاں اس بات کو بھی نظر انداز نہیں کیا ہے کہ تعلیم و تربیت میں ماحول کا بہت بڑا اثر ہوتا ہے اور اسلامیت کے ساتھ وطن کی خدمت کا جذبہ پیدا کرنا بھی ہمارے پیش نظر ہے۔ چنانچہ اس امر کا خاص طور پر لحاظ رکھا گیا ہے۔ جہاں ہندو طلبار کے لئے بہت سے اسلامی معاملات پر معلومات حاصل کرنا ضروری ہے وہاں مسلمان طلبا بھی اہم ہندو رسوم اور ہندو تہذیب و تمدن سے ناآشنا نہ رہیں گے ایک متحدہ ہندوستانی قومیت کی اساس محکم اسی باہمی تفہیم وتفہم پر منحصر ہے۔

"میں تمھیں مبارک باد دیتا ہوں کہ اس پرآشوب زمانے میں جس سے ہماری قوم اور ہمارا ملک اس وقت گذر رہا ہے تم نے اس قدر پامردی اور بلند حوصلگی سے کام لیا۔ میں ان تکالیف سے واقف ہوں جو تمھیں اکثر اٹھانی پڑیں۔ میں تم سے اکثر کی مالی مشکلات سے بھی آگاہ ہوں اور میں اس برے سلوک سے بھی بے خبر نہیں جو تم میں سے اکثر کو اپنے اعزہ کے ہاتھوں جھیلنا پڑا ہے۔ لیکن صد آفریں ہو تم پر اور تمھاری ہمتوں پر کہ تم امتحانوں میں پورے اترے۔ تم میں سے بہت سے آج جیل خانوں کی صعوبتیں برداشت کر رہے ہیں۔ لیکن یاد رکھو یہ سب مصیبتیں چند روزہ ہیں۔ اگر تم اپنے اعلیٰ مقاصد اور ارادوں پر قائم رہے تو یہ تمام مشکلیں سہل ہو جائیں گی تم جانتے

ہو کہ انسان کے لئے دنیا میں حقیقی مسرت اور شادمانی کا وجود اس وقت ممکن ہے جب اس کے مقاصد میں رفعت، اس کے خیالات میں علو اور اس کے مطمح نظر میں وسعت ہو۔ وہ اپنے دل کے اندر نوع انسان کی محبت کے جذبۂ صادقہ کے لئے جگہ رکھتا ہو اور دنیا میں باطل کے فنا اور حق کے قیام کو اپنے وجود کی غایت جانتا ہو۔ اس کے مقاصد کی بلندی اور اس کے مساعی کا خلوص اسے مادی علاقوں سے ایک گونہ بے نیاز کر دے جہاں مادی ذرائع کی کمی ایک پست ہمت آدمی کے لئے سنگ راہ کا کام کرتی ہو وہاں اس کے لئے ان کا نہ ہونا گویا اس کی حریتِ نفس اور آزادیِ فکر کی راہ سے رکاوٹوں کا ہٹ جانا ہوتا ہے۔ وہ جب اپنی منزل کی پُرخطر اور مُشکل راہ پر اقلل من الدنیا کی سمجھ شماری کرتا ہوا گامزن ہوتا ہے تو اس ساز و سامان کا بار اس کی دشواریوں میں اضافہ کرنے کے لئے موجود نہیں ہوتا۔ تم میں سے اکثر پر میرے کلمات صادق آتے ہونگے اور تم اپنی بے سرو سامانی کے باوجود اپنے ضمیر کے اطمینان اور اپنی روح کی آزادی پر جس قدر فخر کرو بجا ہے۔"

حکیم صاحب کے ذاتی تعلقات اس قدر وسیع تھے کہ وہ کہیں نہ کہیں سے جامعہ کے اخراجات کی تکمیل کے لئے روپیہ لے آتے تھے۔ جامعہ والوں کو اس کا پتہ بھی نہیں چلتا تھا کہ وہ کہاں سے لاتے ہیں۔ شروع شروع میں جامعہ کے اخراجات کی کفالت مرکزی خلافت کمیٹی کرتی تھی لیکن کچھ دنوں بعد اکیلے حکیم صاحب کا دستِ غیب جامعہ والوں کی دست گیری عرصے تک کرتا رہا۔

عبد المجید خواجہ کی پرنسپلی | کراچی کے مقدمہ کے بعد مولانا محمد علی جیل بھیج دیئے گئے اور عبد المجید خواجہ ان کی جگہ جامعہ کے پرنسپل مقرر ہوئے۔ انھوں نے جامعہ کی سیاسی

فضا کو تعلیمی فضا میں تبدیل کرنے کا اہم فریضہ ادا کیا جس کے لئے جامعہ کی تاریخ میں ان کا نام یاد رہے گا۔ وہ بڑے دریا دل اور سیر چشم تھے۔ قومی کاموں میں بے دریغ خرچ کرتے تھے۔ جامعہ پر ان کا سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ ذاکر میاں کے ۱۹۲۲ء میں جرمنی جانے کے بعد انھوں نے ان کی واپسی تک (جو ۱۹۲۶ء میں ہوئی) جامعہ کو سنبھالے رکھا۔ ان کے زمانہ میں جامعہ ایک تعلیمی ادارہ بن گیا۔

برلن میں ذاکر میاں کا قیام

ذاکر میاں کا قیام جرمنی میں تقریباً ساڑھے تین سال رہا۔ اگرچہ ان کا خاص مضمون معاشیات تھا لیکن فلسفۂ تعلیم سے انھیں ہمیشہ سے خاص لگاؤ تھا۔ جرمنی میں اس مضمون کے بڑے بڑے ماہر موجود تھے، جن کی صحبت میں انھیں اپنی علمی پیاس بجھانے کا موقع ملا جس کے باعث ان کی شخصیت کا خاص رنگ نکھرا اور اس کے اظہار کی نت نئی شکلیں آئندہ پیدا ہوئیں۔ جرمنی کے پروفیسروں میں جن سے انھوں نے علمی استفادہ کیا۔ زومبارٹ، زہرنگ، اشپرانگر، گوئلہ، پروفیسر شٹوخ اور کرشن اشٹائنو خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ان میں سے ہر ایک اپنے فن کا امام مانا جاتا تھا۔ ذاکر میاں نے برلن یونیورسٹی سے ۱۹۲۶ء میں معاشیات میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔

جرمنی میں ذاکر میاں کے قیام کے زمانے میں بعض ہندوستانی انقلاب پسند موجود تھے جن سے ان کے ذاتی تعلقات تھے۔ ان میں آچاریا، وتا اور چٹو پادھیا کی نسبت میں نے ان سے سنا ہے۔ چٹو پادھیا مسز سروجنی نائڈو کے بھائی تھے۔ انھوں نے اپنی ساری عمر سامراجیت کے خلاف اور محکوم قوموں کی حمایت میں صرف کی۔ ان کا مستقل قیام برلن میں رہتا تھا۔ ویسے اکثر یورپ کے دوسرے ملکوں میں گھومتے رہتے تھے۔

جب وہ فرانس آئے تھے تو میں ان سے شاہد سہروردی کے ساتھ ملا تھا۔ ان کی بیوی اگنس اسمیڈ لے ایک امریکی خاتون تھیں جن کے خیالات اپنے شوہر کی طرح انقلاب پسند تھے۔ وہ چٹو پادھیا کے انتقال کے بعد چین چلی گئی تھیں جہاں انھوں نے سیاست میں حصہ لیا۔ اب معلوم ہوا ان کا انتقال ہو گیا ہے۔

ذاکر میاں برلن میں ہندوستانی طلبا کی انجمن کے صدر تھے۔ ہندوستان کی آزادی کے متعلق ان کی تقریریں جو انھوں نے جرمن زبان میں کی تھیں بے حد پسند کی گئیں۔ ہمبرگ اور برمین میں انھوں نے "انجمن خواتین برائے امن و آزادی" کے زیر اہتمام جو تقریریں گاندھی جی پر کی تھیں انھیں گاندھی جی کے مضامین کے جرمن ترجمے میں دیباچے کے طور پر شایع کیا گیا۔

اس زمانے میں برلن میں فارسی زبان کی کتابوں کی طباعت کے لئے ایک مطبع تقی زادہ نے قائم کیا تھا جس کا نام کاویانی پریس تھا۔ مطبع کے منیجر غنی زادہ سے ذاکر میاں کے ذاتی تعلقات تھے۔ ذاکر میاں نے یہ خواہش ظاہر کی کہ میں کمپوزنگ کا کام سیکھنا چاہتا ہوں۔ غنی زادہ نے کہا بہت اچھا، پریس حاضر ہے۔ چنانچہ وہ کمپوزنگ سیکھنے کے لئے کاویانی پریس جانے لگے۔ جب مہارت ہو گئی تو اپنے ہاتھ سے "دیوان غالب" کمپوز کر کے وہیں سے شائع کیا اور اس کے پورے اخراجات خود برداشت کئے۔ یہ دیوان چھوٹے سائز پر ہے۔ کاغذ نہایت اعلیٰ درجے کا لگایا گیا ہے۔ بیل دار جدول اور دو رنگی چھپائی نے اسے نہایت دیدہ زیب بنا دیا ہے، ایسا کہ اس شان کا "دیوان غالب" اس سے پہلے کہیں نہیں چھپا تھا۔ اس کی جلد بھی نہایت خوبصورت اور پاکیزہ ہے۔ اس پر لکھاوٹ اور رنگوں کی ہم آہنگی اس کے حسن کو دوبالا کرتے ہیں۔ جلد

میں ایسی نرمی ہے کہ چھوؤ تو ایسا محسوس ہو جیسے اس کے اندر نرم اور نازک ننھے ننھے پتلے پتلے گدوں کی تہیں جمی ہوئی ہیں۔ اس کے ساتھ غالب کی جو تصویر دی گئی ہے وہ لائپزگ کے ایک مشہور مصور نے بنائی تھی۔ "اردوئے معلیٰ" اور "یادگارِ غالب" میں غالب کے چہرے بشرے کے متعلق جو معلومات ملیں وہ ذاکر میاں نے جرمن مصور کو اچھی طرح سے ذہن نشین کرا دی تھیں۔ اس نے ان کی بنا پر غالب کی شخصیت کا جو تصور قائم کیا اسے اپنی تصویر میں خطوط اور رنگوں کے لطیف امتزاج سے پیش کر دیا۔ اسے یقیناً مصور کا کمال کہنا چاہئے کہ اس نے غالب کی شخصیت کے جوہر کو صحیح سمجھا اور اپنے موقلم سے اسے زندۂ جاوید بنا دیا۔ اب غالب کی یہ خیالی تصویر اپنے فنی کمال کے باعث اصلی خیال کی جاتی ہے۔ معلوم نہیں جسے اصلی تصویر کہتے ہیں وہ بھی اصلی ہے کہ نہیں۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ اس کے تیار کرنے میں بھی کسی باکمال مصور کے تخیل اور چابک دستی کو دخل ہو۔

جب کاویانی پریس کا مطبوعہ "دیوانِ غالب" ہندوستان پہنچا تو ہر صاحب ذوق نے اسے قدر کے ہاتھوں لیا۔ بہت جلد وہ ایڈیشن ختم ہو گیا تو دوسرا ایڈیشن مکتبۂ جامعہ کو برلن سے منگانا پڑا۔ حکیم اجمل خاں کی خواہش پر ان کے فارسی کلام کا مجموعہ بھی "دیوانِ شیدا" کے نام سے کاویانی پریس میں طبع کروایا گیا۔ یہ بھی اسی چھوٹے سائز پر ہے جس پر "دیوانِ غالب" ہے اور اسی کی طرح دیدہ زیب ہے۔

جرمنی سے واپسی

فروری ۱۹۲۶ء میں جرمنی سے واپسی پر ذاکر میاں جامعہ کے پرنسپل مقرر ہوئے۔ حکیم صاحب پہلے سے امیر جامعہ تھے۔ اب ذاکر میاں کو حکیم صاحب کے ساتھ کام کرنے اور انھیں بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ حکیم صاحب کی سیرت کے متعلق انھوں نے اپنے ایک خطبہ میں اس طرح اظہار خیال کیا ہے:۔

"حکیم صاحب مرحوم نے ہم نوجوانوں کو متانت، رواداری، خاموش خدمت کا سبق دیا۔ حکیم صاحب کی ذہنی جڑیں مسلمانوں کے علمی اور فنی ماضی میں بہت گہری پیوست تھیں اور ان کی نظر حال کی ترقیوں اور مستقبل کے امکانات کو اس طرح صاف دیکھتی تھی جیسے شاید ہی کوئی نام نہاد جدید تعلیم یافتہ دیکھ سکتا ہو۔ ہم نے ان سے قدیم اور جدید کے ہم آہنگ بنانے اور سمونے کا سبق سیکھا۔ حکیم صاحب اپنے دلی کرب کو اپنے دل فریب تبسم کے پردے میں یوں چھپانا جانتے تھے جسے صرف ایک ہم آہنگ شخصیت جانتی ہے۔ تکلیف میں مسکراتے رہنے کی عادت ہم نے ان سے سیکھی"۔

انجمن تعلیم ملّی | ۱۹۲۷ء میں حکیم اجمل خاں کے انتقال پر ڈاکٹر مختار احمد انصاری امیر جامعہ ہوئے۔ وہ شروع ہی سے جامعہ کے ساتھ وابستہ رہے تھے اور اس ادارے کے دلی خیرخواہوں میں تھے۔ اس وقت جامعہ کی مالی حالت بہت خراب ہو گئی۔ سیاسی تحریک کے دب جانے کی وجہ سے جامعہ کو روپیہ ملنا بند ہو گیا۔ کئی کئی مہینے ہو جاتے کہ استادوں کو تنخواہیں نہیں ملتی تھیں۔ سخت پریشانی کا سامنا تھا۔ قرض لے کر کب تک کام چلتا۔ اب ذاکر میاں نے اُمنائے جامعہ کو لکھا کہ اگر جامعہ کو قائم رکھنا ہے تو اس کے چلانے کا انتظام کیا جائے اور اگر اسے بند کرنے کا قصد ہے تو اس فیصلے سے مطلع کیا جائے۔ اس خط کا جواب یہ ملا کہ مناسب ہوگا اگر جامعہ کو بند کر دیا جائے اس لئے کہ روپیہ جمع کرنے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ اس پر ذاکر میاں نے اپنے ساتھیوں کو لکھا کہ کیا وہ اس کے لئے آمادہ ہیں کہ جامعہ کے کسی حصے کو بچائیں اور اسے بند ہونے دیں۔ سبھوں نے یہ جواب دیا کہ روپیہ نہ ہو تو نہ ہو۔ ہم بلا معاوضہ کام کریں گے۔ اب جامعہ کو چلانے کی غرض سے انجمن تعلیم ملّی کا قیام عمل میں آیا جس میں چند اتنا

کے علاوہ گیارہ استادوں نے حیاتی رکن بننا قبول کیا۔ رکنیت کی شرط یہ تھی کہ وہ بیس سال تک اور اگر زندگی اس سے پہلے ختم ہو گئی تو آخری وقت تک جامعہ کی خدمت کا عہد کرتے ہیں اور کبھی ایک سو پچاس روپیہ سے زیادہ معاوضہ نہیں طلب کریں گے۔ بعد میں اس انجمن میں ۲۴ ارکان ہو گئے۔ اس تعلیمی انجمن کا قیام ہندوستان کے مسلمانوں کی تعلیمی اور تہذیبی تاریخ کا ایک اہم واقعہ ہے۔ جو لوگ اس انجمن کے رکن بنے وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ زمانے کے تیور بگڑے ہوئے ہیں، حالات ناموافق ہیں، سیاسی ردعمل اور بددلی سے جذبات سرد پڑ چکے ہیں، ہمتیں پست ہیں اور امنگوں کا ابھار ختم ہو چکا ہے۔ لیکن آفریں ہے جامعہ کے ان مخلص کارکنوں پر جنھوں نے انجمن تعلیم ملی کی رکنیت قبول کی اور اپنے دلوں کو عزائم اور حوصلوں سے آباد رکھا اور آیندہ اپنے عمل سے ثابت کر دکھایا کہ اگر نیت بخیر ہو اور کسی حالت میں خلوص اور جذبۂ خدمت کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹے تو خدا ضرور مدد کرتا ہے۔

حلقۂ ہمدردانِ جامعہ اب انجمن تعلیم ملی کے سامنے یہ مسئلہ درپیش تھا کہ جامعہ کی مالی حالت کو کس طرح سے سدھارا جائے اور اس کے مستقل اخراجات کی کفالت کی کیا سبیل ہو۔ چنانچہ غور و فکر کے بعد یہ بنیادی فیصلہ کیا گیا کہ جامعہ کا مقصد عوام کی خدمت ہے اس لئے عوام ہی کی طرف رجوع کرنا چاہئے۔ امیروں میں جو اعانت پر آمادہ ہوں ان کے عطیات کو خوشی اور شکریہ کے ساتھ قبول کیا جائے۔ لیکن جامعہ کی آمدنی کا اصلی ذریعہ عوام الناس ہونے چاہئیں جن کی خاطر یہ سارے پاپڑ بیلے جا رہے تھے۔ یہ بنیادی اصول طے ہونے کے بعد ۱۹۳۲ء میں ہمدردانِ جامعہ کا حلقہ قائم ہوا جس کا مقصد یہ تھا کہ جامعہ کو چلانے کے لئے زیادہ سے زیادہ لوگوں سے

قلیل مقدار میں امداد لی جائے جو ان پر گراں نہ گذرے۔ حافظ فیاض احمد، خواجہ عبدالحیٔ اور شفیق الرحمٰن قدوائی نے اس حلقے کا انتظام سنبھالا اور اسے وسعت دینے کے لئے اپنے مساعی صرف کئے۔ ان کی نیک نیتی اور مستعدی کے سبب سے ہمدردان جامعہ کا کام خوب چل نکلا اور خدا نے اس میں بڑی برکت دی۔ ملک میں دس ہزار سے زیادہ اشخاص نے اس حلقے کی رکنیت قبول کی جن میں اکثر و بیشتر چھوٹی چھوٹی رقمیں دینے والے تھے۔ شروع میں سب ملا کر پانچ چھ ہزار روپے ہوئے تھے لیکن بعد میں سالانہ پچاس ساٹھ ہزار روپے جمع ہو جاتے تھے۔ اس طرح جامعہ کا مسلم عوام سے گہرا رابطہ قائم ہو گیا۔ جب جامعہ کے کام کو ترقی ہوئی تو حیدر آباد، کشمیر، بھوپال اور رام پور کی ریاستوں سے بھی امداد منظور ہو گئی۔ جامعہ نگر میں جہاں چند سال پہلے ہُو کا عالم تھا اب وہاں عمارتیں بننا شروع ہو گئیں۔ ایسا لگتا تھا جیسے کسی جادوگر نے اس لق و دق میدان میں ایسا منتر پھونکا ہے کہ عمارتیں زمین سے خود بخود اُگنے لگیں اور بستی بسنے لگی۔ بستی بننا کبھی سہل نہیں ہوتا۔ بستے بستے بستی ہے اور اس کے لئے بڑے پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں اور کھکھیڑیں اٹھانی پڑتی ہیں۔ جامعہ کے کام میں خدا نے جو برکت دی اسے نیکی کا کرشمہ اور اچھی نیت کا پھل کہنا چاہیے۔ آج ان عمارتوں کی قیمت پچاس ساٹھ لاکھ سے کم نہیں ہے۔ کہاں تو ناساعد حالات سے بددل ہو کر اُمنائے جامعہ اسے بند کرنے کی فکر میں تھے اور کہاں اس کی دن دونی رات چوگنی ترقی کو دیکھ کر حاسد اور مخالف اچنبھے میں پڑ گئے اور تھڑ دلوں کے حوصلے بلند ہونے لگے۔

تعلیم بالغان تعلیمِ بالغان کی طرف بھی جامعہ والوں نے خاص توجہ دی۔ یہ ہمارے ملک کی تعلیمی ترقی کے لئے بڑا اہم مسئلہ تھا جسے ارباب جامعہ نے عملی طور پر حل کرنے

کی کوشش کی۔ ظاہر ہے کہ اسے محض تقریروں اور مضمونوں کے ذریعے سے حل کرنا ممکن نہیں تھا، اس کے لئے عمل کے میدان میں اترنا ضروری تھا۔ ۱۹۳۸ء میں ادارۂ تعلیم و ترقی قائم ہوا جس کے روح رواں شفیق الرحمٰن قدوائی تھے۔ پہلی ضرورت یہ تھی کہ بالغوں کی تعلیم کے لئے لٹریچر فراہم کیا جائے۔ جو رسائل لکھے جائیں ان میں جامعہ کے بنیادی مقاصد کو نمایاں کیا جائے۔ یعنی جنھیں تعلیم دی جائے ان میں سماجی صلاحیتوں کو اُبھارا جائے تاکہ وہ مل جل کر کام کر سکیں۔ ان میں اپنی ذات پر بھروسا اور ترقی کرنے کا جذبہ پیدا ہو۔ وہ خدا کے نیک بندے، اپنے دیس کے سچے خادم اور سارے انسانوں کی بھلائی چاہنے والے بن جائیں۔ اپنے علم و ہنر سے اپنے اخلاق کو سنواریں اور محنت اور مشقت سے اپنے اور اپنے متعلقین کے لئے حلال کی روزی کمائیں اور خلوص اور محبت سے اپنی قوم کی ترقی اور اپنے ملک کی آزادی کی کوشش کریں۔ ادارۂ تعلیم و ترقی نے دو سو رسالے شائع کئے جنھیں ملک میں پسندیدگی کی نظر سے دیکھا گیا۔ اس ادارے کے قیام سے عوام نے پورا فائدہ اٹھایا جن کے ساتھ جامعہ کا گہرا تعلق قائم ہو گیا۔

اوکھلے کی نئی بستی کالج اور اسکول کی عمارتوں کے علاوہ استادوں کے مدرسے کی عمارت بھی نہایت شاندار بن گئی جس کا نقشہ مسٹر ہائنس نے بنایا جو جرمنی کے رہنے والے ہیں اور جامعہ والوں سے بہت قریبی ربط رکھتے ہیں۔ یہاں بنیادی تعلیم دینے والے استادوں کی تعلیم و تربیت کا انتظام کیا گیا۔ ملک میں یہ اپنی نوعیت کا واحد مدرسہ ہے۔ یہاں صوبوں کی حکومتیں اپنے اپنے علاقوں سے چنے ہوئے استاد ٹریننگ کے لئے بھیجتی ہیں۔ بنیادی (بیسک) تعلیم سے چونکہ ذاکر میاں کا شروع ہی سے تعلق رہا ہے اس لئے یہ مناسب تھا کہ اس نئے تعلیمی تجربے کے متعلق استادوں کو ٹریننگ دینے کا

انتظام جامعہ میں کیا جائے۔ یہ ضرورت اس مدرسے سے پوری ہوگی اور ملک کے ہر حصے سے استاد ٹریننگ کے لئے یہاں آنے لگے۔

بیسک ایجوکیشن ۱۹۳۷ء میں گاندھی جی نے ذاکر میاں کو بیسک (بنیادی) تعلیم کی نیشنل کمیٹی کا صدر بنایا۔ گاندھی جی کا بیسک تعلیم کا تصور یہ تھا کہ بچوں کی تعلیم خود مکتفی ہونی چاہئے۔ ان کا خیال تھا کہ چرخے اور تکلی کے ذریعے سے بچے کو سب مضمون پڑھائے جا سکتے ہیں۔ جب یہ اسکیم ذاکر میاں کے سپرد کی گئی تو انھوں نے اسے خالص تعلیمی رنگ دینے کی کوشش کی۔ انھوں نے جو اسکیم مرتب کی اس میں اس بات کا پورا لحاظ رکھا گیا کہ بچے ہاتھ سے جو کام کریں وہ تخلیقی ہو۔ اس کے لئے یہ لازمی نہیں کہ وہ معاشی اعتبار سے بھی خود مکتفی ہو۔ ملک کے مختلف حصوں میں جو صنعت و حرفت ہیں انھیں کے توسط سے طلبا کے لئے کام کے مواقع نکالنے چاہئیں جن علاقوں میں کپاس کثرت سے ہوتی ہے وہاں چرخے اور تکلی کو تعلیمی اغراض کے لئے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ لیکن یہ ضروری نہیں کہ ہر جگہ ایسا ہو۔ یہ بھی ضروری نہیں کہ بچوں کا کام خود مکتفی ہو۔ اگر ایسا کرنے کی کوشش کی گئی تو اندیشہ ہے کہ تعلیم کا معیار گر جائے گا اور اس کے تخلیقی مقاصد فوت ہو جائیں گے۔

بنیادی تعلیم کی نیشنل کمیٹی کی صدارت قبول کرنے کے دس سال پہلے سے ذاکر میاں جامعہ کے ابتدائی اسکول میں مقصدی طریق تعلیم (پروجیکٹ میتھڈ) کا تجربہ کر رہے تھے اور اس کے خاطر خواہ نتائج نکل رہے تھے۔ اس میں مختلف منصوبوں کے ذریعے سے بچوں کو تعلیم دی جاتی ہے۔ اس میں کتاب کے بجائے کسی کام کو مقصد یا منصوبہ قرار دے کر علم حاصل کرنے کے وسائل مہیا کئے جاتے ہیں۔ لیکن اس میں بچوں کے کام سے جو مقصود بالذات ہوتا ہے کسی آمدنی کی توقع نہیں کی جاتی۔ گاندھی جی کی اسکیم میں

بچوں کی تعلیم کو خود مکتفی بنانے کا خیال پیش کیا گیا تھا اور ان کے پیرووں نے جو ہر بات میں آنکھ بند کر کے آمنا و صدقنا کہنے کے عادی تھے یہ نہیں سوچا کہ اگر ایسا کرنے کی کوشش کی گئی تو تعلیمی لحاظ سے یہ اسکیم ناقابل عمل ہو جائے گی۔ ذاکر میاں نے واردھا کے جلسے میں اس موضوع پر جو تقریر کی اس میں یہ بات واضح کر دی تھی کہ اس اسکیم کو معاشی لحاظ سے نہیں بلکہ خالص تعلیمی لحاظ سے چلانا چاہئے۔ اس طرح وہ مقصدی طریق تعلیم (پروجیکٹ میتھڈ) کی ایک شکل ہو جائے گی اور اس میں ہاتھ کے کام کو جو اہمیت دی جائے گی وہ جدید نظریہ تعلیم کے عین مطابق ہو گی۔ اس طرح وہ سب ماہرین تعلیم جو کام یا دست کاری کو بچوں کی تعلیم میں خاص اہمیت دیتے ہیں اس کے حامی بن جائیں گے۔ گاندھی جی نے یہ بڑی دانشمندی کی کہ اس اسکیم کو بر روئے کار لانے کا کام بنیادی تعلیم کی نیشنل کمیٹی کے ذمے کر دیا۔ اس کمیٹی نے دوسروں کی رہنمائی کے لئے ایک رپورٹ مرتب کی جس میں اسکے متعلق تمام امور پر تفصیلی بحث کی گئی تھی۔ مثلاً بنیادی تعلیم کے اصول، اس کے مقاصد، استادوں کی تعلیم، نگرانی اور امتحان کے طریقے، نصاب تعلیم اور مقامی حالات کے مطابق دست کاری کو چننا جس کے ذریعے سے بچے کو تعلیم دی جا سکتی ہے۔ اس اسکیم میں سفارش کی گئی کہ سب بچوں کے لئے تعلیم لازمی اور مفت ہونی چاہئے۔ تعلیم کا ذریعہ ہر بچے کی مادری زبان ہو گی۔ علم حاصل کرنے کا ذریعہ دست کاری یا حرفے کو قرار دیا جائے گا جو ملک کے مختلف حصوں کے حالات کے لحاظ سے الگ الگ ہوں گے یہ ضروری نہیں کہ ہر جگہ ایک ہی حرفہ رکھا جائے۔ اس طرح اس اسکیم میں خالص تعلیمی مقاصد سمو دیئے گئے اور اسے جدید تعلیمی نظریات سے ہم آہنگ کر دیا گیا۔

موجودہ زمانے کے یورپ اور امریکہ کے ماہرین تعلیم اس پر متفق ہیں کہ کام یا

ڈاکٹی وڈی، کا طریق تعلیم میں خاص مقام ہے۔ اس کی طرف سے آنکھ بند کر کے جو کتابی تعلیم دی جاتی ہے وہ مصنوعی اور غیر حقیقی ہوتی ہے۔ ذاکر میاں نے بھی اس مسئلہ پر بہت غور و فکر کیا ہے۔ اپنے خطبات میں ایک جگہ اس کی نسبت فرماتے ہیں:۔

"کوئی کہتا ہے کہ کام کو اصول کے طور پر مانو۔ اسے مضمون نہ بناؤ۔ کوئی کہتا ہے اسے ایک مضمون بناؤ۔ اسے ایک گھنٹہ دے دو مگر اور سب کام جوں کا توں رہنے دو۔ کوئی کہتا ہے کام ایسا ہو کہ کچھ دام بھی ہاتھ آئیں۔ کوئی کہتا ہے حرکت میں برکت ہے۔ بچوں کو ذرا ہاتھ پیر چلانے کا موقع دو چاہے کچھ بنے یا نہ بنے۔ یہ کوئی مزدوروں کا کام تھوڑے ہی ہے، یہ تو تخلیقی کام ہے۔ میں ان لوگوں میں سے کسی سے جھگڑا مول نہیں لیتا۔ صرف اپنا خیال ظاہر کرنا چاہتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ جب ہم تعلیم کے سلسلے میں کام کا ذکر کریں تو ہمیں وہی کام دھیان میں رکھنا چاہئے جس سے تعلیم ہو۔ ذہن کی تربیت ہو، آدمی اچھا آدمی بنے۔ میں سمجھتا ہوں کہ آدمی کا ذہن اپنے کئے کو پرکھ کر، اس کے اچھے برے پر نظر کر کے ترقی کرتا ہے اور آدمی جب کچھ بناتا ہے، یا کوئی کام کرتا ہے، چاہے یہ کام ہاتھ کا ہو، چاہے دماغ کا، تو اس کام سے اسے ذہنی تعلیمی فائدہ اس وقت پہنچ سکتا ہے جب وہ اس کام کا پورا حق ادا کرے۔ اس کام کے لئے اپنے کو ذرا تجے۔ اپنے اوپر ذرا قابو پائے۔ کام سے تعلیمی فائدہ وہی اٹھاتا ہے جو اس کام کا حق ادا کرے۔ اس کام کے ڈسپلن کو اپنے اوپر اوڑھ لے۔ اس لئے ہر کام تعلیمی کام نہیں ہوتا۔ کام تعلیمی جب ہی ہو سکتا ہے کہ اس کے شروع میں ذہن کچھ تیاری کرے۔ جس کام میں ذہن کو کچھ دخل نہ ہو وہ کام مردہ مشین بھی کر سکتی ہے اور اس سے ذہن کی تعلیم یا تربیت نہیں ہوتی۔ کام سے

پہلے کام کا نقشہ یا کام کا خاکہ ذہن میں بنانا ضروری ہے۔ پھر دوسرا قدم بھی ذہنی ہوتا ہے یعنی اس نقشے کو پورا کرنے کے ذریعے سوچنا۔ ان میں سے کسی کو لینا کسی کو چھوڑ دینا، تیسرا قدم ہوتا ہے کام کو ان چنے ہوئے ذریعوں سے کر ڈالنا۔ اور چوتھا قدم ہے کئے ہوئے کو پرکھنا کہ جو نقشہ بنایا تھا، جو کرنا چاہا تھا وہی کیا اور جس طرح کرنے کا ارادہ کیا تھا اسی طرح کیا یا نہیں اور نتیجہ اس قابل ہے یا نہیں کہ اسے کیا جاتا۔ یہ چار منزلیں ہوں تب بھی ہر کام تعلیمی نہیں ہو جاتا۔ ہر ایسے کام سے کچھ ہنرمندی ضرور پیدا ہو جاتی ہے۔ چاہے ہاتھوں کی ہنرمندی ہو، چاہے ذہن کی، چاہے زبان کی۔ لیکن ہنرمندی تعلیم نہیں ہے۔ تعلیم پائے ہوئے آدمی کی جو تصویر ہم سب کے سامنے آتی ہے اس میں خالی ہنرمندی کا رنگ نہیں ہوتا۔ ہنرمند چور بھی ہوتے ہیں۔ ہنرمند دھوکے بھی دیتے ہیں۔ ہنرمند سچ کو جھوٹ بھی کر دکھاتے ہیں۔ ایسی ہنرمندی تو تعلیم کا مقصد نہیں ہو سکتی۔ تعلیمی کام وہی ہو سکتا ہے جو کسی ایسی قدر کی خدمت کرے جو ہماری خودغرضی سے پرے ہو اور جسے ہم مانتے ہوں۔ جو اپنی ہی غرض کا کام کرتا ہے وہ ہنرمند ضرور ہو جاتا ہے مگر تعلیم یافتہ نہیں ہوتا۔ جو قدروں کی خدمت کرتا ہے وہ تعلیم پاجاتا ہے۔ قدر کی سیوا میں آدمی کام کا فرض ادا کرتا ہے۔ اپنا مزہ نہیں ڈھونڈتا۔ اس سے وہ آدمی بنتا ہے، اپنا اخلاق سنوارتا ہے اس لئے کہ اخلاق اور ہے کیا اس کے سوا کہ جو قدریں ماننے کی ہیں ان کی سیوا میں آدمی اپنی خواہشوں اور لالچوں اور مزوں کو دبائے اور اس قدر کی پوری پوری سیوا کرے اور اس سیوا کا جو حق ہو وہ پورا پورا ادا کرے۔ کام کی یہ صفت ہاتھ کے کام میں بھی ہو سکتی ہے اور ہاتھ کا کام بھی اس سے خالی ہو سکتا ہے اور دماغ کا بھی۔ سچے کام کا مدرسہ وہی ہے جو بچوں میں کام

سے پہلے سوچنے اور کام کے بعد جانچنے اور پرکھنے کی عادت ڈالے تاکہ کام سے اس بات کی عادت سی ہو جائے کہ جب کبھی کام کریں ہاتھ کا یا دماغ کا، اس کا پورا پورا حق ادا کرنے کی کوشش کریں۔ کام کو تعلیم کا ذریعہ بنانے والوں کو ہر دم یاد رکھنا چاہئے کہ کام بے مقصد نہیں ہوتا۔ کام ہر نتیجے پر راضی نہیں ہوتا۔ کام بس کچھ کر کے وقت کاٹ دینے کا نام نہیں۔ کام خالی دل لگی نہیں۔ کام کھیل نہیں۔ کام کام ہے، بامقصد محنت ہے۔ کام دشمن کی طرح اپنا محاسبہ کرتا ہے۔ پھر اس میں پورا اترتا ہے تو وہ خوشی دیتا ہے جو کہیں نہیں ملتی۔ کام ریاضت ہے، کام عبادت ہے۔

"لیکن ریاضت اور عبادت میں بھی تو لوگ خود غرض ہو جاتے ہیں۔ اپنی جنت پکی کرلی، دوسرے سے کیا مطلب۔ کام کا سچا مدرسہ اگر صحیح تعلیم کی جگہ ہے تو کام کو بھی اکیلے کی خود غرضی نہیں بننے دیتا بلکہ سارا مدرسے کا مدرسہ ایک کام میں لگی ہوئی جماعت بن جاتا ہے جس میں سب مل کر کام کرتے ہیں اور سب کے کام ہی سے سب کا کام پورا ہوتا ہے۔ سب سے سب کا کام نکلتا ہے اور سب کے کئے بغیر کام بگڑتا ہے۔ کسی ایک کی غلطی سے سب کام کا ہرج ہوتا ہے۔ کمزور کو پیچھے چھوڑ کر آگے چل دینا مشکل ہوتا ہے۔ یوں مل جل کر کام کرنے میں کھوٹے سے کھرا چھلتا ہے تو وہ صفات پیدا ہوتی ہیں جن کی ہمارے ملک میں بڑی کمی ہے یعنی آدمی کا آدمی سے نباہ کر سکنا اور ذمے داری کا احساس جس سے سماج کا ہر کام ہر ایک کا کام بن جاتا ہے۔" (خطبات۔ص ۹۸-۹۶)

ایک جگہ کہا ہے کہ کام ہاتھوں کے ذریعے سے سوچنا ہے۔ کام سے بچے کے ذہن کی سوئی ہوئی صلاحیتیں اور توانائیاں بیدار ہو جاتی ہیں۔ اس کی چلبلی اور بے چین طبیعت کا یہ اقتضا نہیں ہے کہ ایک جگہ بیٹھ کر کتاب پڑھے۔ اسے اس کی ضرورت ہے کہ بہانے

رٹنے کے بجائے وہ کسی با مقصد کام میں اپنے ہاتھ پاؤں ہلائے اور اس طرح اپنی طبیعت میں سرگرمی اور شوق پیدا کرے جو علم کا اصلی ماخذ ہے۔ فرد اور جماعت کے لطیف تعلق کو "تعلیم کی از سر نو تنظیم" میں اس طرح واضح کیا ہے:۔

"اگر کسی فرد کی نظر صرف اپنی ذہنی، اخلاقی اور روحانی نشو و نما تک محدود ہو، وہ اپنے انفرادی نفس میں تہذیب کی عمارت تعمیر کرنے ہی میں لگا رہے، اس کی پروا نہ کرے کہ سماج کا کیا حال ہے اور اجتماعی زندگی میں اقدار مطلقہ کی تحصیل کس حد تک ہوتی ہے، تو ممکن ہے کہ وہ خود اپنی انفرادی روحانی ہستی کی تکمیل میں کامیاب ہو جائے۔ لیکن اگر اس کی مثال کی تقلید عام ہو جائے تو خود فرد کی تہذیب و تعلیم کی راہیں وحشت ناک پگڈنڈیاں بن کر رہ جائیں گی جو اسے ایک بے آب و گیاہ صحرا میں لا ڈالیں گی اور اپنے آپ میں ڈوبی ہوئی روحانیت کے بلند درجے پر پہنچی ہوئی اخلاقی حیثیت سے آزاد اور خود مختار شخصیت اس صحرا میں سب سے الگ تھلگ ایک چٹان پر آسن جمائے ٹکٹکی باندھے اپنی ذات کو دیکھا کرے گی۔ عالم خلوت میں یہ بے ثمر روحانی رفعت حاصل کرنے کی مثالیں ہر سماج میں یہاں تک کہ جمہوری سماج میں بھی ملتی ہیں۔ اس لیے جن سماجوں میں اچھی شخصیتوں کی کمی نہ ہو وہ اس تعیش سے کام لے سکتی ہیں کہ کچھ لوگوں کو اس قسم کا بے سود روحانی فضل و کمال حاصل کرنے کی اجازت دیں بلکہ ان کی قدردانی اور ہمت افزائی تک کریں، اس لئے کہ وہ جانتی ہیں کہ اچھی زندگی کی یہ مجرد مثالیں بھی ایک تعلیمی قوت ثابت ہو سکتی ہیں .... صرف انفرادی زندگی میں اقدار اعلیٰ کے سامنے سر اطاعت خم کرنا کافی نہیں بلکہ سماج کو بھی اس قابل بنانا ہے کہ اپنی اجتماعی زندگی میں ان اعلیٰ اقدار کی فرماں روائی کو تسلیم کرے۔" (خطبات ص ۴۲)

متحرک اور شالی یونیورسٹی | گذشتہ سات آٹھ سال میں ڈاکٹر میاں نے ملک کی مختلف یونیورسٹیوں میں تقسیم اسناد کے موقع پر جو خطبے دیئے ہیں ان میں صرف موجودہ تعلیم کی کوتاہیاں اور خرابیاں ہی نہیں بتائی ہیں بلکہ ایک ایسی یونیورسٹی کی جانب بھی اشارے کئے ہیں جو ان کے نزدیک ایک متحرک اور شالی یونیورسٹی ہوگی۔ خطبات کے اس مجموعے کا نام "دی ڈائی نمک یونیورسٹی" (متحرک یونیورسٹی) رکھا ہے جو بڑی حد تک ان تمام مضامین پر حاوی ہے جو ان میں بڑی جرأت اور دل سوزی کے ساتھ پیش کئے گئے ہیں۔ ہمارے جمہوری سماج میں جو نت نئے مسائل پیدا ہوتے رہتے ہیں وہ ہماری یونیورسٹیوں کے لئے چنوتی (چیلنج) کا حکم رکھتے ہیں۔ ہمارے صاحب فکر طبقے کو جو یونیورسٹیوں میں ہے ان مسائل کا حل پیش کرنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ مگر یہ تو تبھی ممکن ہے جب کہ یونیورسٹیوں میں علم کو محض معمول طور پر تحصیل نہ کیا جائے بلکہ فاعلیت اور تخلیقی تنقید کے ساتھ۔ بغیر اس کے حق اور باطل کی پرکھ نہیں پیدا ہو سکتی۔ یونیورسٹی جماعتی زندگی کا مظہر ہے جہاں اساتذہ اور طلبا مل کر تحقیق و جستجو کی سرحدوں کو وسیع کرتے ہیں۔ یہاں ایک مہذب ذہن دوسرے ذہنوں کی تہذیب کا کام انجام دیتا ہے۔ نوجوانوں میں قدرت نے جو تحقیق اور دریافت کی قابلیت ودیعت کی ہے وہ بروئے کار آتی ہے۔ یہ اسی صورت میں ممکن ہے جب یونیورسٹی میں انفرادیت کی نشوونما کے ساتھ ساتھ اجتماعی زندگی سے ہم آہنگی کا سامان مہیا کیا جائے۔ یہ کافی نہیں ہے کہ اپنے ذاتی حقوق کا تو احساس ہو لیکن معاشرے نے نئی نسل پر جو ذمہ داریاں عاید کی ہیں ان کی طرف سے غفلت برتی جائے۔ یہ درست ہے کہ فرد کی صحیح نشوونما جبھی ہوگی جب کہ معاشرتی ماحول سازگار ہو۔ چنانچہ یہ بھی جدید یونیورسٹی کے فرائض میں داخل ہے۔ کہ وہ ایسا معاشرہ بنانے کی جد و جہد کرے جس میں اچھے افراد جنم لے سکیں۔

ذاکر میاں نے اپنے ان خطبات میں بار بار اس بات کو واضح کیا ہے کہ تعلیمی اعتبار سے ہماری یونیورسٹیوں کو زیادہ تخلیقی ہونا چاہیئے جہاں نوجوانوں کو جودتِ طبع اور ذوقِ جستجو کے مواقع فراہم کئے جائیں کہ بغیر اس کے کوئی یونیورسٹی، یونیورسٹی کہلانے کی مستحق نہیں ہوسکتی۔ ان کا یہ کہنا بالکل درست ہے کہ طالب علموں کی قوتِ ایجاد کے معطل ہونے سے تمام علوم و فنون کی تعلیم بے کار ہوجاتی ہے بلکہ اس میں لازمی طور پر فتور پیدا ہوجاتا ہے۔ علم اور عمل کی ہم آہنگی صرف ابتدائی تعلیم ہی میں ضروری نہیں بلکہ اعلیٰ تعلیم میں بھی ہمارے سامنے یہی نصب العین رہنا چاہیئے۔ مشرقی یورپ اور امریکہ کی بعض یونیورسٹیوں میں اس اصول پر عمل ہو رہا ہے۔ ہمارے یہاں بھی ذہن اور ہاتھ کے کام میں اگر ربط و تعلق پیدا ہوجائے تو یقینی طور پر اس کے نتائج ہماری قومی زندگی کے لئے مفید ثابت ہوں گے۔ اس وقت ہماری یونیورسٹیوں کی تعلیم میں اکتا دینے والا سپاٹ پن اور بے رنگ یکسانیت پیدا ہوگئی ہے۔ یہ جبھی دور ہوسکتی ہیں جب کہ ذہنی کام اور ہاتھ کے کام میں ہم آہنگی اور ربط قائم ہو۔ اس طرح ہماری تعلیم تجریدی نہیں رہے گی بلکہ اس میں اخلاقی تجربے اور صحیح تربیت کے عناصر کارفرما ہوں گے اور طالب علم یہ محسوس کرے گا کہ وہ جو پیشہ اختیار کر رہا ہے وہ محض روٹی کمانے کا وسیلہ ہی نہیں ہے بلکہ خدمت خلق کا ایک منصب ہے۔ ایک ایسے سماج میں جس میں باہمی تعاون و تعامل سب کچھ ہے نہ کہ انفرادی عمل، انفرادی ذہن اسی وقت پوری طرح نشو و نما پاتا ہے جب کہ اس کی پشت پر صالح جماعت موجود ہو۔ فرد میں فضل و کمال پیدا کرنے کے لئے جماعتی زندگی میں بھی یہ صفات آنی ضروری ہیں،

آج ہم سب کو یہ شکایت ہے کہ ہماری یونیورسٹیوں سے ہر سال تعلیم یافتہ جاہلوں

کی فوج کی فوج ڈگریاں لے کر دنیا میں داخل ہوتی ہے، ان میں بہت کم ایسے ہوتے ہیں جو اپنے کو معاشرے کے لئے واقعی مفید بنا سکیں۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ ہماری یونیورسٹیوں میں اب تک کتابی علم کی طرف توجہ دی گئی ہے۔ عملی تربیت کا دور دور نام و نشان نہیں۔ طالبعلموں کے دماغوں میں لکچروں کے ذریعے سے معلومات کا ڈھیر ٹھونس دیا جاتا ہے جس کے سبب سے ان کی تخلیقی صلاحیت جھلس کر رہ جاتی ہے۔ ان کے بوجھ تلے دب کر صلاحیتوں کو ابھرنے کا موقع نہیں ملتا اور اپج مرجھا جاتی ہے۔ ہماری یونیورسٹیاں مجہول طور پر تجریدی علم حاصل کرنے کی مرکز بن گئی ہیں۔ انھیں تخلیقی علم و عمل کا بامعنی اور موثر سرچشمہ اور ماخذ ہونا چاہیئے۔ ان کا ڈھانچہ اور ان کی تنظیم آج بھی کم و بیش وہی ہے جو انگریزی سامراج کے زمانے میں تھی۔ یہی سبب ہے کہ ان سے ہماری جمہوری زندگی کی ذہنی اور اخلاقی قیادت کا کوئی ثبوت نہیں ملتا جس سے ہمارے بدلتے ہوئے معاشرہ کی رہنمائی ہو سکے۔

ذاکر میاں کے فلسفۂ تعلیم کا اطلاق ابتدائی، ثانوی اور اعلیٰ تعلیم کی منزلوں پر یکساں طور پر ہوتا ہے۔ ابتدائی تعلیم میں دست کاری اور حرفے کو علم حاصل کرنے کا ذریعہ بنایا جائے۔ کتابی علم کی حیثیت اس منزل میں ضمنی رہے۔ دست کاری اور حرفے کے ساتھ مل جل کر کام کرنے کے مواقع فراہم کئے جائیں تاکہ بچپن ہی سے دوسروں کے ساتھ تعاونِ عمل کی عادت راسخ ہو جائے۔ یہ انفرادیت پسندی اور مقابلے کے جذبے کا توڑ ہوگا جو موجودہ ابتدائی تعلیم کا سب سے بڑا روگ ہے۔ ثانوی منزل میں ہاتھ کے کام اور ذہن کے کام کی مساوی حیثیت ہونی چاہیئے۔ معلم کا یہ فرض ہے کہ دونوں کو ایک دوسرے میں سمو کر تعلیم کی وحدت اور ہم آہنگی پیدا کرے۔ اعلیٰ تعلیم میں زیادہ

جھکاؤ ذہنی مشقوں کی طرف ہو اور عام طالب علموں کے لئے فنی کام کی حیثیت ضمنی ہو۔ سوائے خالص فنی کالجوں میں جیسے میڈیکل کالج یا انجینیرنگ کالج ہیں۔ لیکن ان فنی کالجوں میں بھی تخصیص کے ساتھ عام تعلیم کا انتظام ہونا چاہیئے تاکہ نوجوانوں کا ذہنی توازن قائم رہے اور وہ آیندہ زندگی کو یک طرفہ انداز میں نہ دیکھیں۔ اگر انجینیر مشین بنانا سیکھتا ہے تو اس کا یہ تو مطلب نہیں کہ وہ اپنے ذہن کو بھی مشین کے مثل کرلے اور اس میں اتنی صلاحیت باقی نہ رہے کہ وہ اچھی شاعری اور ادب کی قدر کرسکے، یا دلنواز موسیقی سے لطف اندوز ہو سکے۔ اگر تخصیص کے ساتھ عام تعلیم کا لحاظ نہ رکھا گیا تو لازمی طور پر فنون کے طلباً کا نقطۂ نظر یک طرفہ ہو جائیگا۔ ان فنی کالجوں میں داخل ہونے سے پہلے نوجوانوں کے ذہن میں اپنی قومی تہذیب کا پس منظر رہنا ضروری ہے اور ان عالمگیر تحریکوں سے بھی تھوڑی بہت واقفیت ہونی چاہیئے جنھوں نے جدید تمدن کی شکل بدل دی ہے۔

بدقسمتی سے ہماری یونیورسٹیوں میں آج بھی اس نہج پر تعلیم دی جارہی ہے جس انداز سے پچاس ساٹھ سال قبل دی جاتی تھی۔ ہر سال ہزاروں کی تعداد میں گریجویٹ نکلتے ہیں جو نہیں جانتے کہ آیندہ انھیں کیا کرنا ہے۔ اس کے لئے پورے ملک میں تعلیمی منصوبہ بندی ضروری ہے تاکہ اعلیٰ تعلیم قومی زندگی کے دھارے سے بالکل علیٰحدہ نہ ہو جائے۔ زندگی جو نت نئے مسائل اہلِ ملک کے لئے پیدا کر رہی ہے ان سے نبٹنا ضروری ہے۔ ہمارے گریجویٹ امتحان میں چاہے کامیاب ہو گئے ہوں لیکن آیندہ زندگی کی آزمائش میں وہ اس وقت پورے اتریں گے جب کہ ان کی تعلیم زیادہ حقیقت پسندانہ ہوگی۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ ہماری یونیورسٹیوں میں اس بات کا اہتمام کیا جائے کہ نوجوانوں کی شخصیت کا پورا نشوونما ہو جو اسی وقت ممکن ہے جب ان میں جستجو اور

دریافت کی غلش پیدا ہو جائے۔ یونیورسٹی کی تعلیم کا اس سے بڑھ کر اور کوئی مقصد نہیں۔ اگر یونیورسٹی غور و فکر کرنا نہیں سکھاتی تو اس کے سارے ظاہری انتظام بے سود ہیں ہماری یونیورسٹیاں اگر اپنی اس کوتاہی کو دور کر لیں تو وہ ملک اور قوم کی بڑی خدمت انجام دے سکتی ہیں۔ اگر ہمارے نوجوانوں میں جستجو اور ایجاد کی لگن پیدا نہ ہوئی تو ہماری تمدنی زندگی جمود میں مبتلا ہو جائے گی اور ہمیں غیروں کا دست نگر رہنا پڑیگا۔ صنعت و حرفت میں، زراعت میں، سائنس اور ٹیکنالوجی میں اور علم و ادب میں بھی۔

قومیت اور اسلامیت قومی تہذیب کے لحاظ سے یہ بحث بڑی اہم ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی تعلیم میں ان کے مخصوص تمدنی مظاہر کا تحفظ کس حد تک ضروری ہے۔ اس بات کو یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ اس ملک میں جو مذہبی اور لسانی اقلیتیں ہیں ان کی حیثیت قومی نظام تعلیم میں کیا ہو۔ اس خصوص میں ذاکر میاں نے اپنے کاشی ودیاپیٹھ والے خطبے میں بعض بنیادی امور کی جانب اشارے کئے ہیں جن کا اطلاق آج بھی اسی طرح ہوتا ہے جیسا کہ کچھ سال پہلے ہوتا تھا۔ اس خطبے میں اس بات کی وضاحت کی ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی تہذیبی ہستی قابلِ قدر ہے جس کا مٹنا پوری ہندوستانی قوم کے لئے زبردست نقصان ہوگا، ایسا نقصان جس کی تلافی ممکن نہیں۔ اس خطبے میں ذاکر میاں کے اس اصول کا پر تو صاف نظر آتا ہے کہ قومیت اور اسلامیت ایک دوسرے کی ضد اور نقیض نہیں ہیں بلکہ انھیں ایک دوسرے سے تقویت حاصل ہونی چاہئے۔ اگر ایسا نہیں ہے تو ہماری قومی زندگی کا یہ تقاضا ہے کہ ان موانع کو دور کیا جائے جو اس مقصد کے حصول میں سنگِ گراں بنے ہوئے ہیں آپ اس خطبے میں فرماتے ہیں:۔

"کیا ہندوستان کا قومی نظامِ تعلیم مسلمانوں کو اس بات کا موقع دیگا یا نہیں کہ

وہ اپنی تمدنی زندگی کو اپنی تعلیم کا ذریعہ بنائیں۔ آپ جانتے ہیں کہ یہ مسئلہ ہماری قومی زندگی کے لئے کتنا اہم ہے۔ ممکن ہے کہ بعض نیک نیت اور انتہا پسند قوم پرست متحدہ ہندوستانی قومیت کی ایسی تصویر اپنے ذہن میں رکھتے ہوں کہ جس میں مسلمانوں کو یہ حق دینا قوم کی قوت اور قوم کی ترقی کے لئے مضر ہو۔ مگر ہمارے ماہرینِ تعلیم اگر نیک نیتی سے ہندوستان کی تعلیم کا نظام بنائیں تو مجھے یقین ہے کہ وہ مسلمانوں کی اس خواہش کو خوشی سے قبول کریں گے کہ وہ اپنی تعلیم کی بنیاد اپنے تمدن پر رکھیں کہ صحیح تعلیم اور صحیح سیاست دونوں کا یہی تقاضا ہے۔ آپ مجھے معاف فرمائیں گے اگر اس معزز مجمع کے سامنے میں صفائی سے یہ بات پیش کروں کہ مسلمانوں کو جو چیز متحدہ ہندوستانی قومیت سے بار بار الگ کھینچتی ہے اس میں جہاں شخصی خود غرضیاں، تنگ نظری اور دیس کے مستقبل کا صحیح تصور نہ قائم کر سکنے کو دخل ہے، وہاں اس شدید شبہہ کا بھی بڑا حصہ ہے کہ قومی حکومت کے ماتحت مسلمانوں کی تمدنی ہستی کے فنا ہونے کا ڈر ہے اور مسلمان کسی حال میں یہ قیمت ادا کرنے پر راضی نہیں۔ اور میں بہ حیثیت مسلمان ہی نہیں سچے ہندوستانی کی حیثیت سے بھی اس پر خوش ہوں کہ مسلمان اس قیمت کے ادا کرنے پر تیار نہیں۔ اس لئے کہ اس سے مسلمانوں کو جو نقصان ہوگا سو ہوگا ہی، خود ہندوستان کا تمدن پستی میں کہاں سے کہاں پہونچ جائے گا۔

گرچہ مثل غنچہ دل گیریم ما
گلستاں میرد اگر میریم ما

یہی وجہ ہے کہ سچے مسلمان ہندوستانی اپنی مذہبی روایات، اپنی تاریخ، اپنی تمدنی خدمات اور اپنے تمدن سے توقعات کی وجہ سے اپنے ملی وجود کو خود اپنے لئے ہی بے بہا

نہیں سمجھتے بلکہ ہندوستانی قومیت کے لئے بھی نہایت بیش قیمت جانتے ہیں۔ اور اس کے مٹائے جانے یا کمزور کئے جانے کو اپنے ہی ساتھ ظلم نہیں بلکہ ہندوستانی قوم کے ساتھ بھی سخت خیانت سمجھتے ہیں۔ ہندوستانی مسلمانوں کو اپنا دیس کسی اور سے کم عزیز نہیں ہے۔ وہ ہندوستانی قوم کا جز ہونے پر فخر کرتے ہیں مگر وہ ایسا جزو بننا کبھی گوارا نہ کریں گے جس میں ان کی اپنی حیثیت بالکل مٹ چکی ہو۔" (خطبات ص ۲۵)

جامعہ کے مقاصد کے متعلق ذاکر میاں نے اپنے خیالات کو ظاہر کرتے ہوئے بتایا ہے کہ اسلامیت اور قومیت ایک دوسرے کے خلاف نہیں ہیں۔ جامعہ کا تعلیمی مشن یہ ہے کہ دونوں کو ایک دوسرے کے اندر سموئے۔

" جامعہ ملیہ کا سب سے بڑا مقصد یہ ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کی آیندہ زندگی کا ایک ایسا نقشہ تیار کرے جس کا مرکز مذہب اسلام ہو اور اس میں ہندوستان کی قومی تہذیب کا وہ رنگ بھرے جو عام انسانی تہذیب کے رنگ میں کھپ جائے۔ اس کی بنیاد اس عقیدے پر ہے کہ مذہب کی سچی تعلیم ہندوستانی مسلمانوں کو وطن کی محبت اور قومی اتحاد کا سبق دے گی اور ہندوستان کی ترقی میں حصہ لینے پر آمادہ کرے گی اور آزاد ہندوستان اور ملکوں کے ساتھ مل کر دنیا کی زندگی میں شرکت اور امن و تہذیب کی مفید خدمت کرے گا۔ تنگ نظری اور تعصب کے اس دور میں یہ تصور محض خواب و خیال معلوم ہوتا ہے۔ مگر دنیا کی تاریخ میں بہت سے شیخ چلی ایسے ہی خواب دیکھتے آئے ہیں اور ہمت و خلوص، محنت اور استقلال کی برکت سے ان کے خواب حقیقت کا جامہ پہنتے رہے ہیں۔ اگر ہم میں یہ صفات تھوڑی بہت بھی موجود ہیں تو ہمارا یہ خواب بھی سچا ہو کر رہے گا۔ مجھے اعتراف ہے کہ جامعہ کے کارکنوں کے ذہن

میں یہ نقشہ ابھی دھندلا ہے اور اسے واضح اور معین کرنے کے لئے وہ دوسروں کے مشورے اور اپنے مشاہدے اور تجربے سے مدد لے رہے ہیں۔ راہ طلب میں بھٹکنا، ٹھوکریں کھانا اور سنبھلنا غلطی کرنا اور سیکھنا یہی انسانی ترقی کا راز ہے۔

"جامعہ کا دوسرا مقصد یہ ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کی آیندہ زندگی کے اس نقشے کو سامنے رکھ کر ان کی تعلیم کا ایک مکمل نصاب بنائے اور اس کے مطابق ان کے بچوں کو جو مستقبل کے مالک ہیں تعلیم دے۔ جامعہ علم محض روزی کی خاطر جو ہمارے ملک کی جدید تعلیم کا اصول ہے اور علم محض علم کی خاطر جو قدیم تعلیم کا اصول تھا، دونوں کو بہت تنگ اور محدود سمجھتی ہے۔ وہ علم زندگی کی خاطر سکھانا چاہتی ہے جس کے وسیع دائرے میں مذہب، حکمت اور صنعت، سیاست اور معیشت سبھی کچھ آجاتا ہے۔ وہ اپنے طلبا کو اس قابل بنانا چاہتی ہے کہ قومی تہذیب اور عام انسانی تہذیب کی ہر شاخ کی قدر و قیمت کو سمجھ سکیں اور اپنی قابلیت کے مطابق اس کی کسی ایک شاخ میں اس طرح سے کام کریں کہ ان کا کام کسی نہ کسی حد تک مجموعی زندگی کے لئے مفید ہو۔"

۳ر دسمبر ۱۹۵۵ء کو مسلم یونیورسٹی کے اسپشل کنووکیشن کے موقع پر جو سلطان سعود کو اعزازی ڈگری دینے کے لئے منعقد ہوا تھا ذاکر میاں نے وائس چانسلر کی حیثیت سے جو سپاس نامہ پڑھا تھا اس کے چند اقتباس ملاحظہ ہوں:۔

"عرب میں بعثت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے رشد و ہدایت کا جو سورج طلوع ہوا اس کی روشنی سے تمام عالم مستنیر ہوا اور ہمارا ملک بھی اس نعمتِ کبریٰ سے محروم نہیں رہا۔ تمام عالمِ انسانی کے ساتھ ہندوستان بھی عرب کے اس احسانِ عظیم سے گردن نہیں اٹھا سکتا کہ رسولِ عربی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی تعلیمات نے انسانیت کو توحید بخشی،

ارباب متفرق سے چھٹکارا دلا کر ایک واحد القہار کے سامنے انسان کا سر جھکایا۔ اسے توہمات باطل سے نجات دلائی، صالح افراد کی بنیاد پر صالح جماعتی زندگی کی تعمیر کا سبق سکھایا، اخلاق کو سدھارا، روح کو نکھارا، مساوات انسانی کو ایک حقیقت عملی بنایا۔ عدل کو جماعتی اور تقویٰ کو حیات انفرادی کا اصول بنایا۔ انسانی برادری کی بنا رکھی۔ امن اور سلامتی بخشی۔ ہمارا وطن بھی اس فیض سے محروم نہیں رہا۔ اور آج یہی نہیں کہ اس کے تقریباً پانچ کروڑ باشندے رسول عربی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے حلقہ بگوش ہیں بلکہ ہماری ساری قومی زندگی میں اس رحمۃ للعالمین کی تعلیمات کی روح کسی نہ کسی انداز سے کارفرما ہے اور اس کے تمام باشندے ملک عرب کے ساتھ ایک گہری وابستگی رکھتے ہیں۔

"یہ دارالعلوم جس کو آج آپ نے اپنی تشریف آوری کی عزت بخشی ہے ہماری قومی زندگی میں ایک اہم حیثیت رکھتا ہے۔ اس کی تاریخ ایک بڑی ذہنی تحریک کی تاریخ ہے۔ جمود و تعطل ذہنی میں بیداری فکر کے ایک نئے دور کی داستان ہے۔ جہل کی تاریکی میں علم کی تنویری طاقت پر اعتماد کی کہانی ہے۔ غلامی میں آزادی کی تیاری اور آزادی کو صالح زندگی کی تعمیر کا وسیلہ بنانے کی ذمہ داری کی روداد ہے۔ انیسویں صدی عیسوی ہمارے وطن کے لئے بڑے ابتلا کا زمانہ تھا۔ برطانوی استعمار کی زنجیریں زندگی کے ہر شعبے کو جکڑتی جاتی تھیں۔ خود ہماری قومی زندگی کی اخلاقی توانائیاں مضمحل ہو گئی تھیں۔ انفرادی نفسی نفسی نے جماعتی مقاصد کو پس پشت ڈال دیا تھا۔ مغربی استعمار سے سیاسی نفرت و بیزاری نے مغربی علوم جدیدہ سے نفرت کا جذبہ پیدا کر رکھا تھا۔ حوصلے پست تھے ہمتیں شکست تھیں۔ اس عالم یاس میں ایک پیرِ جواں ہمت سید احمد خاں نے تعلیم کے ذریعہ احیاے ملی کا تہیہ کیا۔ ایک چھوٹے سے مدرسے کی بنا آج سے اسّی (۸۰) سال پہلے ۱۸۷۵ء میں ڈالی

جو پورا ثانوی مدرسہ بھی نہ تھا۔ اس میں کل ۷۰ طلبا تھے اور اس کا مجموعی خرچ تقریباً پانچ ہزار روپیے سالانہ تھا۔ دو سال بعد یہ مدرسہ کالج ہوگیا۔ اس کالج اور اس کے طلبا نے ملک میں بڑا نام پیدا کیا۔ ۱۹۲۰ء میں یہ یونیورسٹی ہوگیا۔ آج اس کے مختلف اداروں میں پانچ ہزار سے اوپر طالب علم ہیں۔ تقریباً ۳۵۰ استاد ہیں۔ اس کا سالانہ خرچ اس سال ۴۵ لاکھ روپیے سے اوپر ہے۔"

مسلم یونیورسٹی کا وفد شاہی دعوت پر ۱۹۵۶ء میں مملکت عربیہ سعودیہ گیا تھا۔ اس موقع پر سپاسنامے کے جواب میں ذاکر میاں نے جو تقریر کی اس میں اس بات کو وضاحت سے بیان کیا کہ ہندوستان کے مسلمان تاریخ کا ایک اہم رول ادا کرنے پر مامور ہیں:-

"میں سمجھتا ہوں کہ مسلمانانِ ہند کا مقام ہندی قوم میں آج ایک خاص حیثیت رکھتا ہے۔ مسلمان آبادیاں دنیا میں بہت ہیں۔ لیکن خدا کے فضل سے وہ کہیں اپنی زندگی کی تشکیل میں خود مختار ہیں، کہیں دوسروں کے زیرِ اقتدار آزادی سے محروم۔ مسلمانانِ ہند کی پوزیشن یہ ہے کہ وہ کسی کے زیرِ اقتدار نہیں۔ لیکن تنہا اقتدار بھی نہیں رکھتے۔ وہ ایک آزاد جمہوریت میں آزاد شہری کی حیثیت رکھتے ہیں، جس کی آبادی مختلف مذاہب و مسالک، مختلف السنہ اور مختلف تاریخی تمدنی عناصر پر مشتمل ہے۔ اسلام کی جو حیثیت عالمی زندگی میں ہونی چاہیے مسلمانوں کی وہی ہندوستانی زندگی میں ہے۔ جس طرح دنیا میں مسلمانوں کو اپنے سے مختلف اعمال و اعتقاد رکھنے والوں کے ساتھ زندگی گذارنی ہے اور اپنی مثال، اپنے افکار کی بلندی، اپنے کردار کی خوبی سے ایک صالح اور صحت مندانہ زندگی کا نمونہ دوسروں کے سامنے پیش کرنا ہے، اسی طرح مسلمانانِ ہند پر یہ ذمہ داری عاید ہوتی ہے کہ مشترک اور مختلف العناصر ہندی قوم میں حیاتِ طیبۂ اسلامیہ کا ایسا نمونہ پیش کریں جس سے ان کے

ہم وطنوں کے دل میں ان کے دین کے لئے جگہ پیدا ہو۔ زندگی کی وہ اعلیٰ قدریں جن کے یہ حامل ہوں عام ہندی زندگی کو متاثر کریں اور ہم کہ رحمۃ اللعالمین کے نام لیوا ہیں، اپنے وطن اور اہلِ وطن کے لئے شال اور رحمت کا کام دیں۔ مسلمانوں کی خود مختار آبادیاں جہاں اپنی تنہا حکومت رکھتی ہیں وہ سیاست کی آلودگیوں، اقتدارِ مطلق کی بسا اوقات اخلاقی پستی کی طرف لے جانے والی کششِ ثقل کے باعث شاید اس آسانی سے دوسروں پر اثر انداز ہونے کا فریضۂ اسلامی اس خوبی سے انجام نہ دے سکیں جیسے کہ ہندوستان کی آزاد مسلم آبادی دوسروں کے ساتھ مل کر ایک آزاد اور صالح جماعتی زندگی کی

تعمیر پر مامور ہے"

ہم نے اوپر ذاکر میاں کے خطبات سے جو نمونے پیش کئے ہیں ان سے ان کے فلسفۂ تعلیم کے علاوہ ان کی اسلامیت اور قومیت، دینداری اور وطن پرستی کا تصور واضح ہو گیا ہوگا۔ یہ سب ہماری تہذیبی زندگی کے بڑے اہم مسائل ہیں جن پر بڑی خوش اسلوبی سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ انشا پرداز کی حیثیت سے ذاکر میاں کے اسلوب کی تازگی اور قوت، برجستگی اور متانت اور جوشِ بیان، کلام کی تاثیر کی ضمانت ہیں صفحے کے صفحے پڑھ جایئے زبان وبیان میں تصنع کہیں نام کو نہیں۔ آمد ہی آمد ہے!! آورد کا کہیں پتہ نہیں۔ ان کی ہر تحریر میں ان کی پاکیزہ اور نکھری ہوئی شخصیت کی جھلکیاں صاف نظر آتی ہیں۔ یہ شخصیت ہے کس کی؟ ایک نیک دل اور نیک نیت انسان کی جو بیک وقت دین دار اور وطن دوست ہے، خوش معاملہ ہے، راست باز ہے۔ جس کی دیانت اور صداقت پر آج تک کسی نے انگشت نمائی نہیں کی۔ خدا نے جسے دل اور دماغ دونوں کی اعلیٰ دولت سے نوازا ہے۔ یہ اوصاف فطری بھی ہیں اور

اکتسابی بھی۔ جس کا ذکر ہے وہ بڑا ہی عالی ظرف ہے۔ بڑا آل اندیش، بڑا منکسر مزاج اور متواضع، بڑا متحمل اور صابر ہے۔ مزاج میں چشم پوشی، درگذر اور انصاف پسندی کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ ہر معاملے میں قطعی رائے رکھتے ہوئے اس کے اظہار میں اس کا خیال رہتا ہے کہ کسی کے دل کو چوٹ نہ لگے، نہ کسی کی ذلت و توہین ہو۔ اگر کسی کی رائے سے اختلاف ہے تو اس کی تالیفِ قلب کا سلسلہ برابر جاری رہتا ہے کہ سننے والے کو ناگواری کم سے کم ہو۔ حق گوئی کی جرأت اور انکسار بہ پہلو رہتے ہیں۔

اعلیٰ سیرت | آیئے ذرا دیکھیں کہ اعلیٰ انسانوں میں کون سی ایسی خصوصیات ہوتی ہیں جن کے باعث ہم ان کی عظمت کے آگے جھکنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ سب سے اوّل تو یہ کہ ان کے دل انسانی ہمدردی سے معمور ہوتے ہیں۔ انسانیت دنیا کے کسی کونے میں دکھی ہو ان کے دل میں ٹیس ہوتی ہے۔ اس میں وہ یہ نہیں دیکھتے کہ دکھی کا مذہب، یا اس کی قومیت کیا ہے اور اس کا کس نسل سے تعلق ہے۔ یہ دل سوزی کی صفت قدرِ مشترک ہے جو دنیا کے اعلیٰ پائے کے انسانوں میں ملتی ہے۔ یہ دلسوزی محض زبانی جمع خرچ تک محدود نہیں ہوتی بلکہ انھیں خدمتِ خلق کے لئے ابھارتی ہے۔ یہ بے غرضی اپنوں اور پرایوں میں فرق و امتیاز نہیں کرتی۔

ذاکر میاں کی طبیعت میں دو اور اوصاف ہیں جن سے ان کی انسان دوستی کا خمیر بنا ہے۔ یہ ہیں صداقت اور جرأت۔ اگرچہ وہ بے حد خلیق اور منکسر مزاج ہیں اور کبھی کسی کی دل آزاری یا توہین نہیں چاہتے، بایں ہمہ جب ضرورت ہو تو حق بات کہنے میں تامل بھی نہیں کرتے۔ چند سال ہوئے دہلی میں قومی یک جہتی کی کانفرنس (نیشنل انٹیگریشن کانفرنس) ہوئی تھی جس میں مرکزی اور صوبائی حکومتوں کے وزیر اور کانگریس

کے سب بڑے بڑے نیتا شریک تھے۔ قومی یکجہتی پر بہت سی تقریریں ہوئیں، بعض نے بڑی دور کی کوڑی لانے کی کوشش کی۔ گفتگو دلچسپ مگر حقیقت سے دور تھی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے مرض کا جو علاج تجویز کیا جا رہا ہے وہ اوپری ہے۔ اندرونی بیماری پر نظر نہیں گئی۔ یا لوگ دیدہ و دانستہ نظر بچا گئے تاکہ خود فریبی کو ٹھیس نہ لگے۔ ذاکر میاں کو تقریر کے لئے کہا گیا تو انھوں نے کہا کہ ہماری قومی یک جہتی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ذات پات کا نظام ہے جس کی جڑیں ہماری زندگی میں اتنی گہری پیوست ہیں کہ آزادی حاصل ہو جانے کے باوجود وہ اپنی جگہ ٹس سے مس نہیں ہوئیں۔ ہمارا دستورِ اساسی اسے مانے یا نہ مانے، وہ بھی ان رسم و رواج کو یکایک نہیں بدل سکتا جو ہزارہا سال سے سماجی زندگی پر چھائے ہوئے ہیں، جب تک کہ خود معاشرہ اپنے اخلاقی ارادے کی قوت سے انھیں نہ بدلے۔ انھوں نے اس پر تعجب کا اظہار کیا کہ مولانا ابوالکلام آزاد کو کانگریس نے ایسے حلقۂ انتخاب سے منتخب کرایا جہاں مسلمان رائے دینے والے اکثریت میں تھے۔ مولانا اس ملک کی سیاست میں کوئی غیر معروف شخص نہ تھے۔ تاہم ان کے ساتھ یہ صورت اختیار کی گئی، دوستوں کا تو ذکر ہی کیا ہے۔ جب ذاکر میاں نے اپنی تقریر ختم کی تو ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔ یہ تالیاں ایک حق بات پر پسندیدگی کے لئے تھیں۔

صبر و تحمل کی صفت بڑے ریاض کے بعد پیدا ہوتی ہے۔ ذاکر میاں بعض اوقات نہایت خود غرض، جھوٹے اور متفنی لوگوں کو انگیز کرتے ہیں حالانکہ وہ ان کی بد طینتی سے بخوبی واقف ہوتے ہیں۔ ان کی فراست بلا کی ہے۔ کوئی چاہے کہ جھوٹی سچی باتوں یا للو پتو سے انھیں رام کر لے تو وہ بڑی غلطی میں ہے۔ خوشامد سے انھیں نفرت ہے۔ وہ ہر ایک کی تہ تک بہت جلد پہنچ جاتے ہیں۔ جنھیں اچھا نہیں سمجھتے ان کے ساتھ بھی اخلاق سے

پیش آتے ہیں۔ احمقوں اور کوڑ مغزوں کو بھی بڑے صبر سے جھیلتے ہیں۔ میں نے انھیں بعض اس قسم کے لوگوں سے باتیں کرتے دیکھا ہے۔ یہ لوگ اس غلط فہمی میں گھر واپس جاتے ہیں کہ ہم نے اپنی لیاقت کا کیسا سکہ بٹھا دیا۔ بے وقوف کہیں کے! ذاکر میاں چاہتے ہیں کہ وہ اپنی اس غلط فہمی میں مبتلا رہیں اور ازالۂ وہم کی نوبت نہ آئے۔ یہ اس لئے ہے کہ وہ کسی کا دل نہیں دکھانا چاہتے۔

اعلیٰ سیرت کی تعمیر میں جہاں اقدارِ عالیہ سے گہرا لگاؤ ضروری ہے وہاں یہ بھی ضروری ہے کہ فکر کی صلاحیت بدرجۂ اتم موجود ہو، تاکہ تمام معاملات کی نسبت جن کا تعلق اپنی ذات سے یا جماعتی زندگی کے مسائل سے ہو، آدمی صحیح نتائج اخذ کرسکے۔ قدرت نے ذاکر میاں میں غیر معمولی فراست اور فکری قابلیت ودیعت کی ہے۔ وہ جلد اپنی رائے قائم کر لیتے ہیں اور اکثر و بیشتر وہ صحیح ہوتی ہے۔ ان کی ہر بات میں سنجیدگی، متانت اور وزن ہوتا ہے۔ جو رائے قائم کر لیتے ہیں، اس پر عمل کرتے ہیں۔ ذہن کی تیزی اور سلامتیِ طبع ایک جگہ کم جمع ہوتی ہیں۔ لیکن ذاکر میاں میں دونوں موجود ہیں۔ اسی طرح عقلی اور وجدانی صلاحیت ایک جگہ کم ملتی ہے لیکن غیر معمولی اشخاص میں ان دونوں کے جمع ہونے سے بڑے بڑے کام ظہور میں آتے ہیں۔ جن سے پوری سوسائٹی فائدہ اٹھاتی ہے۔

انشاپردازی ایک اعلیٰ انسان اور ماہرِ تعلیم ہونے کے علاوہ ذاکر میاں کا شمار اردو زبان کے چوٹی کے انشاپردازوں میں ہے۔ یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ ادب میں ادبیت کہاں سے آتی ہے۔ لیکن یہ بات یقینی طور پر کہی جاسکتی ہے کہ ادبیت خلوص کے بغیر جلوہ گر نہیں ہوسکتی۔ لیکن اس کے ساتھ یہ ماننا پڑیگا کہ ہر مخلص شخص اعلیٰ درجہ کا ادیب نہیں ہوجاتا۔ ادیب کے لئے یہ از بس لازمی ہے کہ اس میں اظہارِ خیال کی قابلیت ہو ورنہ کسی کے کتنے ہی عمدہ خیالات

کیوں نہ ہوں اگر وہ اُن کے اظہار پر قدرت نہیں رکھتا تو ان کی خوبی اس کا اندرونی تجربہ ہو کر رہ جائے گی جس میں دوسرے شرکت نہیں کر سکیں گے، بالکل اسی طرح جیسے گونگے کے منہ کا گڑ۔ اظہار خیال کی اعلیٰ قابلیت اور اخلاص دونوں مل کر ادب کا جادو جگاتے ہیں۔ یہ دونوں صفتیں ذاکر میاں کی تحریروں میں موجود ہیں۔ ان کے طرز تحریر میں کہیں کہیں خطیبانہ شان آگئی ہے لیکن اس میں آورد اور تصنع کا نام نہیں۔ ان کی تحریروں سے فکر میں سموئی ہوئی سچی جذباتی کیفیت ظاہر ہوتی ہے۔ اگر کوئی مجھ سے پوچھے کہ حقیقی ادبیت کا سب سے بڑا دشمن کون ہے۔ تو میں اس کا فوراً یہ جواب دونگا کہ تصنّع۔ جس تحریر میں تصنّع ہو، وہ کبھی تخلیقی ادب نہیں ہو سکتی۔ زیادہ سے زیادہ آپ اسے ادبی ملمع کاری کہہ سکتے ہیں جو آج کل ہمارے نام نہاد انشا پردازوں کے یہاں بہت عام ہے۔ شوق ہے کہ کہے جائیں اگرچہ کہنے کے لئے کچھ ہے نہیں۔ یہ کہیں مرصع نگاری کا روپ دھارتی ہے اور کہیں شاعرانہ طرز بیان کی صورت اختیار کرتی ہے۔ خلوص کی کمی کے باعث کلام کا اصل مقصد نہیں حاصل ہوتا یعنی تاثیر۔ لفظ بے روح کے قالب ہیں اگر ان کی تہ میں اصلیت اور صداقت کی کارفرمائی نہ ہو۔

ذاکر میاں کے طرز تحریر میں خلوص کے ساتھ جوش اور ولولہ، تازگی اور قوت ہے جو ان کی شخصیت کا عطیہ ہے۔ انھیں جو کہنا ہے اسے بالکل فطری انداز میں کہتے ہیں۔ بعض دفعہ دوسری مصروفیتوں کے باعث وہ اپنی تحریر پر نظر ثانی تک نہیں کر پاتے۔ اس کے باوجود عبارت میں کہیں ڈھیلا پن اور جھول نہیں ہوتا۔ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے دریا کی روانی کی طرح لفظوں کے قافلے پے در پے رواں دواں ہیں جن کی توانائی اور دل آویزی جاذبِ قلب و نظر ہوتی ہے۔ ذاکر میاں کا شمار اردو کے صاحبِ طرز

ادیبوں میں بجا طور پر کیا جاتا ہے۔

افلاطون کی ریاست کا ترجمہ

بلاغت، کلام کے حسبِ حال اور با موقع ہونے کا نام ہے۔ چنانچہ ذاکر میاں کی تحریروں میں جو مختلف موضوعوں پر ہیں طرزِ ادا کا فرق مضمون کی مناسبت سے صاف نظر آتا ہے اگرچہ بنیادی طور پر اسلوب وہی رہتا ہے جس میں ہر حال میں ان کی شخصیت جھلکتی ہے۔ یہاں ان کی مختلف تحریروں سے چند نمونے پیش کئے جاتے ہیں تاکہ اس بات کا صحیح اندازہ ہو سکے۔ افلاطون کی "ریاست" کا اردو ترجمہ انھوں نے آج سے چالیس سال پہلے کیا تھا جب وہ ایم۔ او۔ کالج میں طالب علم تھے۔ اس میں بنیادی اسلوب وہی نظر آتا ہے، جو بعد کی تحریروں کی خصوصیت ہے "ریاست"، دنیا کے سب سے بڑے مصنّف کی سب سے اہم تصنیف ہے۔ ذاکر میاں نے جو اردو ترجمہ کیا ہے وہ ایسا شُستہ اور سلیس ہے کہ پڑھتے وقت یہ خیال ہی نہیں ہوتا کہ یہ ترجمہ ہے۔ دراصل یہ بات مصنف اور مترجم کی وضع نفسی کی یکسانیت کی دلیل ہے اور اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ مترجم کو موضوع اور اظہارِ مطالب دونوں پر پوری قدرت حاصل ہے۔ ترجمے کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

"اس وقت چونکہ اکثر ممالک میں معاشی زندگی کا ایک اشتراکی مسلک رفتہ رفتہ رواج پا رہا ہے، اس لئے افلاطون کی تجاویز کو ذرا سطحی نظر سے دیکھنے والے اس کے نظامِ معیشت کو جدید اشتراکی نظام سے ملا دیتے ہیں، جو صحیح نہیں۔ افلاطون کے اشتراک کو جدید اشتراک سے دور کی نسبت بھی نہیں ہے۔ اشتراکِ جدید پوری ہیئتِ اجتماعی کے لئے ایک تجویز ہے اور افلاطون کا اشتراک ریاست کے صرف ایک مخصوص طبقے کے لئے۔ جدید اشتراک دولت آفرینی کا سارا کام ریاست کے سپرد کرنا چاہتا ہے۔ افلاطون کے نظام میں دولت آفرینی بدستور افراد ہی کے سپرد ہے اور اس مجوزہ نظام کا براہ راست

کوئی اثر کسی دوکاندار، مزدور یا کسان پر نہیں پڑتا۔ جدید اشتراک ہر ایک سے دولت آفرینی کا کام لے کر دولت کو بڑھاتا اور پھر اس دولت کو سب میں برابر تقسیم کرنا چاہتا ہے۔ افلاطون کے اشتراک میں وہ طبقہ جس کے لئے یہ نظام تجویز کیا گیا ہے دولت آفرینی میں حصہ ہی نہیں لے سکتا۔ جدید اشتراک کے پیشِ نظر ایک معاشی مسئلہ ہے، افلاطون کے سامنے ایک اخلاقی مہم۔ جدید اشتراک سیاسی اور معاشی قوت کا حامل جمہور کو بنانا چاہتا ہے۔ افلاطون کا اشتراک تزکیۂ سیاست کی خاطر اپنے حکمراں طبقے کو معاشی زندگی سے بالکل بے تعلق کرنا چاہتا ہے۔ جدید اشتراک دولت کا اشتراک ہے۔ افلاطون کا اشتراک ترکِ دولت کا اشتراک'' (ص ۲۸)

۱۹۴۰ء کی بنیادی تعلیمی کانفرنس کی تقریر	جامعہ نگر میں ۱۹۴۰ء میں جو بنیادی تعلیمی کانفرنس منعقد ہوئی تھی اس میں بابو راجندر پرشاد کی معرفت جنھوں نے اس کانفرنس

کا افتتاح کیا تھا یہ اپیل سیاسی رہنماؤں کو بھجوائی:

''خدا کے لئے اس ملک کی سیاست کو سدھاریئے اور جلد سے جلد ایسی ریاست کی طرح ڈالئے جس میں قوم قوم پر بھروسا کر سکے۔ کمزوروں کو زورآور کا ڈر نہ ہو، غریب امیر کی ٹھوکر سے بچا رہے۔ جس میں تمدن، تمدن امن کے ساتھ پہلو بہ پہلو پھل پھول سکیں اور ہر ایک سے دوسرے کی خوبیاں اجاگر ہوں۔ جہاں ہر ایک وہ بن سکے جس کے بننے کی اس میں صلاحیت ہے اور وہ بن کر اپنی ساری قوت کو اپنے سماج کا جاکر جانے۔ میں جانتا ہوں کہ ان باتوں کا کہہ دینا سہل ہے اور کرنا کسی ایک آدمی کے بس کی بات نہیں۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ آج یہ بات ہمارے سیاسی رہنماؤں کے ہاتھوں میں اتنی ہے جتنی پہلے کبھی نہ تھی کہ کچھ سمجھ کر، کچھ سمجھا کر، کچھ مان کر کچھ منوا کر، ایسی ریاست کی

ینور کھ دیں۔ جب تک یہ نہیں ہوتا ہم تعلیمی کام کرنے والوں کا حال قابلِ رحم ہے۔ ہم کب تک اس سیاسی ریگستان میں ہل چلائیں۔ کب تک شبہہ اور بدگمانی کے دھوئیں میں تعلیم کو دم گھٹ گھٹ کر سسکتے دیکھیں۔ کب تک ہم اس ڈر سے تھراتے رہیں کہ ہماری عمر بھر کی محنت کو کوئی ایک سیاسی حماقت، کوئی ایک سیاسی ضد بھسم کر دیگی۔ ہمارا کام بھی کوئی پھولوں کی سیج تو ہے نہیں اس میں بھی بہت مایوسیاں ہوتی ہیں اور اکثر دل ٹوٹتا ہے۔ پھر جب ہمارے قدم ڈگمگائیں تو ہم کہاں سہارا ڈھونڈیں۔ کیا اس سماج میں جہاں بھائی ایک دل نظر نہیں آتے، کوئی قدر آخری قدر نہیں معلوم ہوتی جس میں کوئی گیت نہیں جو سب مل کر گائیں، کوئی تہوار نہیں جو سب مل کر منائیں۔ کوئی شادی نہیں جو سب مل کر رچائیں کوئی دکھ نہیں جسے سب بٹائیں۔ ہماری یہ مشکل دور کیجئے۔ اب بھی بہت دیر ہو چکی ہے اور دیر نہ جانے کیا دن دکھائے۔"

(خطبات ص ۹۲)

جامعہ کی سلور جوبلی کے موقع پر جامعہ کا پرچم لہرانے کی رسم کے بعد جو تقریر کی وہ اردو زبان کی خطابت کا اعلیٰ نمونہ پیش کرتی ہے۔ میں اس موقع پر موجود تھا۔ اس تقریر کے ڈھلے ڈھلائے بول ایسے نہیں کہ کسی نے انھیں سنا ہو اور بھول جائے۔ امیر جامعہ عبدالمجید خواجہ کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا ۔

"۲۵ برس کا گذر جانا کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے۔ زمانہ جوں توں ہمیشہ گذرتا ہی ہے لیکن کسی عزم کا ایک مخصوص شدت کے ساتھ ایک عرصے تک قائم رہنا زمانے کے ہردم بہتے دھارے میں ایک نئی توانائی کا اضافہ کرتا ہے۔ اس عزم کی اچھائی یا برائی، شدت یا کمزوری اس وقت سے جو اس پر گذرتا ہے گھٹتی بڑھتی ہے۔ آپ کی خدمت میں مبارکباد اس لئے پیش کرتا ہوں کہ ہماری حیاتِ ملی کے ایک عہد آفریں عزم نے ایک خاص شدت

کے ساتھ ۲۵ سال سے اوپر کی مدت گذاری ہے۔ خصوصیت سے آپ کی خدمت میں ہدیہ مبارکباد پیش کرتے ہوئے مجھے جامعہ کی زندگی کا وہ ابتدائی دور یاد آتا ہے جب اگر آپ کی مخلصانہ، مجاہدانہ سرکردگی حاصل نہ ہوتی تو یہ دیا شاید مخالفوں کی پھونکوں سے بجھ جاتا۔ یہ ننھا سا بیج اگنے سے پہلے شاید کھنڈل دیا جاتا اور ایک نیا چراغ روشن کرنے کے لئے حالات اور بخت و اتفاق کی نہ معلوم کن کن مطابقتوں کا انتظار کرنا پڑتا۔

"ان ۲۵ برس میں جو گذر چکے ہیں ہم نے اس پرچم کو جسے آپ نے ابھی لہرایا ہے کچھ معنی دینے کی کوشش کی ہے۔ ہم نے کوشش کی ہے کہ یہ صحیح تعلیم اور صالح تربیت کا پرچم بن جائے یعنی انفرادی استعدادوں کو کچلے بغیر سیرت میں یکسوئی اور شخصیت میں پختگی پیدا کرنے کا پرچم بن جائے۔ محنت کشی کا پرچم بن جائے۔ نتائج سے بے نیاز سعی صحیح اور سعی پیہم کا پرچم بن جائے۔ کام کو عبادت کی طرح انجام دینے کا پرچم بنجائے۔ باتیں بناکر چمکنے کی سستی سہولتوں کے باوجود جانیں کھپاکر زندگیاں بنانے کا پرچم بنجائے۔ قوت، پاکی زیبائی کا پرچم بنجائے ہمت اور استقامت کا، بے ڈر اخلاقی جرأت اور بے باک صداقت کا، عدل اور حق کی حمایت میں سینہ سپر ہونے کا، ہر ہنگامۂ بے تمیزی میں متانت اور شرافت کا پرچم بنجائے۔ عُسر میں یُسر پر یقین اور یُسر میں اس کی طرف دھیان جو یُسر عطا فرماتا ہے مشکلوں میں صبر اور آسانیوں میں شکر کا پرچم بن جائے۔ ہم نے کوشش کی ہے کہ اس کے سایے میں پرورش پانے والے اچھے سچے تندرست، من دوست انسان ہوں۔ باادب، باتمیز، ارادوں میں پکے، خیالات میں واضح اور ستھرے۔ اپنی کہنے کے قابل، دوسرے کی سننے اور سمجھنے پر آمادہ، زندہ دل، نڈر، بس ایک خدا سے ڈرنے والے اور سب کے ڈر سے بے نیاز۔ ہم نے سچے دل اور پورے یقین کے ساتھ اس پرچم کو یہ معنی دینے کی کوشش کی ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ یہ کوشش ناتمام

ہے۔ ہماری کوتاہیوں کی وجہ سے ناتمام ہے، لیکن ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ جو ایسا ارادہ کرتا ہے اور اس کے لئے کوشش کرتا ہے اس کی سعی مشکور ہوتی ہے اس کی بارگاہ میں جو دلوں میں اچھے عزم پیدا کرتا ہے اور ان کو پورا کرنے کی طاقت بخشتا ہے اور ڈگمگاتے قدموں کو ثبات عطا فرماتا ہے۔"

پنڈت نہرو کا مسلم یونیورسٹی میں استقبال

۱۲ نومبر ۱۹۵۵ء میں پنڈت جواہر لال نہرو کے مسلم یونیورسٹی تشریف لانے کے موقع پر جو تقریر کی اس کا اقتباس پیش کیا جاتا ہے:۔

"کیسی خوش نصیبی ہے میری کہ اپنے محبوب اور محترم مہمان پنڈت جواہر لال نہرو وزیر اعظم ہند کو اس یونیورسٹی میں خیر مقدم کرنے کا شرف مجھے حاصل ہوا ہے۔ پر ہے یہ شرف خاصا کٹھن۔ رسمی خیر مقدم ہو تو جیسے تیسے لفظوں میں ادا ہو جائے۔ جب گرمی کی تپتی پیاسی زمین پر برسات کی گھنگھور گھٹا منڈلاتی ہے تو اس کا ذرہ ذرہ زندگی کی ایک چھپی ہوئی لہر سے تھپکنے لگتا ہے۔ پر اس گھٹا کے خیر مقدم کے لئے وہ لفظوں سے کام نہیں لیتی۔ جب خزاں کی مردنی کے بعد پودوں کی رگوں میں دوڑنے والا رس اور ٹہنیوں میں سے جھجک جھجک کر ٹھٹک ٹھٹک کر جھانکنے والی کلیاں بادِ بہاری کا خیر مقدم کرتی ہیں تو مارے خوشی کے کھل پڑتی ہیں گمسان کا جوشِ نمو خیر مقدم کے لئے لفظ نہیں ڈھونڈ پاتا۔ جب بہار کے قافلے کی پہلی چڑیا چمن میں پہنچتی ہے تو سارا چمن فرطِ خوشی سے لہلہاتا ہے، مسکراتا ہے پر کچھ کہہ نہیں سکتا۔ آدمی نادان ایسے موقعوں پر بھی اس مشورے کو بھول کر کہ "نگاہِ شوق اس مضمونِ رنگین کو ادا کر دے"، لفظوں ہی میں کچھ کہنا چاہتا ہے اور آخر کو اپنی بے بسی پر شرماتا ہے۔ میں بھی اپنی سادگی اور نادانی میں اس رنگین مطلب کو لفظوں میں ادا کرنے کھڑا ہو گیا ہوں پر جانتا ہوں کہ یہ کہتے بنے گا نہیں۔ پھر بھی یقین ہے کہ پنڈت جی اسے سمجھ لیں گے۔"

دکشن بھارت ہندی پرچار سبھا مدراس کا خطبہ

دکشن بھارت ہندی پرچار سبھا مدراس کے جلسے میں جو ۱۹۴۸ء میں ہوا تھا ذاکر میاں نے گاندھی جی کا جن لفظوں میں ذکر کیا ہے وہ خلوص اور محبت کے جذبات میں شرابور ہیں۔ جو اس خطبے کو پڑھے گا متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ موقع اور محل کے لحاظ سے بیان کا جو اسلوب اختیار کیا ہے وہ اقتضائے حال کے عین مطابق ہے۔ گاندھی جی ہندوستانی کو جسے اردو اور ہندی دونوں طرز میں لکھا جا سکتا تھا قومی زبان بنانا چاہتے تھے۔ افسوس ہے کہ یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوا۔ ذیل میں جو عبارت پیش کی جا رہی ہے اس سے یہ اندازہ ہوگا کہ ہندوستانی زبان کتنی سندر ہے، کتنی لطیف ہے اور مطالب کو ادا کرنے کی اس میں کیسی غیر معمولی صلاحیت ہے۔ سارا دار و مدار اس پر ہے کہ اسے برتنے والا کون ہے۔

"باپو کے گذر جانے سے کون سا اچھا کام ہے جس کو دھکا نہیں لگا ہے۔ وہ جب تک ہم میں تھے تو پوری طرح ان کے کام کا پھیلاؤ ہمیں دکھائی نہیں دیتا تھا۔ آج اُن کے اٹھ جانے کے بعد سوجھتا ہے کہ اس ایک آدمی کا ہاتھ کہاں کہاں تھا۔ اس نے قومی زندگی کے ایک ایک روئیں کو کیسا سمجھا تھا۔ وہ اپنی مسیحائی انگلی سے کیسے ہماری دکھتی رگ کو چھوتا تھا اور ہر دکھ کے لئے دوا کے کیا کیا جتن کرتا تھا۔ وہ خالی آزادی نہیں چاہتا تھا۔ آزادی کے لئے ایک قوم بنانا چاہتا تھا۔ وہی ایک تھا جو جانتا تھا کہ راج ہی تو دھرتی پر قوم کی پرکھ نہیں ہوتا ہے۔ اصل چیز راج نہیں ہے۔ قومی جیون ہے۔ قومی جیون روگی ہو تو راج ملا ملایا بگڑتا ہے اور بگاڑتا ہے۔ خود سڑتا ہے اور قومی جیون کو سڑاتا ہے۔ مصیبت بن جاتا ہے۔ چھِن جاتا ہے۔ اور جب یہی جیون سدھرتا ہے تو غلامی کی گھٹا ٹوپ رات میں بھوکے پیٹ ننگے بدن تھرتھراتے ہاتھوں سوراج کا دیا روشن کر لیتا ہے۔ اس کے سنورنے سے

راج سنورتا ہے۔ اس کی مضبوطی سے راج کا بل بڑھتا ہے۔ گاندھی جی رام راج چاہتے تھے۔ اس لئے انھوں نے ساری زندگی قوم کو نیک اور اچھا بنانے میں کھپا دی۔ کہنے اور کرنے کی بیچ کی کڑی جو بہتوں کے یہاں ٹوٹتی رہتی ہے اسے جوڑا پھر جو کچھ کیا اسے سچائی اور اچھائی کے قانون پر پرکھا۔ کھرا پایا تو اس پر جان دینے کی حد تک اڑے۔ اپنے یا اپنے ساتھیوں کے کام میں کوئی کھوٹ پائی تو جگ ہنسائی تک سے نہ ڈرے۔ اور کھوٹ کو کھوٹ بتایا اور تجایا۔ اور یوں اس میدان میں جہاں اچھے نیک لوگ برائی کا سہارا لینے اور برائی کو سہارا دینے سے نہیں چوکتے، جہاں بہتیرے پاک آدرشوں کے لئے ناپاک ذریعوں کے برتنے کو کچھ برا نہیں جانتے، جہاں اپنی آزادی کے لئے دوسروں کو غلام کرنے کا چلن ہے۔ جہاں اپنا حق لینے کے لئے دوسروں کا حق مار لینا کوئی بری بات نہیں سمجھی جاتی، جہاں ایکتا کے نام پر آپس میں نفرت پھیلانے سے لوگ نہیں چوکتے، جہاں دیش کے کارن جھوٹ بولنا سچ کا درجہ رکھتا ہے۔ قوم کے فائدے کے لئے ظلم انصاف مانا جاتا ہے، وہاں اس کٹھن میدان میں اس خدا کے بندے نے سچ اور انصاف کو پھر سے تخت پر بٹھانے کی کوشش کی اور اپنی ساری زندگی اس کوشش میں لگا دی۔ اور اسطرح لگا دی کہ میدان سے اٹھنے سے پہلے وہ ہماری قوم ہی کی نہیں ساری انسانیت کے ضمیر کی آواز بن گیا تھا۔ بے لاگ، بے میل، کڑوی، ستانے والی، بے کل رکھنے والی، مگر جی میں گھر کرنے والی آواز۔ بڑی بھول میں ہے وہ جو سمجھتا ہے کہ یہ آواز چپ ہو گئی ہے۔ نہیں، یہ ہمارے قومی جیون کے رونگٹے رونگٹے میں بس گئی ہے۔ سچ کے راستے پر جب ہمارے قدم ڈگمگائیں گے تو یہ ہمیں للکارے گی۔ ظلم کے لئے جب کبھی ہمارے ہاتھ اٹھیں گے تو یہ ان کو روکے گی۔ ہم ضرور کبھی کبھی اس آواز کو دبانا چاہیں گے۔ اپنے کانوں میں انگلیاں ڈال کر

اس کے سننے سے بچیں گے۔ مگر یہ ہمارا پیچھا نہیں چھوڑے گی۔ یہ کانٹا بن کر ہمارے دل میں کھٹکے گی۔ ہماری نیند حرام کردے گی اور اپنے کو سنوا کر، منوا کر، رہے گی۔ اور اگر کہیں ہم نے اسے دبا دیا، ہمارے کان اس کے لئے بہرے ہو گئے تو ہم چاہے کچھ اور بن جائیں، دنیا میں ایک اچھی، سچی، نیک قوم نہ بن سکیں گے۔ خدا نہ کرے کہ ہم کبھی اس آواز کو دبا سکیں۔"

آگے چل کر اس خطبے میں ہندوستانی زبان کے متعلق جن امیدوں اور خواہشوں کا اظہار کیا ہے وہ وہی ہیں جو ہر سچے دیش بھگت کے دل کی آواز ہیں۔ یہ بات یاد رہے کہ یہ خطبہ ملک کی تقسیم کے بعد کا ہے۔

"مجھے ہندوستانی بھاشا میں ہند کی اصلی روح کی جھلک دکھتی ہے اور آپ کے کام کو اس روح سے جڑا پاتا ہوں۔ میری نظر میں ہندوستانی کی روح ہماری اصلی قومی روح ہے۔ وہ نفرت کی روح نہیں، محبت کی روح ہے۔ کرودھ کی روح نہیں، پریم کی روح ہے۔ وہ الگ کرنے کی نہیں، میل جول کی روح ہے۔ توڑنے کی روح نہیں، جوڑنے کی روح ہے۔ وہ ٹولیوں، پرانتوں، فرقوں کی تنگ روح نہیں، وہ دیش کی ساری جنتا کی وشال روح ہے۔ یہ پنڈتوں، مولویوں اور ان کے سہارے اپنا اُلّو سیدھا کرنے والوں کی روح نہیں ہے۔ یہ سارے دیش واسیوں کی ایک سی سیوا کی روح ہے۔ یہ پنجروں میں بند جانوروں کی نہیں، کھلی ہوئی ہوا میں آزاد اڑنے والوں کی روح ہے۔ اس کی روشنی میں پریم، سیوا اور ایکتا کی کرنیں ملی ہوئی ہیں۔ اس وشال روح نے ہندوستانی بھاشا میں ایک روپ پالیا ہے۔ اس نے دیش پردیش کا بھید مٹایا ہے۔ انجان آدمیوں کے دلوں کو بھائیوں، دوستوں، ساتھیوں کا دل بنایا ہے۔ اس نے

خود غرض ٹولیوں کو توڑتا ہے اور جنتا سے اپنا رشتہ جوڑتا ہے۔ اس کا کام وہی کر سکتے ہیں جن کے دل و جان میں اس کی روح کام کر رہی ہو۔ وہ کر سکتے ہیں جو پریم، دیش سیوا اور دیش ایکتا کے سیوک ہیں۔ جن کے دل میں سب دیش والوں کے لئے جگہ ہے۔ جو شبدوں کی جنم پتری نہیں بناتے اور بھاشا میں چھوت چھات نہیں برتتے۔"

اردو کانفرنس | لکھنؤ میں اردو کانفرنس اس لئے منعقد ہوئی تھی کہ اردو کی حمایت میں جو ۲۰ لاکھ دستخط ہوئے تھے انھیں ایک محضر کے ساتھ صدرِ جمہوریۂ ہند (راشٹرپتی) کی خدمت میں پیش کیا جائے۔ انجمن ترقی اردو کے صدر کی حیثیت سے ذاکر میاں نے اس موقع پر جو خطبہ دیا اس میں ان غلط فہمیوں کو دور کرنے کی کوشش کی جو اردو زبان کے متعلق جان بوجھ کر پھیلائی جا رہی تھیں۔ کوئی کہتا تھا کہ اردو اس ملک کی زبان نہیں ہے۔ کوئی کہتا تھا کہ یہ کوئی زبان ہے ہی نہیں، بلکہ ہندی کی ایک خاص اسلوب (شیلی) ہے۔ کوئی کہتا تھا کہ یہ مسلمانوں کے سیاسی تسلط کی نشانی ہے، اس کا مٹ جانا ہی اچھا ہے۔ کسی کے نزدیک اردو پاکستانی ذہنیت کی غمازی کرتی ہے۔ اور جب مسلمانوں کے لئے پاکستان قائم ہو گیا، تو اردو کے لئے ہندوستان میں حقوق کا مطالبہ کیوں کیا جاتا ہے۔ کسی کا خیال تھا کہ اردو کو علاقہ واری زبان منوانے کی کوشش کھلی فرقہ واریت ہے جسے برداشت نہیں کیا جا سکتا۔ غرضیکہ جتنے منھ اتنی باتیں۔ اردو بے چاری پر ہر طرف سے تکے لگنے لگے۔ ذاکر میاں نے بڑی جرأت سے اردو غریب کی حمایت میں اپنی آواز بلند کی:۔

"کیسا ستم ہے کہ اردو پر اور اردو کے حامیوں پر کوئی فرقہ پرستی کا الزام لگائے۔ اردو کسی فرقے کی زبان نہیں ہے۔ کسی مذہب کی زبان نہیں ہے۔ کسی حکومت کی چلائی ہوئی زبان نہیں ہے۔ کسی خاص نیت سے مصنوعی گڑھی ہوئی زبان نہیں ہے۔ یہ تو

میل جول کا پھل ہے۔ جنتا کی زبان ہے۔ ان لوگوں کی زبان ہے جن کے دل کو کچھ لگی تھی اور وہ اسے دوسرے انسانوں تک پہنچانا چاہتے تھے۔ اور جو ان سے محبت کرتے تھے اور کان دھر کے ان کی بات سننا چاہتے تھے۔ بازار میں کاروبار کے لین دین سے بنی ہوئی زبان ہے۔ منڈیوں میں مبادلۂ اجناس کے ساتھ ساتھ مبادلۂ افکار کے عمل کا نتیجہ ہے۔ یہ فقیروں اور سنتوں کی زبان ہے جو کسی روایت سے ایسے لپٹے ہوئے نہ تھے کہ ہر نئی بات سے، ہر نئے اسلوب سے بدکیں۔ لوگوں سے نہیں لفظوں سے بھی گھن کریں۔ یہ ان کی زبان ہے، وسعت قلب کی زبان ہے۔ رواداری کی زبان ہے۔ محبت اور پریم کی زبان ہے۔ اس لئے ایسی کشادہ دامن زبان ہے۔ ایسی پرمغز زبان ہے۔ ایسی جاندار زبان ہے۔ اس ملک کے رہنے والوں کے رابطۂ دلی اور رابطۂ ذہنی کا نتیجہ ہے اور ان بننے والوں میں ہندو، مسلم، سکھ، کا کوئی امتیاز نہیں۔"

انسان دوستی اور اسلام ذاکر میاں کی انسان دوستی خاص کر اسلام کی تعلیم سے اپنا نور اور بصیرت حاصل کرتی ہے۔ ویسے ان کا زندگی کا نقطۂ نظر عالمگیر ہے۔ ذہنی طور پر وہ عقل پسند اور جذباتی طور پر مذہبی انسان ہیں جس کسی نے انھیں راتوں کو کلام پاک کی تلاوت کرتے سنا یا دیکھا ہے وہ ان کے خشوع وخضوع سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ وہ اپنی دینداری کو چھپاتے ہیں۔ اپنے قریب ترین عزیزوں سے بھی۔ نہ وہ یہ چاہتے ہیں کہ کوئی انھیں عبادت کرتے ہوئے دیکھے۔ میں سمجھتا ہوں، یہ ان کے اخلاص وعقیدت اور بے ریا اور بے تصنع زندگی کا اقتضا ہے۔ ان کی عبادت نمایش کے لئے نہیں بلکہ حقیقی معنوں میں اظہارِ عبودیت کے لئے ہے۔ جس طرح ان کے پالے پوسے ہوئے ادارے جامعہ ملیہ اسلامیہ میں قومیت اور اسلامیت کے اصول کو ملا کر بطور نصب العین رکھا گیا ہے اسی طرح ذاکر میاں کی زندگی

ہیں یہ دونوں اصول تحلیل ہو کر ایک ہو گئے ہیں اور ان کی ہم آہنگی ہی سے ان کی سیرت کے خدوخال نمایاں ہوئے ہیں۔ نہ قومیت ان کی اسلامیت پر انگشت نمائی کرے اور نہ اسلام قومیت کو راندۂ درگاہ اور مردود ٹھہرائے۔ ہم ان کی تحریروں سے چند نمونے یہاں پیش کرتے ہیں جن میں فصاحت و بلاغت اور جوشِ بیان کے علاوہ ان اصولوں کا صحیح امتزاج پیش کیا گیا ہے۔ جامعہ کے جشنِ سیمیں (سلور جوبلی) کے خاص جلسے میں جامعہ کے مقصد کو اس طرح واضح کیا ہے:

"پچیس سال کی سعی اور اتنا حقیر سا نتیجہ۔ پچیس سال کی کوہ کنی اور یہ جوئے کم آب۔ جانتا ہوں کہ بے صبری کا حق نہیں، جانتا ہوں کہ کام کی ماہیت میں ہر سچے کام کی طرح سست رفتاری ہے۔ جانتا ہوں کہ تعلیمی تربیتی کام میں ہتھیلی پر سرسوں نہیں جمتی۔ جانتا ہوں کہ یہ کام آگ نہیں کہ پل مارتے ہی پھیل جائے اور سارے ماحول کو خاکستر بنا دے چمن بندی ہے۔ مادی وسائل کی نہروں سے مدت تک اسے سینچنا ہوتا ہے۔ دہقان کو اپنی پیشانی کا پسینہ ایک بار نہیں روز اس میں ملانا ہوتا ہے اور ہاں خونِ جگر کی کچھ چھینٹیں بھی دینی ہوتی ہیں۔ لیکن اگر یہ آرزو بے چین کرے کہ وسائل کی نہر کچھ کشادہ ہوتی، پسینہ بہانے کی آمادگی بھی ذرا زیادہ لوگوں میں پائی جاتی اور خونِ جگر کا بھی کال نہ ہوتا تو کیا یہ بے صبری اور ناشکری ہو۔ اگر یہ تمنا ستاتی ہے کہ قومی سعی کے تعمیری نتائج قومی شان کے شایان ہوتے تو کیا جلد بازی ہے۔ اگر عمر کے ان تھوڑے سے دنوں میں جو شاید ابھی حصے میں ہوں، اس چھوٹے سے ادارے کو ایسی تعلیمی بستی کی حیثیت دینے کا ارادہ بار بار دل میں اُکسے جہاں لوگ سچی اسلامی زندگی دیکھ سکیں، جہاں ان کے بے شمار تعلیمی اور تمدنی مسئلوں پر فکر و عمل کی روشنی پڑ سکے جس کے تجربے قوم کے ذہنی سوالوں کا جواب دے سکیں، جہاں شخصیت کی نشو و نما کا سامان ہو، جہاں مل جل کر کام کرنا معمول ہو، جہاں قوم کی نئی

نسل درس اور زندگی کی ہم آہنگ فضا میں پرورش پائے اور رحمۃ للعالمین کے چمن کے نونہال بار آور سایہ دار درخت بنیں، یوں پھلیں پھولیں کہ ان کے فیض سے ان کا سارا ماحول مستفیض ہو اور ہر جگہ سے حکمت کو لیں کہ ان کا کھویا ہوا مال ہے۔"

جامعہ کے نشان (موٹو) کی تشریح "پیام تعلیم" کے پڑھنے والوں کے لئے اس طرح کی:-

"جانتے ہو اس نشان کا مطلب کیا ہے؟ دیکھو اس میں سب سے اوپر ایک ستارہ ہے جس میں لکھا ہے اللہ اکبر۔ جب اندھیری رات میں غریب مسافر جنگل بیابان میں سفر کرتے ہوئے راہ بھٹک جاتے ہیں، کوئی راہ بتانے والا نہیں ہوتا تو وہ ستاروں کو دیکھ کر راستہ نکالتے ہیں۔ جامعہ والوں کو راستہ بتانے والا ستارہ یہی اللہ اکبر کا ستارہ ہے۔ ان کی نظر اسی پر جمی ہے۔ یہی دنیا کی اندھیاری میں انھیں راہ بتاتا ہے، اس لئے کہ یہ جتاتا ہے کہ اللہ ہی سب سے بڑا ہے۔ جس نے اس کے آگے سر جھکایا اس نے سچی زندگی کا پتہ پایا۔ اس کے سامنے جھک کر پھر یہ سر کسی اور کے سامنے کیسے جھک سکتا ہے۔ اس چمکتے ہوئے ہدایت کے تارے کے نیچے ایک کتاب ہے جس پر لکھا ہے عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ۔ یہ کتاب قرآن پاک ہے۔ اس سے خدا نے اپنے بندوں کو اپنی مرضی کا پتہ دیا کہ وہ کیا چاہتا ہے۔ کس طرح نیکی کر کے آپس میں ایک دوسرے کو بھائی بھائی جان کر، غریب امیر کا فرق مٹا کر، رنگ روپ کی تمیز ہٹا کر، آقا و غلام کی تقسیمیں مٹا کر اس کے بندے اچھے سچے بندے بن سکتے ہیں۔ اس کتاب نے آدمیوں کو تاریکی سے روشنی میں پہنچایا اور جو راہ بھٹک گئے تھے انھیں بھی سیدھی راہ بتائی۔ اور اس کے لانے والے نے اپنی پاک زندگی کی مثال سے، اپنی آنکھوں کی تاثیر اور دل کی گرمی سے ایک گروہ ایسے نیک آدمیوں کا تیار کر دیا جس نے دنیا سے طرح طرح کی برائیوں

کو مٹا دیا اور اس میں خدا کی سچی برادری قائم کی۔

"اس نشان کے دونوں طرف کھجور کے دو پیڑ ہیں۔ یہ کیا ہیں؟ یہ اُس دیش کا نشان ہیں جہاں خدا کا یہ آخری پیام لانے والا پیدا ہوا۔ اس بنجر وادی کا نشان جس میں یوں تو کچھ اگتا نہ تھا، پر جہاں دینِ الٰہی کے پودے نے جڑ پکڑی۔ جو لوگ ناموافق حالات سے اپنے کاموں میں گھبرا جاتے ہیں ان کے لئے یہ درخت ڈھارس کا سامان ہیں کہ اس دیس سے جہاں ان کھجوروں کے سوا پھول بوٹا نام کو نہ تھا ہدایت کے چشمے ابل پڑے جن سے دلوں کی بستیاں سیراب ہو گئیں۔ پھر تم ظاہری حالات کو دیکھ کر کیوں تھڑ دلے ہوتے ہو۔

"سب سے نیچے ایک پتلا سا ہلال ہے جس میں لکھا ہے "جامعۂ ملیہ اسلامیہ"، یہ ہلال ابھی چھوٹا سا ہے لیکن جیسے ہلال بڑھ کر چودھویں رات کا چاند بن جاتا ہے، اسی طرح یہ جامعہ جس کے کام کی ابھی ابتدا ہے، انشاء اللہ بڑھ کر روشن چاند بنے گی اور دیکھنے والوں کی آنکھوں کا سرور ہوگی۔"

حسن شاہ کا اثر | نوجوانی میں ذاکر میاں کی سیرت و کردار پر ایک صوفی اور درویش حسن شاہ کا گہرا اثر پڑا جو ہمارے دادا کے دور کے عزیز ہوتے تھے۔ بڑی خوبیوں کے انسان تھے اور اپنے رنگ میں منفرد تھے۔ گرمیوں کی تعطیل میں ہم سب بھائی قائم گنج آتے تو حسن شاہ دن بھر ہمارے یہاں رہتے تھے۔ صبح آتے اور شام کو جاتے لیکن کھانا ہمارے یہاں نہیں کھاتے تھے۔ یحییٰ پور میں ان کا قیام رہتا تھا۔ صبح نو دس بجے وہاں سے کچھ کھا کر آتے اور شام کو واپسی پر وہیں جا کر کھاتے۔ ہمارے یہاں دن میں چائے ضرور پی لیتے تھے اور پان شوق سے کھاتے تھے۔ وہ فرخ آباد کے شاہ

طالب حسین مجیب کے ارشد خلفا میں سے تھے اور اپنے شیخ کے ساتھ عقیدت اور وارفتگی بدرجۂ کمال رکھتے تھے ۔ مزاج میں جذب غالب تھا اس لئے کبھی کبھی اپنے معمولات میں شدت اختیار کر لیتے تھے ۔ حضرت مجیب کے عقیدتمندوں میں کثرت سے ہندو صاحبان بھی تھے ۔ چونکہ آپ تو مسلم تھے آپ کے اکثر و بیشتر عزیز ہندو کایستھ تھے ۔ ایک دفعہ حسن شاہ کسی ہندو عقیدتمند کے ماتھے پر قشقہ دیکھ کر بھری محفل میں اعتراض کر بیٹھے ، جو حضرت مجیب کے صلح کل مشرب کے خلاف تھا ۔ چنانچہ حضرت نے حسن شاہ کو اسی محفل میں سب کے سامنے حکم دیا کہ قشقہ لگا کر پہلے یہاں سے کشمیر اور پھر وہاں سے جنوبی ہند میں رامیشورم پیدل جاؤ اور وہاں سے بڑے پروہتوں کی چٹھیاں لاکر دو جن میں تمہاری وہاں حاضری کی تصدیق ہو ۔ حسن شاہ نے بلا تامل اپنے شیخ کے ارشاد کی تعمیل کی اور سفر کی تکمیل کر کے تین سال کے بعد فرخ آباد واپس آئے ۔

حسن شاہ اپنے شیخ کے انتقال کے بعد درگاہ سے وابستہ رہے ۔ ایک روز فجر کی نماز سے کچھ قبل درگاہ کی مسجد میں صفائی کر رہے تھے ۔ گرمی کا موسم تھا ۔ وہ اس وقت صرف لنگوٹ لگائے ہوئے اطمینان سے مسجد میں جھاڑو دینے میں مشغول تھے کہ ان کے پیر بھائی شیخ افتخار الحق جو جید عالم تھے نماز کے لئے مسجد میں داخل ہوئے انہوں نے حسن شاہ پر اعتراض کیا کہ اس طرح سے خانۂ خدا میں لنگوٹ لگائے پھر رہے ہو جس سے مسجد کی بے حرمتی ہوتی ہے ۔ یہ سن کر حسن شاہ برافروختہ ہو گئے ۔ آؤ دیکھا نہ تاؤ ، جھٹ لنگوٹی کھول کر شاہ افتخار الحق کے منھ پر دے ماری اور کہنے لگے کہ "ہم تو یوں ہی آئے تھے اور یوں ہی جائیں گے ۔ خدا نے ہمیں یوں ہی پیدا کیا ہے ۔ لباس کی بدعت تو مولویوں نے نکالی ہے"۔ شاہ افتخار الحق جو حسن شاہ کی جذبی کیفیت سے واقف تھے یہ سن کر چپ ہو رہے ۔ پھندن میاں کو جو شاہ طالب حسین مجیب کے خلیفہ اور جانشین ہوئے،

جب اس واقعہ کا علم ہوا تو انھوں نے ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔ اس پر حسن شاہ درگاہ سے چلے آئے اور پھر کبھی وہاں قدم نہ رکھا۔

حسن شاہ کو مطالعہ کا بے حد شوق تھا۔ ایک لکڑی کے صندوق میں پہیے لگوا کر ایک گاڑی بنوا لی تھی جسمیں کتابیں بھر لیتے تھے۔ گاڑی کے اگلے حصے میں لوہے کا کنڈا تھا جس میں رسی ڈال کر اگر کسی ایسے مقام پر جاتے جہاں صاف سڑک ہو تو صندوق کو کھینچ کر لے جاتے۔ لیکن اگر کہیں ایسی جگہ جانا ہوتا جہاں کا راستہ اونچا نیچا ہے تو ایک گزی کی رنگین خورجی میں کتابیں بھریں۔ خورجی کو کاندھے پر اس طرح ڈالا کہ اس کا ایک حصہ آگے اور دوسرا پیچھے لٹک گیا اور چل کھڑے ہوئے۔ ہمارے یہاں گاڑی لانے میں دشواری تھی اس لئے خورجی میں کتابیں لایا کرتے تھے۔

حسن شاہ ہم سب بھائیوں میں ذاکر میاں کو بہت چاہتے تھے۔ ان سے اپنی فارسی کی کتابیں جو تصوف پر تھیں نقل کرواتے۔ ذاکر میاں کا کہنا ہے کہ اس نقل کرنے کے سبب سے میرا اردو کا خط اچھا ہوگیا۔ ایک مرتبہ ذاکر میاں بیمار پڑ گئے تو روزانہ صبح آکر خود اپنے ہاتھ سے ان کا قارورہ حکیم احمد شیر خاں کے یہاں لے جاتے تھے جو بھان پور میں ہمارے مکان سے کوئی پون میل پر رہتے تھے۔ کبھی انھیں روپیے دیتے تھے کہ قریب کے محلے میں فلاں غریب آدمی کو دے آؤ۔ کبھی کسی بیوہ کے یہاں روپیے بھجواتے۔ برسوں اسی طرح ان کا معمول رہا۔ کتابیں نقل کروانے کے علاوہ ذاکر میاں کو ان کے مطالب و معانی بھی سمجھاتے تھے۔ اس طرح انھوں نے ذاکر میاں کی روحانی تہذیب کی اور انھیں تصوف کی اعلیٰ قدروں سے روشناس کیا۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے حسن شاہ جب دوپہر میں کوٹھی میں لیٹتے اور یہ شعر گنگناتے تو ان پر وجد کی سی کیفیت طاری ہو جاتی تھی اس میں خسرو نے دھنئے کی روئی دھننے کا

صوتی تاثر ظاہر کیا ہے۔

در پے جاناں جاں ہم رفت، جاں ہم رفت

رفت رفت، جاں ہم رفت

ایں ہم رفت و آں ہم رفت

آنہم رفت اینہم رفت، آنہم اینہم۔ انہم۔ آنہم رفت

حسن شاہ کو کیمیا بنانے اور دوائیں تیار کرنے کا بھی شوق تھا۔ ان کے مرید جو کچھ دیتے وہ یا تو غریب غربا پر تقسیم کر دیتے یا دوائیں خریدتے۔ کتابیں انھیں خریدنا نہیں پڑتی تھیں۔ ان کے معتقدین کو ان کے اس شوق کا علم تھا، وہ تحفتاً انھیں پیش کرتے تھے۔ ان کے ایک پیر بھائی نے مجھ سے بیان کیا کہ ایک مرتبہ کسی دوا کو جوش دے رہے تھے۔ جوش کے بعد اسے ایک شیشے میں انڈیلا تو شیشہ ٹوٹ گیا۔ اس وقت روزہ کی حالت میں تھے۔ افطار میں پندرہ بیس منٹ باقی تھے۔ بس طیش میں اٹھے، صراحی میں سے پانی کٹورے میں لے غٹ غٹ پی گئے۔ پانی پیتے جاتے تھے اور کہتے جاتے "تم نے ہمارا شیشہ توڑا، ہم نے تمہارا روزہ توڑا"۔ بعد میں جب خیال آیا اس کا کفارہ ادا کرنے کے لئے پورے سال بھر روزے رکھے۔ ان کا ۱۹۱۷ء میں متھرا کے قریب کسی گاؤں میں انتقال ہوا۔ ان کا سارا سر و سامان ایک جوڑ کپڑا اور کچھ کتابیں تھیں۔ انتقال کے وقت ان کی عمر ۷۰ سے کچھ اوپر تھی۔

تفریحی مشاغل | انسان کی سیرت کے اندرونی رجحانوں کا پتہ اس کے تفریحی مشاغل سے لگتا ہے۔ ذاکر میاں کے تفریحی مشاغل کتب بینی کے علاوہ دو ہیں۔ باغبانی اور پرانے پتھر جمع کرنے کا شوق۔ ایک ماہر تعلیم کے لئے جو نئی نسل کے ذہن اور جذبات کی نشو و نما اور تہذیب چاہتا

ہو باغبانی کے مشغلے میں خاص مناسبت مضمر ہے۔جس طرح تعلیم وتربیت کے ذریعے سے وہ ایسا ماحول فراہم کرتا ہے جس میں شخصیت اپنے کمال کو پہنچے، اسی طرح باغبانی میں اس کا اہتمام کیا جاتا ہے کہ قدرت نے پودے میں جو صلاحیت پوشیدہ رکھی ہے اس کا پوری طرح سے اظہار ہو۔ پھول کھلے تو ایسا کھلے جو کھلنے کا حق ہے، نہ کہ مرا ہوا، مرجھایا ہوا، جھلسا ہوا۔ باغبانی کے شوقین بیجوں کو ملانے سے ان کے رنگ اور جسم بدل دیتے ہیں اور یہ تبدیلی اٹکل پچو نہیں ہوتی بلکہ کسی خیال، کسی منصوبے کے مطابق ہوتی ہے۔اس طرح باغبانی بھی تعلیم کی طرح ایک تخلیقی فن ہے۔

جب ذاکر میاں علی گڈھ کے وائس چانسلر ہوئے تو وہاں ہر طرف خاک اڑتی تھی۔ عمارتیں نئی نئی بنتی تھیں لیکن کسی نے اس طرف توجہ نہیں دی کہ چمن بندی کر کے گردو پیش کو جاذب نظر بنایا جائے۔ پرانی عمارتوں پر ویرانی برستی تھی۔ ذاکر میاں کی توجہ سے نہ صرف نئی عمارتوں کے چاروں طرف چمن بندی ہوئی بلکہ تمام پرانی عمارتوں کے گردو پیش کو کیاریوں، پودوں اور پھولوں سے خوبصورت بنایا گیا۔مقصد یہ تھا کہ طالب علم بجائے خاک پھانکنے کے کیاریوں اور لانوں پر آکر بیٹھیں، وہاں پڑھیں ہنسیں بولیں اور اس طرح ان کا دل لگے اور یونیورسٹی کی رونق میں اضافہ ہو۔ سات آٹھ سال میں یونیورسٹی کی صورت بدل گئی۔جنھوں نے کچھ عرصہ قبل یونیورسٹی کو دیکھا تھا اب دیکھ کر تعجب کرتے تھے۔

پھولوں میں ذاکر میاں کو گلاب بہت پسند ہے۔ ہے بھی وہ پھولوں کا بادشاہ۔ انھوں نے یونیورسٹی کے ہر گوشے میں گلابوں کی کیاریاں لگوائیں۔ ہر رنگ کے گلاب، لال پیلے، گلابی اور سفید۔ اسٹاف کے بعض لوگوں کو بھی اپنے گھروں میں گلاب باغ لگانے کا شوق ہوا۔ یونیورسٹی میں ہر سال گلابوں کی جو نمائش ذاکر میاں کی وائس چانسلری کے

زمانے میں شروع ہوئی وہ اب بھی ہوتی ہے۔ اس میں نارنجی، ارغوانی، سیاہ، سبز اور فاختئی رنگ کے گلاب بھی دیکھنے میں آئے۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی کا گلاب باغ خاص کر دیکھنے کے لائق ہے۔ ہر سال دو ایک انعام ان کے لئے مخصوص ہوتے ہیں۔ علی گڑھ کی زمین ویسے بھی گلاب کے لئے موزوں اور سازگار ہے۔ یونیورسٹی میں کہیں بھی نکل جایئے گلابوں کی بہار دکھائی دے گی۔

گلابوں کے علاوہ ذاکر میاں کے زمانے میں یونیورسٹی میں بوگن ویلا کا بھی کثرت سے رواج ہوا۔ ہر طرف اس کی باڑھ نظر آتی ہے۔ جب بوگن ویلا بہار پہ آتی ہی تو بڑا دلفریب منظر ہوتا ہے۔ خاص طور پر ایس۔ ایس ہال کے باہر کمروں کی دیواروں کے متوازی یہ منظر دیکھنے کے لائق ہی۔ بوگن ویلا کی بہار کے زمانے میں باہر کے جو سیاح علی گڑھ آتے ہیں وہ ایس ایس ہال کے باہر کے منظر کی ضرور تصویریں کھینچتے ہیں۔ پروفیسر حبیب الرحمن نے بوگن ویلا کے مختلف رنگ تخلیق کئے جن کی شہرت علی گڈھ کے باہر بھی پہنچی۔ قدرت نے پودے اور پھول پیدا کئے، انسان اپنی تخلیقی صلاحیت سے ان کے رنگ روپ اور ان کی جسامت میں تبدیلی کرتا ہے۔ چنانچہ اس وقت انسانی تصرف کی وجہ سے ہزاروں قسم کے گلاب اور بوگن ویلا موجود ہیں۔ ہر ملک میں رنگ برنگی تخلیق جاری ہے اور بوگن ویلا کی اقسام میں برابر اضافہ ہو رہا ہے۔ ذاکر میاں کا تخلیقی ذہن انسانوں کے علاوہ نباتات کو بھی خوب سے خوب تر اور بہتر سے بہتر بناتا ہے۔ جب بہار کے گورنر تھے تو پٹنہ کے راج بھون میں تین سو سے اوپر مختلف گلابوں کی قسمیں تھیں۔ ان میں سوائے چند کے جو باہر سے منگوائے تھے سب وہیں کے گلاب باغ کے تھے۔

دیوگڑھ میں ایک بڑے مشہور گلابوں کی تخلیق کے ماہر ہیں جن کا نام مسٹر بھاجارجی

ہے۔ انھوں نے مختلف گلابوں کے میل سے نئے نئے رنگ تخلیق کیے ہیں۔ وہ پٹنہ کے راج بھون میں آئے تو ذاکر میاں کے گلابوں کے شوق اور ان کے انہماک کو دیکھ کر بہت متاثر ہوئے۔ چنانچہ پٹنہ سے واپس جاکر انھوں نے اپنی ایک تخلیق کا نام "ذاکر حسین" رکھا ہے جو ہندوستان بھر میں اور ہندوستان کے باہر بھی اسی نام سے مشہور ہے۔ پروفیسر حبیب الرحمٰن نے بھی بوگن ویلیا کے ایک تخلیق کا نام "ذاکریانا" رکھا جس میں گلابی اور نارنجی رنگوں کی آمیزش سے لطیف تدریجی کیفیت پیدا کی ہے۔ دونوں رنگ الگ الگ رہتے ہوئے ایک دوسرے میں سموئے ہوئے ہیں۔ بنگلور میں کروٹن نہایت عمدہ ہوتے ہیں۔ وہاں کے ایک ماہر نے ذاکر میاں کے شوق کو دیکھ کر جو پودوں اور پھولوں سے انھیں ہے اپنی ایک تخلیق کا نام "ذاکر حسین" رکھا ہے جس کی رنگا رنگی میں لطیف ہم آہنگی ہے۔ جو ذوقِ نظر کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔ راجہ صاحب بھدری نے جو پہلے ہماچل پردیش کے گورنر تھے اور گلے ڈیولس کے بڑے ماہر اور شوقین ہیں اپنی ایک تخلیق کا نام "ذاکر حسین" رکھا ہے۔ یہ ایک پھولدار درخت ہے جس کے پتے تلوار کی شکل کے ہوتے ہیں۔

اس وقت دہلی میں وائس پریسیڈنٹ کے گلاب باغ میں گلابوں کی چار سو سے زائد قسمیں موجود ہیں۔ دوست احباب ہندوستان اور ہندوستان کے باہر کے گلاب تحفتاً بھیجتے ہیں اس لئے کہ انھیں معلوم ہے کہ ذاکر میاں کو اس سے جو خوشی ہوتی ہے، وہ اور کسی تحفے سے نہیں ہوتی۔ چنانچہ انگلستان، فرانس اور جرمنی سے گلاب تحفے میں آئے جو وائس پریسیڈنٹ کے گلاب باغ کی رونق ہیں۔ جب گلاب کا موسم ہوتا ہے تو اس گلاب باغ کی ہر کیاری اپنی بہار دکھاتی ہے۔

ذاکر میاں کو دوسرا شوق پرانے پتھر جمع کرنے کا ہے۔ ایسے پتھر جو کسی زمانے میں نباتاتی یا حیوانی زندگی سے تعلق رکھتے تھے لیکن بعد میں کروڑوں سال زمین کے نیچے دبے پڑے رہنے

سے کیمیاوی عمل کے باعث پتھر میں بدل گئے۔ ذاکر میاں کے پاس سب سے پرانا پتھر (فاسل) ۲۵ کروڑ سال پہلے کا ہے۔اس پر ان درختوں کی پتیوں کا عکس ہے جن سے کوئلہ بنتا ہے۔ الجیریا سے ایک پتھر لائے ہیں جو ہو بہو گلاب کی شکل کا ہے۔ ویسی ہی گلاب کی سی پنکھڑیاں لیکن پتھر کی۔ اسے وہاں ریگستان کا گلاب کہتے ہیں۔ آسٹریلیا کے گورنر جنرل لارڈ کیسی نے ایک وودھیا پتھر بطور تحفہ بھیجا ہے جو نیگوں رنگ کا ہے۔ یہ بھی کروڑوں سال پرانا ہے۔ روسی اکیڈمی کے رکن وناگرو ڈاف نے ذاکر میاں کے فاسلوں کے ذخیرے کو دیکھا تو روس واپس جاکر یورال کے پہاڑ میں جو بلوری پتھر ہوتے ہیں ان کا ایک مجموعہ تحفے کے طور پر بھیجا جس میں رنگ برنگ کے کرسٹل ہیں۔ یہ بلوری پتھر بھی قدرت کا عجیب وغریب کارنامہ ہے۔ جماداتی فطرت کے انبار میں صرف کرسٹلوں میں نظم وترتیب اعلیٰ درجہ کی ملتی ہے۔ یہی نظم وترتیب (آرڈر) جمادات کے مقابلے میں نباتات میں بڑھتا ہے اور پھر انسان میں اس کا کمال نظر آتا ہے۔ کرسٹل میں ارتقا کے قانون کا ہمیں پہلا قدم دکھائی دیتا ہے۔

جامعہ کے ساتھی ذاکر میاں نے جرمنی سے واپسی کے بعد جامعہ میں ۲۲ سال گذارے۔ اس ادارے کے بانی مولانا محمد علی ہیں لیکن اس کی تعمیر کا کام ذاکر میاں کے ہاتھوں انجام پایا۔ اس بائیس سال میں ہر قسم کے نشیب وفراز آئے انگریزی حکومت کو جامعہ کا استحکام ناگوار تھا۔ چنانچہ حکومت ہند کے اشارے پر حیدرآباد سے جو امداد ملتی تھی اسے بند کردیا گیا۔ اس طرح ہر قسم کی پریشانی اور تنگدستی کا سامنا کرنا پڑا۔ انجمن تعلیم ملی کے ارکان نے عہد کیا تھا کہ ان میں سے کوئی بھی ڈیڑھ سو روپیے ماہوار سے زیادہ تنخواہ نہیں لے گا۔ مالی وسائل کی کمی کی وجہ سے یہ تنخواہ بھی پابندی سے نہیں ملتی تھی۔ کبھی بون سول گئے

اور کبھی سو۔ لیکن چونکہ سبھوں کے دل میں خدمت کا جذبہ تھا اس لئے انھوں نے خوش دلی کے ساتھ مالی پریشانیوں کو برداشت کیا جس مستقل مزاجی سے یہ بیس سال جامعہ والوں نے گذارے اس کی داد نہیں دی جا سکتی۔ ہندوستان کے مسلمانوں کی تاریخ میں بے نفسی اور ایثار کی ایسی مثال نہیں ملتی۔ انجمن تعلیم ملی کے ارکان نے عہد کیا تھا کہ وہ اپنی عمر کے بیس سال جامعہ کی خدمت میں گذاریں گے۔ ذاکر میاں اور ان کے ساتھیوں نے جس پامردی اور استقلال سے اپنے اس عہد کو پورا کیا وہ اسی وقت ممکن تھا جب کہ ان کے عمل کا محرک خدمت خلق کا شدید جذبہ رہا ہو ورنہ ان حالات میں اچھے اچھوں کے قدم لڑکھڑا جاتے ہیں۔

جامعہ میں ڈاکٹر عابد حسین اور پروفیسر محمد مجیب ذاکر میاں کے جرمنی کے ساتھیوں میں تھے۔ ان دونوں کو ذاکر میاں نے جامعہ کی خدمت پر آمادہ کیا۔ اس میں شبہہ نہیں کہ ذاکر میاں کو جامعہ میں اپنے تعلیمی تجربوں میں جو کامیابی ہوئی اس میں ان دونوں اصحاب کے مکمل تعاون کا بڑا حصہ ہے۔ انھوں نے ہر قسم کی سختی برداشت کر کے جامعہ کے مقاصد کے حصول کے لئے ذاکر میاں کا ہاتھ بٹایا اور حقِ رفاقت ادا کیا۔ ذاکر میاں ہمیشہ اس کا اعتراف کھلے دل سے کرتے ہیں۔ ذاکر میاں کے جامعہ کے ساتھیوں میں جو اندرونی صفات تھیں انھیں اجاگر ہونے کے مواقع ملے اور ان میں سے بعض نے ادبی اور علمی دنیا میں نام پیدا کیا۔ ڈاکٹر عابد حسین اس وقت اردو زبان کے بہترین مترجم ہیں۔ ان کی تحریریں سنجیدہ سلیس اور پُر مغز ہوتی ہیں۔ عبارت ایسی گٹھی ہوئی اور چست ہوتی ہے کہ اس میں ایک لفظ ادھر ادھر نہیں کیا جا سکتا۔ لفظوں کے چناؤ کا انھیں خاص سلیقہ ہے۔ ان کا اسلوب علمی مطالب کے ادا کرنے کے لئے نہایت

موزوں ہے۔ پروفیسر محمد مجیب کو انگریزی لکھنے میں بڑا ملکہ ہے۔ بہت کم ہندوستانی ہیں جو اتنی عمدہ انگریزی لکھنے پر قدرت رکھتے ہوں۔ اس کے علاوہ اردو میں بھی انھوں نے اپنے اسلوب کی راہ دوسروں سے الگ نکالی ہے۔ ان کی تحریروں میں معنویت اور چونکا دینے والا ببک پن ہوتا ہے، ایسا کہ کہیں ہو پہچانا جاتا ہے۔ ذاکر میاں کے ۱۹۴۸ء میں علی گڑھ جانے کے بعد سے ابتک وہ جامعہ کے وائس چانسلر (شیخ الجامعہ) ہیں۔ ان کے زمانے میں جامعہ نے کافی ترقی کی۔ قومی حکومت قائم ہونے سے جامعہ کی مالی حالت سدھر گئی ہے۔ اب جامعہ کا بجٹ دس لاکھ سالانہ کے لگ بھگ ہے۔

مسلم یونیورسٹی کی وائس چانسلری

ذاکر میاں کم وبیش آٹھ سال مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر رہے۔ شروع میں انھیں علی گڑھ جانے میں پس وپیش تھا لیکن پنڈت جواہر لال نہرو اور مولانا آزاد کے اصرار پر انھوں نے یہ خدمت قبول کی۔ مسلم یونیورسٹی کے لئے یہ انتہائی انتشار کا زمانہ تھا۔ تقسیم ملک کی وجہ سے یہاں کے اساتذہ کی اچھی خاصی تعداد پاکستان چلی گئی تھی۔ مسلمانوں میں علم وفن میں اعلیٰ لیاقت کے لوگوں کی ویسے ہی کمی تھی۔ اب جب کہ مسلم یونیورسٹی کے اساتذہ بڑی تعداد میں پاکستان چلے گئے، تو یہ سوال پیدا ہوا کہ یونیورسٹی کے مسلم کردار کو قائم رکھتے ہوئے کام کیسے چلایا جائے۔ مسلم یونیورسٹی کے سچے ہمدرد اور بہی خواہ کی حیثیت سے انھوں نے سوچا کہ مسئلہ کا حل صرف یہ ہے کہ وہاں کے ہونہار نوجوانوں کو اعلیٰ تعلیم کے لئے یورپ اور امریکہ کی یونیورسٹیوں میں بھیجا جائے اور وہاں سے ان کی واپسی تک کسی نہ کسی طرح نشتم پشتم کام چلایا جائے۔ یہ تجربہ بہت کامیاب رہا۔ چند سالوں میں یہ نوجوان

اعلیٰ تعلیم پانے کے بعد علی گڑھ آگئے اور انھوں نے وہاں کی تعلیمی زندگی کو سنبھالا۔ اس کے علاوہ تین ریسرچ اسکیمیں حکومت ہند سے منظور کرائیں۔ ایک انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز قائم کرنے کی اسکیم تھی تاکہ مشرق وسطیٰ کے ملکوں پر ریسرچ ہو۔ دوسری اسکیم شعبۂ تاریخ میں ہندوستان کی قرون وسطیٰ کی تاریخ پر تحقیق کرنے کی تھی۔ تیسری اردو ادب کی تاریخ مرتب کرنے کی اسکیم تھی۔ یہ تینوں اسکیمیں ذاکر میاں کی وائس چانسلری کے زمانے میں منظور ہوئیں اور حکومت ہند نے بڑی فیاضی سے ان کے اخراجات کے لئے ضروری رقم منظور کی

مسلم یونیورسٹی میں میڈیکل کالج قائم کرنے کی تجویز عرصے سے اس ادارے کے ارباب حل و عقد کے پیش نظر تھی لیکن یوپی گورنمنٹ کی ہٹ دھرمی کے سبب یہ خواب ۱۹۶۲ء سے قبل شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا۔ لیکن پھر بھی اس کے ایک شعبے یعنی بصریات (اپ تھلمالوجی) کا انسٹی ٹیوٹ گاندھی اسپتال چشم (گاندھی آئی ہاسپٹل) کی شرکت میں نومبر ۱۹۵۵ء میں قائم کیا گیا۔ گاندھی آئی ہاسپٹل میں عملی کام کے مواقع تھے تاکہ انسٹی ٹیوٹ میں جو ریسرچ ہو اس کے متعلق تجربے وہاں کئے جا سکیں۔ حکومت ہند نے بھی انسٹی ٹیوٹ کے لئے امداد منظور کی شروع ہی سے انسٹی ٹیوٹ کے کام کی اچھی شہرت رہی ہے اور اب بھی ہے۔ یہاں دور دور سے مریض علاج کے لئے آتے ہیں۔

ذاکر میاں کی وائس چانسلری کے زمانے میں یونیورسٹی کے تمام شعبوں میں کافی ترقی ہوئی۔ نئے اسٹاف کا تقرر ہوا۔ جب ذاکر میاں مسلم یونیورسٹی گئے ہیں تو اس وقت اس کا بجٹ پندرہ لاکھ کے قریب تھا اور جب وہاں سے آئے تو یہ پچاس لاکھ کے قریب ہو گیا تھا۔ اداروں کی زندگی میں سب سے بڑی چیز ان کی ساکھ ہے۔ ان کے عہد میں مسلم یونیورسٹی کی گری ہوئی ساکھ

پھر سے اونچی ہوگئی اور وہاں کی اسناد قدر کی نگاہ سے دیکھی جانے لگیں۔

علمی ذوق | ذاکر میاں کا علمی ذوق بہت بلند معیار کا ہے۔ انتظامی مصروفیات کی وجہ سے علمی کام کے لئے جتنا وقت چاہئے اتنا وہ نہیں دے سکے لیکن پھر بھی انھوں نے جو کچھ ان حالات میں کیا وہ قابل تعریف ہے۔ ۱۹۳۲ء میں الہ آباد کی ہندوستانی اکیڈمی کی دعوت پر "معاشیات، مقصد اور منہاج" کے موضوع پر تین مقالے پڑھے۔ جو کتابی شکل میں شائع ہو چکے ہیں۔ دہلی یونیورسٹی کی فرمائش پر ۱۹۴۵ء میں انھوں نے "سرمایہ داری" کے موضوع پر دس لکچر دیئے جنھیں پہلے دہلی یونیورسٹی نے شائع کیا تھا اور اب اس کا دوسرا اڈیشن ایشیا پبلشنگ ہاؤس بمبئی نے شائع کیا ہے۔ ان میں سرمایہ داری کا علمی جائزہ لیا گیا ہے کہ کن خاص حالات میں اس کے مظاہر رونما ہوتے ہیں۔ ایک طرف تو انسانوں کی لاتعداد خواہشات اور ضروریات ہیں اور دوسری طرف ان کی تشفی کے وسائل محدود ہیں۔ اس وجہ سے اس اہتمام کی ضرورت پڑتی ہے جسے ہم معاشی عمل سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس کے اصول و قوانین کا باہر سے مطالعہ ممکن نہیں۔ انھیں صرف سمجھا جاسکتا ہے۔ اس لئے معاشیات افہامی علم ہے جیسا کہ زومبارٹ نے واضح کیا ہے۔ ان لکچروں میں یہی نقطۂ نظر پیش کیا ہے۔

جرمن ماہر معاشیات فریڈرش لسٹ کی کتاب "قومی معاشیات" کا اردو میں ترجمہ شائع کیا۔ ترجمہ سلیس، شستہ اور رواں ہے۔ یہ کتاب معاشیات کی بلند پایہ تصانیف میں شمار ہوتی ہے۔ اس کا موضوع یہ ہے کہ ہر ملک کی معاشی حالت وہاں کے مخصوص احوال کا نتیجہ ہوتی ہے۔ اگر کسی ملک کے لئے آزاد تجارت کا اصول ٹھیک ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ سب ملکوں پر اس کا اطلاق ہونا چاہئے۔ بعض ملک ایسے ہیں جن کے صنائع کو محفوظ رکھنے کا اگر انتظام نہیں کیا گیا تو وہ کبھی صنعتی ترقی نہیں کر سکتے۔ مثلاً انیسویں صدی میں جرمنی کی حالت تھی۔

وہاں صنعتی ترقی کے امکانات تھے لیکن ان کو بروئے کار لانے کے لئے صنعتوں کو باہر کے مقابلے سے محفوظ رکھنا ضروری تھا۔ ہندوستان کی بھی کم وبیش یہی حالت تھی۔

"مملکت اور اخلاق" کے موضوع پر احمد آباد کے لاسکی انسٹی ٹیوٹ کی فرمایش پر جو لکچر دیا تھا وہ کتابی شکل میں شائع ہو چکا ہے۔ اس میں یہ بتایا ہے کہ اخلاقی اصول مملکت کے لئے نصب العین کا کام دیتے ہیں۔ مملکت کی کوشش رہتی ہے کہ انھیں جہاں تک ہو سکے عمل میں لائے۔ لیکن بایں ہمہ سیاست اور نظم ونسق کی عملی ضروریات کی تکمیل کے لئے مملکت کو اپنے خاص مصالح کو پیش نظر رکھنا چاہئے۔ ایسا کئے بغیر کوئی مملکت کامیابی سے نہیں چل سکتی۔ اس طرح ہر مملکت اپنے وجود کے اسباب کا تعین کرتی اور مصالح ملکی کو بروئے کار لاتی ہے۔

بچوں کا ادب | ہمارے ملک میں بچوں کے ادب کی طرف پوری توجہ نہیں کی گئی۔ ہندوستان کی مختلف زبانوں میں اس صنف پر جو کتابیں شائع ہوتی ہیں وہ بڑوں کے لئے جاذب نظر نہیں ہوتیں تو بھلا بچوں کو اپنی طرف کیسے راغب کر سکتی ہیں۔ اردو زبان میں تو بچوں کے ادب کی اور بھی کمی ہے۔ یورپ کی زبانوں میں ہر سال ہزاروں کتابیں بچوں کے لئے شائع ہوتی ہیں۔ میں نے ایک دفعہ پیرس میں بچوں کی کتابوں کی نمایش دیکھی، تو میری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئی تھیں۔ میں بیان نہیں کر سکتا کہ کتابیں کیسی دیدہ زیب اور دل آویز تھیں، ایسی کہ ان کے دیکھنے سے سیری نہیں ہوتی تھی۔ تصویریں رنگ برنگ کی۔ رنگ نہ بہت شوخ اور نہ بالکل پھیکے، جلدیں نہایت عمدہ۔ ان میں سے بعض تو ایسی دلکش تھیں کہ بچے تو بچے ہی ٹھہرے، بڑوں کو بھی اپنی للچائی نظروں پر قابو رکھنا پڑتا تھا۔ ذاکر میاں نے "ابو خاں کی بکری" اور چودہ اور کہانیاں عرصہ ہوا "رقیہ ریحانہ" کے نام سے لکھی تھیں۔ گذشتہ سال مکتبہ جامعہ نے انھیں کتابی شکل میں شائع کیا ہے۔ یہ مکتبہ کی بہترین مطبوعات میں ہے۔ کاغذ اور جلد کی عمدگی کے علاوہ

اس میں گجراول جیسے آرٹسٹ کی بنائی ہوئی تصویریں شامل ہیں جن سے کتاب کی دلکشی میں اضافہ ہوگیا ہے۔ یہ کتاب ایسی ہے کہ اگر اسے یورپ میں بچوں کی کتابوں کی نمائش میں رکھ دیا جائے، تو تعریف ہی ہوگی، شرمندہ ہونے کی نوبت نہیں آئے گی۔ ظاہری محاسن کے ساتھ اس کی معنوی خوبیاں بھی کم نہیں ہیں۔ کہانیوں کی زبان نہایت سلیس اور سادہ ہے۔ طرزِ بیان قدرتی ہے جیسے کسی سے باتیں ہو رہی ہوں۔ بچوں کی وضع نفسی کو دیکھتے ہوئے یہ طرزِ بیان موزوں ہے اور یقین ہے کہ ان میں تخلیقی اپج پیدا کرنے میں ممد و معاون ثابت ہوگا۔ اس کتاب کی ایک عبارت کا نمونہ پیش کیا جاتا ہے جو "عقاب کی کہانی" سے لیا گیا ہے:-

"ہاں تو چٹان کے اس اوپر والے حصے میں ایک عقاب رہتا تھا۔ آدمیوں کی بستی سے دور اور ان کے جھگڑوں ٹنٹوں سے الگ۔ صبح کو صاف صاف بھینی بھینی خوشبو والی ہوا جب اس کے گھونسلے پر آکر سلام کرتی تو یہ اپنے پروں کو ذرا ہلاتا، اپنے طاقتور بازوؤں کو پھیلاتا جیسے کوئی ہوائی جہاز والا سفر سے پہلے دیکھے کہ سب کل پرزے ٹھیک ہیں کہ نہیں۔ جب ذرا دھوپ نکل آتی اور نیچے کی دنیا اپنی روزی کے دھندوں میں لگ جاتی تو یہ بھی پر پھیلا، چٹان سے اترتا اور آہستہ آہستہ ساری وادی پر چکر لگا کر بستی کا، بستی والوں کا، کھیتوں کا اور تیز رو دریا کا معائنہ کرتا۔ کہیں کوئی کام کی چیز نظر پڑ گئی، کوئی خرگوش یا چوہا، کوئی کبوتر یا مرغی کا چوزا، تو یہ بجلی کی طرح جھپٹتا اور آن کی آن میں اسے اٹھا کر گھونسلے میں پہنچا دیتا۔ وہاں کھا پی کر پھر چٹان سے سنسار کا مطالعہ کرتا۔

وہ یونہی نہ جانے کتنا زمانہ گذر چکا تھا۔ جب ہوا میں ننھے ننھے سفید روئی کے گالے ناچتے دیکھتا یا برف سے ڈھکی ہوئی سفید سفید چھتوں پر اس کے بازوؤں کا کالا سایہ اسے دکھائی دیتا تو یہ سمجھ جاتا کہ اب سردی کا زمانہ آگیا۔ پھر پیڑوں کی کالی کالی ننگی شاخوں پر

ہلکا ہلکا ہرا بباس دیکھتا اور چڑیوں کا چہچہانا اور مست ہو ہو کر گانا سنتا تو جان لیتا کہ بہار آگئی۔
میدان میں ہرنوں کے غول کے غول چوکڑی بھرتے دکھائی دیتے اور چٹان کے پاس سے دریائی
پرندوں کے پرے کے پرے گرم ملکوں کے سفر کے قصد سے گذرتے تو یہ تاڑ جاتا کہ خزاں کی
سواری آنے کو ہے۔ کوئی آئے کوئی جائے اس کی زندگی جیسی آج ویسی کل۔ وہی چٹان،
وہی تنہائی، وہی قوت کا احساس۔ نہ کسی کو سہارا دینے کا موقع نہ کسی سے مدد لینے کی ضرورت
بس اپنی دنیا آپ۔"

گورنر اور وائس پریسیڈنٹ کی حیثیت سے

ذاکر میاں، ۱۹۵۷ء سے ۱۹۶۲ء تک پانچ برس بہار کے گورنر رہے اور اور اب تقریباً پانچ سال سے ہندوستان کے وائس پریسیڈنٹ ہیں۔ اس طویل عرصے میں کوئی ان کا مخالف نہیں ہوا۔ ہر ایک نے تعریف ہی کی۔ نہ ظاہری حشمت و دبدبہ ہے، نہ خواہ مخواہ کا رعب و طمطراق۔ پھر بھی ہر شخص ان کی سچی اور بے لاگ باتوں سے متاثر ہوتا ہے۔ صرف متاثر ہی نہیں بلکہ مرعوب ہوتا ہے۔ یہ رعب وہ نہیں جو فوج اور پولیس کی مدد سے زبردستی قائم کیا جاتا ہے بلکہ اس میں عزت و احترام کا جز شامل ہے۔ وہ خود ہر ایک کی عزت کرتے ہیں اس لئے دوسرے بھی ان کی عزت احترام پر مجبور ہوتے ہیں۔ یہ مجبوری خوشی کی ہے نہ کہ جبر کی۔ ان کی حق پرستی اور حب وطن کو ہر چھوٹا بڑا بلا تفریق مذہب و ملت مانتا اور خراج تحسین پیش کرتا ہے۔

انھوں نے وائس پریسیڈنٹ کی حیثیت سے تین مرتبہ عرب ملکوں کا دورہ کیا اور اپنے عزیز وطن کا وہاں اثر و رسوخ بڑھانے کی کوشش کی۔ جہاں گئے اپنے اخلاق اور قابلیت سے لوگوں کے دلوں کو مسخر کیا۔ ویسے جانے کو ہندوستان سے بہت سارے لوگ عرب ملکوں میں گئے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ پنڈت نہرو کے بعد اگر وہاں کسی کی عزت کی جاتی ہے تو

انھیں کی۔ ان کے ارادت مند ہر عرب ملک میں موجود ہیں۔ کویت کے دورے کے بعد حکومتِ ہند نے کویت کی حکومت کے ساتھ معاشی معاہدہ کیا جس کی رو سے یہ ملک ہندوستان کی صنعت میں سرمایہ لگائے گا جس سے دونوں ملکوں کو فائدہ پہنچے گا۔ ہندوستان کو اپنی صنعتی ترقی کے لئے باہر کے سرمائے کی ضرورت ہے اور کویت کو اس کی ضرورت ہے کہ اپنا فاضل سرمایہ ایسے ملک میں لگائے جہاں وہ محفوظ بھی رہے اور منافع بھی ملے۔ میں سمجھتا ہوں ہندوستان کو ذاکر میاں سے بہتر سفیر کوئی اور نہیں مل سکتا جو دلوں کو جوڑے نہ کہ دلوں کو توڑے، جو قوموں کو ایک دوسرے کے قریب لائے نہ کہ انھیں ایک دوسرے سے دور کرے۔ افسوس ہے کہ اس وقت ہم اپنے سب سفیروں کے متعلق جو ہمارے وطن کی باہر نمایندگی کرتے ہیں یہ بات دعوے سے نہیں کہہ سکتے۔ ان میں بعض تو ایسے ہیں کہ اگر کسی ملک کو ہندوستان کا مخالف کرنا ہو تو انھیں وہاں بھجوا دیجئے۔ یہ کام خود بخود ہو جائے گا، نہ ہڑ لگے گی نہ پھٹکری۔ اب ضرورت ہے کہ ہماری وزارتِ خارجہ اس امر پر زیادہ توجہ دے کہ باہر کی دنیا میں کس قسم کے انسانی نمونے قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں اور کن کے ذریعے سے وطن کے مقاصد کو فروغ دیا جاسکتا ہے، حال میں ذاکر میاں نے جنوب مشرقی ایشیا کے ملکوں کا جو سفر کیا اس سے ہندوستان کے متعلق خیرسگالی کے جذبات میں اضافہ ہوا جس کا احساس حکومت ہند کے محکمۂ خارجہ کو ہے۔ اگرچہ یہ ملک ہمارے پڑوسی ہیں لیکن ان کی طرف جتنی توجہ کرنی چاہیئے اتنی نہیں کی گئی۔ ذاکر میاں کے سفر کے بعد ان ملکوں سے جو دوستانہ تعلقات قائم ہوئے ہیں انھیں آیندہ برقرار رکھنے کی ضرورت ہے، اس لئے اور بھی کہ یہ ملک ہندوستانی تہذیب سے پہلے سے مانوس ہیں۔

بیرونی ممالک کے تعلیمی ادارے | ذاکر میاں کو باہر کے ملکوں میں جن کانفرنسوں میں شرکت

کا موقع ملا وہاں انھوں نے اپنی نیک دلی اور قابلیت کا سکہ بٹھادیا۔ ۱۹۴۵ء میں لندن میں یونیسکو کے قیام کی غرض سے جو پہلا اجلاس ہوا تھا اس میں ذاکر میاں ہندوستان کے وفد میں شریک تھے۔ سرکاری طور پر سرجان سارجنٹ وفد کے صدر تھے لیکن عملاً راج کماری امرت کور نے صدارت کے فرائض انجام دیئے۔ وہ ہر معاملہ میں ذاکر میاں کے مشورے کے بغیر کوئی قدم نہیں اٹھاتی تھیں اور انھیں کرنا بھی یہی چاہیے تھا، اس لئے کہ وہ کوئی ماہر تعلیم تو تھیں نہیں۔ یونیسکو کا جو اجلاس ۱۹۵۶ء میں ہندوستان میں ہوا اس میں ہندوستانی وفد کے صدر اگرچہ مولانا ابوالکلام آزاد تھے جو اس وقت وزیر تعلیم تھے لیکن عملاً ہندوستانی وفد کی سربراہی ذاکر میاں نے انجام دی۔ وہ عرصے تک یونیسکو کے ایگزیکیٹو بورڈ کے رکن رہے۔ بہار کے گورنر مقرر ہونے پر جب انھوں نے دوسری جماعتوں سے استعفیٰ دیا تو اس وقت اس بورڈ کی رکنیت سے بھی مستعفی ہو گئے۔ عرب ملکوں کی تعلیمی حالت کا جائزہ لینے کے لئے یونیسکو کی طرف سے قاہرہ میں جو کانفرنس منعقد ہوئی تھی اس میں انھوں نے ماہر تعلیم کی حیثیت سے یونیسکو کی نمائندگی کی تھی۔ اس موقع پر عرب ممالک کے ماہرین تعلیم کو انھیں قریب سے دیکھنے کا موقع ملا اور اس وقت سے برابر عرب ملکوں میں ان کی عزت و وقعت میں اضافہ ہوتا گیا۔ وہ عرصے تک انٹرنیشنل اسٹوڈنس سروس کی ہندوستانی کمیٹی کے صدر رہے۔ بعد میں جب یہ ادارہ تحلیل ہو کر ورلڈ یونیورسٹی سروس میں بدل گیا تو وہ اس کے بھی صدر رہے اور بہار کے گورنر ہونے پر اس سے مستعفی ہوئے۔ اسی طرح گورنر بہار ہونے کے وقت تک وہ سنٹرل بورڈ آف سکنڈری ایجوکیشن کے صدر تھے۔ یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کے عرصے تک ممبر رہے اور راج سبھا کے بھی۔ وائس پریسیڈنٹ آف انڈیا ہونے کے بعد بھی تعلیمی معاملات میں ان کی دلچسپی بدستور قائم رہی۔

تعلیمی خطبات | مختلف یونیورسٹیوں کے تقسیم اسناد کے جلسوں میں انھوں نے جو خطبے پڑھے ان میں ہندوستان کی تعلیم کے تمام اہم مسائل پر بحث کی ہے اور ہندوستانی ماہرین تعلیم کے بہت سے خلجان رفع کر دیئے ہیں۔ بہت سے گوشے جو تاریکی میں پڑے ہوئے تھے انھیں اپنے قلب و نظر کی بصیرت سے روشنی بخشی ہے۔ انھوں نے بنیادی تعلیم کے لئے جو اصول پیش کیا، وہ یہ تھا کہ بنیادی تعلیم محض کتابی نہ ہو بلکہ عملی ہو۔ ہر مقام کی صنعتی و حرفتی خصوصیات کے مدِ نظر اس کا تعین کیا جائے۔ انھوں نے پچھلے سالوں میں یونیورسٹیوں کے تقسیم اسناد کے جلسوں میں جو خطبے دیئے ہیں ان میں بار بار اس اصول کو دہرایا ہے کہ ثانوی اور اعلیٰ تعلیم میں بھی دستکاری اور حرفے پر زور دینا چاہیے۔ ثانوی میں زیادہ اور اعلیٰ میں اس سے کم۔ آج کل جو ایجوکیشن کمیشن ہندوستان کی تعلیم کے مسئلے پر غور کر رہا ہے امید ہے کہ وہ تعلیم کی ابتدائی، ثانوی اور اعلیٰ منزلوں میں اس بات کا تعین کریگا کہ ہر منزل میں حرفے کی تعلیم کو کتنا وقت دیا جائے۔ اس طرح پورے ملک میں تعلیمی انقلاب پیدا ہو سکتا ہے اور ہماری قومی کارکردگی میں اضافہ ہو سکتا ہے۔ اگر ہم لکیر کے فقیر رہے اور کتابی تعلیم سے چپٹے رہے تو اندیشہ ہے کہ دنیا کی دوسری قوموں کے مقابلے میں زندگی کی دوڑ میں ہم پیچھے رہ جائیں گے۔ تعلیمی کمیشن کے ارکان ذاکر میاں سے مشورے کے لئے متعدد مرتبہ ملاقات کر چکے ہیں۔ امید ہے کہ وہ ان کے خیالات سے استفادہ کریں گے اور ان کے وسیع تعلیمی تجربے کو اپنا رہنما بنائیں گے۔

قومی یک جہتی | ذاکر میاں نے قومی یک جہتی کے مسئلے پر کافی غور کیا ہے۔ ان کے نزدیک قومی یک جہتی سے اس ملک کے باشندوں کا ایسا اتحاد مراد نہیں ہے کہ اجزا کی انفرادیت فنا ہو جائے۔ وہ ہندوستان کے مسلمانوں کی انفرادیت کو قابلِ قدر سمجھتے ہیں اس لئے

کہ یہ قومی ورثے سے جدا نہیں ہے۔ لیکن اس کے ساتھ انھیں مسلمانوں کی ذمہ داری کا بھی احساس ہے۔ انھیں ملک و قوم کی خدمت میں اپنے آپ کو دوسروں کے مقابلے میں زیادہ نمایاں کرنا چاہئے۔ اس کے بغیر وہ اپنی تہذیبی انفرادیت کو حق بجانب نہیں ٹھہرا سکتے۔ ان کا خیال ہے کہ آیندہ ہندوستان کے مسلمان پاکستان کے مسلمانوں کے مقابلے میں اسلام کی زیادہ خدمت انجام دیں گے۔ ان کی اسلام کی اور وطن کی خدمت ساتھ ساتھ ہوگی۔ اس میں کوئی تضاد نہ ہوگا۔ پاکستان کے مسلمانوں کی زیادہ تر توجہ سیاسی اور مملکتی امور کی جانب رہے گی اس لئے وہ مذہب و اخلاق کی خدمت کے لئے زیادہ وقت نہیں نکال سکیں گے۔ اس کے برخلاف ہندوستان کے مسلمانوں کو غیر مسلموں کے ساتھ زندگی بسر کرنے سے وسعت نظر حاصل ہوگی جس کا اثر لازمی طور پر اسلام کی توجیہ و تعبیر پر بھی پڑے گا، جو وہ اپنے لئے قبول کریں گے۔ ان کی فکر اور تخیل دونوں کو ہر وقت نئے نئے چیلنج ملتے رہیں گے جن سے نبٹنے کے لئے وہ اپنی توانائیوں کو مرکوز رکھیں گے۔ جس طرح عالم اسلام دنیا میں اقلیت میں ہے اسی طرح سے ہندوستان کے مسلمان ہندوستان میں اقلیت میں ہیں۔ جن اصولوں پر وہ اپنے مسائل حل کریں گے ممکن ہے وہی اصول پورے عالم اسلام کے لئے فکر و عمل کی نئی راہیں کھول دیں جنہیں اندرونی اخلاقی اور مذہبی اصلاح بھی شامل ہو اور دنیا کی دوسری قوموں سے ربط و تعلق استوار کرنے کا قرینہ بھی۔ یہ ایک ایسے شخص کی امیدیں ہیں جس کی نظر زندگی کے مسائل پر بڑی گہری ہے۔ اس کا امکان ہے کہ تاریخ ان امیدوں کی تصدیق کرے۔ تاریخ کی تخلیقی رَو انسانی عمل اور ارادے سے متعین ہوتی ہے۔ اگر ہندوستان کے مسلمانوں کے مقاصد بلند اور ان کے ارادوں میں پائداری رہی تو کیا عجب ہے کہ وہ پورے عالم اسلام

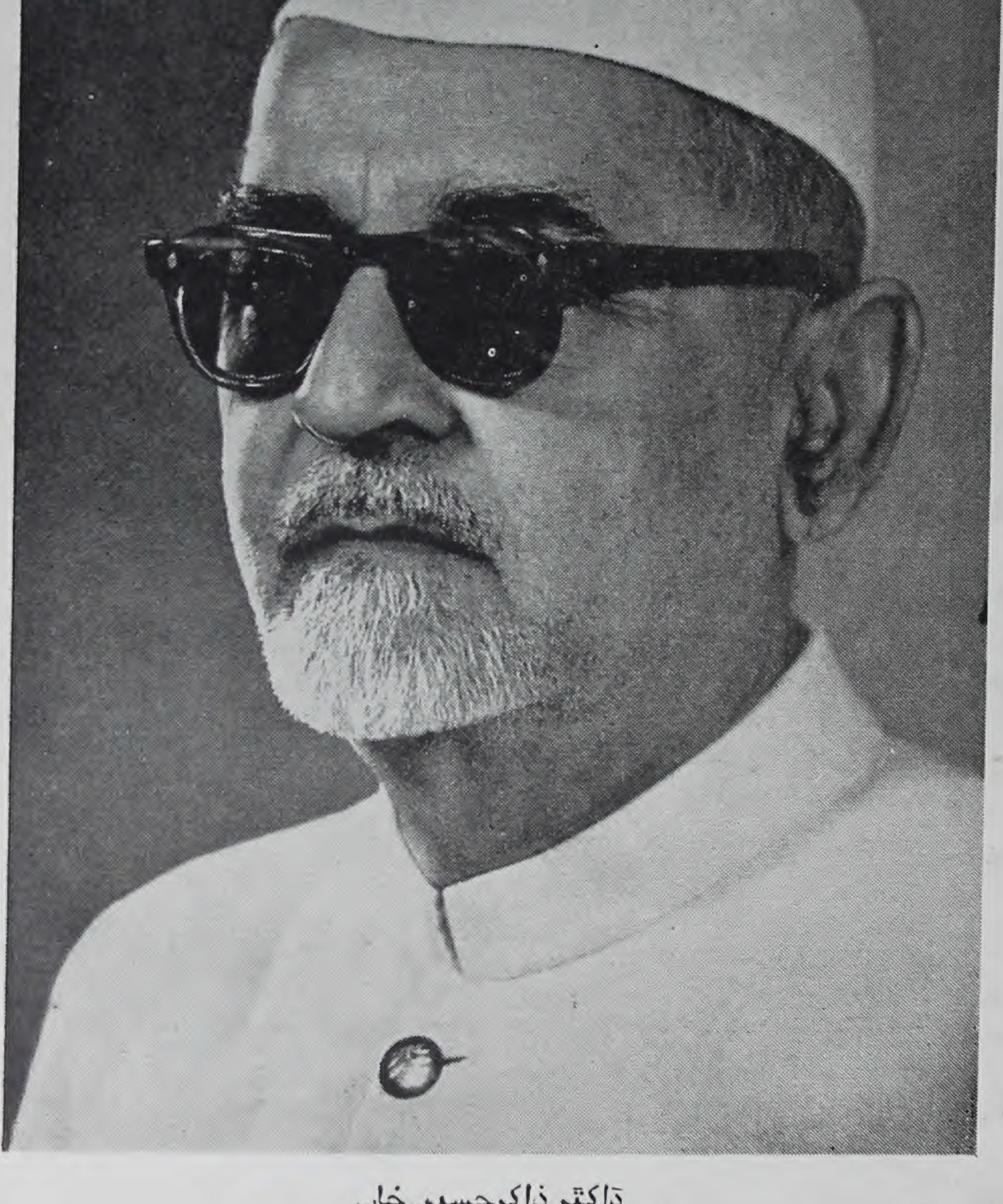
کے لئے نمونہ بن جائیں اور خود اپنی اجتماعی زندگی کو ترقی اور مرفہ حالی کی اعلیٰ منزلوں تک پہنچادیں۔

صبر اور محنت کا پھل | جامعہ کی بائیس سالہ زندگی میں ہر قسم کے نشیب و فراز آئے۔ ہر قسم کی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن ذاکر میاں اور ان کے ساتھیوں کے قدم ذرا نہ ڈگمگائے۔ ذاکر میاں کو کشمیر سے ناظم تعلیمات (ڈائرکٹر آف ایجوکیشن) اور حیدرآباد سے عثمانیہ یونیورسٹی کی وائس چانسلری پیش کی گئی تھی لیکن انھوں نے ان پر جامعہ کی تنگدستی کو ترجیح دی۔ وہ یہاں ایک مقصد لے کر آئے تھے، وہ یہاں سے اس وقت تک کیسے جا سکتے تھے جبتک کہ ان کے تعلیمی مشن کی تکمیل نہ ہو جاتی۔ ان کی نیک نیتی کے سبب سے خدا نے ان کے کام میں برکت دی اور ان کی با مقصد محنت ٹھکانے لگی اور ایسے اسباب پیدا ہو گئے کہ یہ ادارہ مضبوط بنیادوں پر قائم ہو گیا۔ وہ کام جو تجربے کے طور پر شروع ہوا تھا اب سند مانا جاتا ہے۔ جامعہ کا یہ پیغام ہے کہ تعلیم کا مقصد انسان کو انسان کا مقام یاد دلانا ہے جو تہذیب نفس کے بغیر ممکن نہیں۔ اس پیغام کی اہمیت عرصے تک قائم رہے گی بلکہ کہنا چاہئے کہ یہ کبھی فرسودہ نہ ہوگا۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ ہر زمانے میں اسے نئے معنی پہنانے ہوں گے۔

نجی زندگی | انسان کی سیرت کو پرکھنے کے لئے اس کی نجی زندگی کو بھی دیکھا جاتا ہے کہ وہ کیسی ہے۔ بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں جو محراب و منبر یا آج کی اصطلاح میں پلیٹ فارم پر تو بڑے لمبے چوڑے دعوے کرتے ہیں لیکن ذرا اُنکی نجی زندگی کو دیکھئے تو وہاں ان سب بلند آہنگ دعوؤں کی نفی ملتی ہے۔ ذاکر میاں کی نجی زندگی ہمیشہ سے آئینے کی طرح پاک صاف رہی ہے۔ اس میں ہر بات ظاہر ہے، کوئی چیز ڈھکی چھپی نہیں۔

جو کہتے ہیں وہی کرتے ہیں۔ ان کی سیرت کے اوصاف پبلک زندگی اور نجی زندگی دونوں میں یکساں ہیں۔ وہی سادگی، وہی بے ساختگی، وہی نمائش سے گریز، وہی ملنساری اور محبت کا بھاؤ، وہی وضع داری، اپنوں سے بھی اور پرایوں سے بھی۔ وہ ایک شفیق باپ، ایک دردمند بھائی، ایک مخلص دوست ہیں۔ ہر حالت میں آدمی ان پر پورا بھروسا کر سکتا ہے۔ امانت و دیانت کی یہ شان اس زمانے میں کم لوگوں میں دکھائی دیتی ہے۔ اگر کسی سے وعدہ کرلیں تو اسے پورا کریں۔ وہ ہر ایک کا کام نکالنے کو تیار رہتے ہیں، بشرطیکہ وہ جائز اور درست ہو۔ میرے علم میں بہت کم لوگ ایسے ہیں جو ذاکر میاں کی طرح دوسروں کی خوشدلی سے مدد کرتے ہوں۔ اگر وہ کسی کا کام نہیں کر سکے تو بڑے اخلاق سے اس کا اظہار کر دیتے ہیں اور اہلِ غرض کو پوری بات سمجھا دیتے ہیں کہ وہ ایسا کیوں نہیں کر سکیں گے۔ وہ کبھی کسی کو غلط اور موہوم امید نہیں بندھاتے۔ جیسا کہ بعض دوسرے بااختیار لوگوں کا شیوہ ہے جسے وہ اپنی دانست میں بڑی حکمتِ عملی سمجھتے ہیں۔ خاک حکمت عملی ہے۔ جھوٹ کو چاہے کسی برگزیدہ نام سے پکارو، وہ جھوٹ رہے گا۔ ایک حق گو اور صداقت شعار انسان کبھی کسی کو غلط بات باور کرانے کی کوشش نہیں کرے گا۔ اور نہ اسے ایسا کرنا چاہئے۔ سچائی انسان کو بہت ساری آلائشوں سے بچاتی ہے۔ ذاکر میاں کی صداقت کو بڑے چھوٹے سب مانتے ہیں۔ اپنے پرائے سب اس کی گواہی دیتے ہیں۔ اس سے ان کے کردار کی عظمت کا پتہ چلتا ہے۔

بہار کے گورنر اور وائس پریسیڈنٹ آف انڈیا کی حیثیت سے حکومت ان کے قدموں پر رہی لیکن ان کے انکسار میں کوئی فرق نہیں آیا۔ انھوں نے جس طرح فقر میں شاہی کی بلند نگاہی نہیں چھوڑی، اسی طرح شاہی میں فقر کے آداب کا احترام کرتے ہیں۔ جہاں



ڈاکٹر ذاکر حسین خان

۱۹۶۷ء

بھی رہے مقبول اور محبوب رہے۔ جو ان سے ایک مرتبہ مل لیا وہ ان کی دلنواز شخصیت سے مسحور ہو گیا۔ دہلی میں ذاکر میاں کی زندگی کا بڑا حصہ گذرا ہے۔ یہاں ہزاروں لوگ ایسے ہیں جو انھیں جانتے اور ان سے عقیدت رکھتے ہیں۔ وائس پریسیڈنٹ کی کوٹھی کا منظر عید کے دن دیکھنے کے قابل ہوتا ہے۔ سیکڑوں آدمی موٹروں میں، آٹو رکشا میں اور پیدل، جوق در جوق عید کی مبارک باد دینے آتے ہیں۔ ان میں دولت مند بھی ہوتے ہیں اور غریب بھی۔ کوئی ایسا نہیں جس سے مصافحہ اور معانقہ نہ کریں۔ عملے والے اور چپراسیوں سے بھی اسی طرح اخلاق سے ملتے ہیں جیسے دوسروں سے۔ پرانے جاننے والوں سے ہمیشہ کے جیسے ملتے تھے اسی طرح اب بھی ملتے ہیں۔ سب کی خاطر و مدارات کرتے ہیں پٹنہ میں جب گورنر تھے تو کسی تہوار کے موقع پر راج بھون کے سارے عملے کو دعوت دی۔ وہاں جو بھنگی رہتے ہیں انھیں بھی دعوتی رقعہ پہنچا۔ وہ بھی اوروں کی طرح صاف ستھرے کپڑے پہن دعوت میں شرکت کے لئے آئے۔ جب چائے پانی کے بعد تقریب ختم ہوئی تو ذاکر میاں نے باری باری سب سے مصافحہ کیا۔ بھنگیوں سے بھی ہاتھ ملایا۔ ظاہر ہے کہ ان کے نزدیک ایسا کرنے میں کوئی قباحت نہ تھی اور ان کی سچی انسان دوستی کا یہی تقاضا تھا۔ لیکن بہار والوں کے لئے یہ عجیب بات تھی جس کا چرچا میں نے وہاں کی اعلیٰ سوسائٹی میں خود سنا۔ ابھی حال میں ایک بہاری دوست نے بتایا کہ اس کا چرچا ابھی ختم نہیں ہوا گویا کہ یہ ان ہونی بات تھی جو اتفاق سے ہو گئی۔ اب نہ ہو گی۔ یہ اس ملک کا حال ہے جس کے دستورِ اساسی میں اونچ نیچ اور ذات پات کے فرق و امتیاز کو خلاف آئین قرار دیا گیا ہے۔ خالی دستور میں لکھ دینے سے کیا ہوتا ہے۔ جب تک لوگوں کے دل نہ بدلیں، معاشری فرق و امتیاز مٹنے والا نہیں۔ اور جب تک یہ نہیں مٹے گا، ہماری جمہوریت

کی بنیادیں کمزور رہیں گی۔

میں نے اس باب کا عنوان "فخرِ خاندان" رکھا ہے۔ بلاشبہ ذاکر میاں فخرِ خاندان تو ہیں ہی لیکن اس سے بڑھ کر بھی بہت کچھ ہیں۔ ان کی شخصیت کی حدود خاندان کے باہر بہت دور تک پھیلی ہوئی ہیں۔ ان کی روح کی روشنی سے بہت سارے دل اور بہت سی محفلیں منور ہیں۔ اگر انھیں فخرِ قوم کہا جائے تو یہ زیادہ موزوں اور مناسب ہو گا۔ وہ اپنی ذات سے انجمن ہیں اور بہت سی انجمنیں ان کی ذات سے فیضان حاصل کر رہی ہیں۔ ہمیں اس بات پر بجا طور پر فخر ہے کہ یہ چراغ جس سے بہت سی انجمنیں روشن ہیں ہمارے گھر کا چراغ ہے۔ بقول شاعر

یک چراغیست دریں خانہ کہ از پرتوِ آں
ہر کجا می نگری انجمنے ساختہ اند

پانچواں باب (۵)

جامعہ کی زندگی

میں قائم گنج کے قیام کے دوران میں ذاکر میاں سے ملنے علی گڑھ آتا رہتا تھا اتفاق سے جس روز مولانا محمد علی اور ان کے ساتھیوں کو پولیس نے اولڈ بوائز لاج سے نکالا اور ان کا جلوس وہاں سے کرشنا آشرم روانہ ہوا تو اس وقت میں وہاں موجود تھا۔ میں بھی جلوس کے ساتھ ساتھ گیا۔ کرشنا آشرم میں پہلے سے خیموں کا انتظام تھا۔ زیادہ تر طلبا انھیں میں ٹھہرے تھے۔ کہاں پکی بارک کے آراستہ وپیراستہ کمرے اور کہاں ان خیموں کی بے سروسامانی۔ لیکن نوجوانوں میں ایسا جوش تھا کہ وہ اپنی تکلیفوں کو خاطر میں تھوڑی لاتے تھے۔ اسلام کی اور قوم کی خدمت کے خیال میں سب مست ہو رہے تھے۔ کرشنا آشرم کے علاوہ بنگالی کوٹھی بھی کرایہ پر لے لی گئی تھی۔ ذاکر میاں بنگالی کوٹھی میں بیچ کے بڑے کمرے میں سید محمد اور رؤف پاشا کے ساتھ رہتے تھے۔

جامعہ میں داخلہ میری صحت اب ٹھیک تھی۔ حرارت غائب ہو گئی تھی اور بھوک خوب لگتی تھی۔ قائم گنج میں میرا معمول تھا کہ روزانہ صبح کے وقت تین چار میل ضرور چل لیتا تھا۔ کچھ ہلکی ورزش بھی کرتا تھا۔ اس کے علاوہ میں نے لوئی کہنی کا پانی کا قدرتی

علاج کیا جس سے مجھے فائدہ ہوا۔ اب میری صحت اس قابل ہوگئی تھی کہ میں اپنی تعلیم جاری رکھ سکوں۔ ذاکر میاں کی یہ رائے ہوئی کہ میں اور میرے چھوٹے بھائی محمود دونوں جامعہ آجائیں۔ چنانچہ ہم دونوں جولائی ۱۹۲۱ء میں جامعہ میں داخل ہو گئے، میں پریلمنری کلاس میں جو آج کل کے پری یونیورسٹی کی طرح تھا اور محمود اسکول میں

ہم جب وہاں گئے تو مولانا محمد علی اپنی سیاسی سرگرمیوں کی وجہ سے زیادہ تر باہر رہتے تھے اور ان کی جگہ عبدالمجید خواجہ پرنسپل کے فرائض انجام دے رہے تھے اور حسن محمد حیات جو علی گڑھ میں لارڈ حیات کے نام سے مشہور تھے، رجسٹرار تھے۔ میں جامعہ میں داخل ہونے کو اپنی زندگی کا ایک موڑ خیال کرتا ہوں۔

ذاکر میاں بنگالی کوٹھی کے جس کمرے میں رہتے تھے اس کے بازو میں ایک چھوٹا سا کمرہ تھا جس میں میرا قیام تھا۔ پھر بعد میں ذاکر میاں اس کوٹھی میں چلے گئے جو کرزن اسٹریٹ کے پیچھے واقع ہے اور جس میں پروفیسر محمد حبیب اور ڈاکٹر ہادی حسن کا قیام تھا۔ میں بنگالی کوٹھی کے جس چھوٹے کمرے میں رہتا تھا، وہ خوب ہوادار تھا۔ اس میں دو دروازے تھے اور ایک کھڑکی۔ قائم گنج میں کھلی ہوا میں رہنے کے سبب سے مجھے تازہ ہوا کا ہوکا تھا۔ چونکہ میرے پھیپھڑے کمزور تھے اس لئے غالباً ان کی حالت کا یہ تقاضا تھا جو مجھے کشاں کشاں تازہ ہوا میں لئے جاتا تھا۔ سردیوں میں بھی میں اپنے کمرے کی کھڑکی کھلی رکھتا تھا حالانکہ دوسرے طلبا سب دروازے اور کھڑکیاں بند کر کے سوتے تھے۔ بنگالی کوٹھی میں بھی میں نے اپنا صبح کا ٹہلنا جاری رکھا۔ بنگالی کوٹھی میں سامنے کی جانب آم کے درختوں کے بیچ میں ایک خیمہ تھا جہاں پابندی سے پانچوں وقت نماز ہوتی تھی۔ مولانا شرف الدین جو وہیں رہتے تھے، نماز پڑھاتے تھے۔ سردیوں میں فجر کی نماز چھ بجے سے

پہلے ہوتی تھی جب کہ بھبکا ہوتا تھا۔ میں نماز کے فوراً بعد پو پھٹنے سے پہلے ہی قلعے کی طرف ہوا خوری کو نکل جاتا تھا۔ کبھی کوئی ساتھ ہوگیا تو ہوگیا ورنہ اکثر میں تنہا ہی ہوتا تھا۔ بنگالی کوٹھی میں ہم لوگوں کو کھانا اچھا نہیں ملتا تھا۔ میں قائم گنج کے قیام کے دوران میں اچھے کھانے کا عادی ہوگیا تھا۔ ہمارا باورچی بختاور نہایت لذیذ کھانے پکاتا تھا۔ اس کے ہاتھ کے معمولی کھانے میں بھی مزہ تھا۔ وہاں دودھ اور دہی کا استعمال کثرت سے ہوتا تھا۔ علی گڑھ آکر بجائے دودھ کے چائے شروع کر دی۔ غذا کی خرابی کی وجہ سے چند ہی مہینوں کے اندر میری صحت پھر خراب ہوگئی۔ سردی شروع ہوئی تو مجھے مستقل طور پر زکام رہنے لگا اور کبھی کبھی کھانسی بھی ہو جاتی تھی۔ ایک دفعہ مجھے کھانسی ہوئی تو بلغم میں کچھ تھوڑا سا خون آیا۔ مجھے شبہہ ہوا کہ شاید یہ خون میرے سینے سے آیا ہے میں دوسرے روز ذاکر میاں کا خط لے ڈاکٹر انصاری کو دکھانے دہلی چلا گیا۔ اس زمانے میں وہ فتح پوری کی دکانوں کے اوپر سامنے کی جانب اپنا مطب کرتے تھے۔ وہاں جاکر میں نے غالب صاحب کو جو ڈاکٹر انصاری کے سکریٹری تھے اور ان کے عزیز بھی ہوتے تھے، ذاکر میاں کا خط دکھایا۔ اس وقت ڈاکٹر صاحب کسی مریض کو دیکھ رہے تھے جب وہ دیکھ چکے تو غالب صاحب نے اندر جاکر خط دیا۔ انھوں نے فوراً مجھے اندر بلا لیا۔ انھوں نے مجھے خوب ٹھوک بجا کر دیکھا۔ تھرمامیٹر لگایا، تو حرارت بالکل نہیں تھی۔ ڈاکٹر انصاری اس قدر اطمینان سے مریض کو دیکھتے تھے کہ اسے یقین ہو جاتا تھا کہ اب وہ اس کے ریشے ریشے سے واقف ہوگئے ہیں۔ دیکھتے جاتے اور باتیں کرتے جاتے تھے۔ باتوں باتوں میں میری صحت کے متعلق گذشتہ حالات پوچھے لیکن اس طور پر کہ مجھے اپنے بیمار ہونے کا وہم نہ

ہو۔ انھیں معلوم تھا کہ ہمارے تین جوان بھائیوں کا دق کے مرض میں انتقال ہو چکا ہے۔ جب دیکھ چکے تو کہنے لگے "تم بالکل ٹھیک ہو۔ کھانسی میں جو خون آیا تھا وہ حلق سے آیا تھا، سینے سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔" یہ رائے انھوں نے بغیر ایکسرے کے اس قدر اعتماد سے دی کہ مجھ پر اس کا بہت اچھا نفسیاتی اثر ہوا۔ پھر انھوں نے کچھ اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد، خاص کر جامعہ کے متعلق، مجھے بتایا کہ سینے سے اگر خون آئے تو حرارت ضرور ہوتی ہے۔ میں نے کہا دو سال قبل مجھے پانچ چھ مہینے برابر حرارت رہ چکی ہے۔ انھوں نے میرے اس کہنے پر کوئی توجہ نہیں دی۔ مجھے اتنا یاد ہے انھوں نے کہا تھا کہ یہ کسی اور وجہ سے ہو گی۔ میں نے یہ محسوس کیا کہ ان کی ساری کوشش یہ تھی کہ مجھے اطمینان دلائیں اور محسوس کرائیں کہ میں بیمار نہیں ہوں۔ مجھے انھوں نے جو نسخہ دیا اس میں ایک ٹانک تھا جس کا نام غالباً پلول تھا جو میں پہلے بھی استعمال کر چکا تھا جس میں مچھلی کے تیل کا جز شامل تھا۔ اس کے علاوہ دو طرح کی گولیاں تھیں جو میں نے فتح پوری ہی میں خرید لیں اور اپنے ساتھ علی گڑھ لے گیا اور کئی مہینے تک بڑی پابندی سے میں نے پلول اور گولیوں کو استعمال کیا۔ یہ علی گڑھ میں ملتی تھیں اس لئے بعد میں انھیں دہلی سے منگانے کی ضرورت نہیں ہوئی۔ چلتے وقت ڈاکٹر صاحب نے تاکید کی تھی کہ ایک مہینے بعد پھر دکھانے آنا۔ میں پھر کبھی انھیں دکھانے نہیں گیا اس لئے کہ مجھے اس کی کوئی خاص ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ بعد میں جب کبھی جامعہ میں یا دہلی میں اپنی کوٹھی پر ملتے تو ضرور یاد دلاتے کہ تم پھر نہیں آئے۔ ڈاکٹر انصاری کی شفقت بعد میں بھی رہی۔ وہ جب حیدرآباد آتے تو اصغر یار جنگ کے یہاں قیام رہتا۔ وہاں سے کسی نہ کسی کے ذریعے سے مجھے ضرور اطلاع کرا دیتے کہ آکر مل جاؤ۔ میں جاتا تو بڑی محبت سے پیش آتے اور جو لوگ ہوتے ان کے سامنے ہم سب بھائیوں کی تعریف کرتے۔ یورپ

جاتے تو وہاں سے مجھے لکھتے۔ ان کا ایک خط میرے پاس اب بھی موجود ہے۔

جامعہ کی تعلیم

جامعہ آنے کے بعد میں پنج وقتہ نماز کا پابند ہو گیا تھا۔ اس سے قبل میری نماز گنڈے دار رہتی تھی۔ بنگالی کوٹھی میں مجھے نماز میں لطف آنے لگا۔ خاص کر فجر کی نماز میں۔ یہاں مجھے فجر کی نماز کی وجہ سے سحر خیزی کی عادت پڑ گئی جو اب تک ہے۔ یورپ کے قیام میں فجر کی نماز ناغہ ہوئی لیکن اس کے بعد برابر جاری رہی۔ پنج وقتہ نماز کے لئے جس قوت ارادی کی ضرورت ہے وہ مجھ میں نہیں ہے۔ یہ میرے ارادے کی کمزوری ہے کہ سوائے جامعہ کی تقریباً پانچ سال کی زندگی کے میں پنج وقتہ نماز کی پابندی کبھی نہ کر سکا، جس کا مجھے افسوس ہے۔

میرے جامعہ میں داخل ہونے سے قبل ترک موالات اور خلافت کی تحریکیں بڑے زوروں پر تھیں۔ ملک میں ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک سامراج سے آزادی کی خواہش دلوں کو گرما رہی تھی۔ ہزاروں آدمی قید و بند کی صعوبت میں گرفتار تھے۔ میں آزادی کی تحریک کے متعلق اخباروں کے ذریعے سے پوری طرح واقف تھا۔ میں نے اور میرے چھوٹے بھائی محمود میاں نے اپنے سب بدیسی کپڑے مرکزی خلافت کمیٹی کو بمبئی بھجوا دیئے تھے، اس لئے کہ خلافت کمیٹی نے مسلمانوں سے اس کی اپیل کی تھی۔ قائم گنج کی خلافت کمیٹی کے سکریٹری کوکی خیل کے نیاز محمد خاں تھے جو بڑے جوشیلے اور مخلص کام کرنے والے تھے۔ میں نے بھی تھوڑا بہت اس کام میں حصہ لیا۔ اس سلسلے میں مجھے حفیظ الرحمٰن خاں مجیبی سے ملنے کا اتفاق ہوا جو نیاز محمد خاں کے ساتھ مل کر بدیسی کپڑے کے بائیکاٹ کی تحریک کے سلسلے میں قائم گنج میں ایک سدیسی اسٹور قائم کرنا چاہتے تھے۔ میں نے خود موٹے کھدر کے کپڑے پہننے شروع کر دیئے تھے۔ آئندہ جامعہ میں بھی پانچ سال تک

شدہ کھدر کے کپڑے پہنے۔ یورپ جانے پر کھدر کا استعمال ترک ہوگیا۔ وہاں سے واپسی پر میں نے کھدر کے بجائے دیدہ و دانستہ ملوں کے بنے ہوئے سدیشی کپڑے استعمال کرنا شروع کئے۔ ایک تو یہ کہ ملوں کے بنے ہوئے کپڑے نفیس اور مضبوط ہوتے ہیں اور دوسرے کھدر کے مقابلے میں سستے ہوتے ہیں۔ ہم سبھوں نے کھدر کا استعمال بطور علامت شروع کیا تھا لیکن بعد میں میں نے سوچا کہ یہ کوئی معقول علامت نہیں ہے۔ آخر ملوں کا کپڑا بھی تو ہندوستان ہی کا بنا ہوا ہے جسے استعمال کرنے سے ملکی صنعت کو ترقی ہوگی۔

جامعہ میں میرے ہم جماعتوں میں شفیق الرحمٰن قدوائی، سعید انصاری، عبدالقادر سیالکوٹی، عبدالقادر جونپوری، محبوب علی، محمد علی، کیلاش ناتھ کول، ایشور ناتھ ٹوپا اور سی۔ کے۔ نائر تھے۔ جامعہ میں ہندو مسلمان کی کوئی تفریق نہیں تھی۔ ہندو طلبا میں بعض تو مسلمان لڑکوں کے ساتھ کھانا کھاتے تھے۔ لیکن وہ جو گوشت نہیں کھاتے تھے ان کے لئے علیحدہ رسوئی کا انتظام تھا جس میں ایک برہمن کھانا پکانے والا ملازم تھا۔ باقی اور دوسرے تمام معاملوں میں ہندو اور مسلمان طلبا ساتھ شریک رہتے تھے۔ ان کے آپس میں تعلقات ہمدردی اور اخلاص پر مبنی تھے۔ ایک طالب علم جن کا نام مقرب حسین تھا، دھوتی کرتا پہنتے تھے اور ہندو طلبا کی رسوئی میں ترکاری کھاتے تھے۔ ان کی اور کیلاش کی دانت کاٹی دوستی تھی جو اس زمانے میں جامعہ میں ضرب المثل تھی۔ کیلاش، پنڈت جواہر لال نہرو کے سالے تھے۔ عرصے تک یوپی میں باغات کے ڈائرکٹر رہے۔ ابھی حال میں پنشن لے لی ہے اور لکھنؤ کے ڈرگ انسٹی ٹیوٹ میں ریسرچ کر رہے ہیں۔ طالب علمی کے زمانے میں وہ بڑے ملنسار اور خوش مذاق تھے۔ میں گذشتہ چالیس سال میں صرف ایک مرتبہ جامعہ کی جوبلی کے موقع پر ان سے ملا تھا۔ بہت دیر تک جامعہ کے پرانے ساتھیوں کا

ذکر ہوتا رہا۔ اس کے بعد ان سے ملنے کی نوبت نہیں آئی۔ ایک کشمیری طالب علم تھے جن کا نام آنند تھا۔ انھوں نے باؤلی میں گر کر خودکشی کر لی تھی۔ ہم سب ان کے جنازے میں شریک ہوئے۔ مجھے ان کے والد کا دھاڑیں مار مار کے رونا اب تک یاد ہے۔ جب ان کی نعش کو جلایا جا رہا تھا تو آگ کے شعلوں کی جو لپک نکل رہی تھی وہ بھی مجھے یاد ہے۔ اس الم ناک واقعہ کا ہم سبھوں پر کئی دن تک اثر رہا۔ آنند اچھے طالب علم تھے لیکن کم سخن اور کم آمیز تھے۔ میں نے انھیں کبھی کسی سے بات چیت کرتے یا ہنستے نہیں دیکھا۔ وہ کیا اسباب تھے جن کے باعث انھوں نے یہ المناک قدم اٹھایا، میں نہیں جانتا۔ ان کے ساتھ جو طالب علم رہتے تھے انھیں بھی ان کا کوئی حال معلوم نہ تھا۔ ٹوپا ان کے خاص دوستوں میں تھے انھوں نے بھی اپنی ناواقفیت ظاہر کی۔ وہ بھی حیران تھے کہ آنند نے ایسا کیوں کیا۔ یہ بات آخر تک معما رہی۔ ٹوپا میرے ساتھ عثمانیہ یونیورسٹی میں تاریخ کے شعبے میں تھے۔ پھر ریٹائر ہو گئے۔ چند سال ہوئے پنشن لے کر اپنے وطن لکھنؤ میں رہتے ہیں۔ جامعہ کے ساتھیوں میں معین الدین حارث سے میرے دوستانہ تعلقات تھے۔ بمبئی میں سکونت اختیار کر لی ہے۔ ویسے اصل میں رہنے والے کوکن کے علاقے کے ہیں۔ مرہٹی اور گجراتی بہت اچھی بولتے ہیں۔ اخبار "اجمل" کے مدیر ہیں۔ پہلے عرصے تک کانگریس میں شریک رہے، اب سوشلسٹ پارٹی میں ہیں۔ انھوں نے مقامی سیاست میں اپنا خاص مقام پیدا کر لیا ہے۔ بمبئی میں کئی مرتبہ مجھے ان کے ساتھ قیام کرنے کا موقع ملا۔ بڑے خلوص و محبت سے پیش آتے ہیں۔ جامعہ سے انھیں اب بھی قلبی لگاؤ ہے۔ جامعہ کے پرانے طالب علموں میں اشرف، جوہری اور جنگ بہادر نے بھی بعد میں سیاست میں حصہ لیا۔ اشرف اور جوہری کا تو انتقال ہو گیا۔ جنگ بہادر سے دہلی میں کبھی ملاقات ہو جاتی ہے۔ ان کی صحافتی حلقوں میں خاص حیثیت ہے۔

جامعہ کے استاد ۱۹۲۲ء میں جامعہ پر تعلیمی رنگ غالب آگیا تھا۔ پڑھائی باقاعدہ ہوتی تھی۔ اسی سال جامعہ میں کیلاٹ صاحب کا تقرر ہوا۔ وہ ہمیں تاریخ یورپ اور سیاسیات پڑھاتے تھے۔ اس زمانے میں جامعہ کے اور دوسرے اساتذہ یہ تھے۔ مولانا محمد اسلم جیراجپوری جو سیرت اور تاریخ اسلام پڑھاتے تھے۔ مولانا عبد الحئی فاروقی (تفسیر)، مولانا محمد علی شاہ (حدیث اور فقہ) مولانا شرف الدین ٹونکی (اردو) مسٹر جوالا پرشاد سنگل (ہندو اخلاقیات۔ فلسفہ اور معاشیات) محمد عبد العزیز انصاری (انگریزی) سید رؤف پاشا (انگریزی) عبد المجید خواجہ پرنسپل کے کام کے علاوہ کبھی کبھی دستور انگلستان پر لکچر دیتے تھے۔ شروع میں سید نور اللہ ہم لوگوں کو انگریزی پڑھاتے تھے لیکن بعد میں وہ اعلیٰ تعلیم کی غرض سے انگلستان چلے گئے۔ ڈاکٹر ہادی حسن کیمیا اور انگریزی دونوں مضمون پڑھاتے تھے لیکن وہ ایک سال کے اندر ہی مسلم یونیورسٹی کے اسٹاف میں شامل ہوگئے۔ عبد المجید خواجہ کے چلے جانے کے بعد ڈاکٹر محمد عالم نے جو دستور انگلستان اور سیاسات پڑھاتے تھے پرنسپل کے کام کو سنبھالا۔ ۱۹۲۲ء میں بابو ستیش چندر ڈے سیاسیات کی تعلیم کے لئے مقرر ہوئے۔ وہ بہت کمزور اور سنکی تھے۔ جب لکچر دیتے تھے تو گلے کی رگیں کھڑی ہو جاتی تھیں۔ چونکہ ان کی گردن بہت پتلی تھی اس لئے جب وہ بولتے تھے تو بعض اوقات گردن نظر نہیں آتی تھی، صرف رگیں ہی رگیں دکھائی دیتی تھیں۔ ایک حبیب اللہ صاحب آسامی تھے جو کیمسٹری پڑھاتے تھے۔ مولانا محمد سورتی اونچی جماعتوں کو عربی ادب پڑھاتے تھے۔ یہ عربی ادب کے بڑے ماہر تھے۔ جاننے والوں کا خیال تھا کہ انکی ٹکر کے بس ایک مولانا میمن تھے، باقی اور کوئی ہندوستان میں ان کے علم و فضل کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ عقیدے میں بڑے متشدد اہل حدیث تھے۔ عام طور پر لڑکے انھیں وہابی کہتے تھے۔ پاجامہ ٹخنوں سے کئی انگل اونچا پہنتے

تھے۔ سر پر عربوں کا سا رومال باندھتے تھے جس کا پلو ایک طرف لٹکتا تھا۔ سر منڈاتے تھے اور مونچھیں (لبیں) ایسی باریک ترشی ہوتی تھیں کہ دور سے منڈی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔ داڑھی شرعی تھی، یکمشت و دو انگشت۔ شروع شروع میں جب وہ جامعہ آئے تو انھوں نے طالب علموں پر سختی کرنی چاہی۔ ہاتھ میں ایک بڑی قینچی لئے پھرتے تھے جس کے انگریزی بال دیکھے انھیں کاٹ دیا۔ چونکہ ان کی علمیت کی وجہ سے سب لوگ انکی عزت کرتے تھے اس لئے خاموش ہو جاتے تھے۔ پہلے مولانا محمد علی نے اور پھر عبدالمجید خواجہ نے انھیں سمجھایا کہ اگر آپ اتنی سختی روا رکھیں گے تو لڑکے جامعہ چھوڑکر چلے جائیں گے، تب کہیں جاکر وہ قابو میں آئے۔ عربی میں چاہے فصیح و بلیغ ہوں لیکن اردو اٹک اٹک کر بولتے تھے جیسے اجنبی لوگ بولتے ہیں جن کی مادری زبان اردو نہ ہو۔ طاہر محمدی صاحب بھی ۱۹۲۲ء میں جامعہ آئے۔ وہ معاشیات پڑھاتے تھے۔ بمبئی کے رہنے والے، بہت دبلے پتلے آدمی تھے۔ انگریزی بڑے فراٹے سے بولتے تھے۔ بعض دفعہ اتنی تیز بولتے تھے کہ طالب علم سمجھنے سے قاصر رہتے تھے۔ آدمی قابل تھے لیکن طالب علموں کی دشواریوں کو بالکل نہیں سمجھتے تھے۔ انھیں تعلیمی اور نصابی ضروریات کا اندازہ نہیں تھا۔ کسی سے ملتے جلتے بھی نہیں تھے۔ بس اپنے لکچر دیئے اور گھر میں جاکر بیٹھ گئے۔ ان کی اہلیہ کی دماغی حالت میں خلل آگیا تھا جس کا اثر ان کی زندگی پر بھی ہوا۔ چونکہ لوگوں کو ان کی خانگی زندگی کے حالات معلوم نہ تھے اس لئے انکی کم آمیزی کی اساتذہ اور طلبا شکایت کرتے تھے۔ میں بعد میں ایک دفعہ ان سے بمبئی میں ملا تھا۔ ان کی گفتگو کے ہر لفظ سے مایوسی ٹپکتی تھی۔ دماغی توازن بھی اپنی جگہ سے ہٹا ہوا محسوس ہوتا تھا۔

مولویوں میں سب سے زیادہ دلکش شخصیت مولانا اسلم جیراجپوری کی تھی جو "تاریخ الامت"

کے مصنف ہیں۔ ان کی نظر قرآن پر بہت گہری تھی۔ میں نے عالموں میں اتنا جدت پسند شخص نہیں دیکھا۔ مولانا آزاد سبحانی کو چھوڑ کر مولویوں میں مولانا اسلم جدید زمانے کے تقاضوں کو اچھی طرح سمجھتے تھے۔ تقلیدِ جامد کے مخالف اور اجتہاد کے قائل تھے۔ کہا کرتے تھے کہ جب سے مسلمانوں نے دین کے معاملات میں اجتہاد کو چھوڑا اس وقت سے ان کا زوال شروع ہوا۔ اب ضرورت ہے کہ پھر سے اجتہاد کا دروازہ کھولا جائے اور نئے حالات کی روشنی میں اسلامی فقہ کو پرکھا جائے۔ ان کا پڑھانے کا انداز نہایت عمدہ اور جدید اصول کے مطابق تھا۔ اپنے آپ کو طالب علموں کے معیار پر لاکر ان کی دشواریوں کو سمجھنے کی کوشش کرتے تھے۔ جب تک طلبا بالکل مطمئن نہ ہو جائیں، آگے نہیں بڑھتے تھے۔ بڑے خوش بیان مقرر تھے۔ میلادِ نبوی کے جلسوں میں اور ان کے علاوہ دوسرے موقعوں پر جب کبھی تقریر کرتے تو اپنی بات سننے والوں کے دلوں میں اتار دیتے۔ کبھی کبھی شعر بھی کہتے تھے، زیادہ تر قومی رنگ میں۔ جامعہ کی عمارت کا سنگ بنیاد رکھتے وقت انھوں نے جو نظم کہی تھی اس کا ایک شعر ہے:۔

عشرتِ شاہی میں بھی حاصل نہیں پرویز کو
وہ مزا جو کوہکن کی سعیِ لاحاصل میں ہے

مولانا عبدالحیٔ فاروقی تفسیر پڑھاتے تھے۔ تفسیر پر ان کی متعدد تصانیف شائع ہوئیں۔ ان پر مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا عبیداللہ سندھی کے خیالات کا گہرا اثر تھا۔ جہاد کے متعلق اکثر کلاس میں گفتگو کیا کرتے تھے۔ محمد علی شاہ سندھ کے رہنے والے تھے۔ وہ فقہ پڑھاتے تھے۔ بڑے ذہین آدمی تھے۔ متکلموں کی طرح بال کی کھال نکالنے میں مشتاق تھے۔ سب سے پہلے حنفی فقہ کی کتاب "الحیل" کا ذکر میں نے انھیں سے سنا تھا۔ میں اس

زمانے میں بھی اس قسم کے تفقہ فی الدین کا قائل نہیں تھا اور اکثر اوقات مولانا محمد علی شاہ سے میری بحث ہو جاتی تھی۔ میں سمجھتا ہوں دین کی معنویت اس قسم کی فقہی سخن سازی سے کہیں زیادہ بلند چیز ہے جس سے روح کی تہذیب ہوتی ہے۔ مولانا شرف الدین اردو پڑھاتے تھے۔ یہ ہم سب بھائیوں کے اٹاوہ کے اسلامیہ ہائی اسکول میں استاد رہ چکے تھے۔ ان کا علم مستحضر تھا۔ جو کچھ جانتے تھے اچھی طرح جانتے تھے اور بڑے اعتماد کے ساتھ اپنی بات کہتے تھے۔ نہایت صاف گو تھے۔ مجھ پر بڑی شفقت فرماتے تھے بعد میں میری شادی میں شرکت کے لئے قائم گنج تشریف لائے تھے۔ پرانے غزل گو تھے ظہیر دہلوی کے شاگردوں میں۔ پہلے یاس تخلص کرتے تھے پھر اسے بدل کر مومن کر دیا تھا۔

مسٹر جوالا پرشاد سنگل ہندو اخلاقیات اور معاشیات پڑھاتے تھے۔ میں ان کے معاشیات کے لکچروں میں جاتا تھا۔ جب لکچر دیتے تھے تو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ جیسے بالکل کھوئے ہوئے ہوں۔ کبھی کبھی کلاس میں جو کھڑکی تھی اس پر اچک کر بیٹھ جاتے اور اس بلند مقامی سے لکچر کا سلسلہ جاری رکھتے۔ اس زمانے میں ہندو فلسفے پر ایک کتاب لکھ رہے تھے اس کا ذکر معاشیات کے لکچروں میں کرتے تھے اور جن موضوعوں پر اس کتاب میں بحث کی تھی ان کی تفصیل بیان کرتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اس کتاب سے دنیا میں ذہنی انقلاب برپا ہو جائے گا۔ انھوں نے کتاب کا نام "ایٹرنل ٹرتھ" (دائمی صداقت) رکھا تھا۔

ہمارے اساتذہ میں سب سے زیادہ لائق اور بافیض مسٹر کیلاٹ تھے جو سیاست اور تاریخ کے پروفیسر تھے۔ نصاب کے علاوہ وہ طالب علموں کی عام معلومات

پڑھانے کے لئے روزانہ ایک لکچر دیتے تھے جو نہایت دلچسپ ہوتا تھا۔ اس کا موضوع بدلتا رہتا تھا۔ کبھی مذہب اور اخلاق اور کبھی علم انسان (انتھراپولوجی)۔ طرز بیان شُستہ اور برجستہ تھا۔ انگریزی زبان پر بڑی قدرت تھی۔ بولتے بھی اچھی تھے اور لکھتے بھی اچھی تھے۔ وہ اپنے ہر لکچر کی تیاری پر کافی محنت کرتے تھے۔ کلاس میں لکچر شروع کرنے سے پندرہ بیس منٹ پہلے آکر بلیک بورڈ پر تقریر کے خاص خاص نکات تحریر کر دیتے تھے۔ پھر لکچر دیتے وقت ان میں سے ہر ایک پر تفصیلی بحث کرتے تھے۔ ہم لوگوں سے تقریر کے دوران میں پوچھتے جاتے تھے کہ کسی کو کچھ کہنا تو نہیں ہے۔ بعض دفعہ ہم لوگ ان سے کڑے سوال کرتے جن کا وہ تشفی بخش جواب دیتے اور پھر اپنے لکچر میں آگے بڑھتے۔ تاریخ کے علاوہ انھیں انگریزی ادب سے بھی خاص لگاؤ تھا۔ وہ انگریزی ادب کی عظمت کا اکثر ذکر کرتے تھے۔ کہتے تھے کہ انگلستان کی سماجی تاریخ کو سمجھنے کے لئے ڈکنس کا پڑھنا ضروری ہے۔ ان کے کہنے پر میں نے ڈکنس کے اکثر ناول پڑھ ڈالے۔ اس کے بعد مجھے ناول پڑھنے کا شوق ہوگیا۔ ایچ۔ جی۔ ولیس کے ناول پڑھے، ٹالسٹائی کی وار اینڈ پیس (جنگ اور صلح) کا مختصر انگریزی ایڈیشن بھی پڑھا۔ میں ڈکنس اور ٹالسٹائی کے ناولوں سے بہت متاثر ہوا۔ میں نے دوسرے احباب سے بھی ان ناولوں کا ذکر کیا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے شفیق الرحمٰن قدوائی نے بھی میرے کہنے پر ٹالسٹائی کی "وار اینڈ پیس"، (جنگ اور صلح) پڑھی تھی۔ چونکہ یہ عام طور پر مشہور تھا کہ گاندھی جی نے جن لوگوں کا اثر قبول کیا ہے ان میں ٹالسٹائی بھی ہیں، اس لئے ہم لوگوں نے ٹالسٹائی کی دوسری تصانیف بھی پڑھیں۔

کیلاٹ صاحب کی توجہ سے ہم سبھوں میں خود پڑھنے کا شوق پیدا ہوگیا۔ اس

عمر میں ہمیں انگریزی پر اتنی قدرت نہیں تھی کہ ٹکسالی زبان کے نازک اور باریک فرق اچھی طرح سمجھ سکیں جیسا کہ بعد میں سمجھنے لگے۔ ادب سے اثر پذیری کے لئے یہ ضروری نہیں کہ ہر لفظ اور محاورے کو سمجھا جائے۔ اگر ایسا ہو تو بہت اچھا ہو لیکن اگر ایسا نہ ہو تو بھی ادب سے انسان لطف اندوز ہو سکتا ہے۔ میں نے غالب کے کلام کا نسخۂ "حمیدیہ" جب پڑھنا شروع کیا تو بہت سارے شعر میری سمجھ میں نہیں آئے لیکن پھر بھی میں ان سے لطف اندوز ہوا اس لئے کہ ان کے عام مفہوم اور اس ذہنی اور جذباتی فضا پر جو اس مفہوم سے پیدا ہوئی میری گرفت تھی۔ اسی طرح انگریزی زبان کے ناولوں اور دوسری زبانوں کے ناولوں کے انگریزی ترجموں سے اس ذہنی اور جذباتی فضا پر گرفت رہی جو ان سے پیدا ہوتی تھی، یہی حال مصوری کا ہے۔ تصویر دیکھنے والا اس کا عمومی اثر قبول کرتا ہے، چاہے اس کی ہر تفصیل کو نہ سمجھے۔ ادب اور آرٹ دونوں کا مقصد اثر پذیری ہے اور یہ مقصد ہم لوگوں نے پوری طرح سے حاصل کیا۔ کیلاٹ صاحب کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے ہم سبھوں میں یہ ذوق ابھارا اور اس کے نشوونما میں مدد دی۔ اگر استاد یہ کام کر دے تو پھر اس سے زیادہ کچھ اور نہیں چاہئے۔ اگر وہ شاگردوں کو راستے پر ڈال دے تو پھر وہ خود آگے بڑھتے ہیں۔ میرے نزدیک یونیورسٹی کی تعلیم کا یہی مقصد ہونا چاہئے۔ اس کے بغیر میکانکی طور پر جو علم حاصل کیا جاتا ہے وہ ذہن کا جز نہیں بنتا، امتحان کامیاب کرنے میں اس سے چاہے کتنی مدد ملے۔ استاد کا کام یہ ہے کہ وہ اپنے شاگردوں کے اندرونی قوی کو حرکت میں لائے تاکہ ان کی روح کے سوتے کھل جائیں۔ اگر ایسا ہو جائے تو شاگرد اس سوتے سے اپنی ذہنی زندگی کو خود ہی شگفتہ اور شاداب بنالیں گے اور وہ جس

راستے پر پڑ گئے ہیں اس پر خود کسی کی مدد کے بغیر آگے بڑھتے چلے جائیں گے۔

کیلاٹ صاحب کے لکچروں میں ہمیں ایسا محسوس ہوا جیسے ہمارے سامنے علم کی دنیا کے دروازے کھل گئے ہوں جو اب تک بند تھے۔ لکچروں کے علاوہ انھوں نے ہم سب میں اپنی معلومات بڑھانے کا شوق پیدا کر دیا۔ ہم یہ سمجھنے لگے جیسے علم کی روشنی ذہن کی تاریکی کو اپنی جگہ سے ہٹا رہی ہے۔ میں مختلف موضوعوں کی کتابیں اور رسائل رات کو دیر تک پڑھتا رہتا تھا۔ لیکن اس کا میری سحر خیزی کی عادت پر کوئی اثر نہیں ہوا اور نہ صبح کی نماز معمولاً قضا ہوئی کبھی کبھار ہو گئی تو اس کی بات الگ ہے۔ میں مختلف مسائل پر کیلاٹ صاحب سے گفتگو کرنے ان کے گھر جایا کرتا تھا۔ وہ خود ہم سبھوں سے کہتے تھے کہ جب جی چاہے میرے یہاں آ جایا کرو۔ میں سب سے زیادہ ان کے یہاں کے حاضر باشوں میں تھا۔ چھٹی کے دن ڈو تین گھنٹے ان کے ساتھ ضرور گذرتے تھے۔ اگر کسی مسئلے میں ان کی رائے سے اختلاف کیا جائے تو وہ دوسروں کی طرح کبیدہ خاطر نہیں ہوتے تھے بلکہ خندہ پیشانی سے پوری بات سنتے، پھر جواب دیتے تھے۔ استادوں میں انھیں اور مولانا اسلم جیراجپوری کو میں نے دیکھا کہ طالب علموں کے اعتراضوں سے گھبراتے نہیں تھے بلکہ ہمت افزائی کرتے تھے، چڑھنا اور چیں بہ جبیں ہونا تو کجا کیلاٹ صاحب کی صحبت سے میں نے جو فیض حاصل کیا وہ آیندہ جب میں اعلیٰ تعلیم کے لئے یورپ گیا تو بہت کام آیا۔ میں ان کے احسان کو کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔

کیلاٹ صاحب کی وضع اور سیرت کے استاد آج ہمارے کالجوں اور یونیورسٹیوں میں ناپید ہیں۔ آج ہماری درسگاہوں میں جو عام طور پر نظم وضبط کا فقدان ہے اس کی اصلی وجہ یہ ہے کہ گذشتہ پندرہ سولہ سال میں استادوں کی پرانی پیڑھی کی جگہ نئی پیڑھی

نے لے لی ہے جسے اپنے کام سے جیسی دلچسپی ہونی چاہیے ویسی نہیں ہے۔ دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ مذہب و اخلاق کی بندشیں ڈھیلی پڑ گئی ہیں جس کے باعث نوجوانوں میں سر پھرا پن بڑھ گیا ہے۔ ان کی نظر میں نہ کسی کا ادب ہے نہ لحاظ، نہ اپنی علمی اور اخلاقی کوتاہیوں کو دور کرنے کی خواہش۔ جب اچھائی اور برائی کی تمیز ہی اُٹھ جائے تو پھر سدھار کی کون سی شکل باقی رہتی ہے۔ ان استادوں میں سے اکثر و بیشتر نے غلط پیشے کا انتخاب کیا ہے۔ ان کا دل اس میں نہیں، کہیں اور رہتا ہے اس لئے وہ بیگار ٹالتے ہیں۔ اپنی کوتاہیوں کو چھپانے کے لئے پارٹی بازی میں پڑ جاتے ہیں اور طالب علموں کو غلط امیدیں دلا کر انھیں اپنی سیاست میں مبتلا کرتے ہیں۔ انھیں طالب علموں سے سچی ہمدردی نہیں اور نہ وہ انکی اخلاقی اور ذہنی نشو و نما کی طرف توجہ کرتے ہیں۔ توجہ کریں کیوں؟ اوپر کے چند عہدداروں کو ملا لیا، بس پھر اطمینان ہے۔ اب کون پوچھنے والا ہے کہ تمھارے منفرد کے دانت ہیں۔ ہندوستان کی کسی یونیورسٹی کے اسٹاف کلب میں چلے جائیے۔ ٹینس کے بعد یا تو شطرنج اور تاش کھیلے جاتے ہیں یا گپ ہوتی ہے۔ گفتگو کا موضوع بیشتر یہ ہوتا ہے کہ تنخواہ کس طرح بڑھوائی جائے۔ فلاں یونیورسٹی میں گریڈ بڑھ گئے۔ ہمارے یہاں اب تک نہیں بڑھے۔ گریڈ میں اضافے کی خواہش بالکل جائز خواہش ہے لیکن یہی تو سب کچھ نہیں۔ اس کے علاوہ کبھی یہ بھی تو گفتگو کا موضوع ہونا چاہیے کہ طالب علموں کی ذہنی اور اخلاقی نشو و نما کے لئے کیا تدابیر اختیار کی جائیں۔ آج ہماری یونیورسٹیوں کی گراوٹ اور ان کی فضا کی خرابی کی اصل وجہ یہی ہے کہ استادوں کی دلچسپی کا مرکز طالب علم نہیں رہے بلکہ ذاتی مفاد یا گروہ بندی کی سیاست ان کی تمام تر توجہ کو جذب کر لیتی ہے۔ سیاست بازی کا جب آسان نسخہ موجود ہے تو مشقت کر کے اپنی قابلیت بڑھانے اور

اس طرح اپنی علمی حیثیت منوانے کی کیا ضرورت ہے۔ بغیر اس کے بھی گریڈ مل جاتا ہے جو مقصود و منتہا ہے۔

کیلاٹ صاحب کا اوڑھنا بچھونا جامعہ تھی۔ صبح سے شام تک انھیں یہ فکر رہتی تھی کہ طالب علموں کی اخلاقی اور جسمانی حالت کو کس طرح بہتر بنایا جائے، اُس میں سُدھار کیونکر ہو۔ دس بجے سے ایک بجے تک پڑھاتے تھے۔ سہ پہر میں طالب علموں کے ساتھ کھیل میں شریک ہوتے تھے۔ رات میں دوسرے دن کے لکچر تیار کرنے کے لئے دو تین گھنٹے پڑھتے تھے۔ انھوں نے کبھی کوئی لکچر بغیر تیاری کے نہیں دیا۔ دمے کے مریض تھے لیکن سردی کے موسم میں تڑکے سے اٹھ بیٹھتے تھے اور طالب علموں کو ورزش کے میدان میں فوجی ڈرل کراتے تھے۔ مالابار کے رہنے والے تھے لیکن علی گڑھ اور دہلی کی سردی کو نہیں مانتے تھے۔ ان کا پڑھانے اور ورزش کرانے کا پروگرام برسوں جاری رہا اور طالب علموں کی کئی پیڑھیاں ان کی شفقت آمیز رہنمائی میں جامعہ سے فارغ التحصیل ہو کر نکلیں۔ لڑکوں کی جسمانی صحت کی طرف ان کی خاص توجہ رہتی تھی۔ ہر ایک کو مستعد اور مضبوط بنانے کی تدابیر بتاتے تھے۔ کسی کو کہتے ڈمبل کرو، کسی کو کہتے دوڑ لگاؤ، کسی کو تیرنے کا مشورہ دیتے۔ کسی کے لئے ہاکی کھیلنا تجویز کرتے اور کسی کے لئے والی بال۔ خود ہاکی کے شوقین تھے۔ سنٹر ہاف کی حیثیت سے کھیلتے تھے شفیق اور میں ہمیشہ فارورڈ کھیلتے تھے۔ وہ رائٹ ان اور میں سنٹر فارورڈ۔ ہم دونوں جامعہ کے بہترین ہاکی کھیلنے والوں میں شمار ہوتے تھے۔ کیلاٹ صاحب کا مقولہ تھا کہ تعلیم و تربیت کی تکمیل جسمانی ورزش کے بغیر نہیں ہوتی۔ وہ اہل یونان کے اصول کے قائل تھے کہ نوجوانوں کے خوبصورت جسم ہی میں حسین دماغ نشو و نما پا سکتا ہے۔

کیلاٹ صاحب مذہب میں پروٹسٹنٹ عیسائی تھے۔ اتوار کے روز گرجا ضرور جاتے تھے۔ روزانہ

انجیل مقدس پڑھتے تھے۔ کہا کرتے تھے کہ عیسائی مذہب اور اسلام چچازاد بھائی (کزنس)
ہیں۔ انھیں ایک دوسرے کو سمجھنا چاہیے۔ کیلاٹ صاحب موحد تھے اور اسلام نے توحید
پر جو زور دیا ہے اسے سراہتے تھے۔ دوسرے مذہب کے ماننے والوں سے رواداری برتتے
تھے۔ وہ ہندوستان کی آزادی کے دل سے خواہاں تھے۔ لیکن قومیت کی ادعا پسندی کو
انسانیت کے لئے خطرہ تصور کرتے تھے۔ انھوں نے ہمیں قومیت اور بین الاقوامیت کے
اصول اپنے لکچروں میں بڑی وضاحت سے سمجھائے تھے۔ اگرچہ وہ خود نیشنلسٹ تھے لیکن
اس کے ساتھ یورپ اور خاص کر انگریز قوم کی علمی اور اخلاقی عظمت کو مانتے تھے۔ گاندھی
جی کو ہندوستانی قوم کا سب سے بڑا لیڈر تسلیم کرتے ہوئے ان کے بعض اصولوں سے انھیں
اختلاف تھا۔ مثلاً وہ چرخے اور تکلی کو فضول خیال کرتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ گاندھی جی کی
ذات سے ہندوستان میں آزادی کی تحریک کو فروغ ہوا لیکن تہذیب و تمدن کے متعلق
ان کے خیالات رجعت پسندانہ ہیں۔ صنعتی انقلاب کے بعد انسانیت جن مسائل سے دوچار
ہے انھیں وہ سمجھنے سے قاصر ہیں۔ وہ کھدر کے بجائے ہمیشہ سدیشی استعمال کرتے تھے
اور اسے حق بجانب بتاتے تھے۔ کلاس میں ہمیشہ قمیص اور تہمد میں آتے تھے۔ تہمد اس
وضع کا جیسا کہ جنوبی ہند والے استعمال کرتے ہیں جو شمالی ہند کے تہمد سے کچھ مختلف ہے اور
اس میں ایک خاص وضع کا سجیلا پن ہوتا ہے۔ ویسے وہ کبھی کبھی سوٹ بھی پہنتے تھے۔
سوٹ کے ساتھ ترکی ٹوپی میں نے پہلی مرتبہ انھیں کو استعمال کرتے دیکھا۔ ہیٹ بہت
کم پہنتے تھے۔ سوٹ پر یا تو نیچی باڑھ کی ترکی ٹوپی پہنتے تھے یا ننگے سر رہتے تھے۔
جب جامعہ قرول باغ میں تھی تو کیلاٹ صاحب کی سرکردگی میں ہم لوگ بھولی
بھٹیاری کے محل کے پاس جو تالاب ہیں ان میں تیرنے کیلئے جایا کرتے تھے۔ بوعلی بختیاری کو

دہلی والوں نے بھولی بھٹیاری کر دیا۔ یہ پہاڑ گنج کے حدود میں ایک مرتفع پہاڑی پر واقع ہے۔ یہاں سے دور دور کے منظر دکھائی دیتے ہیں برسات کے موسم میں یہاں پون پرچھا کا میلا ہوتا تھا جس میں دہلی کے جو تشی اور رمال جمع ہوتے تھے سید احمد خاں نے آثار الصنادید میں لکھا ہے کہ یہاں فیروز تغلق کے زمانے میں پانی کو روکنے کے لئے جو پہاڑوں میں سے آتا ہے ایک بند بنایا گیا تھا۔ اب یہاں دو بڑے بڑے حوض میونسپلٹی نے بنوائے ہیں جن سے پہاڑ گنج اور قرول باغ کو پانی مہیا کیا جاتا ہے۔ چونکہ یہ تالاب میونسپلٹی کے ذخیرۂ آب کے طور پر استعمال ہوتے تھے اس لئے ان میں نہانے کی اجازت حاصل کرنی پڑتی تھی۔ کیلاٹ صاحب باقاعدہ اجازت لے کر ہم لوگوں کو یہاں تیرنا سکھانے لے جاتے تھے۔ ایک دفعہ ہم لوگ کیلاٹ صاحب کے ساتھ جمنا میں نہانے کی غرض سے اوکھلا گئے۔ سب مل کر دس بارہ طالب علم ہوں گے۔ سب لوگ جمنا میں اترے۔ بعض جو اچھے تیراک تھے چند منٹ میں کنارے سے کافی دور نکل گئے۔ کیلاٹ صاحب خود بھی اعلیٰ درجے کے تیراک تھے، وہ تیراکوں میں سب سے آگے تھے۔ میں کنارے پر کھڑا یہ تماشا دیکھ رہا تھا۔ چودھری اکبر علی نے جو ابھی کنارے ہی پر تھے مجھے کہا کہ آپ بھی اندر آجایئے، میں تیرنا سکھا دونگا۔ چنانچہ میں پانی میں اترا مشکل سے آٹھ دس قدم گیا ہونگا کہ ایک دم سے میرا قدم ایک گڑھے میں نیچے اتر گیا اور میں اپنے آپ کو نہ سنبھال سکا۔ دو تین غوطے بری طرح لگے۔ چودھری اکبر علی یہ دیکھ کر جھپٹے اور مجھے دونوں ہاتھوں سے اوپر اٹھا لیا۔ وہ کسرتی آدمی تھے اور تیراک بھی بہت اچھے تھے۔ اگر وہ اس وقت میرے قریب موجود نہ ہوتے تو میں یقیناً

ڈوب گیا ہوتا۔ میں چودھری اکبر علی کے اس احسان کو کبھی نہیں بھول سکتا۔ اس وقت سے میرے دل میں پانی کا ایسا ڈر بیٹھ گیا کہ میں نے تیرنا سیکھنے کی پھر کبھی کوشش نہیں کی۔ بعد میں جب میں یورپ گیا تو تعطیل کے زمانے میں سمندر کے کنارے کئی دفعہ جانا ہوا لیکن میں کبھی سمندر میں نہیں اترا۔ دور سے دوسروں کے تیرنے کا تماشا دیکھا کرتا تھا۔

چودھری اکبر علی اسلامیہ کالج لاہور سے ترک موالات کر کے جامعہ آئے تھے۔ وہ کیلاٹ صاحب کے چہیتے شاگردوں میں تھے۔ جامعہ کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لئے وہ امریکہ چلے گئے۔ وہاں سے واپس آئے تو دماغ میں پھوڑا ہو گیا۔ آپریشن میں جاں بر نہ ہو سکے۔ بڑے مرنجاں مرنج شخص تھے۔ اس کے ساتھ بڑے خوددار سچے اور کھرے انسان تھے۔ صاف گو ایسے کہ کسی کی لگی لپٹی نہیں رکھتے تھے لیکن خواہ مخواہ کسی کا دل بھی نہیں دکھاتے تھے۔ ورزش کا شوق تھا۔ کپڑے اتار، لنگوٹ کس، جب کسرت کرتے تو انکا خوبصورت سڈول جسم دیکھنے کے لئے کتاب کے کیڑے بھی ٹھٹھک جاتے تھے۔ کھڑے ہوتے تو بلا مبالغہ بالکل اپولو کے مجسمے کے مثل نظر آتے تھے۔ افسوس کہ ان کی عمر نے وفا نہ کی۔ کیلاٹ صاحب سے چودھری صاحب کی گاڑھی چھنتی تھی۔ کیلاٹ صاحب دو قسم کے طالب علموں کو پسند کرتے تھے۔ اچھے دماغ والے اور خوبصورت ورزشی جسم والے۔ انھیں خود اپنا جسم بنانے کا شوق تھا جس کے متعلق چودھری اکبر علی سے مشورہ کرتے رہتے تھے۔ چودھری صاحب نے ڈنڈ بیٹھک سے اپنا جسم سڈول بنایا تھا مگر کیلاٹ صاحب دیسی ورزش کے طریقوں کے قائل نہ تھے۔ وہ یا تو ڈمبل کرتے تھے یا ولایتی ورزش جس میں ہاتھ پاؤں اور دھڑ کو مختلف حرکتوں اور جنبشوں سے چاق و چوبند بنایا جاتا ہے۔ لیکن

کبھی کبھی چودھری صاحب کے اصرار پر دیسی ورزش بھی کر لیتے تھے جیسے فرض کفایہ ادا کر رہے ہوں۔ کیلاٹ صاحب ہمیشہ کہتے تھے کہ ہمارے دیسی ورزش کے طریقے سائنٹفک نہیں ہیں۔ ان سے جسم میں پھرتی نہیں آتی بلکہ بھدا پن آجاتا ہے۔ اس معاملہ میں کیلاٹ صاحب اور چودھری اکبر علی میں اختلاف رہتا تھا لیکن بایں ہمہ وہ دونوں ایک دوسرے کی عزت کرتے تھے۔ چودھری اکبر علی امریکہ جانے سے پہلے مکتبۂ جامعہ کے منیجر ہو گئے تھے۔ انھوں نے یہ خدمت تقریباً دو سال بڑی محنت اور دیانتداری سے انجام دی ان کے جانشین حامد علی خاں ہوئے۔ حامد علی خاں کے بعد غلام ربانی تاباں نے جو میرے برادر نسبتی ہیں مکتبے کے کام کو سنبھالا۔ ان کے حسن انتظام سے مکتبے کو خوب ترقی ہوئی ہے۔ وہ اچھے منتظم ہونے کے ساتھ اچھے شاعر بھی ہیں۔ غزل خوب کہتے ہیں۔

نیا نصاب

میں جس سال جامعہ میں داخل ہوا، اس سال مولانا محمد علی کا بنایا ہوا نصاب تعلیم جامعہ میں نافذ ہوا تھا جس میں بی۔اے۔ اور بی اے آنرز دونوں کا التزام کیا گیا تھا۔ میں پریلیمنری کلاس کے بعد بی اے کے پہلے سال میں آیا اور تین سال میں اس کی تکمیل کی۔ مولانا کی اسکیم میں ابتدائی اور ثانوی تعلیم کی منزلوں میں صنعت و حرفت کو لازمی مضمون کے طور پر رکھا گیا تھا تاکہ شروع ہی سے بچوں میں ہاتھ سے کام کرنے کی عادت پڑے اور وہ اسے اپنے لئے کسر شان نہ خیال کریں اور اگر ثانوی تعلیم کے بعد یونیورسٹی کی تعلیم کسی وجہ سے نہ حاصل کر سکیں تو باعزت طریقے سے اپنی روزی کما سکیں اور کسی کے دست نگر نہ رہیں۔

مولانا محمد علی کے نصاب میں اس بات کا پوری طرح لحاظ رکھا گیا تھا کہ جامعہ کی تعلیم میں قدیم اور جدید، دینی اور دنیوی کا صحیح امتزاج عمل میں آئے اور یہ درس گاہ حکومت کے اثر سے بالکل آزاد رہ کر ملک و قوم کی خدمت انجام دے۔ تعلیم میں سیاسی

اثر کم ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ جامعہ ملک کی آزادی اور ہندوستانی قومیت کی تعمیر کے لئے جو تحریک چل رہی تھی، اس سے اپنے آپ کو بے تعلق کر لے۔ یہ کسی طرح بھی ممکن نہ تھا، اسلئے کہ آزادی کی تحریک ہی سے جامعہ نے جنم لیا تھا۔ یہاں کے طالب علموں کی اچھی خاصی تعداد اس تحریک میں حصہ لینے کے سبب سے جیلوں کو گئی تھی۔ وہاں سے چھوٹنے پر ان میں سے بعض تو ہمیشہ کے لئے سیاست میں پھنس گئے۔ لیکن جو اپنی تعلیم جاری رکھنا چاہتے تھے ان کے لئے جامعہ کے دروازے ہمیشہ کھلے رہے۔ اب جامعہ کے تعلیمی مشن کا ملک کے ہر گوشے میں چرچا ہونے لگا۔ اور اس ادارے کی طرف لوگوں کی نظریں اٹھنے لگیں۔ چنانچہ دو سال کے عرصے میں ملک کے مختلف حصوں میں جو نیشنل اسکول قائم ہوئے ان میں سے سترہ کا الحاق جامعہ کے ساتھ کیا گیا جس کی وجہ سے ایک ناظر المعارف (انسپکٹر آف اسکولز) کا عہدہ قائم کرنا پڑا جس کے ذمے یہ کام تھا کہ وہ سب جگہ معیار کی یکسانیت برقرار رکھنے کی تدابیر اختیار کرے۔

اسکول کی تعلیم میں صنعت و حرفت پر خاص توجہ مبذول کی گئی تھی جس میں لیتھو اور ٹائپ کی طباعت بھی شامل تھی۔ تصویریں بنانا اور ہاف ٹون بلاک تیار کرنا بھی سکھایا جاتا تھا۔ جامعہ پریس کا کام چالو ہو چکا تھا جس کے منیجر عبدالعلی خاں تھے۔ انھوں نے بڑی محنت اور جانفشانی سے پریس کی کارکردگی کو بڑھایا۔ بعد میں جب جامعہ دلی منتقل ہوئی تو پریس بھی دلی آگیا اور عبدالعلی خاں ہی اس کے منیجر رہے۔ نورالرحمٰن صاحب کی نگرانی میں تصنیف و تالیف کا شعبہ قائم ہوا اور رسالہ جامعہ کا پہلا شمارہ جنوری ۱۹۲۳ء میں شائع ہوا۔ اس رسالے میں زیادہ تر مضمون جامعہ کے استادوں اور طالب علموں کے ہوتے تھے۔ میں نے سب سے پہلے اسی رسالے میں مضمون نگاری شروع کی تھی۔ شروع ہی سے

رسالہ جامعہ نے اپنی علمی ساکھ قائم کر لی تھی۔ چند سال بعد یہ اردو کے چوٹی کے رسالوں میں شمار ہونے لگا۔ جامعہ میں سائنس کی تعلیم کا بھی انتظام تھا۔ خواجہ عبدالجید، آر۔ این سیلوم، ایل۔ این۔ گپتا اور ڈاکٹر محمد عظیم خاں سائنس کے مختلف مضامین پڑھاتے تھے۔ بی۔ ایس۔ سی تک کی تعلیم کے لئے لیبارٹیری قائم ہو گئی تھی اور ضروری سامان مہیا کر لیا گیا تھا۔

ڈاکٹر پی۔ سی۔ رے کا خطبہ | ۱۹۲۳ء کے تقسیم اسناد کے جلسے کی صدارت کے لئے ملک کے نامور سائنسٹسٹ ڈاکٹر پی۔ سی رے کو بلایا گیا جنھیں ترک موالات سے پہلے سر کا خطاب حاصل تھا۔ لیکن اس تحریک کے شروع ہونے پر رابندر ناتھ ٹیگور کی طرح انھوں نے بھی اپنا خطاب برطانوی حکومت کو واپس کر دیا۔ ڈاکٹر پی۔ سی۔ رے نے اس موقع پر جو خطبہ دیا وہ یادگار رہے گا۔ اس میں انھوں نے کہا:۔

"سائنس نے بنی نوع انسان کی بڑی خدمت کی ہے اس کی سب سے بہتر اور سب سے زیادہ مستقل خدمت تحکم و جبروت سے بغاوت، صداقت کی جستجو اور معقولیت کی حمایت رہی ہے اور آج ایک سائنس داں کی حیثیت سے خطاب کرتے ہوئے میں آپ سے اس محکم صداقت اور نشانِ حریت کو ہمیشہ بلند رکھنے کی درخواست کرتا ہوں .... میں اسلام کی علمی روایات سے واقف ہوں۔ مسلمانوں نے سائنس، علوم و فنون اور فلسفے کی جو خدمت انجام دی ہے اس سے میں بے خبر نہیں ہوں...... جب یورپ کی دنیا بربروں کے حملوں سے زوال پذیر ہو کر ناگفتنی تاریکی کے گڑھے میں جا پڑی تھی، اگر اس وقت اسلام کمک نہ پہنچاتا اور اعلیٰ علوم کی تخم ریزی کر کے ان کی پوری پرداخت نہ کرتا اور حق و حریت کی جاں بخش آب و ہوا میں ان کی تربیت کر کے انھیں

پھلنے پھولنے نہ دیتا، تو میں پوچھتا ہوں کہ آج دنیا کہاں ہوتی اور جدید تہذیب کا نشان کہاں ملتا؟
میں جانتا ہوں کہ مسلمان مادرِ وطن کے ویسے ہی حقیقی سپوت ہیں جیسے کوئی بڑے سا بڑا محبِ وطن ہندو۔ میں ان سے یہ گذارش کرتا ہوں کہ مسلم جماعت میں اخوت وحبِ وطن کا جذبہ ہمیشہ جاری ہے اور یہی وہ پیغام محبت ہے جس کی تبلیغ واشاعت اس قومی یونیورسٹی کو کرنی ہے۔ اس کو تمام ہندوستان کے سامنے اخوت اور بھائی چارہ کا نمونہ پیش کرنا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اپنے نصب العین کی تکمیل اس کے اُن بانیوں کو خوش کرنے کا بہترین ذریعہ ہوگی جن کے لئے ہندو مسلم اتحاد بطور عقیدے کے تھا۔ مجھے خوشی ہے کہ اس کی ابتدا بہت اچھی ہوئی ہے۔ آج تک اس تعلیم گاہ کی سرگرمیاں بہت ہمت افزا رہی ہیں۔ یہاں کے طلبا میں مذہبی تعلیم کے لئے بھی خاص انتظام کیا گیا ہے اور متعدد خالص ہندو مدارس جامعہ سے ملحق ہیں۔ خدا کرے یہ برادرانہ جذبہ دن دونی رات چوگنی ترقی کرے۔"

ڈاکٹر پی سی رے نے اپنی عمر بھر کی کمائی کیمسٹری کی تعلیم کو فروغ دینے کیلئے وقف کردی تھی۔ خود نہایت سادہ برہم چاریوں کی سی زندگی بسر کرتے تھے علی گڑھ میں ان کا قیام عبدالمجید خواجہ صاحب کی کوٹھی پر تھا۔ ہم لوگ وہاں جب ان سے ملنے کی غرض سے گئے تو دو گھنٹے کے قریب مسلمانوں کے علمی کارناموں پر گفتگو کرتے رہے ہندوستان میں سائنس کی تعلیم کو فروغ دینے کی نسبت اپنی تجاویز کا ذکر کرتے تھے جن میں سے بعض پر کلکتہ میں ان کے شاگردوں اور ماننے والوں نے عمل کرنا شروع کردیا تھا۔ ڈاکٹر پی۔ سی رے کا انداز کچھ ونوبا بھاوے جی سے ملتا جلتا تھا۔ دبلے پتلے موٹے کھدر کا کرتا دھوتی پہنے ننگے سر، پاؤں میں چپل، سر کے بال الجھے ہوئے، داڑھی

چھدری چھدری، نہ بڑی نہ چھوٹی۔ ان کی آنکھیں بڑی روشن تھیں اور بعض دفعہ جب وہ بات کرتے تھے تو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ ان کی آنکھیں پورے چہرے پر چھا گئی ہیں۔ بات کرنے میں کھوئے ہوئے سے نظر آتے تھے۔ ان کی سادگی، بے ساختگی اور اخلاص سے ہم سب بہت متاثر ہوئے۔ ان کی صحبت میں جو چند گھنٹے گذرے ان کی نسبت جب میں سوچتا ہوں تو یہ خیال آتا ہے کہ قدیم ہندوستان کے رشی منی انھیں کی طرح ہوتے ہوں گے۔ ڈاکٹر پی۔ سی۔ رے کی زندگی بڑی با مقصد زندگی رہی ہے۔ ان کے شاگرد ان کی پرستش کرتے تھے۔ اور کیوں نہ کرتے۔ ان میں بڑا اپنے تھا، اتحا، پسندی نہ تھی، خود غرضی نہ تھی۔ وہ دوسروں کے لئے اپنے آپ کو تج دینے والے، اپنی ذات کو مٹا دینے والے تھے۔ اس میں تعجب کی کیا بات ہے اگر لوگ ایسے شخص کے پاؤں دھو کر پئیں۔ ہم لوگوں کی پی۔ سی۔ رے سے جو باتیں رہیں ان کا بعد میں بھی چرچا ہوتا رہا۔ ان کی شخصیت نے ہم سبھوں کو اپنا گرویدہ بنا لیا تھا۔ انھوں نے اپنے خطبے میں مسلمانوں کے علمی اور سائنٹفک کارناموں کا جو تذکرہ کیا وہ خلوص اور صداقت پر مبنی تھا، نہ کہ کسی مصلحت پر۔ وہ ایک بڑے دل و دماغ کے انسان تھے۔ ان کی سادگی نے ان کی عظمت کو چار چاند لگا دیئے تھے۔

ڈاکٹر پی سی۔ رے نے خاص طور پر جامعہ کی سائنس کی لیباریٹری دیکھی جو بالکل معمولی حیثیت کی تھی اور جس کے در و دیوار پر بے سر و سامانی برستی تھی ظاہر ہے کہ اس کا مقابلہ کلکتہ یونیورسٹی کی سائنس کی لیباریٹریوں سے نہیں کیا جا سکتا تھا۔ یہاں بس اتنا اہتمام کیا گیا تھا کہ بی۔ ایس۔ سی تک تعلیم ہو سکے۔ ہمارے ساتھیوں میں کریم اللہ اور علی احمد اور دوسرے چند طالب علم سائنس پڑھتے تھے۔ ڈاکٹر پی۔ سی۔ رے نے ہمارے سائنس

کے اساتذہ کی ہمت افزائی کی اور لیباریٹری کو بہتر بنانے کے متعلق ان کے سامنے چند تجویزیں رکھیں۔ وسائل کی کمی کی وجہ سے اس زمانے میں جامعہ میں سائنس کی تعلیم کا ویسا انتظام نہیں ہو سکا تھا جیسا کہ آرٹس کے مضمونوں کا تھا۔ تاہم کام چلانے کی حد تک انتظام کر لیا تھا۔ ڈاکٹر پی۔ سی۔ رے کی باتوں سے جامعہ کے سائنس کے استادوں کی بڑی ہمت افزائی ہوئی۔

جامعہ کے استادوں کی خصوصیت جامعہ کے استادوں کے ایثار اور ان کی شفقت سے ہم سب طالبعلم متاثر تھے اور دل سے ان کا احترام کرتے تھے۔ ان کے درسوں سے زیادہ ان کی سادہ اور بے تصنع زندگی ہمارے لئے سبق آموز تھی۔ یہ سبق ایسا ہوتا ہے کہ آدمی اسے کبھی نہیں بھول سکتا۔ کتابوں کا کیا ہے، انھیں آج پڑھا کل بھول گئے۔

جامعہ کے اساتذہ کی ہمدردی اور ان کے ساتھ بے تکلف میل جول سے ہم سبھوں نے بہت کچھ سیکھا۔ یہ قدرتی بات ہے کہ باتوں باتوں میں انسان بہت کچھ حاصل کر لیتا ہے، بشرطیکہ سیکھنے والوں اور سکھانے والوں کے دلوں میں ربط و تعلق ہو۔ کلاسوں کے علاوہ بھی ہم لوگ اپنے استادوں کے مکان پر جاتے تھے اور گھنٹوں ان سے گفتگو کرتے تھے۔ کیلاٹ صاحب کے یہاں تو میں پابندی سے جاتا تھا۔ خاص کر جمعہ کے دن جب ہماری تعطیل ہوتی تھی ان سے باتیں ہر موضوع پر ہوتی تھیں۔ مذہب، سیاست، اہلِ مغرب کی علمی اور سماجی فوقیت، سب پر کچھ نہ کچھ تبصرہ ہوتا۔ کیلاٹ صاحب اور دوسرے استادوں کے خیالات کا اثر ہم سبھوں پر ہونا لازمی تھا۔ اس سے نہ صرف یہ ہوا کہ ہماری صحیح تعلیم اور تربیت ہوئی بلکہ یہ اثر ایسا گہرا تھا کہ بعد میں بھی قائم رہا۔ میں خود جب اپنے خیالات کا تجزیہ کرتا ہوں تو مجھے ان پر

کیلاٹ صاحب کا اثر صاف نظر آتا ہے۔ نوجوان اپنی اثر پذیری کی عمر میں جو اثر قبول کر لیتے ہیں وہ نہ دھوئے دھلتا ہے نہ چھڑائے چھٹتا ہے۔

جامعہ کے سب استادوں کو اپنے فرض منصبی کا بڑا خیال رہتا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ تعلیم ایک سانچہ ہے جس میں نوجوانوں کی سیرت ڈھالی جاتی ہے۔ اس سانچے کے بنانے والے وہ خود ہیں۔ انھیں فکر تھی تو اس کی کہ جامعہ کے استاد کی حیثیت سے ان کے ہاتھوں میں جو اثر پذیر مادہ دیا گیا ہے اس کو ملت کی پختہ اور مستحکم عمارت میں لگانے کے قابل بنائیں۔ ورنہ ان میں اور دوسری یونیورسٹیوں کے استادوں میں کیا فرق ہوگا۔ وہ اپنے اس بلند مقصد کی خاطر ہر قسم کی تکلیف برداشت کرنے کو تیار تھے۔ مادی وسائل کی کمی سے کم حوصلہ لوگ پست ہمت ہو جاتے ہیں لیکن یہی چیز باحوصلہ لوگوں کے عزائم کو ابھارتی ہے اور وہ اس چیلنج سے نبٹنے کے لئے اپنی جان کھپا دیتے ہیں۔ جامعہ کے استاد معمولی استاد نہیں تھے جو معلمی کا پیشہ اس لئے اختیار کرتے ہیں کہ کسی دوسرے پیشے میں انھیں گھسنے کا موقع نہ مل سکا۔ میں غور کرتا ہوں تو مجھے محسوس ہوتا ہے کہ اس زمانے کے جامعہ کے استادوں میں ہر ایک اپنی خاص خصوصیت رکھتا تھا۔ ان سبھوں میں ایک قدرِ مشترک یہ تھی کہ وہ سب ملک کی آزادی کے دیوانے تھے اور اس کی خاطر بہت کچھ تج چکے تھے، بیشتر اس کے کہ وہ جامعہ کے استادوں کے زمرے میں شامل ہوں۔

اقامتی زندگی | کالج کے طالب علم پہلے کرشنا آشرم اور بنگالی کوٹھی میں رہتے تھے۔ بعد میں جامعہ نے چندنیاں کی چار کوٹھیاں کرایے پر لے لی تھیں۔ ۱۹۲۵ء میں جامعہ کے دہلی منتقل ہونے تک ہم لوگ چندنیاں کی کوٹھیوں میں رہے۔ اسکول کے طلبہ فرید

منزل، دلکشا منزل اور مشرف منزل میں رہتے تھے، اور حافظ فیاض احمد خاں ان کے نگراں تھے جو ایم۔ اے۔ او کالج کے کالجیٹ اسکول سے ترک موالات کر کے جامعہ آئے تھے۔ چھوٹے بچوں کے ساتھ ان کا برتاؤ پدرانہ شفقت کا تھا۔ ان کی نگرانی میں اسکول کی بزم کمال بڑی کامیابی سے چلتی رہی۔ اسکول کے لڑکوں نے "جوہر" نام کا ایک قلمی اخبار نکالنا شروع کیا جس کے اصلی محرک میرے چھوٹے بھائی محمود میاں تھے۔ یہ رسالہ بعد میں عرصے تک نکلتا رہا۔ "جوہر" کا محمد علی نمبر کافی اونچے معیار کا نکلا تھا۔

بزم اتحاد جامعہ کالج کی بزم اتحاد بھی طالب علموں میں تقریر کا ذوق پیدا کرنے میں کامیاب تھی۔ ہر طالب علم کو اس کے پلیٹ فارم پر تقریر کرنے کے مواقع حاصل تھے۔ اس کے پہلے نائب صدر سید نور اللہ تھے جو ایم۔ اے۔ او کالج سے ہجرت کے وقت وہاں کے یونین کے نائب صدر تھے۔ جب میں ۱۹۲۱ء میں جامعہ میں داخل ہوا تو اس وقت سید نور اللہ استادوں کے زمرے میں آچکے تھے۔ ان کے بعد مولوی سعد انصاری بزم اتحاد کے نائب صدر منتخب ہوئے۔ وہ ندوۃ العلماء کے فارغ التحصیل تھے۔ جامعہ میں انگریزی تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے آئے تھے۔ جامعہ سے وہ اعلیٰ تعلیم کے لئے مصر گئے اور وہاں سے واپسی پر ان کا جامعہ میں تقرر ہوگیا۔ ان کی عمر نے وفا نہ کی۔ بڑی خوبیوں کے مالک تھے۔ ان کے بڑے بھائی مولوی عبدالباری ندوی جامعہ عثمانیہ میں فلسفے کے شعبے میں ریڈر تھے۔ سیرۃ النبیؐ کی تیسری جلد کا ایک باب "دلائل و معجزات اور عقلیات جدیدہ" انھیں کی کاوش ذہنی کا نتیجہ ہے۔ تصوف پر بھی متعدد کتابیں لکھی ہیں۔ چند سال ہوئے لکھنؤ میں ان سے ملاقات ہوئی تھی۔ گذشتہ سال علی گڑھ میں بھی ملنے کا موقع ملا۔ اب ۸۰ سے اوپر ہیں

لیکن اب بھی ذہن میں جودت اور شادابی ہے۔ ذرا اونچا سننے لگے ہیں لیکن دماغ پر بڑھاپے کا کوئی اثر نہیں۔

مولوی سعد انصاری کے بعد ظہیر الدین خاں نائب صدر ہوئے جو ایم۔اے او کالج کے ان طلبا میں سے تھے جنھوں نے ترک موالات کیا تھا۔ پنجاب کے رہنے والے تھے۔ ان کے بعد ۱۹۲۳ء میں شفیق الرحمٰن قدوائی بزم اتحاد کے نائب صدر منتخب ہوئے۔ ان کی نائب صدارت کے زمانے میں اس انجمن نے قابلِ لحاظ ترقی کی ہفتہ وار تقریروں کے علاوہ طلبا مقالے لکھ کر پڑھتے تھے جن پر مباحثہ ہوتا تھا۔ انجمن کے جلسے محمد علی ہال میں ہوتے تھے۔ یہ ہال ہر قسم کے کاموں کے لئے استعمال ہوتا تھا۔ یہاں نماز ہوتی، دونوں وقت کھانا ہوتا، کالج کے اوقات میں درس ہوتے اور جامعہ کے اور بزم اتحاد کے جلسے بھی یہیں ہوتے تھے۔ اس میں مونج کا فرش تھا جس پر کبھی کھدر کی سفید چادریں بچھا دی جاتیں۔ کھانے کے وقت مونج کے فرش پر کھدر کے سفید لمبے لمبے دسترخوان بچھا دیتے تھے جن کے دونوں طرف طالب علموں کی قطاریں کھانے کے لئے بیٹھتیں۔ محمد علی ہال کی ویسے تو کوئی خاص عمارت نہ تھی جسے جاذب نظر کہا جائے مگر جامعہ کے طالب علموں کو اس سے ایک طرح کا جذباتی تعلق پیدا ہوگیا تھا۔ یہاں بعض بڑے اہم جلسے ہوئے تھے۔ مارماڈیوک پکتھال اور ڈاکٹر پی۔ سی رے کے تقسیم اسناد کے جلسوں کے خطبے یہیں ہوئے۔ خواجہ کمال الدین اور مولانا محمد علی لاہوری کی اسلام پر تقاریر یہیں ہوئیں۔ ایک تقریر عبدالرحمٰن صدیقی کی اس ہال میں ہوئی تھی جو زبان و بیان کے اعتبار سے نہایت اعلیٰ

پانے کی تھی۔ انھوں نے اس میں ان مظالم کی داستان بیان کی تھی جو یونانیوں نے ترکوں پر انگریزوں کی ایما پر ڈھائے تھے۔ میں یہ تو نہیں کہتا کہ مجھ میں اس وقت اتنی صلاحیت تھی کہ انگریزی زبان کی تقریر کے حسن و قبح پر رائے دے سکوں لیکن اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں کہ میں عبدالرحمٰن صدیقی کی تقریر سے بیحد متاثر ہوا تھا۔ کئی سال بعد میں نے انگلستان میں پھر ان کی تقریر سنی تو میرے پہلے تاثر کی توثیق ہو گئی۔ اتنی عمدہ انگریزی بولنے والے ہندوستانی میں نے بہت کم دیکھے اور سنے۔ بعد میں مجھے عبدالرحمٰن صدیقی سے لندن اور پیرس میں ملنے کا موقع ملا اور میں نے انھیں بہت قریب سے دیکھا۔ وہ کام آنے والے دوست اور اعلیٰ سیرت کے انسان تھے۔ بڑے صاف گو، بڑے مخلص، بے ریا اور کھرے ایسے کہ کبھی لگی لپٹی نہیں رکھتے تھے۔ مجھ پر بہت مہربان تھے۔ میں کلکتہ میں کئی روز ان کے یہاں مہمان رہا تھا۔ بڑے مزے کی باتیں کرتے تھے۔ ایسے سچے اور ہمدرد انسان اب کاہے کو پیدا ہوں گے۔

۱۹۲۳ء میں جب مولانا محمد علی قید فرنگ سے چھوٹ کر جامعہ تشریف لائے تو اسی محمد علی ہال میں انجمنِ اتحاد کی جانب سے ان کی خدمت میں سپاسنامہ پیش کیا گیا۔ یہ جلسہ جامعہ کے نہایت شاندار جلسوں میں شمار ہوتا ہے۔ جامعہ والوں کے علاوہ اس میں باہر کے بہت سے لوگ بھی شریک ہوئے تھے۔ ہم لوگوں نے محمد علی ہال کو پھول پتیوں سے خوب آراستہ کیا تھا۔ اس موقع پر اقبال کی نظم "اسیری" ایسی خوش الحانی سے پڑھی گئی کہ سماں بندھ گیا۔ ہر مصرعہ جب پڑھا جاتا تو طالب علم نے میں لے ملاتے جس سے سارے مجمع پر کیفیت طاری ہو گئی۔ یہ نظم اقبال نے اس وقت کہی تھی جب پہلی جنگ عظیم کے موقع پر مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی کو انگریزی

حکومت نے گرفتار کر کے پانچ سال چھندواڑہ میں نظر بند رکھا تھا نظم کے اشعار یہ ہیں۔

ہے اسیری اعتبار افزا جو ہو فطرت بلند — قطرۂ نیساں ہے زندانِ صدف سے ارجمند

مشک اذفر چیز کیا ہے اک لہو کی بوند ہے — مشک بن جاتی ہے ہو کر نافۂ آہو میں بند

ہر کسی کی تربیت فطرت نہیں کرتی مگر — کم ہیں وہ طائر کہ ہیں دام و قفس سے بہرہ مند

شہ پر زاغ و زغن در بندِ قید و صید نیست — ایں سعادت قسمتِ شہباز و شاہیں کردہ اند

شفیق صاحب نے اپنی تقریر میں "حسرت تعمیر" کی طرف اشارہ کیا تھا۔ مولانا محمد علی نے جواب میں پہلے تو یہ بتایا کہ جامعہ کو کن کن دشواریوں کا سامنا کر کے چلایا گیا۔ پھر کہا کہ جامعہ کی یہ آبادی مدینہ کے مہاجرین اور انصار کے مشابہ ہے جو فتح مکہ کے انتظار میں ہیں اصل قلعہ تو علی گڑھ کالج ہے جس پر ہمیں ایک دن قبضہ کرنا ہے۔ پھر جامعہ کے طالب علموں کو قرآنی تعلیم کی طرف متوجہ کیا۔ توحید باری تعالیٰ کا ذکر کرتے ہوئے اس آیت کی تفسیر بیان کی۔ "ءَاَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَیْرٌ اَمِ اللّٰہُ الْوَاحِدُ الْقَھَّارُ" آخر میں اپنی نظر بندی کے زمانے کے تجربے بیان کر کے تقریر کو اپنے اس شعر پر ختم کیا تھا:۔

یوں قید سے چھٹنے کی خوشی کس کو نہ ہوگی
پر تیرے اسیروں کی دعا اور ہی کچھ ہے

چھنڈواڑہ میں پانچ سال جو قید فرنگ میں گذرے ان میں مولانا محمد علی نے قرآن حفظ کیا اور اردو غزل میں اپنے بے پناہ خلوص اور جوشِ بیان سے ایک نئی جان ڈال دی۔ مکتبۂ جامعہ نے ان کے کلام کا مجموعہ "کلام جوہر" کے نام سے شائع کیا جسے بڑی مقبولیت حاصل ہوئی۔ اس جگہ ان کی متعدد ولولہ انگیز غزلوں میں سے ایک کے چند شعر میں نقل کرتا ہوں۔ فرماتے ہیں:۔

کبھی چکھے ہی نہیں آبلہ پائی کے مزے — خضر کیا جانیں بھلا راہ نمائی کے مزے
کثرتِ شوق سے تھا ہجر بھی ہم رنگِ وصال — ہم نے لوٹے ہیں بہت تیری جدائی کے مزے
طبعِ آزاد اسیری میں بھی پابند نہ تھی — بند میں ہم نے اٹھائے ہیں رہائی کے مزے

شفیق صاحب طالب علمی کے زمانے ہی میں ہم سب شفیق صاحب کی عزت کرتے تھے۔ صرف عزت ہی نہیں ان سے محبت کرتے تھے۔ ان کا خلوص بے پناہ تھا۔ کوئی مخالف سے مخالف بھی اس پر شبہہ کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے مخالف کا لفظ غلط استعمال کیا۔ شفیق صاحب کا میں سمجھتا ہوں کہ کبھی کوئی مخالف ہوا ہی نہیں۔ اور اگر اتفاق سے کوئی ہوتا تو یقیناً وہ اسے اپنے اخلاقِ حسنہ سے رام کر لیتے۔ وہ ایسے مرنجان مرنج تھے کہ ہر کوئی ان کا دوست تھا۔ کبھی ایسا ہوتا کہ ہمعصر طالب علموں میں آپس میں چپقلش یا اَن بَن ہو جاتی تو شفیق صاحب ان میں میل کرواتے۔ اپنی بات کہتے جاتے اور ہنستے جاتے۔ جب وہ ہنستے تو ایسا محسوس ہوتا کہ ہنستے ہوئے چہرے میں سب سے زیادہ آنکھیں ہنس رہی ہیں۔ مصیبت میں بھی ان کی آنکھوں کی مسکراہٹ اپنا کام کرتی رہتی۔ مایوس ہونا تو وہ جانتے ہی نہیں تھے۔ اس لئے کہ خدا پر ان کا ایمان ایسا مضبوط اور پکا تھا جیسے چٹان۔ ان کی پنج وقتہ نماز نمائش کے لئے نہیں تھی۔ ان کا ذوقِ عبودیت ان کے ایمان کو مضبوط کرنے کا ایک وسیلہ تھا۔ عقیدت مندی کا اخلاص جیسا میں نے شفیق صاحب کی زندگی میں دیکھا کہیں اور نہ نظر آیا۔ ان کے ہاں اسلام اور وطن دوستی کا امتزاج چلتی پھرتی صورت میں دکھائی دیتا تھا۔ ان کی خلوت و جلوت یکساں تھی۔ قول اور فعل میں تضاد نہ تھا۔ ان کی بات پر ہر شخص کو پورا اعتماد تھا۔ وہ صداقت اور مروت کا پیکر مجسم تھے۔

شفیق صاحب کی شخصیت کی تعمیر میں مختلف عناصر کی کارفرمائی تھی۔ سب سے پہلے تو وہ مولانا محمد علی سے متاثر ہوئے۔ پھر انھوں نے گاندھی جی کی تعلیم کو اپنی ذات میں اپنایا۔ اس کے بعد ذاکر میاں کی ہم نشینی سے کسب فیض کیا۔ غرضیکہ ان مختلف اثرات سے ان کی سیرت کے مخفی جوہر نمایاں ہوئے۔ ان کی ذات میں ان سب اثرات کی کارفرمائی اسی لئے ممکن ہوئی کہ خود ان میں اخلاق اور نیکی کی غیر معمولی صلاحیتیں موجود تھیں۔ انھوں نے بڑے ریاض اور مجاہدے سے جامعہ کے مقاصد اور نصب العین کو اپنی شخصیت میں سمویا تھا۔ سچی قومیت، بے لاگ اسلامیت، خدمتِ خلق کا بے پناہ جذبہ، یہ تھے شفیق صاحب کے کردار کے نمایاں خدوخال۔ مجھ پہ بڑی شفقت فرماتے تھے۔ ہمدردانِ جامعہ کے سلسلے میں جب کبھی حیدرآباد آتے تو ہمیشہ میرے ساتھ قیام فرماتے۔ مجھے آخر تک یہ نہ معلوم ہو سکا کہ ان کے کتنے بچے ہیں۔ جب کبھی ان کی خانگی زندگی کا ذکر آتا تو شرما جاتے اور بات کاٹ کر دوسری بات شروع کر دیتے۔ خدمت دوسروں نے بھی کی لیکن شفیق صاحب نے خدمت کے ساتھ اپنے آپ کو بالکل مٹا دیا تھا۔ وہ خود بظاہر مٹ گئے تاکہ وہ مقاصدِ عالیہ زندہ رہیں جن کے لئے انھوں نے اپنے کو وقف کر دیا تھا۔

شفیق صاحب کبھی کسی کے جھگڑے میں نہیں پڑتے تھے۔ اگر کہیں کوئی جھگڑا ہو تو اس میں یکسوئی اور صلح و صفائی کی کوشش کرتے۔ ان کا مسلک صلح کل تھا۔ جب حیدرآباد آتے تو ہر جماعت کے لوگ ان کا ہاتھ بٹاتے تھے اس لئے کہ ہر ایک ان کی عزت کرتا تھا۔ اور ان کی بے نفسی اور ایثار کا مداح تھا۔ ہمدردانِ جامعہ اور بعد میں تعلیم بالغان کے سلسلے میں انھوں نے ہر شخص اور ہر شہر کے لئے جتنی رقم مختص کر دی تھی وہ انھیں

بلا کسی عذر یا چون وچرا کے مل جاتی تھی بعض دفعہ ہم لوگ جان بوجھ کر اپنے احباب سے تاخیر کرا دیتے تھے تاکہ اس طرح شفیق صاحب مجبوراً کچھ دن اور حیدرآباد میں ٹھہریں۔ ان کے ایک جیل کے دوست محمود حسن حیدرآبادی تھے جو شروع میں کتابوں کا کاروبار کرتے تھے اور پھر پی۔ ڈبلیو۔ ڈی میں مددگار معتمد (اسسٹنٹ سکریٹری) ہوگئے تھے۔ چندہ کی وصولی میں ان سے بڑی مدد ملتی تھی۔ محمود حسن ہم لوگوں کے ساتھ جامعہ میں تھے۔ بڑے رکھ رکھاؤ کے انسان تھے۔ اپنے اوپر غیر معمولی اعتماد تھا۔ جو بات کہتے وہ ایسی جیسے دور کی کوڑی لائے ہوں۔ اخباری معلومات اچھی تھیں۔ ان کی گفتگو کا موضوع اکثر و بیشتر سیاسی مسائل اور رفتار عالم سے متعلق ہوتا۔ جو رائے دیتے وہ قطعی ہوتی۔ اگر کوئی اس سے اختلاف کرتا تو ناراض ہو جاتے تھے۔ ایک طویل زمانہ رندی میں گذارا۔ پھر مذہب و عقیدت سے وابستگی پیدا کرلی اور قرآن کے مطالعہ پہ کافی وقت صرف کرنے لگے۔ ان کی زندگی کا یہ رنگ عارضی نہیں بلکہ پختہ ثابت ہوا۔ شفیق صاحب ان کی رندی کے مشاغل سے واقف تھے لیکن پھر بھی وہ محمود حسن سے دلی محبت کرتے تھے۔ مجھ سے کہا کرتے تھے "محمود کا دل بہت اچھا ہے"۔ وہ جو کہتے تھے وہ بالکل ٹھیک نکلا۔ اس زمانے میں جس نے محمود حسن کو دیکھا ہوگا وہ بھلا کیسے یقین کرتا کہ ایک دن وہ تقویٰ کی پاک و صاف زندگی بسر کریں گے۔ حامد علی عباسی کے مکان پہ جو ہفتہ وار درس قرآن ہوتا تھا اس میں پابندی سے آتے تھے۔ میں بھی جاتا تھا۔ وہیں ان سے ملاقات رہتی تھی۔ اس کے علاوہ کبھی وہ میرے یہاں آتے اور میں ان کے یہاں جاتا۔ جامعہ میں جب تھے تو اکثر ان سے بحثا بحثی ہو جاتی تھی۔ شفیق صاحب کی مشترک دوستی کی وجہ سے حیدرآباد میں میرے اور ان کے تعلقات بہت خوشگوار رہے۔

محمود حسن شفیق صاحب سے محبت کرتے تھے لیکن کبھی کبھی انھیں چھیڑنے کو کج بحثی شروع کر دیتے تھے۔ زیادہ چوٹ شفیق صاحب کی گاندھیت پرستی پر ہوتی۔ جو دوسرے لوگ موجود ہوتے وہ سب محمود حسن کا ساتھ دیتے اور بیچارے شفیق صاحب تنہا رہ جاتے۔ ان کی نیکی اور معصومیت دیکھ کر مجھے ان پر بڑا رحم آنے لگتا کہ اکیلے چوکھی لڑ رہے ہیں۔ جواب دیتے جاتے ہیں اور مسکرائے جاتے ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا کہ مسکراہٹ نے دائمی طور پر ان کے چہرے سے آشنائی کر لی ہے۔ میں جب دیکھتا کہ شفیق صاحب کے احباب انھیں بہت دق کر رہے ہیں تو میں ان کی حمایت میں بولنے لگتا۔ جب گرماگرم بحث ہونے لگتی تو میں کہتا کہ بھئی اب ختم کرو۔ کچھ بھی ہو شفیق صاحب ہم سبھوں سے بہتر مسلمان ہیں۔ ہم لوگ تو بس اسلام کی باتیں کرتے ہیں۔ شفیق صاحب اسلام پر عمل کرتے ہیں۔ ہم میں سے کتنے ہیں جو ان کی طرح پنجوقتہ نماز پڑھتے ہوں، پابندی سے روزے رکھتے ہوں، غریبوں اور بیکسوں کی خدمت کرتے ہوں۔ محمود یہ سُن کر چپ ہو جاتے۔ دوسرے بھی اِدھر اُدھر دیکھنے لگتے۔ اتنے میں کوئی اور بات چھڑ جاتی اور چند منٹ پہلے جو بحث ہو رہی تھی اسے سب بھول جاتے۔ چونکہ یہ بحث و گفتگو بر سبیل تفنن ہوتی اس لئے کبھی تلخی پیدا نہ ہوتی تھی۔

شفیق صاحب اپنی نیکی کے جادو سے لوگوں کو مسحور کرنا جانتے تھے۔ بعض اوقات میں نے دیکھا کہ ان کی خاموشی بلکہ کہنا چاہیئے ان کی بے زبانی بڑے سے بڑے مخالف کا منھ بند کر دیتی تھی اور اپنی اخلاقی عظمت تسلیم کرا لیتی تھی۔ ان کی شخصیت میں نیکی اور معصومیت کا نور جھلکتا تھا۔ ان کی نیکی کا یہ پھل تھا کہ خدا نے ان کے عزائم میں برکت دی۔ کچھ دن کے لئے انڈونیشیا گئے تھے وہاں ایسے نیک نام رہے کہ ان کے چلے آنے کے بعد بھی ان کا ذکر عزت کے ساتھ کیا جاتا تھا۔ ۱۹۵۶ء میں آسٹریلیا سے واپسی پر میں چند روز کے لئے

جکارتا میں ٹھہرا تھا۔ وہاں میں نے لوگوں سے ان کے اخلاق کی تعریف سنی۔ ہندوستان کے آزاد ہونے پر وہ صوبۂ دہلی کی حکومت میں وزیر تعلیم مقرر ہوئے۔ افسوس کہ ان کی عمر نے وفا نہ کی۔ ایسی نیک اور بافیض زندگی اور اتنی کوتاہ! مجھ سے صرف ایک سال بڑے تھے۔ ان کی اہلیہ محترمہ بھی بڑی خوبیوں کی خاتون تھیں۔ شفیق صاحب کے انتقال کے بعد پارلیمنٹ کی ممبر ہو گئی تھیں۔ طبیعت میں وہی ملنساری، وہی انکسار جو پہلے تھا اب بھی رہا۔ ان کی عمر نے بھی وفا نہ کی۔ میاں بیوی دونوں کی انسانیت اور دوست داری کبھی نہیں بھولے گی۔ ایسوں کو دیکھنے کو اب آنکھیں ترستی ہیں۔

شدھی اور سنگٹھن ۱۹۲۴ء کے شروع میں ہندو مسلم فسادات کی وبا ملک میں پھوٹ نکلی۔ شدھی اور سنگٹھن کی تحریکوں نے خوب زور پکڑا۔ ان کے جواب میں تبلیغ اور تنظیم کی تحریک مسلمانوں کی طرف سے شروع ہوئی۔ ہندو مسلم فساد اور خون ریزیوں اور بلوؤں کی خبریں روزانہ ملک کے مختلف حصوں سے آرہی تھیں۔ ان خبروں سے گاندھی جی کو دلی صدمہ ہوا۔ انھوں نے جب کہ وہ دہلی میں مولانا محمد علی کے مکان پر قیام پذیر تھے، ۱۸ ستمبر ۱۹۲۴ء کو اکیس دن کا روزہ رکھنے کا اعلان کر دیا۔ اس کے متعلق انھوں نے اپنے میزبان تک سے مشورہ نہیں کیا۔ ان کے روزہ رکھنے کا اعلان اس وقت کیا گیا جب کہ مولانا محمد علی جامعہ کی انتظامی کمیٹی میں شرکت کے لئے گئے ہوئے تھے جو حکیم اجمل خاں کے مکان پر منعقد ہوئی تھی۔ دوشنبہ کا دن گاندھی جی کی خاموشی کا دن تھا۔ اس لئے انھوں نے اس ارادے کا اعلان ایک کاغذ پر لکھ کر اپنے سکریٹری کو دیدیا تھا۔ اس روزے کا مقصد یہ تھا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے دلوں میں تبدیلی پیدا ہو اور وہ ایک ملک کے شہریوں کی حیثیت سے ساتھ رہنے کا عزم کریں۔ اس خبر سے سارے ملک میں تہلکہ مچ گیا۔

ملک کی تمام سیاسی پارٹیوں کا ایک جلسہ اسی دوران میں منعقد ہوا تاکہ گاندھی جی کو یقین دلایا جائے کہ اب سب جماعتیں مل کر ملک میں امن و امان قائم رکھنے کی کوشش کریں گی۔ دہلی کی اس آل پارٹیز کانفرنس میں جامعہ کے چند طالب علموں کو مولانا محمد علی کے ذریعے سے شریک ہونے کا موقع مل گیا تھا۔ اس جلسے میں مسز اینی بسنٹ، سی۔ آر۔ داس، موتی لال نہرو، لالہ لاجپت رائے، ڈاکٹر مونجے اور دوسرے لیڈر شریک تھے۔ چنانچہ ہم لوگوں کو ان سبھوں کی تقریریں سننے کا موقع ملا۔ مسز اینی بیسنٹ کی فصاحت اور بلاغت اور خطابت جیسی سنی تھی اس سے زیادہ پائی۔ بس ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے لفظوں کا ایک سمندر ہے جو ٹھاٹھیں مار رہا ہے۔ خطابت تھی لیکن دلیلوں کے ساتھ۔ جوش تھا لیکن ضبط کے ساتھ۔ ہم لوگوں کو دوسرے کانگریسی لیڈروں کے مقابلے میں مولانا محمد علی کی تقریر زیادہ پسند آئی اور وہ تھی بھی واقعی بہت اونچے میعار کی۔ مولانا محمد علی کی عظمت کا اندازہ ہمیں اس آل پارٹیز کانفرنس میں شریک ہونے کے بعد اور زیادہ ہوا کہ وہ کس طرح اونچے درجے کے لوگوں میں بھی اپنی عظمت کا سکہ بٹھا سکتے ہیں۔

سنگھٹن اور شدھی کے خلاف جو تبلیغ اور تنظیم کی تحریک شروع ہوئی تھی اس میں جامعہ کے چند استادوں اور طالب علموں نے بھی حصہ لیا۔ طالب علموں میں حصہ لینے والوں کے لیڈر کنور محمد اشرف تھے۔ چونکہ ان کے آبا و اجداد ہندو راجپوت تھے جو مسلمان ہو گئے تھے اس لئے وہ اسے اپنا فرض سمجھتے تھے کہ اس میں حصہ لیں اور دوسروں کو بھی اس کی ترغیب دیں۔ تبلیغ و تنظیم کی تحریک کے مرکز دہلی اور آگرہ تھے۔ کنور محمد اشرف اور ان کے ساتھی آگرہ کے مرکز سے وابستہ ہو کر آس پاس کے گاؤں میں دورے کرنے لگے جن میں ملکھان راجپوت آباد تھے جنھیں ہندو بنانے کی کوشش آریہ سماجیوں کی طرف

سے ہو رہی تھی۔ ملکھان راجپوتوں کے رسم و رواج میں اسلامی اور ہندو عناصر دونوں برابر کے شریک تھے، بلکہ ہندوانہ رسوم کا اثر غالب تھا۔ کنور محمد اشرف ایک دفعہ جب علی گڑھ آئے تو بہت اصرار کیا کہ میں بھی ان کے ساتھ آگرہ چلوں۔ لیکن میں ٹالتا رہا کہ کون اس کھیکڑ میں پڑے۔ میری صحت اس قابل نہ تھی کہ میں دیہاتوں میں دوردوں کا تکان برداشت کر سکتا اور نہ اصولی طور پر بھی میں اشرف کے خیالات سے متفق نہ تھا۔ شدھی اور تبلیغ نے فرقہ وارہی جذبات کو مشتعل کر دیا تھا۔ ملکھانے دونوں کی بولی بولتے تھے۔ ہندوؤں سے ملتے تو کہتے ہم تمھارے ساتھ ہیں اور جب مسلمانوں سے ملتے تو اپنے کو مسلمان بتاتے ان فرقہ واری تحریکوں سے ملک کی سیاسی فضا خراب ہو گئی اور سامراج کی گرفت پہلے سے بھی زیادہ مضبوط ہو گئی۔ ترک موالات کی تحریک سے ملک میں جو خیرسگالی کی فضا پیدا ہوئی تھی وہ تباہ ہو گئی! اور ہندوؤں اور مسلمانوں کی یگانگت اور یک جہتی کو فرقہ واری تحریکوں نے برباد کر ڈالا۔

کانگریس کے جلسے | جامعہ کے طالب علم انڈین نیشنل کانگریس کے سالانہ جلسوں میں شرکت کے لئے جایا کرتے تھے۔ چنانچہ میں بھی دوسرے طالبعلموں کے ہمراہ احمد آباد گیا اور کان پور کے کانگریس کے سالانہ جلسوں میں شریک ہوا۔ ہم نوجوانوں پر کانگریس کے لیڈروں کی خاص عنایت تھی۔ چنانچہ جلسہ عام کے علاوہ ہم لوگوں کو سبجیکٹس کمیٹی کے اجلاسوں میں بھی شریک ہونے کی بطور خاص اجازت مل جاتی تھی۔ احمد آباد میں سردار پٹیل اور گیا میں مظہر الحق صاحب کی مہربانی سے ہمیں ان مباحثوں کو سننے کا موقع ملا جن میں کانگریس کے صرف چوٹی کے لیڈر شریک ہوتے تھے۔ احمد آباد کانگریس کے کھلے اجلاس میں مولانا حسرت موہانی نے مہاتما گاندھی کے اس اصول کی مخالفت کی کہ ہندوستان ایسی خود مختاری کو قبول کرنے کو تیار ہے جو نوآبادیاتی درجے (ڈومینین اسٹیٹس)

کی ہو۔ حسرت اپنی بات کہے گئے، چاہے کوئی سنے یا نہ سنے۔ ان کی تجویز متفقہ طور پر رد کر دی گئی۔ حسرت کی یہ جرأت اور حق گوئی ان کے کردار کا جز تھی۔ جس بات کو وہ حق سمجھتے تھے اس کے اظہار میں وہ کسی سے مرعوب نہیں ہوتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ احمد آباد کانگریس کے زمانے میں مہاتما گاندھی اپنے اثر و رسوخ کے انتہائی عروج پر ہیں، تاہم وہ جس بات کو ٹھیک جانتے تھے اس کا انھوں نے اظہار کر دیا۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ چونکہ ان کی رائے مہاتما گاندھی کی رائے کے خلاف ہے، اس لئے کوئی ان کا ساتھ نہیں دیگا۔ بایں ہمہ وہ اپنی بات کہے گئے چاہے کوئی مانے یا نہ مانے۔ گیا کانگریس میں پنڈت موتی لال نہرو اور مسٹر سی آر داس نے کونسلوں میں داخل ہونے کی تجویز پہلی مرتبہ کانگریس کے پلیٹ فارم پر پیش کی۔ یہاں پیش ہونے سے کئی مہینے پہلے اخباروں میں اس کی حمایت اور مخالفت میں مضمون شائع ہونا شروع ہو گئے تھے۔ اس معرکہ آرا مسئلے پر سبجکٹس کمیٹی میں زبردست بحث ہوئی پنڈت موتی لال نہرو، سی۔ آر داس اور مسٹر جےکر کونسلوں میں جانے کے موافق تھے، تاکہ وہاں اندر رہ کر ان کی قلعی کھولی جائے اور انھیں ختم کیا جائے۔ مسٹر راج گوپال اچاریہ ترک موالات کے پروگرام میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں چاہتے تھے۔ میں اور حیدرآباد والے محمود حسن ان سب مباحثوں میں شریک رہے۔ ہم دونوں کے علاوہ حبیب داد خاں اور عبد القادر سیالکوٹی بھی ہم لوگوں کے ساتھ تھے۔ دن میں تو سبجکٹس کمیٹی کا مباحثہ سنتے اور رات میں ہم لوگوں میں آپس میں بحثا بحثی رہتی۔ میں کونسلوں میں جانے کا موافق تھا اور محمود مخالف تھے۔ ہم لوگ دن بھر کی مصروفیات سے اتنے تھک جاتے کہ رات میں بحث کرتے کرتے سو جاتے اور صبح اٹھ کر پھر جلسوں میں شرکت کے لئے چل دیتے۔ گیا سے ہم لوگ چند روز کے لئے کلکتہ بھی گئے تھے۔ وہاں مولانا ابو الکلام

آزاد سے ملے جو چند روز قبل رہا ہوئے تھے اور گیا کانگریس میں شریک نہیں ہوسکے تھے۔
اگرچہ انھوں نے اپنے خیالات صاف صاف نہیں بتائے لیکن ان کا رجحان پنڈت موتی لال
نہرو اور سی۔آر۔داس کی تائید میں تھا۔ یہ بھی محمود حسن کے مقابلے میں میری ایک اور
جیت تھی۔ کلکتہ سے واپسی پر بہت دیر تک اس پر بحث ہوتی رہی کہ کلکتہ اچھا ہے یا بمبئی۔
ظاہر ہے کہ اس قسم کے مباحثوں میں آدمی کسی نتیجے پر تو کبھی پہنچتا نہیں، ہاں وقت کاٹنے
کا اچھا مشغلہ مل جاتا ہے۔

میں ۱۹۲۴ء میں بزم اتحاد کا نائب صدر اور رسید انصاری سکریٹری منتخب ہوئے۔
ہم دونوں نے شفیق صاحب کی روایات کو مضبوط کرنے کی کوشش کی۔ تقریروں اور
مقالوں کے جلسے خوب کامیاب رہے۔ باہر کے معزز مہمانوں کو بھی جلسوں میں تقریر
کرنے کی دعوت دی جاتی تھی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے میں نے اپنے افتتاحی خطبے
"حسرت تعمیر" کی نسبت بڑی تفصیل سے ذکر کیا تھا۔ اس وقت ہمارے سان گمان میں
بھی نہ تھا کہ چند سال کے اندر ہماری یہ دلی تمنا اور خواب پورا ہوجائیگا۔ میرے یورپ
جانے سے پہلے کچھ عرصے کے لئے رسالۂ جامعہ کی ادارت بھی تفویض کی گئی۔

اقبال سے ملاقات | بچپن ہی سے اقبال نے مجھے اپنی طرف کھینچا اور بڑی قوت سے کھینچا۔
میں جب جامعہ میں تھا تو "بانگ درا" مجھے تقریباً پوری یاد تھی اور "اسرارِ خودی"، "رموزِ
بے خودی" اور "پیامِ مشرق" بھی میں نے بڑی توجہ سے پڑھے تھے اور ان کے بھی بعض
حصے مجھے یاد تھے۔ مجھے اور میرے چھوٹے بھائی محمود میاں کو ڈاکٹر اقبال سے ملنے کا بڑا
اشتیاق تھا۔ چنانچہ ۱۹۲۴ء کی گرمیوں میں ہم دونوں نے پہلے کشمیر جانے اور واپسی پر
لاہور ٹھہرنے کا پروگرام بنایا۔ نذیر نیازی کے توسط سے سری نگر میں ہاؤس بوٹ

میں رہنے کا انتظام ہوگیا۔ سری نگر میں نذیر نیازی کے بھائی جن کا نام مجھے یاد نہیں رہا، ہمیں منشی سراج الدین سے ملانے لے گئے جو بہ سلسلۂ ملازمت عرصے سے سری نگر میں مقیم تھے۔ یہ بڑے دلچسپ شخص تھے۔ اقبال کے پرستاروں میں تھے۔ بڑے خلیق، ملنسار، بامروّت اور بافیض۔ ہم دونوں سے بڑی شفقت سے پیش آئے۔ ہم سری نگر میں ایک مہینہ ٹھہرے اچھابل، ویری ناگ، گل مرگ اور سون مرگ کی بھی سیر کی۔ گئے تھے راولپنڈی کے راستے سے واپسی جموں کی طرف سے ہوئی۔ ویری ناگ میں حفیظ جالندھری سے پہلی مرتبہ ملاقات ہوئی اور انھوں نے اپنے مخصوص انداز میں وہاں اپنا کلام بھی سنایا تھا۔ بعد میں جب کبھی وہ حیدرآباد آتے تو ملاقات رہتی تھی۔

لاہور میں ہم دونوں اسٹیشن کے قریب ایک معمولی ہوٹل میں ٹھہرے تھے۔ شام کے وقت ڈاکٹر اقبال سے ملنے گئے۔ ان کے یہاں لوگوں کا مجمع تھا۔ ہم نے جب کہا کہ خاص طور سے ان سے ملنے لاہور آئے ہیں تو بہت متاثر ہوئے۔ اوروں کو چھوڑ کر ہم دونوں سے جامعہ کے متعلق گفتگو کرتے رہے۔ مولانا محمد علی کا بار بار ذکر کرتے تھے۔ انھوں نے یہ بھی بتایا کہ مولانا محمد علی کی خواہش تھی کہ وہ جامعہ کی پرنسپلی قبول کرلیں لیکن وہ صحت کی خرابی کی وجہ سے معذور رہے۔ میری ڈاکٹر اقبال سے یہ پہلی ملاقات تھی۔ اس کے بارہ سال بعد، ۱۹۳۰ء میں جب لاہور میں انڈین ہسٹاریکل ریکارڈز کمیشن کا اجلاس ہوا تو میں عثمانیہ یونیورسٹی کے نمایندے کی حیثیت سے اس میں شریک ہوا تھا۔ اس موقع پر مجھے ڈاکٹر اقبال کے پاس دو مرتبہ حاضری کا موقع ملا اور ان سے تفصیلی گفتگو بھی رہی۔ اب مجھ میں اتنی پختگی آگئی تھی کہ میں ان سے استفادہ کرسکوں۔ وہ ہندوستانی مسلمانوں کے سیاسی مستقبل کی طرف سے بےحد متفکر تھے اور کہتے تھے کہ جب تک ان کی علیحدہ مملکت نہ ہوگی ان کا

دین و تمدن خطرے میں رہے گا۔ اس بات کو بھی انھوں نے بار بار دہرایا کہ مسلمان اپنی تقدیر کی تشکیل خود ہی کر سکتے ہیں۔ اگر دوسرے کریں گے تو انھیں دوسروں کا رنگ اختیار کرنا پڑیگا۔ ان ملاقاتوں سے مجھے اقبال سے جو عقیدت تھی اس میں اور اضافہ ہو گیا۔

جامعہ کا فیض میں جامعہ میں تقریباً پانچ سال رہا۔ جولائی ۱۹۲۱ء سے لے کر مئی ۱۹۲۶ء تک۔ ذاکر میاں کی جرمنی سے واپسی فروری ۱۹۲۶ء میں ہوئی اور تین مہینے بعد میں مئی کے مہینے میں اورینٹ لائن کے ذریعے اعلیٰ تعلیم کے لئے فرانس روانہ ہو گیا۔ اورینٹ لائن کے جہاز کولمبو آتے تھے۔ میں وہیں سے سوار ہوا اور فرانس کے بندرگاہ تولون میں اترا۔ ہندوستان سے روانہ ہونے سے چند ماہ پیشتر میں نے کچھ فرانسیسی سیکھ لی تھی جسے شُد بُد کہنا چاہئے۔ کشمیری دروازہ میں ایک فرانسیسی موسیو لوگران رہتے تھے جن کا یہاں پر کاروبار تھا۔ وہ فرانسیسی کے درس بھی دیتے تھے میں ہفتے میں تین روز ان کے ہاں جاکر فرانسیسی پڑھتا تھا۔ اگر کوئی آہستہ آہستہ بولے تو چند لفظ سمجھ لیتا تھا اور آسان عبارت کا تھوڑا بہت مفہوم نکال لیتا تھا۔ پیرس پہونچ کر میں نے محسوس کیا کہ میں فرانسیسی زبان میں بالکل کورا ہوں۔ مجھے اس کی جانب خاص توجہ کرنی پڑی گی۔ دہلی میں چند ماہ جو فرانسیسی سیکھی تھی وہ کچھ زیادہ کام نہیں آئی۔

جامعہ کی پانچ سال کی تعلیم سے مجھ میں یہ صلاحیت پیدا ہو گئی کہ یورپ کے کسی ملک میں جاکر اعلیٰ تعلیم حاصل کروں۔ جامعہ کی تعلیم کا معیار چاہے سائنس کی حد تک ہندوستان کی دوسری یونیورسٹیوں کی میار سے کچھ نیچا ہو لیکن آرٹس میں میرے خیال میں کوئی خاص فرق نہ تھا۔ آرٹس کی تعلیم میں ساز و سامان پر اتنا دارومدار نہیں ہوتا جتنا کہ اساتذہ کی اپنے مضمون سے دلچسپی پر اور طالب علموں میں مطالعہ کے شوق پر۔

جامعہ میں یہ دونوں باتیں موجود تھیں۔ استادوں کو نہ صرف یہ کہ اپنے مضمون سے خاص لگاؤ تھا بلکہ وہ یہ بھی چاہتے تھے کہ یہاں کے طالب علموں کی لیاقت میں اضافہ ہو۔ اس کے لئے جس دلسوزی سے وہ محنت کرتے تھے اس کی مثال سرکاری یا نیم سرکاری یونیورسٹیوں میں نہیں ملتی۔ اس کے علاوہ جامعہ کا کتب خانہ اچھا خاصہ تھا۔ مولانا محمد علی اور عبدالمجید خواجہ کے کتب خانوں کے علاوہ اور دوسرے چھوٹے کتب خانے بھی لوگوں نے جامعہ کو بطور عطیہ دیئے تھے۔ نئی کتابیں اور رسائل بھی منگائے جاتے تھے۔ غرضکہ آرٹس کے طالب علموں کے لئے یہاں پڑھنے کے لئے کافی سامان موجود تھا۔ مجھے یاد ہے کہ جامعہ کے کتب خانے میں میں نے پہلی مرتبہ انسائیکلوپیڈیا برٹانکا کے مضامین پڑھے جو مجھے بیحد پسند آئے۔ کالج میں جب کوئی گھنٹہ خالی ہوتا تو میں کتب خانہ میں جاکر یا تو نئے رسائل پڑھتا یا انسائیکلوپیڈیا برٹانکا۔ اس کے حاشیوں پر کسی کے ہاتھ کے لکھے ہوئے نوٹس تھے۔ جب مجھے معلوم ہوا کہ یہ مولانا محمد علی کے ہاتھ کے ہیں تو میں نے مضمون کے ساتھ ان نوٹس کو بھی بڑے شوق سے پڑھنا شروع کر دیا۔ ان میں مولانا نے اپنے حسب معمول موافقت یا مخالفت میں اپنی رائے کا اظہار کیا تھا۔ صاف صاف، دوٹوک، بے باکی سے، جس کی ان سے توقع تھی۔ بعض مضمونوں میں جہاں مضمون نگار نے اسلام کو غلط طریقے سے پیش کیا تھا وہاں مولانا دشنام گوئی اور سب وشتم پر اتر آئے تھے جو ان کے جوشِ ایمانی کا اقتضا تھا، خاص کر جب آنحضرتؐ پر بحث ہوتی تھی۔ انسائیکلوپیڈیا برٹانکا کے حواشی پر مولانا نے جو نوٹس لکھے انھیں اگر کوئی علحدہ کر کے شائع کر دے تو ایک اچھی خاصی دلچسپ کتاب نکل آئے گی۔ مجھے علم نہیں انسائیکلوپیڈیا برٹانکا کا یہ نسخہ اب بھی جامعہ کے کتب خانے میں موجود ہے یا نہیں۔ مولانا نے

جب دہلی سے دوبارہ "کامریڈ اور ہمدرد" نکالے تھے تو اپنے کتب خانے کی بعض کتابیں جامعہ سے منگالی تھیں۔ ممکن ہے یہ بھی انھیں میں شامل ہو۔

میں جب تک جامعہ میں رہا وہ قرول باغ میں تھی۔ اس کے بعد بھی کئی برس تک یہیں اس کا کام چلتا رہا۔ پھر جب ۱۹۴۰ء میں اس کی نئی عمارتیں اوکھلے میں تیار ہوگئیں، تو اس کے سب شعبے وہاں منتقل ہوگئے اور اس کے کام میں خدا نے بڑی برکت دی۔ دیکھتے دیکھتے ایک پوری بستی آباد ہوگئی۔ یہاں بھی شروع میں دشواریاں پیش آئیں جنھیں جامعہ والوں نے صبر اور استقلال سے برداشت کیا اور اپنے عزائم اور حوصلوں کو کبھی پست نہیں ہونے دیا۔ آزادی کے بعد حکومتِ ہند نے اسے یونیورسٹی مان لیا اور اس کی ڈگری تسلیم کرلی۔ مرکزی حکومت کی گرانٹ سے اب جامعہ کے کاموں میں ہر قسم کی سہولت پیدا ہوگئی ہے اور ترقی کی شاہراہیں اس کے سامنے کھل گئی ہیں۔ وہ جو کبھی ایک خواب تھا آج حقیقت بن گیا ہے۔ آزاد ہندوستان کی ہر اسٹیٹ کے طالبعلم یہاں تعلیم حاصل کرنے آتے ہیں۔ اس ادارے کی نیک نامی اور کارکردگی روز بروز بڑھتی جاتی ہے۔

چھٹا باب (۶)

دیارِ فرنگ

سرزمین فرانس کے ابتدائی تاثرات

میں مئی ۱۹۲۶ء میں کولمبو سے اورینٹ لائن کے جہاز سے روانہ ہو کر دو ہفتے میں جنوبی فرانس کے بندرگاہ تولون پہنچا۔ یہ نیس اور مارسیلز کے درمیان واقع ہے اور بحر روم میں فرانس کا سب سے بڑا بحری فوجی مرکز ہے۔ یہ علاقہ جہاں یہ بندرگاہ واقع ہے ایک زمانے میں اطالوی حکومت کے تحت تھا۔ یہاں کی آبادی اکثر و بیشتر لاطینی نسل کے لوگوں پر مشتمل ہے۔ میں تولون میں چھ سات گھنٹے ٹھہرا۔ یہاں کی ہر چیز مجھے عجیب معلوم ہوئی۔ میرے لئے یہ بالکل ایک نئی دنیا تھی۔ دہلی میں موسیو لوگرا ان سے جو تھوڑی بہت فرانسیسی سیکھی تھی وہ کچھ کام نہ آئی۔ مجھے یہ محسوس ہوتا تھا کہ ہر شخص بے حد تیزی سے بولتا ہے۔ سوائے چند لفظوں کے میرے پلّے کچھ نہیں پڑتا تھا، گفتگو کا مفہوم سمجھنا تو کجا۔ تولون میں سوائے ان چند لوگوں کے جو میرے ساتھ جہاز پر ہم سفر تھے اور کوئی انگریزی نہیں جانتا تھا۔ اس لئے میں جتنی دیر وہاں ٹھہرا زیادہ تر خاموشی کے ساتھ آنے جانے والوں کا تماشا دیکھتا رہا۔ کھانے اور چائے کا انتظام ٹامس کُک نے کر دیا تھا۔ باقی وقت شہر کی سیر گشت میں صرف ہوا۔

تھک جاتا تھا تو سڑک کے کنارے کسی قہوہ خانے میں قہوہ منگا کر پی لیتا تھا۔ ہمارا جہاز دیر سے پہلے وہاں پہنچ گیا تھا اور پیرس کے لئے ٹرین رات ہی ملتی تھی۔ اس لئے گھومنے کا کافی موقع ملا۔ جہاز کے ساتھیوں میں زیادہ تر آسٹریلیا کے لوگ تھے اور جو ہندوستانی تھے ان میں کوئی دلچسپ شخص نظر نہ آیا۔ اس لئے میں نے تنہا گھومنے کو ترجیح دی۔

فرانس کا پہلا تاثر | مجھے تولون میں جس چیز نے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ بڑے بڑے جنگی جہاز نہ تھے بلکہ نسوانی حسن تھا۔ میں نے ایسا باغ و بہار حسن اپنی زندگی میں پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ جنوبی فرانس کی عورتیں نہایت حسین ہوتی ہیں۔ ان کے حسن میں مجھے کچھ مشرقیت محسوس ہوئی۔ رنگ گورا، آنکھیں اور بال سیاہ، قد بوٹا سا، لڑکیاں اور بعض ادھیڑ عمر والیاں بھی رخساروں پر غازہ اور ہونٹوں پر روژ لگاتی ہیں، جس سے ان کا حسن دوبالا ہو جاتا ہے۔ عام طور پر تیز چلتی ہیں جیسے کوئی بڑی مصروفیت ہو یا شاید ان کی چال کا انداز ہی یہ ہو۔ بقول داغ

ٹھہر گئے وہ جہاں سرو باغ تھے گویا
اگر چلے تو نسیم بہار ہو کے چلے

میں نے اب تک ہندوستان میں جو انگریز عورتیں دیکھی تھیں ان میں اکثر بانس کی کھپچی کی طرح لمبی، دبلی، بے ڈول تھیں جیسے ہیجڑا چلا آتا ہو۔ رنگ چونے کی طرح سفید بھک، ملاحت اور نمک نام کو نہیں۔ تولون کی عورتیں مجھے ان سے بالکل مختلف نظر آئیں۔ رنگ ڈھنگ میں، ڈیل ڈول میں، چال ڈھال میں، حرکات و سکنات میں، ناز و انداز میں۔ مجھے یاد نہیں کہ میں نے کبھی کسی انگریز عورت کو ہندوستان میں ہنستے ہوئے دیکھا ہو۔ میں یہ نہیں کہتا کہ وہ ہنستی نہیں تھیں۔ ضرور ہنستی ہوں گی، اپنے گھروں

یں یا کلبوں میں۔ حکمراں طبقے سے تعلق رکھنے کی وجہ سے یہ بات ان کی شان کے خلاف تھی کہ کسی ہندوستانی سوسائٹی میں ہنستی ہوئی نظر آئیں کہ اس سے حکومت کی بے رعبی ہوتی۔ تولون کی عورتوں کو میں نے دیکھا کہ جب کبھی کسی سے بات کرتی تھیں تو ہنس کر، مسکرا کر، آنکھوں میں انسانی ہمدردی کا سرمہ لگا کر۔ میں سمجھتا ہوں اس سرمے کو شوخی اور حیا کے لطیف اجزا میں کوٹ کر تیار کرتے ہوں گے۔ ان کے سریلے، رسیلے، قہقہے اب تک کانوں میں گونج رہے ہیں اور ان کی خوبصورت مسکراہٹ آنکھوں میں پھر رہی ہے۔

عورتیں دنیا کی ہر زبان اچھی اور شستہ بولتی ہیں۔ تولون کی عورتوں کو میں نے دیکھا کہ جب وہ بولتی تھیں تو مجھ اجنبی کو جو ان کی گفتگو سمجھنے سے قاصر تھا ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے ان کے منہ سے پھول جھڑ رہے ہوں۔ میں بعد میں یورپ کے دوسرے ملکوں میں بھی گیا جہاں کی زبان سے میں ناواقف تھا۔ وہاں کہیں مجھے یہ تجربہ نہیں ہوا۔ میں نے یہ ضرور محسوس کیا کہ مردوں کے مقابلے میں عورتیں اپنی زبان تیز بولتی ہیں۔ بقول ہماری بڑی بوڑھیوں کے ان کی جیب قینچی کی طرح چلتی ہے۔ لیکن یہ احساس کہ ان کے منہ سے پھول جھڑ رہے ہوں سوائے فرانس کی خواتین کے کسی اور ملک کی خواتین کی گفتگو سے نہیں پیدا ہوا۔ نہ انگلستان میں، نہ جرمنی میں، نہ ہالینڈ میں، نہ اٹلی میں، نہ سوئٹزرلینڈ میں۔ فرانسیسی کے بعد اگر کسی یوروپین زبان میں شیرینی ہے تو وہ اطالوی ہے۔ نسلی اور لسانی دونوں اعتبار سے فرانسیسیوں اور اطالوی لوگوں میں مشابہت ہے۔ نسلی لحاظ سے تو ہسپانوی بھی ان سے ملتے جلتے ہیں لیکن ان کی زبان میں سختی اور کرختگی پن ہے، جرمن کی طرح۔

میں جب قہوے کی پیالی میز پر رکھ کر قہوے خانے کے باہر کے حصے میں بیٹھ جاتا کہ دنیا کا تماشا دیکھوں تو میرے قریب جو عورتیں بیٹھی ہوتیں وہ بلا کسی تعارف کے مجھے مخاطب کرتیں

اس خیال سے کہ میں فرانسیسی ضرور جانتا ہوں گا اس لئے کہ ان کی دانست میں ہر مہذب انسان کو یہ زبان جاننی چاہیئے۔ میں مسکرا دیتا اور جواب میں صرف اتنا کہتا " ژو نو پارل پا فرانسے" (میں فرانسیسی نہیں جانتا) اس پر وہ سب ہنس دیتیں اور میں بھی مسکرا دیتا۔

مغربی یورپ میں مئی کے مہینے میں بہار اپنے شباب پر ہوتی ہے۔ چند مہینے پہلے جو درخت برہنہ تھے اب پھولوں سے لدے نظر آتے ہیں۔ بعض درختوں میں تو بس پھول ہی پھول نظر آتے ہیں، پتوں کی ہریاہٹ تک دکھائی نہیں دیتی۔ فرانس کے دیہاتوں میں مئی کے مہینے میں بڑے اہتمام سے جشنِ بہاراں منایا جاتا ہے۔ گاوں کی سب سے زیادہ حسین لڑکی کو پھولوں کا تاج پہناتے ہیں۔ اس کے ارد گرد نوجوان لڑکے لڑکیاں رقص کرتے اور گیت گاتے ہیں۔ پیرس میں لڑکیوں میں حسن کا مقابلہ ہوتا ہے جس کا فیصلہ کرنے کے لئے بڑے بڑے آرٹسٹ لوگوں کا باقاعدہ بورڈ بنتا ہے۔ سب سے زیادہ حسین لڑکیوں کو پہلا، دوسرا اور تیسرا انعام دیا جاتا ہے۔ ان کا جلوس شاہراہوں پر سے گذرتا ہوا شان زلیزے جاتا ہے۔ جلوس کے ساتھ بلا مبالغہ لاکھوں آدمی ہوتے ہیں۔ صحیح معنوں میں اس ہجوم میں کھوے سے کھوا چھلتا ہے، جسے دیکھو وہ نظارہ جمال کے لئے بیتاب ہے۔ سوائے ۱۴ جولائی کے جشن کے جس دن اہلِ فرانس انقلاب کی یاد مناتے ہیں اور کوئی جشن مئی والے جشنِ بہاراں کے پاسنگ کا نہیں ہوتا۔ اسکاٹ لینڈ اور آئرلینڈ میں بھی مئی کا جشن مناتے ہیں۔ شہروں کے نوجوان پھول اکٹھا کرنے کے لئے دیہات کا رخ کرتے ہیں جسے " اے مے اینگ ،، کہتے ہیں۔

تولون میں میں نے ایک ہی وقت میں درختوں پر اتنے پھول اور شگوفے دیکھے کہ ہندوستان میں کبھی نہیں دیکھے تھے۔ بعض چھوٹے درخت واقعی ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے دلھن بنے کھڑے ہوں، اوپر سے نیچے تک پھولوں میں لدے ہوئے۔ انگلستان اور جرمنی کے پھولوں میں خوشبو برائے نام ہوتی ہے لیکن جنوبی فرانس کے پھولوں کی مہک مشامِ جان کو معطر کرتی ہے۔ انسان عجب شش و پنج میں پڑ جاتا ہے۔ گل و عارض کا حسن اپنی اپنی جداگانہ دل کشی رکھتا ہے۔ ایک طرف فطرت کا جوبن اور دوسری طرف انسانی حسن کی پھبن۔ انسان حیران رہ جاتا ہے کہ قدرت کے جلووں کی رنگارنگی کو دو آنکھوں سے کیونکر دیکھے۔ میں ہندوستان سے اپنے ساتھ چند کتابیں لے گیا تھا جن میں دیوانِ غالب بھی تھا۔ اسے میں اپنے اٹیچی کیس ہی میں رکھتا تھا۔ غالب سے مجھے جامعہ ہی میں بڑا شغف تھا۔ اب تو حافظہ کمزور ہو گیا مگر اس زمانے میں مجھے غالب کے بلا مبالغہ سیکڑوں شعر یاد تھے۔ تولون کے قہوہ خانے میں بیٹھ کر جب میں فطرت اور انسان کے حسن کا مشاہدہ کر رہا تھا تو معاً مجھے غالب کی گل والی غزل یاد آئی۔ میں نے دیوان نکالا اور اسے بار بار پڑھنے لگا۔ میرے قریب ایک پورا خاندان بیٹھا ہوا تھا جس میں ایک معمر بزرگ تھے، ایک بڑی بی تھیں، ایک جوان عورت تھی اور دو تین چھوٹی چھوٹی لڑکیاں تھیں۔ جب دیوانِ غالب پڑھ رہا تھا تو وہ سب مجھے بڑے تعجب سے دیکھنے لگے۔ دل تو گنگنا کر پڑھنے کو چاہا لیکن اس خیال سے کہ کہیں دوسروں کا تماشا کرتے ہوئے میں خود تماشا نہ بن جاؤں میں دل ہی دل میں پڑھ کر لطف اندوز ہوتا رہا۔ امریکی شاعر اور ادیب والٹ وہٹ من نے ایک جگہ لکھا ہے کہ اس سے بڑا فرق پیدا ہو جاتا ہے کہ آدمی کتاب کہاں پڑھ رہا ہے۔

پھر وہ کہتا ہے کہ دانتے کی "طربیہ خداوندی" (ڈیوائن کومیڈی) کو جنگل میں پڑھنے میں مجھے جو لطف ملا وہ شہر میں پڑھنے میں کبھی نہ ملا۔ اسی طرح ہومر کی ایلیڈ کا لطف سمندر کے کنارے پر دوبالا ہو گیا۔ میں سمجھتا ہوں والٹ وہٹ مین کے قول میں اصلیت ہے۔ دیوان غالب کو تولون میں پڑھنے میں مجھے جو مسرت حاصل ہوئی وہ پہلے کبھی نہیں ہوئی تھی۔ تولون کی نئی دنیا نے غالب کے تجربوں کی معنویت اور صداقت مجھ پر کھول دی اور معانی کی نئی نئی نزاکتوں کا مجھ پر انکشاف ہوا۔ اس غزل کے چند شعر جنھوں نے مجھ پر کیفیت سی طاری کر دی تھی اب تک یاد ہیں۔

بے اختیار دوڑے ہے گل در قفائے گل
تیرے ہی جلوے کا ہے وہ دھوکا کہ آج تک

شاعر کا حسن توجیہ لاجواب ہے۔ کہتا ہے کہ یہ جو ایک دوسرے کے بعد پھول کھلتے ہیں تو اس کی وجہ کسی کے جلوے کا ذوق دیدار ہے ورنہ ایسا کیوں کرتے۔ پھر کہتا ہے:

میرا رقیب ہے نفسِ عطر سائے گل
ایجاد کرتی ہے اسے تیرے لئے بہار

جس کا خیال ہے گلِ جیبِ قبائے گل
غالب مجھے ہے اس سے ہم آغوشی آرزو

گل کی خوشبو سے عاشق کی رقابت اس لئے ہے کہ بہار نے یہ خوشبو محبوب کی خاطر پیدا کی ہے۔ اس لئے محبوب سے خوشبو کا یہ قرب و اتصال ناگوار ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ گل نے جس کے خیال کو اپنے جیبِ قبا کی زینت بنایا ہے اسی سے ہم آغوشی کی مجھے بھی آرزو ہے۔ غرضکہ عاشق کی گل سے رقابت عجیب و غریب شاعرانہ معنی آفرینی ہے۔ میں اس غزل کو پڑھتا رہا اور گل و عارض کا تماشا کرتا رہا۔ دل نے کہا گل و عارض کا مقابلہ آن پڑا ہے، بڑا ہی نازک معاملہ ہے، تم کس کے ساتھ ہو؟ میں نے کہا تم جس کے ساتھ ہو میں بھی ادھر ہی ہوں۔ دل جھٹ بولا میں تو عارض کا پرستار ہوں اس کی

طرف جاؤنگا۔ میں نے کہا تو میں بھی پیچھے پیچھے ہوں۔ دل یہ سُن کر کچھ گنگنانے لگا۔ میں نے پوچھا کیا گنگناتے ہو۔ کہنے لگا کہ میں محشر بنارسی کا یہ شعر پڑھ رہا ہوں:۔

عکس گل، رنگ شفق ہے رخِ جاناں کے قریب

اک گلستاں نظر آتا ہے گلستاں کے قریب

میں نے کہا شعر تو حسب حال ہے۔ گل و عارض کی محفل میں کہیں ایسے نہ ریجھنا کہ ہمیں سے آنکھ چرا جاؤ۔ میری طرح داغ دہلوی کو بھی یہ خطرہ تھا جبھی تو انھوں نے کہا تھا:۔

لئے تو چلتے ہیں حضرتِ دل تمھیں بھی اُس بزم میں لیکن

ہمارے پہلو میں بیٹھ کر تم ہمیں سے پہلو تہی نہ کرنا

شام ہوئی تو ٹامس کُک کے دفتر پہنچ گئے۔ ٹامس کک نے میرے پورے سفر کا انتظام کیا تھا۔ تولون سے پیرس جانے کے لئے واگون لی (خواب گاڑی) کا ٹکٹ لیا تھا جو یورپ کی بہترین اور سب سے زیادہ گراں ٹرین ہے اور استنبول سے شمالی فرانس میں کیلے کے بندرگاہ تک جاتی ہے۔ ہم لوگ رات کو تولون سے چل کر دوسرے دن دس بجے کے قریب پیرس پہنچ گئے۔ ویگون لی میں ہر مسافر کو ایک علٰحدہ چھوٹا سا ڈبہ مل جاتا ہے جس میں بستر، پڑھنے لکھنے کے لئے میز کرسی اور ساتھ لگا ہوا غسل خانہ ہوتا ہے۔ صفائی ستھرائی کی تعریف نہیں کی جا سکتی۔ تیزی اور سبک رفتاری میں یہ یورپ کی بہترین ٹرین مانی جاتی ہے میز پر بیٹھ کر اطمینان سے خط لکھا جا سکتا ہے۔ معلوم ہی نہیں ہوتا کہ ریل گاڑی جنبش میں ہے۔ میں پہلی اور آخری مرتبہ اس میں بیٹھا، وہ بھی دھوکے میں۔ ٹامس کک کو چاہئے تھا کہ اس ٹرین کے بجائے جو رئیسوں کے لئے ہے مجھ جیسے طالب علم کے واسطے کسی معمولی ٹرین میں انتظام کرتے۔ بعد میں یورپ کے مختلف ملکوں کی عمدہ قسم کی ریل گاڑیوں میں بیٹھنے کا اتفاق

ہوا لیکن واگون لی کی بات کہیں نہیں ملی۔ غالباً اس کے ڈبوں کے نچلے حصوں میں جو کمانیاں اور پرزے لگائے جاتے ہیں وہ خاص طور پر تیار ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ باوجود حرکت اور جنبش کے سکون کا احساس ہوتا ہے اور یہ کمانیاں ایسی لچک دار بنائی جاتی ہیں کہ دھکا یا دھچکا نام کو نہیں لگتا۔

فرانسیسی خاندان میں قیام

پیرس پہنچا تو افتخار علی اسٹیشن پر موجود تھے۔ میں نے انھیں اپنے پہنچنے کے پروگرام سے پہلے ہی مطلع کر دیا تھا۔ ریو متی یون میں ان کی دکان تھی جہاں ہندوستان سے شال، کامدانی، جامہ وار، زربفت اور کمخواب پیرس کے اعلیٰ طبقے کی خواتین اور ایکٹرسوں کے لئے مہیا کرتے تھے۔ افتخار بڑے میاں آدمی ہیں پہلی ملاقات ہی میں ان سے بے تکلفی ہو گئی اور اسٹیشن پر ہی میں نے محسوس کیا جیسے میں عرصے سے ان سے واقف ہوں۔ انھوں نے اپنی دکان کے قریب ایک ہوٹل میں میرے ٹھہرنے کا انتظام کر دیا تھا۔ اسی دن سہ پہر میں انھوں نے مجھے ڈاکٹر انصاری کے بھانجے شوکت اللہ شاہ سے ملایا جو بولارین کے کالج میں زیر تعلیم تھے اور وہیں ایک خاندان کے ساتھ رہتے تھے۔ ان سے یہ طے ہوا کہ وہ بولارین ہی میں کسی فرانسیسی خاندان میں بات چیت کر لیں گے تاکہ میں بھی کچھ دنوں کے لئے وہاں آجاؤں جس سے فرانسیسی زبان سیکھنے میں آسانی ہو گی۔ پیرس میں رہ کر ہر وقت انگریزی بولنے کا موقع ملے گا اس لئے فرانسیسی سیکھنے میں دیر لگے گی۔ چنانچہ انھوں نے موسیو تریو کے یہاں میرا ٹھکانا طے کر دیا۔ تین چار روز کے بعد ان کے ساتھ میں پیرس سے بولارین چلا گیا جہاں میں کم و بیش ایک سال رہا۔ موسیو تریو سرکاری ملازمت سے پنشن لے چکے تھے۔ ان کا مکان شوکت کے کالج کے بالکل سامنے واقع تھا۔ موسیو تریو کے داماد، لڑکی اور نواسے نواسیاں ان کے

ساتھ رہتے تھے۔ ان کی بڑی بی بڑی معقول خاتون تھیں۔ رات کے کھانے کے بعد وہ مجھے فرانسیسی پڑھاتی تھیں۔ دن بھر میں بچوں کو اپنی ٹوٹی پھوٹی فرانسیسی کا تختۂ مشق بناتا تھا۔ دوپہر کے کھانے سے قبل اور سہ پہر میں بچوں کو ساتھ لے کر ٹہلنے نکل جاتا تھا۔ راستہ بھران سے باتیں کرتا تھا۔ وہ میری فرانسیسی پر ہنستے تھے کہ اتنا بڑا ہوکر بھی صحیح نہیں بول سکتا۔ مجھے ان بچوں کی صحبت سے بہت فائدہ ہوا۔ تین مہینے کے اندر میں فرانسیسی اچھی طرح سمجھنے لگا اور مانی الضمیر ادا کرنے پر بھی تھوڑی سی بہت قدرت ہوگئی۔ چھ ماہ بعد تو میں یونیورسٹی کے لکچر اچھی طرح سمجھ لیتا تھا اور بلاتکلف بات چیت کرسکتا تھا۔

موسیو تریو کو انگریزی سیکھنے کا اتنا ہی شوق تھا جتنا کہ مجھے فرانسیسی سیکھنے کا۔ وہ ہر وقت اپنی جیب میں ایک چھوٹی سی ڈکشنری رکھا کرتے تھے جس میں فرانسیسی لفظوں کے انگریزی مترادف الفاظ درج تھے۔ وہ اس کی مدد سے اپنی انگریزی چھانٹتے تھے اس خیال سے کہ مجھے فرانسیسی نہیں آتی۔ تھوڑے دنوں بعد میں نے ان سے یہ کہنا شروع کر دیا کہ مجھ سے فرانسیسی بولیے اس لئے کہ میں آپ کی انگریزی کے مقابلے میں آپ کی فرانسیسی بہتر طور پر سمجھ سکتا ہوں۔ تب کہیں جا کر انھوں نے مجھے اپنا تختۂ مشق بنانا چھوڑا۔ میں انھیں اپنی فرانسیسی کا تختۂ مشق برابر بناتا رہا، انکے سب خاندان والوں کو بھی۔ وہ جب انگریزی لفظ بولنے کی کوشش کرتے تھے تو "شو" (جوتا) کو اس کے املا کے بموجب "شوئے" کہتے۔ اور "بٹ" (مگر) کو "بُت"۔ بالکل اسی طرح جیسے "پُٹ" کو "پُت" کہتے تھے، ہر چند صحت کی جائے لیکن وہ کہاں ماننے والی اسامی تھے۔ فرانسیسی میں چونکہ ٹ۔ ڑ۔ ڈ خ۔ ق نہیں ہیں اس لئے اہلِ فرانس شاذونادر ان حرف کا صحیح تلفظ کرتے ہیں۔

مادام تریو کے اسباق کے علاوہ میں نے فرانسیسی پڑھنے کے لئے باقاعدہ ایک استاد

رکھا جو روزانہ ایک گھنٹہ مجھے پڑھاتا تھا۔ یہ سلسلہ تقریباً ایک سال تک جاری رہا حتیٰ کہ میں بولارین میں رہا۔ میں نے اپنے فرانسیسی کے استاد سے جو مقامی اسکول میں ٹیچر تھے وکٹر ہیوگو اور وودے کی کتابیں پڑھیں۔ وودے کی زبان نہایت صاف اور شستہ ہے مگر اس کی تلمیحات دشوار تھیں۔ پھر بولارین سے پیرس منتقل ہونے کے بعد آہستہ آہستہ والٹیر، دیدرو اور بالزاک کی تصانیف پڑھیں۔ میرا ادبی ذوق بڑھتا گیا اور میں نے اکثر و بیشتر ادیبوں کی اہم تصانیف پڑھ لیں اور بعد میں اپنی چھوٹی سی لائبریری بنا لی جس میں فرانسیسی ادب کی دو سو کے قریب کتابیں تھیں۔

سوربون میں داخلہ

اکتوبر ۱۹۲۶ء کو میں پیرس یونیورسٹی (سوربون) میں ڈاکٹریٹ کے لئے باقاعدہ شریک ہو گیا۔ فرانس میں ابتدائی تعلیم کی طرح اعلیٰ تعلیم بھی مفت ہے۔ ہر سال برائے نام کچھ رقم یونیورسٹی کے دفتر میں داخل کرنا پڑتی ہے تاکہ طالب علم کا قانونی وجود مسلّم ہو جائے اور وہ یونیورسٹی سے اپنا شناختی کارڈ (آئی ڈینٹیٹی کارڈ) لے سکے جسے ہر وقت اپنے ساتھ رکھنا ضروری ہے۔ بولارین سے سوربون آنے جانے میں کافی وقت لگتا تھا اس لئے میں نے یونیورسٹی کے بالکل قریب ریو دیو شُمے رار میں ایک کمرہ کرایہ پر لے لیا۔ یہاں صبح کا ناشتہ اور سہ پہر کی چائے مل جاتی تھی۔ دوپہر اور شام کا کھانا باہر کسی ریستوران میں کھاتا تھا۔ اس علاقے میں بہت اچھے اچھے صاف ستھرے ریستوران ہیں جہاں یونیورسٹی کے اکثر طالب علم کھانا کھاتے تھے۔ یہ زیادہ گراں بھی نہیں تھے۔ میں اس جگہ پونے تین سال کے لگ بھگ رہا۔ میرا کام زیادہ تر یونیورسٹی لائبریری یا ببلیوتک ناسیونال میں رہتا تھا۔ میں دو پروفیسروں کے لکچروں میں پابندی سے جاتا تھا۔ ایک موسیو لوئی ماسینیون جن کے لکچر کولج دو فرانس میں ہوتے تھے اور دوسرے موسیو گوڈل بلوک

جن کے لکچر کموں دولانگ دیوانت میں ہوتے تھے۔ میں اپنے مقالے کی تیاری میں انھیں دونوں سے مشورہ کرتا تھا۔ ان کے علاوہ اور دوسرے پروفیسروں کے لکچروں میں بھی کبھی کبھی جاتا تھا خصوصاً فرانسیسی ادب و تنقید، فلسفہ اور تاریخ یورپ کے لکچروں میں۔ سوربون میں ایک مستقل سلسلہ تاریخ تہذیب پر عام لکچروں کا برابر جاری رہتا تھا۔ ان میں بھی اکثر اوقات شرکت کرتا تھا۔ موسیو سلوان لیوی اور موسیو فوشے کے لکچروں میں جو قدیم ہند پر ہوتے تھے، میں کبھی کبھی شریک ہوتا تھا۔ سلوان لیوی اعلیٰ کردار کے شخص تھے۔ ان کے مکان پر ہر مہینے آخری اتوار کو چائے کی دعوت ہوتی تھی جس میں ہندوستانی طالب علموں میں سے باری باری دو یا تین ضرور مدعو ہوتے تھے۔ مجھ پر وہ بہت مہربان تھے۔ خاص کر مادام سلوان لیوی بڑی شفقت فرماتی تھیں۔ ہندوستانی طالب علموں میں صرف میں ہی تھا جو ان کی یہاں کی ہر پارٹی میں مدعو ہوتا تھا۔ شاید یہ اس لئے تھا کہ میں دو سال تک ہندوستانی طالب علموں کی انجمن کا سکریٹری رہا۔ انجمن کے صدر مسٹر رانا تھے جو پرانے انقلابی تھے۔ گجرات کے کسی راجا کے خاندان سے ان کا تعلق تھا۔ پہلی جنگ عظیم کے وقت سے یورپ میں مقیم تھے۔ پیرس میں ان کی موتیوں کی تجارت تھی۔ ان کی اہلیہ ایک جرمن خاتون تھیں جو ہم سبھوں پر بہت شفقت فرماتی تھیں۔ مسٹر رانا بڑے امیرانہ ٹھاٹھ سے رہتے تھے۔ ہر مہینے دو مہینے میں ان کے یہاں دعوت میں شرکت کا موقع ملتا تھا۔ موسیو سلوان لیوی کی پارٹیوں میں پروفیسر، ادیب اور آرٹسٹ مدعو ہوتے تھے۔ راس مسعود سے بھی پہلی مرتبہ وہیں ملنے کا موقع ملا جب کہ وہ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہونے کے بعد سائنس اور ریاضی کے پروفیسروں کی تلاش میں یورپ آئے تھے۔ آندرے وائل بھی موجود تھے جن سے سلوان لیوی

نے انھیں ملایا۔ آندرے وائل نے سوربون میں ریاضی میں اعلیٰ ریسرچ کی تھی۔ ان کی قابلیت کی اس زمانے کے طالب علموں میں بڑی شہرت تھی۔ چنانچہ سلوان لیوی ہی کی سفارش پر راس مسعود نے آندرے وائل کو علی گڑھ آنے کی دعوت دی۔ جنوری ۱۹۳۰ء کو وہ اور میں ایک ہی جہاز پر اطالوی بندرگاہ جنوا سے روانہ ہو کر ہندوستان پہنچے۔ آندرے وائل مسلم یونیورسٹی میں کئی سال رہے۔ ذرا تنک مزاج آدمی تھے، پرو وائس چانسلر ریمز باتھم سے کسی بات پر اختلاف ہو گیا تو مستعفی ہو کر فرانس واپس چلے گئے۔ ہندوستان سے واپسی پر انھوں نے اپنی تحقیقات کی بدولت بڑی شہرت حاصل کی۔ اب آج کل چھ مہینے وہ امریکہ میں اور چھ مہینے فرانس میں رہتے ہیں۔ اپنے وقت کے مالک ہیں کہ جس طرح چاہیں صرف کریں۔ ان کی تحقیقات کے ڈانڈے ریاضی اور طبیعات دونوں سے ملتے ہیں۔ آج کل ان کا شمار چوٹی کے ماہرین سائنس میں ہوتا ہے۔

سوربون کی تاریخ | میں ریو دیوسے وار کے جس مکان میں رہتا تھا وہاں میرے کمرے کی کھڑکی سے نوتر دام کا کلیسا نظر آتا تھا۔ اس کلیسا سے فرانسیسی تاریخ کے ہر عہد کی یادیں وابستہ ہیں۔ جس جگہ یہ واقع ہے وہیں رومن لوگوں نے لیوتیتیا کا شہر آباد کیا تھا جس کے آثار کلیسا کے قریب جو کھدائی ہوئی ہے اس میں نکلے ہیں۔ کلیسا کے آس پاس کا علاقہ ایل دے لاستے (شہر کا جزیرہ) کہلاتا ہے اس لئے کہ دریائے سین کی ایک شاخ نے اس جگہ ایک جزیرہ سا بنا دیا ہے۔ جس طرح یہ جزیرہ، جو دو پلوں کے ذریعے سے شہر سے ملتا ہے، پیرس کا مرکز ہے، اسی طرح اس کا مرکز نوتر دام کا کلیسا ہے۔ یہ صرف پیرس ہی کا نہیں بلکہ فرانس کا مرکز ہے اس لئے کہ فرانس کے نقشوں میں ملک کے تمام فاصلے اسی مقام سے ناپے جاتے ہیں۔ مثلاً کہیں گے کہ نوتر دام کے کلیسا کے مغربی دروازے سے یہ مقام دو سو

یا ڈھائی سو کیلو میٹر ہے۔ جہاں یہ کلیسا ہے وہ مقام کم و بیش دو ہزار سال سے مقدس خیال کیا جاتا ہے۔ رومنوں کے زمانے میں یہاں جوپیٹر کا مندر تھا۔ چوتھی صدی عیسوی میں جب فرانس میں مسیحیت کی نشر و اشاعت ہوئی تو یہاں جوپیٹر کے مندر کی جگہ کلیسا کی تعمیر ہوئی جہاں مذہبی تعلیم کا انتظام تھا۔ موجودہ کلیسا کی تعمیر ۱۱۶۳ء میں شروع ہوئی۔ بارہویں صدی میں نوتر دام کے مدرسے کے دو استادوں کی سارے یورپ میں شہرت تھی۔ ایک ابے لارا اور دوسرے گیوم دے شاپنو۔ ان سے استفادہ کرنے کے لئے دور دراز ملکوں سے طالب علم آتے تھے۔ یہ اسکول پیرس کے اسقف (بشپ) کی نگرانی میں چلتا تھا جس سے بعض امور کی نسبت ابے لارا اور گیوم دے شاپنو کو اختلاف پیدا ہو گیا۔ چنانچہ ان دونوں نے نوتر دام کے اسکول سے علٰحدہ ہو کر ریوسین ژاک میں اپنے درس شروع کر دیئے۔ ان دونوں عالموں کے علم و فضل کی ایسی دھاک بیٹھی ہوئی تھی کہ جہاں وہ گئے وہیں شاگردوں اور علم کے پیاسوں کا جمگھٹا لگ گیا۔ نوتر دام کے اسکول کو چھوڑ چھوڑ کر طالب علم ریوسین ژاک میں جمع ہونے لگے۔ ۱۱۸۰ء میں جہاں اب سوربون کی عمارت ہے وہاں ایک کالج قائم ہو گیا تھا جہاں دینیات کی تعلیم دی جاتی تھی۔ ہوتے ہوتے اس کالج کی شہرت سارے یورپ میں پھیل گئی۔ فرانس کے بادشاہ فلپ آگسٹس نے اس کالج کو ۱۲۰۰ء میں یونیورسٹی تسلیم کر کے اس کی اسناد منظور کی۔ اس کے بعد سے اس کی سند وقعت کی نظر سے دیکھی جانے لگی۔ یونیورسٹی نوتر دام کے انتظامی اثر سے آزاد تھی اور اسے ڈگریاں دینے کا اختیار حاصل تھا جس کی توثیق پاپائے روم سے بھی کرا دی گئی تاکہ پیرس کا بشپ کوئی اڑنگا نہ لگا سکے۔

۱۲۲۱ء میں پہلی مرتبہ اس یونیورسٹی نے اپنی علٰحدہ مہر استعمال کی اور اپنے شعبوں

کی تنظیم جمہوری اصول پر کی۔ ہر شعبہ اپنا ڈین منتخب کرتا تھا چونکہ شروع ہی سے یہ یونیورسٹی بین اقوامی تھی اس میں ہر ملک کے طالب علم شریک ہوتے تھے فنون کے شعبے میں طالب علموں کی تعداد اور شعبوں سے زیادہ رہتی تھی۔ یونیورسٹی کا اعلیٰ افسر ریکٹر کہلاتا تھا۔ مختلف شعبوں میں مشترک اجلاس ہوا کرتے تھے جن میں ہر شعبے کی ضروریات کو یونیورسٹی کے نقطۂ نظر سے جانچا جاتا تھا۔ تیرہویں صدی کے وسط میں پیرس یونیورسٹی میں طلبا کی تعداد پندرہ ہزار کے لگ بھگ تھی۔ بادشاہ سین لوئی کے خاندانی پادری (چیلپن) نے جس کا نام روبیردے سوربون تھا دینیات کی تعلیم کے لئے ایک وقف قائم کیا جس کی رو سے کچھ جائداد اس خاص مقصد کے لئے تولیت میں دیدی گئی۔ دینیات کی تعلیم میں علم کلام پر بہت زور دیا جاتا تھا لیکن بعد میں فلسفیانہ علوم کی طرف بھی توجہ دیجانے لگی۔ اس یونیورسٹی میں ارسطو کے مسلک کو خاص مقبولیت حاصل تھی۔ ایسے استاد بھی تھے جو فطرت اور عقل کے اصول کو مانتے تھے۔ ان کے گرد ان کے ہمخیال شاگردوں کا مجمع رہتا تھا۔ چودھویں صدی میں اس یونیورسٹی میں جو اب مختصراً سوربون کہلانے لگی انسان دوستی (ہیومن ازم) کے مسلک کو مقبولیت حاصل ہوئی اور یونانی اور لاطینی ادب عالیہ کا فرانسیسی زبان میں ترجمہ ہوا۔ پندرہویں صدی میں ساربون میں ایک مطبع بھی قائم ہوگیا جہاں ہر قسم کی علمی کتابیں طبع ہوتی تھیں۔ وزیر رشیلیو نے اس درس گاہ کی نئی عمارتیں اور کلیسا تعمیر کرایا۔ رشیلیو پندرہ سال تک سوربون کا ریکٹر رہا۔ اب یہاں قانون اور طب کی تعلیم کا بھی خاص انتظام کیا گیا۔ سوربون کی موجودہ عمارتیں کلیسا کو چھوڑ کر ۱۸۸۵ء میں بننا شروع ہوئیں اور چار سال کے عرصے میں ان کی تکمیل ہوئی۔ ریو سین ژاک پر جہاں قدیم سوربون تھی وہیں یہ شاندار عمارتیں تعمیر ہوئیں۔

سوربون کی بین اقوامی خصوصیت تقریباً آٹھ سو سال سے قائم ہے۔ اس خصوصیت کو اور زیادہ نمایاں کرنے کے لئے ۱۹۲۵ء میں پیرس کے باہر لوپرت اورلیان کے قریب ستے یونی ورسی تیر (شہر جامعہ) بنایا گیا جہاں مختلف قوموں کے طالب علم مل جل کر زندگی بسر کرتے ہیں۔ مختلف قوموں نے اس کے احاطے میں اپنی اپنی عمارتیں تعمیر کرائیں جن میں ۵۰ فی صدی اُس قوم کے طالب علم، ۵۰ فی صدی فرانسیسی اور ان کے علاوہ دوسری قوموں کے نوجوان بھی رہتے ہیں۔ ان اقامت خانوں میں چھ ہزار طالب علموں کی رہائش کا انتظام ہے۔ میں بھی کبھی کبھی بعض دوستوں کے ساتھ یہاں کھانا کھانے جایا کرتا تھا۔ یہاں اپنی مدد آپ، کرنے کے اصول پر عمل ہوتا ہے۔ کھانا میزوں پر چنا رکھا ہوتا ہے۔ خود جاؤ اور اپنی رکابی میں، جو چیز لینا چاہو، ڈال لو اور واپس آکر کھانے کی میز پر بیٹھ کے کھالو۔ اگر بیچ میں کسی چیز کی ضرورت ہو پھر جاؤ، نکالو اور لے آؤ۔ میں نے یہ طریقہ سب سے پہلے یہیں سِتے یونیورسٹی تیر، میں ۱۹۲۷ء میں دیکھا۔ بعد میں یورپ کی دوسری یونیورسٹیوں میں بھی دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ جرمنی، اور آسٹریلیا کی سب یونیورسٹیوں میں اسی پر عمل ہوتا تھا اور میں سمجھتا ہوں، اب امریکہ اور یورپ کی اکثر یونیورسٹیوں میں ایسا ہی ہے۔

سوربون نے علم و فن میں جو تعلیمی ٹھیکہ داری قائم کر لی تھی وہ بعض عالموں کو کھلنے لگی۔ انھوں نے بادشاہ فرانس کو آمادہ کیا کہ ایک شاہی کالج قائم کرے جہاں یونانی، لاطینی اور عبرانی زبانوں کی تعلیم کا خاص انتظام ہو۔ یہ کالج براہ راست بادشاہ کے تحت ہو اور اس میں دینی علوم کے بجائے دنیوی علوم پر زیادہ زور دیا جائے۔ سوربون کے شعبۂ دینیات نے اس کالج کے قیام کی سخت مخالفت کی۔ بادشاہ فرانس اوّل نے، جس کے خیالات پر نشاۃ ثانیہ کی انسان دوستی کا گہرا اثر تھا، سوربون

کے شعبۂ دینیات کی تجاویز کو مسترد کر دیا اور کسی کی ایک نہ سنی۔ اس کے حکم سے کلاسکی زبانوں کے علاوہ فلسفہ، خطابت، طب اور ریاضی کی تعلیم کا خاص انتظام کیا گیا اور قابل قابل لوگ پروفیسر مقرر ہوئے۔ فرانسس اول کی وفات کے بعد کولیج دو فرانس کو شاہی سرپرستی حاصل رہی۔ یہاں کے پروفیسروں کو اپنے طریق تعلیم کے متعلق پوری آزادی تھی۔ سب لکچر فرانسیسی زبان میں ہوتے تھے بخلاف سوربون کے جہاں لاطینی ذریعۂ تعلیم تھی۔ یہ کالج بعد میں خود ایک چھوٹی سی یونیورسٹی بن گیا جس میں صرف تحقیقات کی جاتی ہے، لکچر بھی ہوتے ہیں لیکن کسی مضمون کا امتحان نہیں لیا جاتا۔ شروع شروع میں سوربون (پیرس یونیورسٹی) اس کالج کو اپنا مدِ مقابل سمجھتی تھی لیکن رفتہ رفتہ یہ رقابت ختم ہو گئی اور آپس میں تعاون کے اصول پر عمل ہونے لگا۔ اب یہ ادارہ براہ راست وزیر تعلیم کے تحت ہے۔ اس کالج کے لکچروں میں ہر شخص شریک ہو سکتا ہے، چاہے وہ طالب علم ہو یا نہ ہو۔ اس میں پروفیسر ہونا فرانس کی علمی دنیا میں بڑا اعزاز سمجھا جاتا ہے۔ برگسون کے لکچروں میں اتنا مجمع ہوتا تھا کہ لوگوں کو بیٹھنے کے لئے خاص انتظام کرنا پڑتا تھا۔ ان میں طالب علموں کے علاوہ فرانس کے اعلیٰ طبقے کی خواتین بھی بڑی تعداد میں شرکت کرتی تھیں۔ پروفیسر ماسینیون کے اسلامی علوم پر لکچر بہیں ہوتے تھے، جن میں مجھے بھی شریک ہونے کا موقع ملا۔

کارتیۓ لاطین | نوترہ دام کے کلیسا اور سوربون کے آس پاس کے علاقوں میں جو دریائے سین کے بائیں کنارے پر واقع ہے۔ طالب علموں اور آرٹسٹوں کا جمگھٹا رہتا ہے۔ یہ علاقہ کارتیۓ لاطین (لاطینی محلہ) کہلاتا ہے، اس لئے کہ پرانے زمانے میں یہاں قدم قدم پر اسکول اور کالج تھے جہاں لاطینی پڑھائی جاتی تھی۔ یورپ کے دوسرے ملکوں سے

جو طالب یہاں آتے تھے وہ لاطینی زبان بولتے تھے۔ اُس زبان میں لاطینی اہل یورپ کے لئے بین اقوامی زبان تھی۔ اب بھی پیرس کے اکثر و بیشتر کالج (دلی سے) یونیورسٹی، مختلف انسٹی ٹیوٹ اور آرٹ کے مرکز اسی علاقے میں واقع ہیں۔ دریائے سین کے کنارے کنارے چھوٹی چھوٹی لکڑی کی صندوق نما دکانیں میلوں چلی گئی ہیں جہاں پرانی کتابیں اور تصویریں بلاک سے تیار کی ہوئی تصویریں اور نقشے اور متفرق علمی اشیاء سستے داموں مل جاتی ہیں۔ جب کچھ کرنے کو نہ ہو تو علم دوست اشخاص یہاں سیر و تفریح کے لئے چہل قدمی کرنے نکل جاتے ہیں۔ یہاں بعض دفعہ نہایت عمدہ چیزیں کوڑیوں کے مول مل جاتی ہیں۔ ایک دفعہ میری نظر دیوان ولی پر پڑی جسے اب سے سو سال پہلے گارساں دے تاسی نے ترتیب دیکر شائع کیا تھا۔ یہ مجھے چند فرانک میں مل گیا جب میں عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد میں تھا تو میں نے یہ کتاب یونیورسٹی کی لائبریری کو تحفہ کے طور پر دیدی تھی تاکہ ریسرچ اسکالر اس سے استفادہ کرسکیں۔ ان صندوق نما لکڑی کی دکانوں کے بیچ بیچ میں دریا کے کنارے نیچے جانے کے لئے راستے چھوڑ دیئے ہیں۔ نیچے جاؤ تو سیکڑوں لوگ دریا میں مچھلیاں پکڑتے نظر آئیں گے جس کے لئے باقاعدہ سرکاری اجازت لینا پڑتی ہے۔ اتوار کے دن یہاں خاص گھما گھمی رہتی ہے۔

کارتیئے لاطین (لاطینی محلے) میں علم اور آرٹ کی جو خاص فضا ہے اس کی نظیر یورپ میں کہیں اور نہیں ملتی۔ یہاں طالب علم اور آرٹسٹ سستے کرائے کے مکانوں اور اقامت خانوں میں زندگی بسر کرتے ہیں۔ کوئی گلی ایسی نہیں جس میں کوئی نہ کوئی نامی گرامی ادیب یا فاضل یا مصور یا سنگ تراش نہ رہا ہو۔ پیرس کے دوسرے علاقوں کی طرح یہاں بھی سڑکوں پر قہوے خانے ہیں جن کا پچھلا آدھا حصہ اندر مکان میں اور آدھا باہر سڑک

(ڈاکٹر

کے سرے پر سائبان کے تلے ہوتا ہے۔ یہاں نوجوان لڑکے لڑکیاں قہوہ پیتے اور بحث و مباحثہ میں سرگرم دکھائی دیتے ہیں۔ فرانس کی بیشتر علمی اور فنی تحریکوں کی ابتدا انھیں قہوہ خانوں میں ہوئی۔ یہاں کی شاہراہیں بُلوار سین جرمین اور بُلوار سین مشل ہیں جسے طالب علم عام طور پر "بل مش" کہتے ہیں۔ یہ دریائے سین کے مغربی کنارے پر شمال سے جنوب کی طرف جاتی ہے۔ یہاں آپ کو ہر وقت دنیا کے مختلف ملکوں کے طالب علم مختلف زبانیں بولتے گھومتے ہوئے نظر آئیں گے۔ بعض دفعہ دیکھنے میں آتا ہے کئی کئی نوجوانوں کی ٹولیاں سڑک پر مل کر گھوم رہی ہیں۔ بڑی سرگرمی اور جوش کے ساتھ بحثا بحثی ہو رہی ہے۔ اگر کوئی نیا یا دہ مختلف فیہ مسئلہ آگیا تو وہیں سڑک پر ٹھہر گئے اور ایک ساتھ سب اپنی اپنی دلیلیں پیش کرنے لگے۔ یہ بیچ سڑک والے مباحثے سیاسی بھی ہوتے تھے اور علمی اور فنی بھی۔ ہر ایک اپنی دلیل کو انتہائی خلوص اور جوش و خروش سے پیش کرتا تھا، جیسے دنیا کے سارے مسئلوں کا حل بس اسی کی رائے پر منحصر ہو۔ ہمعصر نوجوانوں کے اخلاص، جوش اور سرگرمی اور بے ریا سادگی کے یہ منظر ہمیشہ یاد رہیں گے، اس لئے اور بھی کہ میں خود کبھی کبھی ان میں شریک ہوتا تھا۔ اگرچہ زیادہ تر تو دور سے ان کا تماشا دیکھا کرتا تھا۔ میں نے ہمیشہ ایسے مواقع پر محسوس کیا کہ باہر کے ملکوں کے نوجوان بحث و مباحثہ میں اتنا زیادہ جوش کا اظہار نہیں کرتے جتنا کہ خود فرانسیسی نوجوان جن میں سیاسی نظریوں کی انتہاپسندی نمایاں تھی۔ ان میں شاہی پرست بھی تھے اور کمیونسٹ بھی۔ کبھی کبھی ان میں گلخپ بھی ہو جاتی تھی اور سڑک پر چلتے چلتے فقرہ بازی تو برابر چلتی رہتی تھی۔ لیکن اس نوک جھونک اور طنز و مزاح میں تلخی نہیں ہوتی تھی۔

کارتیے لاطین میں سین ژان ویو کی پہاڑی بھی واقع ہے۔ ژان ویو شہر پیرس کی محافظ

تھی۔ وہ اپنے زمانے میں ولی اللہ مانی جاتی تھی۔ جب ہنوں نے اٹیلا کے تحت وسط یورپ پر حملہ کیا تو انھوں نے پیرس کا رُخ کیا۔ ژان ویو نے پیرس کے لوگوں کی ہمت بندھائی اور کہا کہ مجھے خواب میں بشارت ہوئی ہے کہ ہن حملہ آور پیرس پہنچنے سے قبل ہی پلٹ جانے پر مجبور ہو جائیں گے۔ اُنکا یہ خواب سچ نکلا ہنوں کو فرانکون کے بادشاہ موروویے کے ہاتھوں سخت شکست ہوئی اور وہ واپس جانے پر مجبور ہو گئے۔ ژان ویو کی خانقاہ جس پہاڑی پر تھی وہیں وہ دفن کی گئی۔ دور دور سے لوگ اس خانقاہ کی زیارت کو آتے ہیں۔ اسی طرح کی دوسری خاتون جو ولی مانی جاتی تھی ژون آف آرک تھی جس نے انگریزی فوجوں کا بڑی بہادری سے مقابلہ کیا تھا۔ انگریزی فوج نے اسے گرفتار کر کے اس پر چڑیل ہونے کا الزام لگایا اور اسے زندہ جلوا دیا تھا۔ اس کا یہ اثر ہوا کہ فرانس کے جھگڑالو ڈیوکوں میں اتحاد پیدا ہو گیا اور انھوں نے انگریزی فوج کو ساحل تک پیچھے ڈھکیل دیا اور بالآخر فرانس کا شمالی علاقہ انگریزی عمل دخل سے آزاد ہو گیا۔

نشأۃ ثانیہ کے بعد سوربون یونیورسٹی انسان دوستی کا زبردست مرکز بن گئی اور یہاں دینیات کے ساتھ دنیوی علوم کی تعلیم کو فروغ حاصل ہوا۔ یہاں کے فلسفیوں اور علوم کے ماہروں سے استفادے کے لئے یورپ کے دور دور ملکوں سے نوجوان ٹوٹے پڑتے تھے۔ عقلیت کے دور میں والٹیئر، دیدرو اور رُوسو کی دھاک سارے یورپ میں بیٹھ گئی، جن کا اگرچہ براہ راست سوربون سے کوئی تعلق نہیں رہا لیکن وہ اس فضا کی نمایندگی کرتے تھے جو سوربون کی بدولت پورے ملک میں پیدا ہو گئی تھی۔ جدید زمانے میں سوربون کے پروفیسروں میں پاستیور، جس نے جراثیم پر فتح حاصل کی، اور مادام کیوری جس نے ریڈیم دریافت کیا عالمگیر شہرت رکھتے ہیں۔ دونوں کی دریافتوں سے انسانی دکھوں کا

مداوا ہوا۔ ابھی حال کے زمانے میں پروفیسر ڈوبیو کیوری کی جو ہری دریافتوں کی بھی بڑی شہرت ہوئی۔

اسی لاطینی محلّے کے قریب دریا کے دوسری طرف مون پرناس کا علاقہ ہے جو ایک پہاڑی پر واقع ہے۔ یہ یورپ کے فن کاروں کی جنت کہلاتا ہے، یہاں سیکڑوں اسٹوڈیو ہیں جہاں نقش و نگار کی ایک علٰحدہ دنیا آباد ہے۔ فرانسیسی ادب میں لاطینی محلّے اور مونا پرناس کی اتنی تعریفیں ہوئی ہیں کہ اب اہل فرانس کے تخیل میں یہ محلے نہیں ہیں بلکہ شخصیتیں بن گئی ہیں۔ جس طرح کسی بچے کی زیادہ تعریف کی جائے تو اندیشہ ہوتا ہے کہ کہیں وہ بگڑ نہ جائے یہی حال محلوں اور شہروں کا ہے۔ ان کی زیادہ تعریف و توصیف رہنے والوں میں بگاڑ پیدا کر دیتی ہے اور ان میں بغیر ضروری طور پر اپنی ذات کا احساس و شعور پیدا ہو جاتا ہے۔ اسی طرح کارتے لاطین اور مون پرناس پیرس کے بگاڑے ہوئے بچے ہیں۔ ناز و نعمت سے زیادہ انھیں ان کی تعریف نے بگاڑا ہے۔ کارتے لاطین میں طالب علموں کو جو مراعات ملی ہیں پیرس کے دوسرے شہریوں کو حاصل نہیں ہیں لیکن طالب علم بھی شہریوں کی طرح اپنی ذمہ داری کو سمجھتے ہیں اور ان رعایتوں سے بیجا فائدہ نہیں اٹھاتے۔

شان زیلزے دریائے سین کے دائیں جانب پیرس کے متمول لوگ رہتے ہیں۔ یہاں بڑے بڑے ہوٹل اور ریستوران، سفارت خانے، رہائشی مکان، مہاجنی کوٹھیاں اور عالیشان بازار ہیں۔ یہیں پلاس دے لاکنکور واقع ہے جو دنیا کا سب سے بڑا چوک ہے۔ یہاں جو مجسمے اور فوارے لگائے گئے ہیں وہ اس چوک کی وسعت کو پیش نظر رکھ کر ہیں۔ دو بڑے فواروں کے درمیان لال پتھر کا بلند مینار کھڑا ہے۔ جس کی چوٹی مخروطی ہے؛

اس پر قدیم تصویری تحریر ثبت ہے، جو فرعون رامسس دوم کی مدح و ثنا میں ہے۔ یہ مینار محمد علی پاشا حکمرانِ مصر نے لوئی اٹھارہویں کو تحفے میں بھیجا تھا۔ اگرچہ یہ مینار اور اس کی تصویری تحریر پلاس دے لاکنکورد کے گرد و پیش میں بالکل بدیسی چیز ہے، لیکن اسے اس سلیقے سے لگایا ہے کہ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے یہ خاص اس جگہ کے لئے بنایا گیا ہو۔ فرانسیسی لوگوں کو اندرونی اور بیرونی نمائش و آرائش کا خاص سلیقہ اور ذوق ہے۔ یہی سبب ہے کہ پیرس دنیا کا سب سے زیادہ حسین شہر ہے۔ قدم قدم پر اس قوم کے ذوقِ جمال کی داد دینی پڑتی ہے۔ پلاس دے لاکنکورد کی وسعت میں تناسب اور موزونیت کا برقرار رکھنا بڑے فنی کمال پر دلالت کرتا ہے جو بغیر انجینیر اور آرٹسٹ کے مکمل تعاون کے ممکن نہ تھا۔ اس کی وسعت کو ایسے فنی کمال سے سمیٹا گیا ہے کہ خالی جگہ بھی بھری بھری سی لگتی ہے۔

سامنے تیولیری کا چمن ہے جس سے متصل لوور کا عجائب خانہ ہے جو کسی زمانے میں شاہی محل تھا۔ پیرس کی بلکہ کہنا چاہئے دنیا کی سب سے بارونق شاہراہ شان زلیزے، پلاس دے لاکنکورد سے شروع ہو کر اتوال کو چلی گئی ہے۔ یہ شاہراہ خاص قسم کی مضبوط لکڑی کی اینٹوں سے بنائی گئی ہے جن پر ڈامر کی تہہ جمی ہوئی ہے۔ یہاں روشنی کا انتظام ایسا اعلیٰ درجہ کا ہے کہ دل و دیدہ روشن ہو جاتے ہیں۔ سیکڑوں بجلی کے قمقموں کی روشنی سے ایسا سماں بندھ جاتا ہے جیسے رات میں دن ہو۔ رات میں شان زلیزے بلور کی سڑک معلوم ہوتی ہے۔ یہ سڑک تو لیری کے چمن سے لے کر آرک دو تری اونف ہوتی ہوئی دس کیلومیٹر تائی کے مقام تک اسی شان سے چلی جاتی ہے۔ آرک دو تری اونف پر بارہ سڑکیں اس سے آکر ملتی ہیں۔ پیرس کی شاہراہوں کے دونوں طرف دکانیں اور ستورِان ہوتے ہیں۔ دکانوں کی کھڑکیوں کو نفیس قسم کے سامان سے سجایا جاتا ہے۔

دنیا بھر کے بے غم لوگ یہاں سیر گشت کرتے دکھائی دیں گے۔ دنیا کے کسی شہر میں نہ اتنی سایہ دار سڑکیں ہیں اور نہ سڑکوں کے پہلوؤں میں اتنی وسیع کھلی جگہ ہے۔ شان زلیزے کے دونوں طرف کھلی جگہوں میں لوہے کی کرسیاں پڑی رہتی ہیں۔ ٹہلتے ٹہلتے تھک گئے تو یہاں دم لینے اور ستانے کے لئے بیٹھ جائیے۔ اس شاہراہ کے قریب ہی فرانس کے پریسیڈنٹ کی جائے رہائش ہے۔ آرک دوتری اونف کے قرب و جوار میں اکثر سفارت خانے واقع ہیں۔ اس شاہراہ کا پلاس دے لاکنکورد والا جو سرا ہے اس کے قریب دو سڑکیں ریو روپال اور ریو دو ریوولی سامان عیش و طرب کی خرید و فروخت کے لئے ساری دنیا میں مشہور ہیں۔ خواتین کے لئے پیرس کا یہ حصہ خاص دلکشی رکھتا ہے فیشن اور آرائش و زیبائش کی کوئی عمدہ سے عمدہ چیز ایسی نہیں جو یہاں دستیاب نہ ہوتی ہو۔ لباس، خوشبوئیں، کامدانی اور کارچوب کے تھان، کمخواب، زربفت جو چاہیے خرید لیجئے۔ دکانیں ہر قسم کے سامان سے ایسی بھری پڑی رہتی ہیں جیسی پھٹی پڑتی ہوں خلقت کی ایسی ریل پیل کہ کھوے سے کھوا چھلے۔ جسے دیکھو اپنے خیال میں ڈوبا ہوا چلا جا رہا ہے۔ اگر سُدھ بُدھ ہے تو بس ان چیزوں کی جنھیں مختلف دکانوں میں تلاش کیا جاتا ہے۔ ایکٹرسوں کو دیکھنے کے شوقین ان سڑکوں کے چکر کاٹتے ہیں کہ شاید دور ہی سے نظارۂ جمال میسر آ جائے۔

فرانسیسی پروفیسر فرانس میں میرا قیام ساڑھے تین سال سے کچھ زائد رہا۔ میں مئی ۱۹۲۶ء سے جنوری ۱۹۳۰ء تک۔ دسمبر ۱۹۲۹ء میں مجھے ڈاکٹریٹ کی ڈگری ملی۔ اس عرصے میں میرا براہ راست تعلق موسیو ماسین یون اور موسیو ژول بلوک سے رہا۔ ایک اسلامی علوم کے ماہر اور دوسرے ہندوی علوم و السنہ کے ماہر۔

میں ان کے لکچروں کے علاوہ اکثر ان کے مکان پر بھی جایا کرتا تھا۔ موسیو ماسین یون کبھی کبھی سہ پہر کی چائے پر بلاتے تھے۔ اپنے مضمون کے علاوہ اور دوسرے مسائل پر گفتگو رہتی تھی، خاص کر نفس مذہب کے متعلق۔ موسیو ماسین یون کیے کیتھولک تھے، لیکن اسلام اور مسلمانوں کے مداح تھے۔ میں نے بعض لوگوں سے یہ کہتے سنا کہ وہ دل سے مسلمان ہیں، ظاہر میں کیتھولک ہیں۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ یہ رائے غلط تھی۔ یہ رائے غالباً اس لئے قائم ہوئی کہ وہ اسلام کی قدر اور مسلمانوں سے ہمدردی کرتے تھے۔ وہ طبعاً مذہبی شخص تھے اور مسیحیت اور اسلام کو ایک دوسرے سے بہت قریب سمجھتے تھے۔ میں نے خود انھیں کئی مرتبہ یہ کہتے سنا کہ مسیحیت اور اسلام ایک دوسرے کے اتنے قریب ہیں کہ ان میں غلط فہمیاں نہیں رہنی چاہئیں۔ موسیو ماسین یون اسلامی ملکوں کی سیاست کے متعلق حکومتِ فرانس کے مشیر تھے۔ اس لئے بعض اسلامی ملکوں کے طالبِ علم جو سوربون میں میرے ساتھ پڑھتے تھے۔ انھیں شبہ کی نظر سے دیکھتے تھے اور کہتے تھے کہ وہ سامراجی خیال کے آدمی ہیں، خاص کر مصر، الجیریا، اور مراکش کے طالب علموں کا یہ خیال تھا۔ میں سمجھتا ہوں ان کی اس رائے میں مبالغہ سے کام لیا گیا تھا۔ ژول بلوک، سلوان لیوی کی طرح یہودی تھے۔ وہ مذہب و عقیدت کو علمی تحقیق کا اچھا موضوع تو سمجھتے تھے لیکن ان کی روحانی تاثیر کو شبہہ کی نظر سے دیکھتے تھے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ مذہب سے زیادہ ضروری چیز اخلاق ہے جس کے بغیر انفرادی اور اجتماعی زندگی بسر نہیں ہو سکتی۔ وہ سلوان لیوی کے شاگردوں میں تھے اور اپنے استاد کا بیحد احترام کرتے تھے۔ ژول بلوک بڑے متواضع اور ملنسار شخص تھے۔ کبھی ایسا ہوا کہ میں سوربون کی لائبریری میں بیٹھا کام کر رہا ہوں، وہ گئے اور لائبریری میں سے پانچ چھ موٹی موٹی کتابیں چن کر خود اٹھا لائے اور

میرے پاس لاکر رکھ دیں ۔ میں سمجھتا ہوں کسی دوسرے ملک میں شاید ہی کوئی
پروفیسر ایسا کرے ۔ کتابیں میرے پاس رکھ کر کہتے، انھیں اپنے نام جاری کرا لو۔
انھیں ضرور پڑھو ۔ یونیورسٹی لائبریری میں یہ قاعدہ تھا کہ جتنی کتابیں چاہو اپنے نام جاری
کرا کے پڑھو اور جب پڑھ چکو تو دوسرے دن کے لئے کلرک کے پاس اپنے نام سے علحدہ
رکھوا دو ۔ موسیو ژول بلوک نے اس طرح مجھے کئی مرتبہ شرمندہ کیا ۔ میں ہرچند کہتا
کہ آپ کیوں زحمت کرتے ہیں، مجھے نام بتا دیجئے تو ان کتابوں کو میں خود نکلوا لوں گا۔
لیکن میرے کہنے کا انھوں نے کوئی اثر نہیں لیا ۔ ان کے علم و فضل نے ان کی انانیت کو
بالکل مٹا دیا تھا ۔ وہ میرے ساتھ اس طرح سے ملتے تھے جیسے کوئی بے تکلف دوست ہو۔
وہ پیرس سے آٹھ دس میل دور رہتے تھے ۔ مہینے میں ایک اتوار میں اُن کے یہاں گذارتا
تھا ۔ صبح ناشتہ کر کے جاتا، دوپہر کا کھانا ان کے خاندان کے ساتھ کھاتا، پھر سہ پہر
کی چائے کے بعد ریل کے ذریعہ واپس آجاتا ۔ ان کے مکان کے قریب ایک مصنوعی
جنگل تھا دوپہر کے کھانے کے بعد ہم ٹہلنے نکل جاتے ۔ کبھی ان کے بیوی بچے بھی ساتھ ہوتے
اور کبھی وہ اور میں تنہا ہوتے ۔ موسیو ژول بلوک کی ادبی معلومات بہت وسیع تھیں۔
ان کے کہنے پر میں نے رینان اور اناتول فرانس کی تصانیف پڑھیں جن کے متعلق
ان سے گفتگو رہتی تھی ۔ کہتے تھے یہ دونوں خالص فرانسیسی زبان لکھتے ہیں ۔ صاف
ستھری، متوازن، نپی تلی، بے تکلف ۔ دونوں مصنف تشکیک پرست تھے اور خود
ژول بلوک کا ذہنی رجحان بھی تشکیک کی طرف مائل تھا، اگرچہ کبھی انھوں نے اس
بات کو واضح نہیں کیا ۔ شاید وہ یہ نہیں چاہتے تھے کہ میری عقیدت کو ڈانواں ڈول
کریں ۔ ویسے وہ مذہب کے مخالف نہیں تھے لیکن اخلاق کی فضیلت کو زیادہ اہم (ڈاکٹر صاحب)

سمجھتے تھے، جس کے لئے ان کے خیال میں مذہب کی ضرورت نہ تھی۔ وہ صرف انسانی عقل کی فضیلت کو مانتے تھے۔

موسیو سلوان لیوی سردیوں میں پیرس میں رہتے تھے اور موسم بہار اور گرمیوں میں پیرس سے کچھ فاصلے پر مون مون رانسی چلے جاتے تھے جہاں ان کا ذاتی بنگلہ تھا۔ یہ وہی مقام ہے جہاں روسو کی معتقد مادام دے پینے نے اس کی رہائش کے لئے جنگل کے قریب ایک مکان پیش کیا تھا اور جہاں اس نے کئی تصانیف لکھیں۔ یہاں اسے فطرت کا قرب، سکون اور بے فکری کچھ عرصے کے لئے حاصل ہوئی۔ گرمیوں میں سلوان لیوی کے اس مکان میں مجھے کئی مرتبہ دوپہر کا کھانا کھانے کا اتفاق ہوا تو وہ پیسے والے آدمی تھے اور ان کا دسترخوان وسیع تھا۔ جس طرح اپنے پیرس کے گھر میں وہ ہندوستانی طالب علموں کو باری باری سے مدعو کرتے تھے اسی طرح دوپہر کے کھانے پر مون مون رانسی بھی باری باری سے بلاتے تھے۔ یہاں بھی ان کی پارٹیوں میں ماہرین سیاست، ادیب اور آرٹسٹ ہوتے تھے جن سے ہم لوگوں کو ان کے توسط سے ملنے کا موقع ملا۔ میں نے اپنے فرانس کے دوران قیام میں محسوس کیا کہ فرانسیسی پروفیسر بے حد خلیق ہیں۔ موسیو فوشئے کے یہاں بھی ہم لوگ کئی مرتبہ مدعو ہوئے۔ وہ بھی پیرس سے کچھ فاصلے پر پرسو کے مقام پر رہتے تھے۔ ان کا بھی اپنا ذاتی بنگلہ تھا جو بالکل عجائب گھر معلوم ہوتا تھا۔ موسیو فوشئے ہندوستان اور مشرق بعید کے ممالک میں مدتوں رہے۔ ان کے مکان کے بیرونی صحن میں مہاتما بدھ کے متعدد بڑے بڑے مجسمے تھے۔ اندر مکان میں ایک بڑا کمرہ مجسموں اور مختلف نوادر سے بھرا ہوا تھا۔ اس کمرے کی دیواروں پر چین اور ہندوستان کی مصوری کے نمونے بڑے سلیقے سے سجائے گئے تھے جن کے بیچ بیچ میں

چینی نقش ونگار کے پردے آویزاں تھے۔ موسیو فوشے نے قدیم تصاویر کے تحفظ پر تحقیقات کی تھی اور اس فن میں بڑے ماہر خیال کئے جاتے تھے۔ حکومت حیدرآباد نے بھی کچھ عرصے کے لئے ان کی خدمات مستعار لی تھیں، تاکہ وہ اجنٹا کی دیواری تصاویر کے تحفظ کے لئے اپنی تجاویز پیش کریں۔ ان کی سفارش پر حیدرآباد کے محکمۂ آثار قدیمہ نے عمل کیا اور اجنٹا کی تصاویر کے تحفظ کی صورت پیدا ہوئی۔ اس زمانے میں مولوی غلام یزدانی اس محکمے کے ناظم (ڈائرکٹر) تھے جنھوں نے اجنٹا کی تصاویر کے عکس کئی جلدوں میں شائع کئے جو نہایت دیدہ زیب ہیں۔ اجنٹا کی تصاویر کے تحفظ کے لئے انھوں نے جو کام کیا وہ قابل تعریف ہے۔ مولوی غلام یزدانی فاضل شخص تھے اور فنون لطیفہ پر ان کی نظر بہت وسیع تھی۔

موسیو فوشے کے مکان سے تھوڑے فاصلے پر فرانس کا وہ مشہور ریستوران ہے جو جنگل میں درختوں پر بنایا گیا ہے جس کا نام رُبے سون، رابنسن کروسو کے نام کی مناسبت سے رکھا گیا ہے۔ یہاں چائے اور قہوے کے علاوہ کھانے کا بھی انتظام ہے تعطیل کے دن پیرس سے بہت سارے لوگ دوپہر کا کھانا کھانے کے لئے یہاں آتے اور سہ پہر میں جنگل میں گھومتے ہیں۔ درختوں پر چڑھنے کے لئے سیڑھیاں بنی ہوئی ہیں۔ اوپر میز کرسیاں بڑی مضبوطی اور حکمت سے جمائی ہیں جیسے کسی کمرے میں رکھی ہوں۔ نیچے لان پر بڑی بڑی موٹے ریشمی کپڑے کی چھتریوں کے نیچے بیٹھ کر کھانا تناول کرتے ہیں تاکہ گرمی کے موسم میں دھوپ سے حفاظت ہو سکے۔ پیرس سے یہاں تک ریل گاڑی اور بسوں کا انتظام ہے۔ پیرس کے باشندوں کو اس کی تو زیادہ فکر نہیں ہوتی کہ ان کی رہائش گاہ کے کمرے ہوادار ہوں مگر اس کی فکر رہتی ہے کہ اگر ہو سکے تو کھلی ہوا میں بیٹھ کر کھانا کھائیں۔

یا قہوہ نوش کریں۔ شہر سے چند میل کے فاصلے پر ملا ہوا ایک مصنوعی جنگل ہے جس کا نام بوا دو بولون ہے۔ یہاں لوگ چھٹی کے دن درختوں کے نیچے کھانا کھاتے ہیں۔ شہر کے ہر حصے میں باغ اور چمن ہیں جہاں بڑے چھوٹے اپنے گھروں سے کھانے پینے کی چیزیں لاکر تناول کرتے ہیں۔ کارتیے لاطین (لاطینی محلے) میں لکسان بور کا باغ واقع ہے جو اسی نام کے شاہی محل کے ساتھ ملحق تھا۔ اس محل میں اب فرانسیسی مقننہ کے ایوان بالا (سینیٹ) کے اجلاس ہوتے ہیں۔ لکسان بور کا باغ بے فکروں کا مرکز ہے جہاں زیادہ تر طالب علم اور آرٹسٹ دن بھر جمع رہتے ہیں۔ یہاں شاہ بلوط کے پرانے درختوں کے نیچے کرائے پر کرسیاں ملتی ہیں۔ آس پاس کی خواتین اپنے بچوں کو یہاں لاتی ہیں تاکہ وہ خوب بھاگیں، دوڑیں، کھیلیں اور کھلی ہوا میں پھریں۔ اس باغ میں کانس اور پتھر کے بعض مجسمے مشہور استادوں کے بنائے ہوئے ہیں جن کی فنی خوبیوں کے دیکھنے کے لئے دور دور سے آرٹسٹ آتے ہیں۔ نیچے پھولوں کی کیاریاں ہیں جن میں رنگ برنگ کے خوش نما پھول سوائے سردیوں کے ہمیشہ دکھائی دیتے ہیں۔ اوپر پیڑوں پر چڑیوں کی چہچہاہٹ سامعہ نوازی کرتی ہے۔ یہاں کی پُر سکون فضا میں گھنٹوں گذار دیجئے کچھ پتہ نہیں چلے گا، نہ جی گھبرائیگا۔

فرانسیسی تہذیب بنجامن فرنیک لن نے، جو فرانس میں کافی عرصے تک رہا، اور فرانسیسی تہذیب کا دلدادہ تھا، ایک موقع پر کہا تھا کہ "ہر شخص کے "دو" وطن ہیں ایک اس کا اپنا دیس اور دوسرے فرانس"۔ فرانس یورپ کے ملکوں میں سب سے زیادہ حسین ملک ہے۔ اس کے باشندے بجا طور پر اسے لابل فرانس (حسین و جمیل فرانس) کہتے ہیں۔ میں نے یہاں اپنے دورانِ قیام میں دیکھا کہ فرانسیسی لوگ یورپ کے دوسرے ملکوں کے باشندوں کی طرح اپنی چھٹیاں گذارنے کے لئے اپنے ملک کے باہر کہیں نہیں جاتے اور نہ کبھی ایسی

یہ خواہش گدگداتی ہے کہ اپنا دیس چھوڑ کر کسی دوسرے ملک میں جا کر آباد ہوں۔ سترھویں اور اٹھارہویں صدی میں اہلِ فرانس کناڈا تو ضرور گئے لیکن اس کے بعد سوائے الجیریا کے بڑی تعداد میں کہیں اور نہیں گئے۔ یہ ان کی آخری آبادکاری تھی۔ ایک وجہ تو یہ تھی کہ صنعتی انقلاب کے بعد یورپ کے دوسرے ملکوں کی آبادی میں بے تحاشہ اضافہ ہوا مگر فرانس کی آبادی میں بڑھوتی تو کجا الٹی کمی ہوتی گئی۔ لوئی چودھویں کے زمانے تک فرانس کی آبادی انگلستان سے دگنی تھی۔ انقلاب اور نپولین کی جنگوں نے فرانس کی آبادی میں اضافہ کو روک دیا جس کا اثر اب تک موجود ہے۔ دوسری بڑی وجہ اہلِ فرانس کے باہر نہ جانے کی یہ ہے کہ ان کے یہاں خدا کی دی ہوئی ہر چیز افراط سے موجود ہے۔ جتنا اچھا اور ذائقہ دار کھانا ایک اوسط درجہ کے فرانسیسی کو ملتا ہے دنیا میں کسی دوسری قوم کے متوسط طبقے کے افراد کو میسر نہیں آتا۔

فرانس خیرالامور اوسطہا کی تعبیر پیش کرتا ہے۔ ملک نہ بہت بڑا ہے، نہ بالکل چھوٹا، نہ بہت دولت مند، نہ غریب۔ قدرت بھی یہاں اعتدال کا رنگ لئے ہوئے ہے۔ پہاڑ ہیں لیکن بہت زیادہ اونچے نہیں۔ دریا ہیں لیکن بہت لمبے چوڑے نہیں۔ میدانوں کا پھیلاؤ بھی حد کے اندر ہے۔ قدرت نے کوئی چیز بے ڈھنگی اور بے توازن نہیں بنائی اور نہ اپنی صنعت میں کہیں مبالغے کو راہ دی۔ گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے میں آدمی ملک کے ایک حصے سے دوسرے حصے میں آسانی سے پہنچ سکتا ہے۔ صبح ناشتے سے پہلے کوہستان الپس کی برف سے ڈھکی ہوئی چوٹی پر پہیے دار جوتوں سے ریٹنے کا کھیل کھیلا، دوپہر کا کھانا شہر نیس کے کسی ریستوران میں کھایا، سہ پہر میں بحر روم میں تیرے اور خوب غوطے لگائے، رات کا کھانا پیرس میں کھایا اور کھانے

کے بعد کسی تھیٹر میں اپنی محبوب اداکارہ کے غمزہ و ناز کی داد دی۔ غرضکہ ہر لحاظ سے فطرت پوری طرح انسان کے قابو میں ہے۔ طبقہ واری لحاظ سے دیکھا جائے تو یہ درمیانی طبقے کا ملک ہے۔ یہاں اگر فراوانی ہے تو فطرت کی فیاضیوں کی۔ زرخیزی کا یہ عالم ہے کہ ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک چلے جایئے کہیں اوسر یا افتادہ زمین نظر نہیں آئے گی۔ کل رقبے کے ۵/۱ حصے میں جنگل ہیں۔ باقی میں کاشت ہوتی ہے۔ اٹلی میں جتنی زمین زیر کاشت ہے اس سے دگنی اور انگلستان میں جتنی ہے اس سے چوگنی فرانس میں ہے۔ اٹلی اور انگلستان دونوں کی آبادی فرانس سے زیادہ ہے۔ زمین کے نیچے جو فطرت کے خزانے چھپے ہوتے ہیں ان میں فرانس مالا مال ہے۔ فرانس میں زمین کے نیچے لوہے کی جس مقدار کا اندازہ لگایا گیا ہے وہ اس سے زیادہ ہے جو سارے یورپ میں ملا کر ہے۔ روس کو چھوڑ کر۔ فرانس کو باہر سے بہت تھوڑی چیزیں درآمد کرنی پڑتی ہیں جن میں روئی اور پٹرول شامل ہیں، جن کی وجہ سے پیداوار کا لگ بھگ پندرہ فی صدی برآمد کرنا پڑتا ہے۔ اب حال میں پری نیس کے کوہستان اور شمالی افریقہ کے صحرائے اعظم میں فرانسیسی انجینیروں نے پٹرول نکالا ہے۔ فرانس کی معیشت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ انگلستان، جرمنی اور سوئڈن کو اپنی مجموعی پیداوار کا ۳۰ فیصدی اور ہالینڈ کو ۵۰ فیصدی برآمد کرنا ہوتا ہے تاکہ درآمد کے ذریعے ضروریات کی تکمیل ہو سکے اور فرانس کو صرف ۱۵ فیصدی۔

صنعتی انقلاب نے یورپ کی کایا پلٹ دی۔ طریق پیداوار اور تقسیم دولت کے نئے طریقے رائج ہوئے جن کی وجہ سے انگلستان اور جرمنی میں لوگوں نے زراعت کو چھوڑ کر صنعتی مرکزوں کا رخ کیا۔ اس طرح تقریباً سارے یورپ میں صنعتی آبادی وجود

میں آئی مگر فرانس میں اس کا الٹا اثر ہوا۔ فرانس کے متوسط طبقے نے ۱۷۸۹ء کے انقلاب کے بعد امیروں کے طبقے کو بے دخل کر کے سیاسی اور معاشی قوت اپنے ہاتھ میں لے لی اس طبقے نے جو حیثیت اٹھارہویں صدی کے اواخر میں حاصل کر لی تھی اس کے تحفظ کے لئے قدامت پرستی کا سہارا لیا۔ ان کا مفاد اس میں تھا کہ دولت کی پیداوار کے وسائل چھوٹی چھوٹی اکائیوں میں تقسیم رہیں جیسے کہ صنعتی انقلاب سے قبل انگلستان اور جرمنی میں تھے۔ انقلاب نے کسانوں کو جو مراعات دیں وہ ان سے ہر طرح مطمئن تھے اور اپنے حالات میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں چاہتے تھے۔ کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ تبدیلی سے وہ نقصان میں رہیں گے اور اسی لئے وہ ہر انقلابی تحریک کے مخالف تھے۔ وہ بس اتنا چاہتے تھے کہ اپنی زمینوں پر قابض رہیں اور حکومت کا کاروبار متوسط طبقہ چلاتا رہے۔ انقلاب کے بعد فرانس میں جو متوسط طبقہ وجود میں آیا وہ انتہا درجے انفرادیت پسند تھا جس کے نزدیک جائداد متبرک چیز تھی۔ اس کے عمل کا صرف ایک محرک تھا، ذاتی مفاد۔ اگر حکومت امداد دیتی ہے تو اچھی ہے اور اگر ٹیکس بڑھاتی ہے تو بری ہے۔ یہ مشہور ہے کہ متوسط طبقے کا ہر شخص اپنے وطن کے لئے جان کی بازی لگا دیگا لیکن اگر کوئی کہے کہ وطن کی حفاظت کی خاطر محصول زیادہ دو تو وہ خوشی سے کبھی تیار نہ ہوگا۔ یہ فارسی شعر بالکل اس کے حسب حال ہے۔

گر جاں طلبی مضائقہ نیست   زر می طلبی سخن درین است

فرانسیسی شہری جو ٹیکس حکومت کو ادا کرتا ہے اس کا تقریباً ۳۰ فیصدی براہ راست محصول کی شکل میں ہے اور باقی بالواسطہ محصول ہے جس کا بار غریب طبقے پر پڑتا ہے۔ فرانس میں آمدنی پر جو ٹیکس لگایا جاتا ہے اس میں مقررہ شرح کے علاوہ یہ بھی دیکھا جاتا

ہے کہ متعلقہ شخص کی عام زندگی کا معیار کیسا ہے۔ آیا وہ موٹر رکھتا ہے یا نہیں۔ اگر رکھتا ہے تو خود چلاتا ہے یا ڈرائیور رکھتا ہے۔ باہر سے دیکھنے میں اس کے مکان کی سج دھج کیسی ہے۔ چنانچہ یہ مشہور ہے کہ بعض کروڑپتی ٹیکس سے بچنے کے لئے اپنے مکانوں کو بے مرمت رہنے دیتے ہیں تاکہ وہ فرسودہ نظر آئیں اور نظر میں نہ جچیں۔ حکومت کے محصولوں کی وجہ سے سرمایہ دار لوگ اپنی آمدنی بڑھانا بے سود خیال کرتے ہیں۔ پھر چونکہ آبادی میں اضافہ نہیں ہو رہا ہے اس لئے معاشی لحاظ سے اشیا کی مانگ میں بھی کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔ جو پہلے تھی وہی رہتی ہے۔ حکومت اپنے اخراجات پورے کرنے کے لئے مصنوعی طور پر زر کی مقدار بڑھاتی ہے جس کی وجہ سے کثرت زر (انفلیشن) کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے ۱۹۲۶ء میں جب میں وہاں پہنچا تو ملک اسی قسم کے دور سے گذر رہا تھا۔ بعد میں پوان کارے کی حکومت نے معاشی استحکام پیدا کیا ورنہ وہی حالت ہو جاتی جو چند سال قبل جرمنی کی تھی۔ کچھ خریدنا چاہو تو لاکھوں کے نوٹوں کا گٹھا اپنے ساتھ رکھو لیکن فرانس میں یہ صورت پیدا نہیں ہوئی، تاہم وہ لوگ جن کے پاس پونڈ تھے بہت کم داموں میں عمدہ سے عمدہ چیزیں خرید سکتے تھے۔ میں نے اس زمانے میں کافی کتابیں خریدیں اور سوٹ بنوائے اور سیر و تفریح کی جو بعد میں فرانک کی قیمت بڑھنے کی وجہ سے ممکن نہ تھی۔ اپنے قیام کے آخری دو سالوں میں تو مجھے اپنے اخراجات پر کڑی نظر رکھنی پڑی۔

فرانس میں تاریخ زندہ حقیقت معلوم ہوتی ہے۔ فرانسیسیوں کو دوسری قوموں کے مقابلے میں اس بات کا شدید احساس ہے کہ ان کا ماضی ان کے حال کا جزو رہیگا۔ زندگی کبھی نہ رکنے والا دریا ہے جو رواں دواں ہے۔ پیرس میں ایسا محسوس ہوتا

ہے جیسے یہاں کہیں بھی جاؤ تاریخ سے مفر نہیں۔ شہر کے ہر حصے میں تاریخی شخصیتیں ہر وقت نظروں کے سامنے رہتی ہیں۔ کہیں ان کے مجسمے ہیں، کہیں سڑکوں کے نام ان کے نام پر ہیں۔ اس معاملے میں فرانسیسیوں نے وسعت نظر اور عالمگیریت کا ثبوت دیا ہے۔ مثال کے طور پر پیرس کے ایک گوشے کی سیر کیجئے اور تر ے کو درے کی بلندی کی طرف قدم بڑھائیے۔ جنرل فوش اور بنجامن فرانکلن آمنے سامنے مکالمے میں مصروف نظر آتے ہیں۔ دونوں مجسمے چابکدست استادوں نے بنائے ہیں۔ اگر سائنس کا ڈور اہوتا تو جیتے جاگتے انسان ہو جاتے۔ مجھے یہاں ایسا محسوس ہوا جیسے جنرل فوش بنجامن فرانک لن سے کچھ کہنا چاہتا ہے، کوئی ایسی بات جو کبھی ختم نہ ہو گی۔ دونوں ایک دوسرے کو ایسی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں جو کبھی نہیں جھپکتیں۔ بنجامن فرانک لن ایک کرسی پر بیٹھا ہے اس سڑک کے کونے پر جو اس کے نام پر ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس جگہ وہ مشہور ماہر کیمیا (کیمسٹری) موسیو لوازئیے کے ساتھ سائنٹفک مسائل پر گفتگو کیا کرتا تھا۔ اس کی گفتگو کا موضوع زیادہ تر کیمیا، بجلی کے کرشموں اور کرامتوں سے تعلق رکھتا تھا۔ فوش کے مغربی جانب ذرا بڑھئے تو پریسیڈنٹ ولسن اوے نیسو آجاتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ صلح نامہ ورسائی کے موقع پر کلے مانسو اور لائڈ جارج نے پریسیڈنٹ ولسن کو جو سیدھا سادہ امریکی پروفیسر تھا جی بھر کے بے وقوف بنایا اور اس کی اصول پرستی کی آڑ میں اپنے قومی مفاد کو مضبوط کیا۔ یہاں سے ذرا اور ذرا دیر چلو تو جارج واشنگٹن کا مجسمہ ہے، گھوڑے پر سوار، جیسے اپنے ساتھیوں کو عمل کے لئے للکار رہا ہو۔ شان زلیزے کے قریب جہاں اور اوسے نیو ہیں وہاں جارج پنجم کی اوے نیو ہے (اوے نیو دے تودرج سین) بلجیم کے البرٹ اول اور روس کے سکندر دوم کے نام پر دریائے سین

کے دوول ہیں۔ مٹرو (زیر زمین بجلی کی ریل) کے ایک اسٹیشن کا نام فرنکلن روزولٹ ہے۔
بعض ایسے لوگ جنھیں خود ان کے ملکوں نے بالکل فراموش کر دیا ہے۔ پیرس میں فراموش نہیں کئے گئے ہیں، ان کے نام یہاں کسی نہ کسی حیثیت سے باقی ہیں گویا پیرس کیا ہے عالم کا عجائب گھر ہے۔ اس طرح فرانسیسی قوم اپنے ماضی کو ہر وقت اپنی نظروں کے سامنے رکھتی ہے۔ کہتے ہیں کہ ماضی کا ہر کا بڑھاپے کی نشانی ہے اور فرانس ایک بوڑھی قوم ہے۔ اس میں بڑھاپے کی خوبیاں بھی ہیں اور خرابیاں بھی۔ اس میں دانائی اور اعتدال کے ساتھ نک چڑھاپن اور بدخوئی پیدا ہو گئی ہے، جو نوع انسانی کی نیکی کی منکر ہے، جو ہر قسم کی عقیدت کی جڑوں کو کھوکھلا کر ڈالتی ہے اور ترقی کی راہ میں سنگ گراں بن جاتی ہے۔ فرانسیسیوں کا دعویٰ ہے کہ یورپ کی موجودہ قوموں میں ان کی قوم سب سے زیادہ قدیم ہے۔ اس کی عمر دو ہزار سال ہے جب کہ سیزر نے گال کو فتح کیا تھا۔ رومن اور یونانی تہذیبوں میں یہ عام دستور تھا کہ اگر کوئی جرم کرتا تھا تو پورا خاندان یا قبیلہ اس کا ذمہ دار سمجھا جاتا تھا لیکن گال میں صرف وہی شخص ذمہ دار ٹھہرتا تھا جس نے جرم کا ارتکاب کیا ہو اور اسی کو سزا دی جاتی تھی۔ انفرادی آزادی گال کی خاص خصوصیت تھی جس کی بے احتیاطی کا اجتماعی نظم پر لازمی طور پر اثر پڑا۔ رومن اقتدار سے اس کی تھوڑی بہت اصلاح ہوئی۔ آج بھی فرانسیسی سوسائٹی آزادی کے بے جا استعمال سے اپنے لئے پیچیدگیاں اور دشواریاں پیدا کر رہی ہے۔ گال اپنے قبیلے کے قائد کو بس گوارا کر لیتے تھے۔ یہی ذہنیت آج بھی فرانس میں کام کر رہی ہے۔ کسی وزیر اعظم کو زیادہ عرصے تک گوارا نہیں کیا جاتا۔ اس مزاجیت کا ردعمل موجودہ زمانے میں دی گال کی آمرانہ حکومت ہے جو جمہوریت کی آڑ میں شاہی کر رہا ہے، بالکل اسی طرح سے جیسے نپولین سوم نے کی تھی۔

کسی ملک کے سیاسی دستور کی اصلیت کا اندازہ اس سوسائٹی کی حالت سے لگانا چاہیے جس کے اغراض و مقاصد کو پیش نظر رکھ کر اسے وضع کیا گیا ہے۔ انگریزوں کے یہاں کوئی تحریری دستور نہیں لیکن ملکی اور سماجی روایات جمہوری ہیں۔ چنانچہ وہاں شہریوں کو حقیقی معنوں میں جو حقوق حاصل ہیں دنیا میں کہیں حاصل نہیں۔ یہاں کی حکومت کا اصلی محرک پارٹی بندی کا جمہوری نظام ہے نہ کہ مملکت کی ہیئت۔ پارٹی نظام کی بدولت انفرادی اختلاف کو باقی رکھتے ہوئے سیاسی نظم کو مفلوج ہونے سے بچا لیا جاتا ہے۔ امریکہ میں ریپبلکن اور ڈیمارکیٹک پارٹیوں کا اختلاف ان کا اندرونی معاملہ ہے۔ مملکت کی سیاسی ہیئت پر اس کا اثر نہیں پڑتا۔ فرانس میں انتہائی انفرادیت کی وجہ سے اول تو پارٹیوں کی تعداد بہت زیادہ ہے، دوسرے یہ کہ وہاں سیاسی اختلاف پارٹیوں تک محدود نہیں رہتا بلکہ سیاسی ہیئت کو بھی متاثر کرتا ہے۔ فرانس میں سوائے آمریت کے لوگوں کو ہمخیال بنانا ممکن نہیں۔ یہاں کی پارٹیوں کا انتشار دور کرنے کی بس یہی ایک تدبیر ہے جس پر اس ملک کی تاریخ میں وقتاً فوقتاً عمل ہوتا رہا ہے اور آج بھی ہو رہا ہے۔

فرانسیسی اس قدر انفرادیت پسند کیوں ہیں؟ یہ سوال میں نے اپنے بہت سے فرانسیسی دوستوں سے کیا تھا۔ مجھے اس سوال کے جو جواب ملے ان پر میں نے اپنی ذاتی رائے قائم کی۔ میرے خیال میں ان کی انفرادیت کی اصل وجہ یہ ہے کہ وہ ہر قسم کے اقتدار کو شبہ کی نظر سے دیکھتے ہیں اور اسی پر مطلق بھروسا نہیں کرتے، چاہے وہ مملکت ہو یا سوسائٹی۔ وہ یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ ہر شخص کی نجات خود اس کے ہاتھ میں ہے۔ انھیں اس مقولے پر بھی یقین نہیں کہ "اپنے پڑوسی سے محبت کرو" اس کے برخلاف وہ اس

اصول کو مانتے ہیں کہ اپنے پڑوسی پر کڑی نگرانی رکھو اس لئے کہ تمھیں اس سے نقصان پہنچے گا۔ یہ فیض نہیں ملے گا۔ اس کے علاوہ یہ بھی ہے کہ فرانسیسی لوگ حکومت اور قوم کے درمیان فرق و امتیاز کرتے ہیں۔ ان کی وفاداری جمہوریت اور اپنے جھنڈے کے ساتھ ہے نہ کہ حکومت (گورنمنٹ) کے ساتھ جو ہر چند مہینے کے بعد بدلتی رہتی ہے۔ امریکی لوگ گورنمنٹ کو لازمی شر خیال کرتے ہیں لیکن فرانسیسی اسے اپنا دشمن سمجھتے ہیں۔ انھیں اس کی پروا نہیں کہ ان کی حکومت کی کارکردگی کا معیار اتنا اونچا نہیں جتنا کہ انگلستان میں ہے۔ وہ ہر قیمت پر اپنی انفرادیت کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں۔ فرانسیسی قوم کی ذہنیت وہاں کے کاشت کار کی ذہنیت ہے۔ ان کی تہذیب میں بھی اسی لئے ارضیت پائی جاتی ہے۔ اس میں بہت زیادہ اونچی روحانی باتوں سے احتراز کیا گیا ہے۔ زمین سے محبت، کھانے کا شوق، جنسی آزادی، یہ ہیں اوسط درجے کے فرانسیسی کے مقاصد حیات۔ باغبانی کا شوق، ماہی گیری کا شوق، مرغیاں پالنے کا شوق، پھولوں کا شوق، یہ سب باتیں کاشتکاری ہی سے کسی نہ کسی حیثیت سے تعلق رکھتی ہیں۔ فرانسیسیوں کو صنعتی ترقی کی فکر نہیں اور نہ بڑے پیمانے کی پیداوار کو وہ زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ ان کی صنعتیں بھی تنظیم کے لحاظ سے درمیانی درجے کی ہیں۔ وہ اپنے معاشی نظام سے مطمئن ہیں اور اس میں کسی بنیادی تبدیلی کے خواہاں نہیں۔

ہر قوم کے ہیرو کا ایک ٹائپ ہوتا ہے۔ انگلستان میں دولت مند لبرل، امریکہ میں انتظامی ماہر (ایگزیکیٹو)، فرانس میں روشن خیال آرٹسٹ کو ہیرو سمجھا جاتا ہے۔ یہ روشن خیال آرٹسٹ فلسفے کا پروفیسر، اکیڈیمی کا رکن، ناول نگار یا ماہر سیاست ہو سکتا ہے۔ امریکہ میں کوئی ماہر سیاست اگر علمی دلچسپی رکھتا ہے تو وہ اس بات کو چھپاتا ہے کہ

کہیں اس سے اس کی ناموزونیت نہ ثابت ہو جائے۔ وہ چاہتا ہے کہ باوجود اپنی علمیت کے معمولی آدمی نظر آئے جو معمولی زبان بولتا ہے جسے سب آسانی سے اپنے دماغ پر کسی قسم کا بار ڈالے بغیر سمجھ سکیں۔ اس کے برخلاف اگر فرانسیسی ماہر سیاست میں علمیت ہے تو وہ اسے ظاہر کرتا ہے تاکہ اسے دوسروں پر امتیاز اور فوقیت حاصل ہو۔ میرے زمانے میں موسیو ایریو وزیر اعظم تھے۔ ان کی وزارت کئی مرتبہ ٹوٹی اور کئی مرتبہ بحال ہوئی۔ وہ تاریخ کے پروفیسر تھے۔ آج بھی ویگال کے وزیروں میں فرانسوا موریاک شامل ہیں جو اعلیٰ پائے کے ناول نگار ہیں۔ اس سے ان کی فضیلت کو چار چاند لگ گئے ہیں۔ ناول نگار ہونے سے ان کی سیاسی یا انتظامی ناموزونیت نہیں ثابت ہوتی بلکہ اس سے ان کی روشن خیالی اور انسانی فطرت سے واقفیت کا ثبوت ملتا ہے۔

نشاۃ ثانیہ کے بعد سے یورپ کے ہر ملک کے نوجوان تحصیل علم کے لئے پیرس برابر آتے رہے ہیں۔ سب سے بڑھ کر تو سوربون کی کشش تھی۔ شروع سے اب تک باہر کے ملکوں کے پانچ لاکھ سے زیادہ طلبا یہاں سے فارغ التحصیل ہوئے جس کا مقابلہ دنیا کی اور کوئی یونیورسٹی نہیں کر سکتی۔ پھر اس کے علاوہ پیرس میں ہر قسم کی اعلیٰ التعلیم کے انسٹی ٹیوٹ موجود ہیں جن سے استفادہ کے لئے آرٹسٹ، ادیب، فن تعمیر کے ماہر، مختلف حرفوں کو سیکھنے والے برابر آتے رہے۔ باہر سے بہت سارے مصور یہاں آئے اور یہیں کے ہو رہے۔ فان گاف، مودی لیانی، پکاسو اور دوسروں نے فرانس کو اپنا وطن بنا لیا۔ ادیبوں میں امریکہ کے مشہور ادیب ہینی مور کو پر نے اپنی مشہور تصنیف "دے پیرے ریز" پیرس کے قہوہ خانوں میں بیٹھ کر لکھی تھی، جیمس جائس، گر ٹرڈ اسٹائن، ہیمنگ وے۔ دوس پالوس، جان اسٹائن بک نے پیرس کا گہرا اثر قبول کیا۔ لیونارڈو

دا ونچی سے لے کر پکاسو تک مصوروں اور نقاشوں کا ایک طویل سلسلہ ہے جو یورپ کے مختلف ملکوں سے آکر فرانس سے فیض یاب ہوئے۔ یورپی ملکوں کے علاوہ جاپان کے طلبا، ادیب اور آرٹسٹ بڑی تعداد میں پیرس آتے رہے ہیں۔ ناگی کی فرانس کی کہانیاں جاپانی زبان کے ادب عالیہ میں شمار ہوتی ہیں۔ یاکومت سو نے اپنی ساری تصانیف پیرس کے قیام کے دوران میں لکھیں اور سبرت زادہ نے اپنی کتاب "میں پیرس میں مرنا چاہتا ہوں" پیرس ہی میں بیٹھ کر لکھی تھی۔ جس زمانے میں پیرس میں تھا اسلامی ملکوں کے سیکڑوں طالب علم پیرس آتے تھے۔ اسی طرح چینی طالب علم تھے جن کی وجہ سے متعدد چینی ریستوران کارتیے لاطین میں کھل گئے تھے۔ اور بہت مقبول تھے۔ میں بھی بعض دوستوں کے ساتھ کبھی کبھی رات کا کھانا وہاں کھاتا تھا۔ مرغ کے گوشت کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے چاولوں کے ساتھ پکاتے ہیں جو چینیوں کا بڑا ہی لذیذ کھانا ہے۔ چینی لوگ اپنے سب کھانے لکڑی کی پتلی پتلی چھڑیوں سے کھاتے ہیں۔ وہ ان پتلی پتلی چھڑیوں کو بڑی صفائی اور چابکدستی سے استعمال کرتے ہیں۔ میں نے ایک دفعہ انھیں برتنے کی کوشش کی تو چاول تو کیا ان کی گرفت میں آتا گوشت کی بوٹی تک نہ اٹھ سکی، ذرا اٹھی اور بس وہیں رکابی میں گر گئی۔ چینی ان پتلی چھڑیوں سے اس قدر تیزی سے بلا تکلف کھاتے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے۔ ہر استادی اور ہنرمندی کی طرح اس کے لیے بھی مشق اور مہارت درکار ہے۔

فرانسیسی ادب کا مطالعہ میں نے پیرس میں اپنے شروع کے ایک سال کے قیام میں فرانسیسی زبان اچھی خاصی سیکھ لی تھی اور مجھے فرانسیسی ادب سے براہ راست واقفیت حاصل کرنے کا شوق تھا۔ سب سے پہلے میں نے وکتر ہیوگو، دودے اور اناتول فرانس کی

کتابیں پڑھیں۔ اس کے بعد پی ایر لوتی اور دیوما دفرزند) کی۔ دیوما کا ڈراما "کمیلیا کے پھول والی خاتون" مجھے بہت پسند آیا۔ اگرچہ اس کا موضوع رومانی ہے لیکن تفصیلات میں بڑے ضبط اور حقیقت پسندی سے کام لیا ہے۔ اس ڈرامے میں متوسط طبقے کی ریاکاری اور بدتوفیقی کا پول کھولا ہے۔ اناتول فرانس کی سادگی اور پرکاری اور اس کی زبان و بیان کی بے تکلفی مجھے بہت اچھی لگی لیکن فکر کی نفاست اور لطافت کے ساتھ اس کی یہ کوتاہی بھی محسوس ہوئی کہ وہ انسانی ہمدردی اور دل سوزی سے نابلد تھا۔ اس زمانے میں سب سے زیادہ چرچا اندرے ژید۔ پال ویلری اور پروست کا تھا۔ فرانسیسی نوجوان جن سے میری ملاقات تھی ویلری اور پروست کے بڑے مداح تھے اور مجھ سے کہتے تھے کہ انھیں پڑھو۔ یہ تینوں بڑے ہی مشکل پسند لکھنے والے ہیں۔ خاص کر ویلری۔ میں نے پروست کے شہ کار "کھوئے ہوئے زمانے کی جستجو" کو پڑھنا شروع کیا تو مجھے اس کی عبارت بہت مشکل اور الجھی ہوئی محسوس ہوئی۔ چنانچہ چند صفحے پڑھنے کے بعد میں نے اسے چھوڑ دیا۔ اسی طرح ویلری کی نظمیں بھی کچھ سمجھ میں نہیں آئیں۔ ایک سال کے بعد میں نے پھر انھیں پڑھا تو اب عبارت سمجھ میں آنے لگی ویلری کی رمز نگاری ذہن میں ایک مبہم سا احساس چھوڑ جاتی ہے۔ خود اہلِ زبان کا جب یہ حال ہے تو ظاہر ہے میں اپنی حد تک اس سے زیادہ کیا توقع کر سکتا تھا جب پروست کے مطالب واضح ہوئے تو میں ان سے لطف اندوز ہونے لگا۔ بایں ہمہ پروست کا مطالعہ بغیر فرانسیسی لغت کی مدد کے میرے لئے ممکن نہ تھا۔ پروست نے "کھوئے ہوئے زمانے کی جستجو" میں اپنے حافظے کو کھنگال کر گذشتہ واقعات کو ایک لڑی میں بڑی خوبی سے پرو دیا ہے۔ اس کا خیال تھا کہ ماضی کی یادیں موجودہ حقیقت

سے بھی زیادہ حقیقی ہیں، ان یادوں کا تعلق اس کی ذاتی سوانح سے بھی ہے اور ان کے ذریعے سے اس نے پیرس کے اعلیٰ طبقے کی زندگی کی تصویر کھینچی ہے جو ۱۸۹۰ء اور ۱۹۲۰ء کے درمیانی تیس سال میں سیاست اور معیشت پر حاوی تھا۔ پروست نے اپنے کردار مارسل کی زبان کہلوایا ہے کہ ہماری اصلی زندگی ہماری نظروں سے اوجھل رہتی ہے۔ ادب کا کام یہ ہے کہ ان تجربوں اور تاثروں کی توجیہ پیش کرے جو خارجی حقیقت سے پیدا ہوتے ہیں اور پھر ہماری اندرونی حقیقت کا جُز بن جاتے ہیں۔ مثلاً جب پروست کسی دیوان خانے کی منظر کشی کرتا ہے تو وہاں کے سازوسامان کی تفصیل نہیں بیان کرتا بلکہ وہ مصور کی طرح موقلم کی ہلکی سی کشش سے اپنا کام نکال لیتا ہے۔ کمرے کے اندر سورج کی کرن اپنے رقص سے جو خاص تاثر پیدا کرتی ہے وہ اس کا ذکر کرتا ہے۔ یا گلدان کے پھولوں کی ہلکی ہلکی مہک جو ہوا کی موجوں سے ہم آغوش ہو کر مشام جان کو معطر کرتی ہے، اس کی نسبت وہ اشارہ کر دیتا ہے۔ کسی کمرے میں کتابوں کی بھینی بھینی سی بساند اسے اپنی جانب متوجہ کرتی ہے۔ یہ سب چیزیں سازوسامان کے مقابلے میں یادوں کو برانگیختہ کرتی ہیں۔ وہ ان کی اس اندرونی خاصیت سے واقف ہے اور اس سے پورا فائدہ اٹھاتا ہے۔ پروست کے یہاں جدید زمانے کے انسان کے احساس کی ترجمانی کی گئی ہے۔ جدید ذہن کلاسکی اور رومانی ذہن سے علیحدہ ہے۔ اس کے کرداروں کی رہنمائی عقل و منطق سے نہیں بلکہ وجدان سے ہوتی ہے جو حسی تجربے کی اصلیت کو جھٹلاتا نہیں بلکہ وہ جیسی ہے اسی طرح سے اسے پیش کرتا ہے۔

میں نے پروست کے بعد آندرے ژید کے ناول پڑھے۔ ژید نے اپنے "روزنامچے" میں اپنی پچاس سال کی زندگی پر نظر ڈالی ہے جو تخلیقی ادب اور تنقید کا مجموعہ ہے۔

اس میں اس نے جو اخلاقی سوال اٹھائے ہیں ان کی نوعیت عالمگیر ہے۔ اس کے ناولوں میں بھی روزنامچوں کا انداز ملتا ہے جو ادبی خیالات کے اظہار کا نہایت موزوں پیرایۂ بیان ہے۔ ژید بھی پروست کی طرح دائمی تغیر کی حقیقت کو مانتا تھا اس لئے اس کے نزدیک ہر لمحہ قابل قدر ہے۔ اس نے آزادی کے لفظ کو وسیع معنوں میں استعمال کیا ہے۔ یہ نہ صرف سیاسی اور معاشری بندھنوں سے گلوخلاصی ہے، بلکہ اخلاق کے ضابطوں سے بھی۔ اس کا مسرت کا تصور یہ نہیں کہ عیش اور آزادی حاصل ہو بلکہ یہ کہ ہمیشہ جد وجہد اور گرمجوشی کی کیفیت برقرار رہے۔ اس کی تصانیف میں "جھوٹے سکے ساز" اور "بدکار" خاص طور پر اہم ہیں جن میں اس نے آرٹ اور اخلاق کی نسبت اپنے خیالات ظاہر کئے ہیں۔

رومین رولاں کی "ژان کرستوف"، بھی میں نے اسی زمانے میں پڑھی۔ اس کا نقطۂ نظر اخلاقی ہے۔ اسے انسانی مقدر کے المیہ کا احساس تھا اور اسے انسانی عقل وشعور پر بھی بھروسا تھا جو ادب خوردہ وجدان ہو۔ وہی انسانیت کو تباہی کے گڑھے میں گرنے سے بچا سکتا ہے۔ ژان کرستوف کا المیہ انفرادی نہیں بلکہ یورپ کی پوری ایک پیڑھی کی کہانی ہے جو صداقت اور آزادی کی جستجو میں سرگرداں رہی "ژان کرستوف" کے ان حصوں میں خاص طور پر بڑی تازگی اور تاثیر ہے جہاں جذبات کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ اگرچہ نسوانی کرداروں میں بعض جگہ کمزوری اور پھیکا پن محسوس ہوتا ہے۔ اس ناول میں رومین رولاں نے اپنے زمانے کی پوری تہذیب کا جائزہ لیا ہے اور وہ اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ انسان کو اپنی کتاب زندگی کو پھر سے نئے معنی دیتے ہیں اور اسے اپنے عالمی تصور، اپنی جمالیات اور اخلاقیات اور اپنے مذہب

اور اپنی انسان دوستی کی تجدید کرتی ہے۔ رومین رولین کی زبان و بیان میں ژید کے ناولوں کی سی چستی اور برجستگی نہیں تاہم اس کی معنویت اور اخلاقی بلندی جاذب نظر ہے "ژان کرستوف" کے ذریعے سے رومین رولان نے جرمنی اور فرانس کو ایک دوسرے قریب لانے کی کوشش کی اور انسان دوستی کے مقاصد کو قصے کے پیرایے میں پیش کیا۔

رومانیت پسندوں میں مجھے وکٹر ہیوگو اور میوسے خاص طور پر پسند آئے۔ وکٹر ہیوگو کا ناول "مصیبت زدہ" (لے مزے رابل) میں پہلے انگریزی میں پڑھ چکا تھا۔ اصل فرانسیسی میں اس کی تاثیر دوبالا ہوگئی۔ اس میں ہیوگو کی اور دوسری تصانیف کی طرح خود کلامی کی مثالیں کثرت سے ملتی ہیں جو اس کی داخلی زندگی کی غمازی کرتی ہیں۔ غالباً اس کی وجہ یہ تھی کہ ہیوگو کو اپنی زندگی کا سب سے زیادہ تخلیقی زمانہ ایک جزیرے کی تنہائی میں جلا وطنی میں گذارنا پڑا۔ سال دو سال نہیں، پورے اٹھارہ سال۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسے تنہائی میں خود اپنے آپ سے سرگوشیاں کرنے کی عادت ہوگئی تھی "مصیبت زدہ" میں ژان وال ژان جو اپنے دل سے باتیں کرتا ہے وہ دراصل خود ہیوگو کی خود کلامی ہے۔ میں نے ہیوگو کی "مصیبت زدہ" کے علاوہ اس کی نظموں کا ایک مجموعہ بھی پڑھا تھا۔ اسے لفظوں، اور تشبیہوں اور استعاروں کے استعمال پر غیر معمولی قدرت حاصل ہے۔ فرانسیسی زبان کا وہ سب سے بڑا شاعر ہے۔

اور دوسرے ناول نگار جن کی کتابیں میں نے پڑھیں یہ ہیں بالزاک، استندھال، لامرتین، فلوبیر اور ژول رومین۔ مولیو، راسین، پورت ریش، بے نورمان، کلودیل، ژیرادو، اور ژان کوکتو کے ڈرامے پڑھے اور دیکھے۔ اس زمانے کے مزاحیہ ڈرامانگاروں میں ساشا گتری اور بوردے کے نام قابل ذکر ہیں، جنھوں نے اپنے مزاحیہ مکالموں

سے پیرس والوں کو عرصے تک خوب ہنسایا اور دنیاوی افکار بھلانے کا موقع دیا عوامی تھیٹروں میں مورس شیوالیے مردوں میں اور عورتوں میں جوزفین بیکر۔ اور مستین گت کو اس زمانے میں قبول عام حاصل تھا۔ جوزفین بیکر نے پیرس میں حبشی ناچوں کو نیا نیا شروع کیا تھا جن پر لوگ ریجھے پڑتے تھے۔

فنی تحریکیں | سوربون کے طالب علموں میں علم و فن کے متعلق آپس میں اکثر مباحثے ہوتے تھے جن میں میں بھی شریک رہتا تھا۔ اس زمانے میں امپریشن ازم اور کیوبزم کی فنی تحریکوں کا ذکر اکثر سننے میں آتا تھا جن سے میں قطعاً ناواقف تھا۔ بعض دوستوں کے بتانے پر میں نے ان تحریکوں کے متعلق چند کتابیں یونیورسٹی لائبریری سے لے کر پڑھیں اور پھر ان کے ساتھ عجائب خانوں میں جاکر اس مسلک کے ماننے والے فن کاروں کی بنائے ہوئے مجسمے اور تصویریں دیکھیں تو مجھے ان تحریکوں کے متعلق کچھ واقفیت ہوئی۔ دراصل برگسون کے خیالات کا فلسفیانہ حلقوں کے باہر بھی اثر ہوا اور ان سے ان سب ادیبوں اور فن کاروں نے پورا فائدہ اٹھایا جو سطحی عقلیت سے بیزار تھے۔ بیسویں صدی کے شروع میں ادیبوں اور فن کاروں نے محسوس کیا کہ ان کے پیشرو جس ڈگر پر چلے آرہے ہیں وہ اعتماد کے لائق نہیں رہی۔ برگسون کے خیالات نے ذہنی تصورات کی اس عمارت کو جو صدیوں سے مستحکم خیال کی جاتی تھی ڈھا دیا۔ فضا میں نئی نئی آوازیں گونجنے لگیں۔ اس زمانے میں مصوری میں تاثر پسندی (امپریشن ازم) کے دبستان کو مقبولیت حاصل ہوئی۔ اس تحریک کے بانی موورے اور پسارو ہیں۔ انھوں نے روشنی اور سائے کے تاثر سے رنگوں کا ایک خاص توازن تخلیق کیا۔ اپنے موضوع کی تفصیل کے لئے وہ اس کا مجموعی اثر نمایاں کرتے تھے۔ اس لئے کہ ان کا خیال تھا کہ انسان کی آنکھ کسی منظر کے تمام حصوں کو

ایک وقت میں نہیں دیکھ سکتی، اس لیے سب حصوں کی تفصیل ظاہر کرنا بے سود ہے۔ سیزان نے اس نظریئے میں اور اضافہ کیا۔ اس کے نزدیک عالم جو نظر آتا ہے وہ متعدد رنگین نقطوں پر منقسم ہے۔ تناظر اور تناسب (پرس پکٹو) غیر ضروری ہیں۔ فن کار کو چاہئے کہ فطرت کی نقل کے بجائے اس پر اپنا تاثر و احساس طاری کر دے اور من مانے طور پر اسکی توجیہ کرے۔ فن کار کا تصور فطرت کی رعنائی کو اس طرح سے سمجھے کہ خود حقیقت بن جائے۔ یہ داخلیت کا مسلک تھا جس نے خارجی حقیقت کے احترام کا کوئی لحاظ نہیں رکھا۔ رموز فطرت سے زیادہ اس کا اندرونی تاثر و احساس قابل قدر قرار پائے۔ فطرت کی ٹھوس اور پائیدار اشیا تصویر میں ایسی نظر آنے لگیں جیسے نشے کی حالت میں ڈگمگا رہی ہوں۔

کیوبزم کا بانی پکاسو ہے جو دراصل اسپین کا رہنے والا ہے لیکن اس نے پیرس کو اپنا وطن بنالیا۔ اس تحریک کے بانیوں نے بھی خارجی اور عقلی حقیقت کو فریب نظر اور ناقابل اعتبار بتایا اور اشکال کی تہ میں جو حقیقت ہے اس تک پہنچنے کی کوشش کی۔ سینے گال اور سوڈان سے حبشی فن کاری کے جو مختلف نمونے فرانس آتے تھے۔ وہ اکثر ہندسی شکلوں کے مکعب نما ہوتے تھے، خاص کر وہاں سے جو مجسمے اور مورتیاں آتی تھیں، وہ ان گھڑ نیم وحشی اور مکعب شکل کی آتی تھیں اور منبت کاری بھی اسی وضع کی تھی۔ پکاسو اور اس کے ساتھیوں نے اس قدیم ٹیکنک کو اپنایا۔ اس حبشی آرٹ میں ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے حقیقت کے مختلف اجزا کو تحلیل کر کے دوبارہ نئے نظم کے تحت ان کی ترتیب اور تقسیم کی گئی ہو۔ کیوبزم کے مسلک کو ماننے والوں نے کہا کہ تصویر کا مقصد ہیئت کی تخلیق ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ فطری اشیا سے اس کا کوئی ربط و تعلق

بھی ہو۔ پکاسو کی مصوری میں فطرت کو سادہ اقلیدسی شکلوں میں تحلیل کر دیا گیا ہو اور رنگوں میں ہم آہنگی کے بجائے تضاد اور ناموافقت کا التزام ہے تاکہ عقل اور تخیل کو صدمہ پہنچے۔ اس کی علامتوں میں بھی تنوع ہے جن میں عالم کی ابتری اور پراگندگی کا عکس نظر آتا ہے۔

فرانس کے لوگوں میں ایک طرف تو روایت پرستی کا رجحان ہے اور دوسری جانب بغاوت کا جذبہ انھیں اپنی طرف کھینچتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فرانس میں برابر نئے نئے ادبی اور سیاسی تجربے ہوتے رہتے ہیں اور تنقید کی زد سے کوئی نہیں بچتا۔ فرانس میں زیادہ عرصے تک زندگی کا کوئی نظریہ برقرار نہیں رہتا۔ ہر زمانے کے ادیبوں میں مکالمہ جاری رہتا ہے۔ ہر بڑے ادیب کو اپنے ہمعصروں سے مکالمے میں ایسی آوازیں سنائی دیتی ہیں جو اتنی ہی پُرتاثیر ہوتی ہیں جتنی کہ خود اسکی آواز۔ ان مکالموں کے ذریعے سے زندگی کے مختلف نظریوں میں مفاہمت کی صورت پیدا ہو جاتی ہے۔ نشاۃ ثانیہ کے وقت یہ مکالمہ رابیلے اور کالون کے درمیان تھا۔ دیکارت اور پاسکال دو متضاد اصولوں کے علمبردار تھے۔ دیکارت نے تشکیک کے علمی طریق تحقیق کو صداقت تک پہنچنے کا ذریعہ قرار دیا۔ پاسکال نے کہا کہ جذبے کے اسباب عقل کی گرفت سے باہر ہیں۔ دیکارت کی عقل پرستی اور پاسکال کی عقیدت شعاری فرانسیسی تہذیب میں دونوں اپنا مقام رکھتی ہیں۔ جدید زمانے میں اناتول فرانس اور بارس، ویلری اور کلودیل، آندرے ژید اور موریاک اسی قسم کی متضاد مثالیں ہمارے سامنے پیش کرتے ہیں۔ اس طرح مختلف نظریوں اور خیالوں میں ہم آہنگی کی صورتیں ہر زمانے میں پیدا ہوتی رہی ہیں جو متوازن ذہن اور ہم آہنگ زندگی کی

ضامن ہیں۔ دراصل اہلِ فرانس مختلف ذہنی رجحانوں اور نظریوں کے تصادم کو قدر کی نظر سے دیکھتے ہیں اور اس سے روشنی اور بصیرت حاصل کرتے ہیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ وہ ایک ہی آواز کو زیادہ عرصے تک سننا پسند نہیں کرتے۔ وہ چاہتے ہیں کہ مختلف اور متضاد نظریئے ان کے سامنے پیش ہوتے رہیں اور ان میں ادل بدل ہوتا رہے تاکہ تہذیبی زندگی کا تنوع برقرار رہے۔ فرانسیسی مزاج میں خوش طبعی اور ظرافت خلقی طور پر موجود ہے۔ اس کی بدولت وہ اپنا زندگی کا توازن اور اپنی تہذیب کی وحدت قائم رکھتے ہیں۔ ان کے مشہور ڈرامانگار مولیئر کا یہ اصول کہ جہاں کہیں اور جب کبھی فطرت اور حقیقت کی خلاف ورزی ہوگی تو انسان اپنے آپ کو مضحکہ خیز بنائے گا' آج بھی اہل فرانس کی رہنمائی کر رہا ہے۔ اس طرح وہ اپنے عمل کے حدود کا پتہ چلا لیتے ہیں اور اعتدال کا دامن ان کے ہاتھ سے نہیں چھوٹتا۔ وہ شراب پیتے ہیں لیکن کبھی کوئی فرانسیسی سڑک پر مدہوش نظر نہیں آئے گا۔ اس حالت میں پیرس کی سڑکوں پر جو لوگ ملتے ہیں ان میں زیادہ تر انگریز، امریکی اور اطالوی ہوتے ہیں۔ حکومت اور سماج کو طنز و مزاح کا نشانہ بنایا جاتا ہے تاکہ حدود کا تعین ہوتا رہے۔ عورت کی وہ عزت کرتے ہیں اور اس کی محبت کا احترام اپنا فرض سمجھتے ہیں لیکن عورت اور اس کی محبت بھی طنز کے نشتروں سے نہیں بچتی۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اگر ایسا نہ کریں تو تہذیبی توازن میں پراگندگی آجائے۔ دراصل جدید تہذیب کی بنیاد تنقید پر قائم ہے جو تخلیق کی محرک ہے۔ فرانسیسی ادب میں اس کا پورا لحاظ رکھا گیا ہے۔

چند دلچسپ اصحاب سے ملاقات | فرانس کے دورانِ قیام میں مجھے بعض دلچسپ اصحاب سے ملنے کا موقع ملا۔ حسن شاہد سہروردی کی تعریف میں ذاکر میاں سے سُن چکا تھا جن سے

ان کی ملاقات جرمنی میں ہوئی تھی۔ جب میں پیرس پہنچا تو شاہد سہروردی کچھ عرصے سے
وہاں سکونت اختیار کر چکے تھے۔ لیگ آف نیشنز کے علمی تعاون کے ادارے (انٹلی ایک
ٹویل کواپریشن آف دی لیگ آف نیشنز) میں انھیں ملازمت مل گئی تھی۔ اس کام کا
انھیں مشاہرہ تو کم ملتا تھا مگر نشستم پشتم گذر ہو جاتی تھی۔ پیرس میں ہندوستانی طالب علموں
کی انجمن کے سالانہ جلسے میں میری ان سے پہلی مرتبہ ملاقات ہوئی۔ میں دو سال اس انجمن
کا سکریٹری رہا۔ مجھ سے پہلے انیل کمار داس سکریٹری تھے جو سوربون میں فزکس میں
ڈاکٹریٹ کر رہے تھے۔ شاہد سہروردی سے پہلی ملاقات کے بعد میں برابر ان سے ملتا
رہتا تھا۔ کبھی کبھی میں ان کے یہاں جاتا جب کہ وہ ریو دے سین میں رہتے تھے۔ بعد
میں انھوں نے بوا دو بولون کے قریب ایک چھوٹا سا مکان کرایے پر لے لیا تھا۔ ان سے
مل کر میں ان کی زباندانی سے بہت مرعوب ہوا۔ وہ فرانسیسی نہایت عمدہ بولتے تھے۔
اس کے علاوہ انگریزی، جرمن، اطالوی، ہسپانوی اور روسی پر بھی قدرت رکھتے
تھے۔ انھوں نے میرا تعارف مادام گرمنووا سے کرایا جو انقلاب سے پہلے کے روس
کی مشہور اداکارہ تھیں اور ماسکو تھیٹر سے ان کا تعلق رہ چکا تھا۔ مجھے ان کی اداکاری
بھی دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ ایک دفعہ ہیملٹ میں انھوں نے اوفیلیا کا پارٹ اس خوبی
سے ادا کیا تھا کہ لوگ عش عش کرنے لگے۔ جب میں ان سے ملا تھا تو مجھے ان کی عمر کچھ نہیں تو
چالیس پینتالیس کے لگ بھگ معلوم ہوئی لیکن اسٹیج پر وہ بیس سال کی دوشیزہ نظر آرہی
تھیں۔ مادام گرمنووا کے صاحبزادے سے بھی شاہد سہروردی نے میرا تعارف کرایا تھا
جن کی عمر چودہ پندرہ سال کی رہی ہوگی۔ یہ بچہ شاہد سہروردی کے ساتھ ہی رہتا تھا۔
شاہد سہروردی نے مجھے ایک ایرانی مصور موسیو محسن مقدم سے بھی ملایا تھا جو میرے

رہائشی مقام کے قریب رہتے تھے۔ بڑے دلچسپ آدمی تھے۔ ان کی ادب اور مصوری کے متعلق نہایت عمدہ معلومات تھیں خود بھی اعلیٰ درجے کے مصور تھے۔ میں کبھی کبھی ان کے ساتھ لکسان بور کے باغ میں ٹہلنے جاتا تھا۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ وہ تہران یونیورسٹی میں فنون لطیفہ کے پروفیسر ہو گئے تھے۔ دھن گوپال مکرجی سے بھی شاہد سہروردی کے توسط سے ملاقات ہوئی تھی۔ وہ مستقل طور پر امریکہ میں رہتے تھے اور وہیں انھوں نے شادی کر لی تھی۔ اس زمانے میں ان کی کتاب "میرے بھائی کا چہرہ" (مائی برادرز فیس) کا بڑا چرچا تھا۔ خود انھوں نے اس کا ایک نسخہ مجھے عنایت فرمایا تھا۔ واقعی اچھی کتاب ہے۔ اس پر انھیں کوئی خاص انعام بھی امریکہ میں ملا تھا۔ ہندوستان آنے کے بعد مجھے یہ معلوم کر کے بڑا افسوس ہوا کہ انھوں نے نہ معلوم کن حالات سے مجبور ہو کر خودکشی کر لی۔

پروفیسر سلوان لیبوی نے سوربون میں جو ہندوستانی تہذیب کا انسٹی ٹیوٹ قائم کیا تھا اس میں وہ ذی وجاہت لوگوں کو مدعو کرتے رہتے تھے۔ میرے فرانس جانے سے قبل انھوں نے آغا خاں کو مدعو کیا تھا۔ میرے زمانے میں مہاراجا بڑودہ سیاجی راؤ سوم کو بلایا اور ان کی خوب خاطر مدارات کی میرا خاص طور پر مہاراجا سے تعارف کرایا اور مجھ سے کہا کہ ان کے پاس بیٹھ کر ان سے گفتگو کرو۔ مہاراجا نے بڑی بے تکلفی سے میرے ساتھ گفتگو شروع کر دی۔ وہ انگریزوں کے سخت مخالف اور نیشلسٹ خیال کے تھے۔ وہ مجھے اپنی گفتگو سے نہایت روشن خیال معلوم ہوئے۔ ذات پات اور اونچ نیچ کے فرق و امتیاز کو ہندوستانی سماج کی لعنت بتاتے تھے اور کہتے تھے کہ بغیر اسے دور کئے ہوئے اگر سیاسی آزادی مل بھی گئی تو دیرپا نہ ہو گی۔ انھوں نے اپنے یہ خیالات اپنی متعدد تقریروں میں بھی ظاہر کئے جو طبع ہو چکی ہیں۔ چلتے وقت مجھ سے کہنے لگے

تم مجھ سے میرے یہاں آکر فلاں دن ضرور ملنا۔ پرائیوٹ سکریٹری سے کہا کہ نوٹ کرلو۔ چنانچہ میں ملنے گیا۔ چائے کے ساتھ خاصا اہتمام تھا۔ اسی روز ان سے ہندوستان کے متعلق تقریباً ایک گھنٹے گفتگو رہی۔ جب میں اٹھا تو کہنے لگے شام کا کھانا ایک روز ہمارے ساتھ کھاؤ۔ پھر سکریٹری کو بلاکر تاریخ اور دن نوٹ کرادیا۔ میں پھر ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اس روز کچھ اور لوگ بھی مدعو تھے۔ ایک فرانسیسی پروفیسر بھی تھے گفتگو کا موضوع ہندوستان کی جنگ آزادی اور انگریزی سامراج تھا۔ فرانسیسی زبان کے متعلق بھی گفتگو رہی۔ مہاراجا فرانسیسی بہت اچھی بولتے تھے اور ہمعصر ادبی رجحانوں سے پوری طرح واقف تھے۔ مجھے انھوں نے ایک مرتبہ پھر چائے پر بلایا اور اس دفعہ انھوں نے فرانس سے واپسی پر مجھے بڑودہ آنے کی دعوت دی۔ سیر و تفریح کے لئے نہیں بلکہ وہاں کی یونیورسٹی میں استاد کی حیثیت سے۔ میں نے ان کا شکریہ ادا کیا اور عرض کیا کہ ہندوستان جانے کے بعد ہی میں یہ طے کرسکوں گا کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ ہندوستان واپس آنے کے چند ماہ کے اندر مجھے عثمانیہ یونیورسٹی میں پہلے عارضی طور پر اور پھر مستقل کام مل گیا جو میری طبیعت اور رجحان کے موافق تھا اس لئے کہیں اور جانے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوا۔ اگر مجھے عثمانیہ یونیورسٹی میں کام نہ ملتا تو میں ضرور بڑودہ چلا جاتا۔ مہاراجا کی علم دوستی اور انسانیت دونوں نے میرے دل کو متاثر کیا۔ میں نے جب ان کے انتقال کی خبر اخباروں میں پڑھی تو مجھے بڑا رنج و ملال ہوا۔ ایسے روشن خیال اور بیدار مغز والیانِ ریاست اگر چند اور ہوتے تو دیسی ریاستیں بدنام نہ ہوتیں۔ انھوں نے اپنی ریاست میں سنسکرت اور گجراتی زبان کی ترقی کے لئے جو مساعی کیں وہ یادگار رہیں گی۔ وہ بڑے دبنگ آدمی تھے، ایسے کہ لارڈ کرزن تک کو خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ انگریزی حکومت ہمیشہ ان سے چوکنی رہتی

تھی۔ وہ سچے قوم پرست تھے اور عالمی تحریکوں سے بھی بے خبر نہ تھے۔

پروفیسروں میں سلوان لیوی، فوشے، ماسین یون، ژول بلوک کے علاوہ میں موسیو ڈے موں بین اور پروفیسر مارسون اورسل سے بھی ملا کرتا تھا۔ فرانسیسی طالب علموں میں میرے تعلقات آندرے وائل سے تھے جو بعد میں مسلم یونیورسٹی میں ریاضی کے پروفیسر ہو کر آئے تھے۔ سوربون میں اسلامی ملکوں کے طالب علم سیکڑوں کی تعداد میں داخلہ لیتے ہیں۔ ان میں سے بعض سے میرے تعلقات تھے۔ شام کے ذکی اور مراکش کے عبدالجلیل میرے دوست تھے۔ عبدالجلیل شاہی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے متعلق یہ مشہور تھا کہ ماسین یون پیرس کے کسی اعلیٰ خاندان میں ان کی شادی کرا کے انھیں عیسائی بنانا چاہتے تھے۔ ایک مرتبہ ایک عرب صحافی جار اللہ نے مجھ سے یہ بات کہی تو میں نے اس کی تردید کی۔ ماسین یون عرب قوم پرستوں کی آنکھوں میں کھٹکتے تھے اس لئے کہ وہ عرب ممالک کے سیاسی امور کے متعلق فرانسیسی حکومت کے خاص مشیر تھے۔ ہندوستانی طالب علموں میں انیل کمار داس ہین، شوکت اللہ شاہ (موجودہ شوکت انصاری جو سوڈان میں ہندوستان کے سفیر ہیں) اور رحمت علی سے ملاقات رہتی تھی۔ انیل کمار داس طبیعات میں تحقیقات کر رہے تھے۔ کلکتہ یونیورسٹی میں وہ ڈاکٹر ساہا کے خاص شاگردوں میں تھے۔ ہندوستان واپسی پر حکومت ہند کے موسمیات کے محکمے میں (میٹریولاجیکل ڈیپارٹمنٹ) اعلیٰ عہدے پر فائز ہوئے۔ اب غالباً پنشن لے لی ہے۔ انھوں نے ایک انگریزی لڑکی سے شادی کر لی تھی جو اسی زمانے میں پیرس میں تعلیم حاصل کر رہی تھی۔

نئی خاندان | میرے ملاقاتیوں میں مادام شو پاک اور میڈموزیل نئی بھی تھیں جو سلوان لیوی کے خاص شاگردوں میں تھیں اور دونوں نے سنسکرت زبان میں اعلیٰ مہارت حاصل کی تھی۔

مادام شوپاک روسی خاتون تھیں جنھوں نے بولشوک انقلاب کے بعد اپنے شوہر کے ساتھ پیرس میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ سنسکرت زبان میں انھوں نے اپنی محنت اور جانفشانی سے جو ملکہ حاصل کیا اس کی وجہ سے انھیں سلوان لیوی بہت چاہتے تھے اور ہندوستانی تہذیب کے انسٹی ٹیوٹ میں انھیں مستقل کام دے رکھا تھا۔ میڈموزیل نتی سنسکرت میں ڈاکٹریٹ کی تیاری کر رہی تھیں۔ ان کے والد فرانسسکو نتی اٹلی میں مسولینی کے برسرِ اقتدار آنے سے کچھ قبل وزیر اعظم تھے۔ انھوں نے ۱۹۲۰ء میں استعفا دے دیا تھا۔ مسولینی کے برسرِ اقتدار آنے سے کچھ قبل وہ اپنے خاندان کے ساتھ پیرس آ گئے۔ میں ان سے میڈموزیل نتی کے ساتھ ان کے مکان پر کئی مرتبہ ملا۔ فرانسیسی نہایت فصیح بولتے تھے۔ انگریزی بھی تھوڑی بہت جانتے تھے۔ برطانوی لبرل ازم کے بڑے مداحوں میں تھے۔ انھوں نے متعدد کتابیں اطالوی زبان میں لکھی تھیں جن کے فرانسیسی میں اور بعد میں انگریزی میں بھی ترجمے ہوئے۔ میڈموزیل نتی نے اپنے والد کی تصانیف میں سے مجھے "زوال یورپ"، "بالشوزم، فاشزم اور جمہوریت" اور "دنیا کی بد امنی" دی تھیں جو فرانسیسی زبان میں تھیں۔ میڈموزیل نتی نے مجھے اپنی چھوٹی بہن اور بڑے بھائی سے بھی ملایا تھا۔ ان کی چھوٹی بہن فنون لطیفہ کی تعلیم حاصل کر رہی تھی۔ ایک اطالوی نوجوان صحافی سے اس کی منگنی ہو گئی تھی۔ میرے فرانس سے واپس آنے سے چند ماہ قبل اس کی شادی ہوئی جس میں شریک تھا۔ نتی بہنوں کے متعلق یونیورسٹی کے طالب علموں میں اکثر چرچا رہتا تھا۔ لڑکے کہتے تھے کہ ان میں بڑی تو فرشتہ ہے اور چھوٹی حور ہے۔ بڑی بہن واقعی فرشتہ سیرت لڑکی تھی۔ سوائے سنسکرت زبان کی صرف و نحو کے دنیا میں اسے کسی اور چیز سے دلچسپی نہ تھی۔ شکل و صورت بھی

بس واجبی واجبی سی تھی۔ بدصورت تو نہیں کہہ سکتے لیکن نسوانی کشش چھو کر نہیں گئی تھی۔ نہایت ملنسار اور خوش اخلاق تھی۔ سب لڑکے اس کی عزت کرتے تھے۔ چھوٹی بہن نہایت حسین اور چنچل تھی۔ لڑکوں نے اس کا نام مونا لیزا رکھا تھا۔ مونا لیزا، لیونارڈو ڈاونچی کی محبوبہ تھی جس کی تصویر اس نے بڑے چاؤ سے بنائی تھی جو پیرس میں لوور کے عجائب خانے میں ہے۔ جب کبھی اس تصویر کے پاس سے گذریئے تو وہاں دس پندرہ آدمیوں کا ہجوم ضرور نظر آتا تھا۔ چند منٹ وہاں ٹھہریئے تو یورپ کی متعدد زبانیں بولنے والے اپنی اپنی زبان میں تصویر پر فنی تبصرہ کرتے سنائی دیں گے۔ چھوٹی نتّی کا حسن مونا لیزا کے حسن سے کم نہ تھا، بلکہ کچھ بڑھ چڑھ کر ہی تھا۔ ایک مرتبہ چند فرانسیسی طالب علموں کے ساتھ جن میں روسے، مارسل اور پی ایر شامل تھے میں مون پرناس کے مشہور قہوہ خانے دودم میں بیٹھا ہوا تھا کہ ایک فرانسیسی آرٹسٹ، جس کا نام مجھے یاد نہیں رہا، ہم لوگوں کے پاس آکر بے تکلفی سے باتیں کرنے لگا اور ہمارے ساتھ قہوہ نوشی میں شریک ہو گیا۔ فرانسیسی طالب علموں میں سے ایک سے اس کی پہلے سے ملاقات تھی۔ فنون لطیفہ کا ذکر چھڑا۔ فرانسیسی طالب علم نے لیونارڈو کی مونا لیزا کے متعلق آرٹسٹ کی رائے دریافت کی۔ کہنے لگا کہ لوگ کہتے ہیں کہ لیونارڈو نے اپنی محبوبہ مونا لیزا کو سامنے بٹھا کر یہ تصویر کھینچی تھی اور بعض کا خیال ہے کہ یہ خیالی کمال فنی کا شاہکار ہے۔ لیکن میں کہتا ہوں کہ یہ تصویر اصل ہے اور مونا لیزا چاہے وہ کیسی ہی حسین کیوں نہ رہی ہو، اس کی نقل تھی۔ نہ صرف مونا لیزا بلکہ سارا عالم نسوانیت اس تصویر کی نقل ہے۔ ہر عورت اس اصل سے مشابہت کی کوشش کرتی ہے۔ اس پر میرے فرانسیسی دوست نے معاً کہا کہ دنیا کی عورتیں اس اصل کی نقل سہی سوائے چھوٹی نتّی کے جس کے حسن کی کشش اگر لیونارڈو زندہ ہوتا تو بغیر

محسوس کئے نہ رہتا۔ اس پر آرٹسٹ بولا کہ استاں دھال جیسے شاعر نے بھی اپنی محبوبہ میتلد میں مونا لیزا کی شبیہہ دیکھی تھی جو پُر اسرار نسوانی معصومیت کا شہ کار ہے۔ اس پر طالب علم کہنے لگا کہ لیونارڈو اور استاں دھال چھوٹی بچی کو دیکھتے تو اپنی محبوبہ کو بھول جاتے۔ اس پر ہم سب ہنس دیئے میں نے اس پر کہا کہ ہمارے یہاں ایک بڑا شاعر ہوا ہے جس کا تخلص غالب تھا۔ اس نے اپنے ایک شعر میں یہ مضمون باندھا ہے کہ میرا محبوب بے مثل ہے۔ حور یا پری سے اسے تشبیہہ دینا بے سود ہے اس لئے کہ وہ ان سے کہیں بالاتر ہے۔ اگر اس کے مقابل میں کسی کو پیش کیا جا سکتا ہے تو وہ خود اس کی ذات ہے۔

سامنا حور و پری نے نہ کیا ہے نہ کریں
عکس تیرا ہی مگر تیرے مقابل آئے

میں نے اپنی ٹوٹی پھوٹی فرانسیسی میں اس شعر کا مطلب بیان کیا تو آرٹسٹ اور طالب علم سب کے سب پھڑک گئے۔ ایک طالب علم نے جو جنوبی فرانس کا رہنے والا تھا کہا کہ قدیم پروانس کی شاعری میں بھی اسی طرح کا مضمون ملتا ہے، تھوڑے بہت فرق کے ساتھ۔ میں نے اسے بتایا کہ اسپین اور جنوبی اٹلی کی طرح جنوبی فرانس بھی عرصے تک عربوں کے تحت رہ چکا ہے۔ اب یہ بات تحقیق ہو چکی ہے کہ ازمنۂ وسطیٰ میں عربوں کے اثر سے عاشقانہ غنائی شاعری اٹلی، اسپین اور جنوبی فرانس میں شروع ہوئی اور وہاں سے سارے یورپ میں یہ انداز پھیل گیا، یہاں تک کہ روسی، جرمن اور انگریزی میں بھی لرک کو رواج ہوا۔ یہ لرک عربوں کی غزل ہی کی ذرا سی بدلی ہوئی شکل ہے۔ اس کی بدولت عشق نے نیا مزاج پایا اور ادب میں گرمی اور سپردگی کا اظہار ممکن ہوا جو اس سے پہلے کہیں نہیں نظر آتا۔ عربوں کا عشق کا نظریہ یہ تھا کہ تخیل عشق کا خالق ہے۔ وہ محبوب

میں ایسے اوصاف دیکھتا ہے جو ضروری نہیں کہ اس میں موجود ہوں۔ اس کمال بینی ہی پر عاشق کی محبت کا انحصار ہے جیسا کہ فارسی شاعر نے کہا ہے:

لطیفہ ایست نہانی کہ عشق از و خیزد

کہ نام آں نہ لب لعل و خط زنگاریست

میں نے اس شعر کا مطلب بھی فرانسیسی میں بیان کیا۔ آرٹسٹ نے مجھے گلے لگایا اور کہنے لگا کہ میں عربی اور فارسی کے شاعروں کے کلام کے فرانسیسی ترجمے پڑھونگا۔ فرانسیسی طالب علم بھی کہنے لگے کہ ہم بھی ترجمے ضرور پڑھیں گے تاکہ مشرقی ادب سے لطف اندوز ہو سکیں۔

چھوٹی نتی کو جب سوربون کے طالب علم حور کہہ کر پکارتے تھے تو وہ سن کر مسکرا دیتی تھی، اس انداز سے کہ ہر لڑکا سمجھتا تھا کہ مسکراہٹ کا رخ اسی کی طرف ہے۔ ان دونوں بہنوں کی والدہ پرانی وضع کی مذہبی خاتون تھیں۔ لڑکیاں ان کے حکم کی تابعدار تھیں۔ بھلا کیا مجال ہے کہ بغیر ان کی اجازت کے کبھی باہر قدم تو رکھیں۔ بڑی بی مجھ پر بہت مہربان تھیں اور مجھے بے حد نیک سمجھتی تھیں۔ میرے سامنے کئی مرتبہ انھوں نے اپنی دونوں لڑکیوں کو مخاطب کر کے کہا کہ موسیو حسین کے ساتھ تم جب چاہو جا سکتی ہو۔ لیکن فرانسیسی لڑکوں کے ساتھ مت جاؤ اس لئے کہ وہ بڑے پاجی ہیں۔ چنانچہ یہ بہنیں کبھی کبھی میرے ساتھ تھیٹر جاتی تھیں۔ زیادہ تر کلاسکز دیکھنے کے لئے۔ کبھی اوڈیون، کبھی پیلے رویال، اور کبھی سارا برنارکا تھیٹر۔

چھوٹی نتی نے مجھے اپنی ایک امریکی دوست مس ہوف مان سے ملایا جو اس کے ساتھ فنون لطیفہ کے کورس میں شریک تھی۔ بعد میں مس ہوف مان سے میری بے تکلفی بڑھ گئی اسے اسلامی تہذیب سے خاص لگاؤ تھا۔ میرے کہنے پر اس نے امیر علی کی بُوسی اسپرٹ آف اسلام"

اور بعض دوسری کتابیں پڑھیں مس ہوف مان اعلیٰ درجے کی مصورہ تھی۔ اس نے میری متعدد تصویریں اتاری تھیں ایک تصویر پنسل سے اتاری تھی جو میرے پاس اب بھی موجود ہے بعض فن کے ماہروں نے مجھ سے اس تصویر کی تعریف کی اور خود مس ہوف مان کو بھی یہ بہت پسند تھی۔ مس ہوف مان کا ادبی ذوق پاکیزہ تھا۔ اس کے کہنے پر میں نے بعض امریکی ناول پڑھے لیکن وہ مجھے فرانسیسی ناولوں کے مقابلے میں پھیکے اور بے مزہ لگے۔ ایمرسن کے مضامین (اسیز) مجھے بہت پسند آئے۔ ان میں اکثر فکر انگیز ہیں۔ انھیں پڑھتے وقت ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے لکھنے والے کی شخصیت اپنے تصورات میں تحلیل ہوگئی ہو۔ مجھے گوئٹے کی تحریروں کو پڑھتے وقت بھی یہ بات محسوس ہوئی تھی۔ ہر ادیب کی تحریریں پڑھنے والے کو یہ محسوس نہیں ہوتا، شاذونادر ہوتا ہے۔

گفتگو کے دوران میں نتی بہنیں اپنے وطن کے مناظر کی بیحد تعریف کرتی تھیں اور کہتی تھیں کہ وہاں سیر کے لئے ضرور جاؤ۔ انکے والد موسیو نتی بھی اٹلی کی بڑی تعریف کرتے تھے۔ کہتے تھے کہ فاشسٹ حکمراں بُرے ہیں لیکن اطالوی قوم کا دل بُرا نہیں۔ ان کا بھی اصرار تھا کہ اٹلی ضرور دیکھو۔ اٹلی کی گذشتہ تاریخ کے متعلق کبھی کبھی عالمانہ انداز میں گفتگو کرتے تھے۔ ان کے ٹھیک ٹھیک الفاظ تو مجھے یاد نہیں ہیں لیکن عام مطالب میرے حافظے میں محفوظ ہیں اور میری یادداشتوں میں بھی ان کی نسبت اشارے موجود ہیں۔ ایک دن بڑے فخریہ انداز میں کہنے لگے کہ ہمارے ملک کا ماضی بڑا شاندار ہے۔ اطالوی قوم کی ہزار زندگیاں ہیں۔ ایک ختم ہو جاتی ہے تو دوسری جنم لیتی ہے۔ رومنوں نے پورے مغربی یورپ اور مغربی ایشیا کو تہذیب و تمدن کا سبق دیا۔ ازمنۂ وسطیٰ میں کیتھولک کلیسا کے ذریعے سے یورپ کی قیادت اٹلی کے پاس رہی۔ طامس اقوناس اور دانتے اس عہد کے روحانی قائد ہیں۔ کولمبس جس نے

امریکہ دریافت کیا اطالوی تھا۔ امریگو وسپیس جس کے نام پر امریکہ کے برِعظم کا نام رکھا گیا اطالوی تھا۔ ان جہازرانوں نے دنیا کی جغرافیائی حدود کی وسعت کے ساتھ انسانی ذہن کی وسعتوں کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ نشأۃ ثانیہ اور ہیومن ازم کی ابتدا بھی اٹلی میں ہوئی۔ فنونِ لطیفہ میں لیونارڈو داونچی، مائیکل انجیلو اور رفائل کے نام رہتی دنیا تک یادگار رہیں گے۔ مجھ سے کہنے لگے کہ پیٹراک کو ضرور پڑھنا جو ہمارا بہت بڑا ادیب ہے۔ دانتے کو بھی ضرور پڑھنا جو ہمارا سب سے بڑا شاعر ہے جو شاعری میں ورجل اور روحانی تربیت میں اقوناس سے فیض یاب ہوا تھا۔ اس کی شاعری ازمنۂ وسطیٰ کی پوری تہذیب کی تصویر کشی ہے۔

اٹلی کا سفر ان سبھوں کے کہنے پر مجھے اٹلی دیکھنے کا شوق پیدا ہوا اور ۱۹۲۷ء میں ایک مہینہ کے لئے میں وہاں گیا۔ پیران دلّو کی متعدد کتابوں کے فرانسیسی ترجمے پڑھنے سے مجھے اطالوی زندگی کا تھوڑا بہت علم ہو گیا تھا۔ سب سے پہلے میں میلان پہنچا۔ یہاں کا دوادمو یورپ کے بڑے کلیساؤں میں شمار ہوتا ہے۔ لیونارڈو کی قبر یہیں ہے۔ مائیکل انجیلو کے بنائے ہوئے مجسمے یہاں کے عجائب خانے میں دیکھے۔ یہاں سے فلارنس گیا۔ یہ شہر مجھے بہت پسند آیا۔ یہ ایک زمانے میں ہیومن ازم کی تحریک کا مرکز تھا اور یہاں سے جو شعاعیں پھوٹی تھیں انھوں نے سارے یورپ کو منور کر دیا تھا۔ شہر کو دریائے آرنو دو حصوں میں تقسیم کرتا ہے۔ ٹس کنی کی پہاڑیاں چاروں طرف نظر آتی ہیں جو شہر کے لئے حسین پس منظر کا کام دیتی ہیں۔ گرمی کے موسم میں یہاں کی روشنی اور پھول جاذبِ نظر ہوتے ہیں۔ یہاں کی آرٹ گیلوریز میں افی زی، پتی اور اکادمی مشہور ہیں اور دیکھنے سے تعلق رکھتی ہیں۔ اکادمی کے نچلے حصے میں مائیکل انجیلو کے مجسمے ہیں

جن میں داؤد (ڈیوڈ) خاص طور پر فنی اعتبار سے مکمل ہے۔ لیونارڈو دا ونچی جو فلارنس ہی کے رہنے والے تھے۔ ان کی تصویروں میں نشاۃ ثانیہ کی اصلی خصوصیت نمایاں ہے، یعنی زندگی سے لطف اندوزی، صحت مندی، حسن اور مسرت کا احساس۔ یہ احساس کہ زندگی ایک قابلِ قدر امانت ہے، ہر انسان کا فرض ہے کہ اس کی مخفی توانائیوں کو ظاہر کرے۔

فلارنس سے میں روم گیا۔ اسے سات پہاڑیوں والا شہر کہتے ہیں۔ دریائے ٹائبر شہر کے بیچ میں بہتا ہے۔ یہاں ایک سو آٹھ ایکڑ زمین میں پوپ کی حکمرانی ہے جو دنیا بھر کے رومن کیتھولک مذہب کے ماننے والوں کا مرکز ہے۔ ویٹی کن میوزیم دنیا کے بہترین عجائب گھروں میں ہے۔ یہاں رفائل کی بنائی ہوئی دیواری تصویریں ہیں جن میں حضرت مسیح کی زندگی کے مناظر پیش کیے گئے ہیں۔ روم اٹلی کا ابدی شہر ہے۔ ہر زمانے میں اسکی شان نرالی رہی ہے۔ یہاں رومنوں کے زمانے کے شاندار کھنڈر دیکھنے کے لائق ہیں، خاص طور پر کولی زیم اور اس کے زمین دوز راستے۔ رومنوں کے زمانے میں روم کی آبادی دس لاکھ تھی اور وہ دنیا کا سب سے بڑا شہر تھا۔ ازمنۂ وسطیٰ میں بھی یہ مثل یورپ کی مختلف زبانوں میں مشہور تھی کہ "ساری شاہراہیں روم کو جاتی ہیں"، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ مغربی تہذیب کا سب سے بڑا مرکز تھا۔ آج بھی اس کی اہمیت جنوبی یورپ میں مسلم ہے۔

روم سے میں نیپلز پہنچا جو اسی نام کی خلیج پر واقع ہے۔ یہاں سے تھوڑے فاصلے پر پومپی آئی کے کھنڈر ہیں۔ جوالا مکھی ویسوویس سے جو گرم پگھلا ہوا مادہ نکلا اس سے شہر پومپی آئی اور آس پاس کے دیہات تباہ و برباد ہو گئے۔ کھدائیوں

میں یہ پورا شہر زمین کی تہہ سے برآمد ہوا جس میں سے اعلیٰ درجے کے مجسمے نکلے ہیں جنھیں دیکھ کر رومنوں کی تمدنی زندگی آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے۔ نیپلز کی یورپ کے شہروں میں سب سے زیادہ گھنی آبادی ہے۔ سڑکوں پر ہر وقت اس قدر ہجوم رہتا ہے کہ یہ شبہہ ہوتا ہے کہ شاید اس شہر میں گھروں میں کوئی نہیں رہتا بلکہ ہر شخص سڑک پر سرگشت کرتا پھرتا ہے۔ آدمیوں کی بھیڑ میں گدھے، خچر، ہاتھ سے چلائی جانے والی گاڑیاں، گھوڑے گاڑیاں، موٹریں، لاریاں سب خراماں خراماں حرکت میں نظر آتی ہیں۔ جنوب میں ہونے کی وجہ سے یہاں کی عورتیں بہت شوخ رنگ کا لباس پہنتی ہیں۔ مردوں کے لباس زیادہ تر ہلکے رنگ کے ہوتے ہیں۔ عورتیں اور مرد دونوں باتیں کرنے میں ہاتھوں اور گردن کی حرکت سے مفہوم کو ظاہر کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ بیچ سڑک پر کھڑے زور زور سے باتیں کرتے ہیں۔ وہ اپنی جگہ سے نہیں ہٹتے، گاڑی والے خود اپنی گاڑی بچا کر لے جاتے ہیں۔ میں نے نیپلز کے شہر میں جتنا شور سنا یورپ کے اور کسی شہر میں نہیں سنا۔ سڑکوں پر پھیری والے اور خوانچے والے بھی بلا تکلف ادھر سے اُدھر پھرتے دکھائی دیتے ہیں۔ یہ بھی زور زور سے آواز لگاتے ہیں تاکہ راہ گیروں کو اپنی طرف متوجہ کریں۔ یورپ میں سوائے اس شہر کے میں نے کبھی کہیں نہیں دیکھی گلیوں میں گندے پانی کی نکاس کا چونکہ اچھا انتظام نہیں اس لئے ایک خاص قسم کی بساند آتی تھی جس سے ہندوستان کی یاد میرے حافظے میں تازہ ہو گئی۔ یہاں کی عورتیں بڑی تیز طرار اور چنچل ہیں۔ ان کے ناز و انداز میں مشرقیت کی جھلک نظر آتی ہے۔ رنگ اجلا، بال کالے، آنکھیں سیاہ اور بڑی بڑی، قد درمیانی، نہ لمبا نہ چھوٹا۔ چلتی ہیں تو ان کا گداز بچھایا ہچکولے کھاتا ہے جیسے جھولا جھول رہا ہو۔

میں چند روز کے لئے وینس بھی گیا۔ یہ عجیب و غریب جگہ ہے۔ متعدد جزیروں پر واقع ہونے کی وجہ سے یہاں نہروں سے سڑکوں کا کام لیا جاتا ہے۔ سب سے بڑی نہر دو میل لمبی ہے جو شہر کو دو حصوں میں بانٹ دیتی ہے۔ چھوٹی چھوٹی نہریں جن کی تعداد ڈیڑھ سو ہے، اس میں آکر ملتی ہیں۔ ان میں بعض صرف چار یا پانچ فٹ چوڑی ہیں، اُن تنگ و تاریک گلیوں سے بھی کم چوڑی جو لکھنؤ اور دہلی کی پرانی بستیوں میں نظر آتی ہیں۔ ان نہروں پر چار سو پل ہیں جو شہر کے مختلف حصوں کو ایک دوسرے سے ملاتے ہیں۔ ان میں جو کشتیاں چلتی ہیں انھیں گنڈولا کہتے ہیں۔ ان کی ساخت ایسی ہوتی ہے کہ چھوٹی سی چھوٹی نہر میں وہ جا سکتی ہیں۔ شہر کا مرکزی مقام سین مارکو کا چوک ہے جہاں اس نام کا کلیسا ہے۔ اس کا طرز تعمیر مشرقی ہے۔ دور سے اس کے گنبدوں کو دیکھ کر مسجد کا دھوکا ہوتا ہے۔ اس جگہ ہزارہا کبوتر غٹرغوں غٹرغوں کرتے پھرتے ہیں۔ اور دوسرے مقامات میں کبوتر بلندی پر بیٹھے ہوئے یا اڑتے ہوئے نظر آتے ہیں لیکن یہاں زیادہ تر چوک پر خوش خرامی اور سٹر گشت کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ ان کے پرے کے پرے جب ساتھ ساتھ چلتے ہیں تو کبک خرامی کا سماں بہت ہی بھلا معلوم ہوتا ہے۔ یہاں مرد اور عورتیں ثواب کے لئے ان کبوتروں کو دانہ ڈالتی ہیں، بالکل اسی طرح جیسے ہمارے یہاں بعض لوگ چیونٹیوں کو شکر ڈالتے ہیں۔

بڑی نہر میں کشتی میں سوار ہو کر چلیں تو وینس کے سب سے بڑے بازار کی سیر ہو جائے۔ نہر کے دونوں طرف بڑی عالیشان دکانیں اور پرانے محلات ہیں جو دیکھنے کے لائق ہیں۔ سین مارکو کے چوک پر قدیم مجسٹریٹوں (دوجے) کا محل واقع ہے اور وہاں جو کلیسا ہے وہ ان حکمرانوں کا مخصوص کلیسا تھا۔ عوام کو اس میں عبادت کرنے کی اجازت بعد میں

ملی۔ ازمنۂ وسطیٰ میں وینس کی جمہوریت ایشائے کوچک اور یورپ کے درمیان تجارت کا مرکز تھی۔ جینوا اور وینس میں تجارتی رقابت کی وجہ سے اکثر لڑائی رہتی تھی۔ جب ترکوں نے قسطنطنیہ پر قبضہ کر لیا تو وینس کی حکومت نے ان سے صلح کر لی اور تجارت کے لئے سالانہ محصول دینا منظور کیا۔ بعد میں وینس کی ترکوں سے بھی جنگ ہوئی جس کے بعد ترکوں نے قبرص (سائپرس) کے جزیرے پر قبضہ کر لیا۔

سوئٹزرلینڈ اٹلی سے سوئٹزرلینڈ ہوتا ہوا میں پیرس واپس آیا۔ سوئٹزرلینڈ عملی لوگوں کا ملک ہے جنھیں اپنی مادی ضروریات پوری کرنے سے اتنا وقت نہیں بچتا کہ فنون لطیفہ اور علمی اور تخیلی باتوں کی طرف توجہ دیں۔ ویسے ژان ژاک روسو اور مادام دسے استایل نے سوئٹزرلینڈ میں جنم لیا تھا لیکن چونکہ ان کی زندگی فرانس میں گذری اس لئے وہ فرانسیسی ادبی روایات سے وابستہ تصور کئے جاتے ہیں۔

شہر جنیوا کی جھیل کا منظر نہایت دلکش ہے۔ اس جھیل کا بیشتر حصہ سوئٹزرلینڈ میں واقع ہے لیکن ایک چوتھائی سے کچھ زیادہ فرانس میں ہے۔ فرانس کے دریائے رھون کا منبع یہی جھیل ہے۔ شہر میں ہر طرف خوبصورت باغ اور پارک ہیں۔ لیگ آف نیشنز کی عمارت جھیل کے کنارے راک فیلر (جونیئر) نے بنوائی تھی۔ سوئٹزرلینڈ کی گھڑیاں بہت مشہور ہیں اور ساری دنیا میں جاتی ہیں۔ گھڑی سازی اس ملک کی گھریلو صنعت ہے۔ یہاں کے انگریزی باغ (ژاردان انگلے) میں رنگ برنگے پھولوں کی بہتات اور ان کی مجموعی اثر آفرینی کو انسان کبھی نہیں بھول سکتا۔

میں شمونی کا برفستان فنی کولہ کے ذریعے گیا۔ یہ ایک ڈبہ ہوتا ہے جو لوہے کی موٹی رسیوں پر بجلی سے ایک چوٹی سے دوسری چوٹی کو جاملتا ہے۔ اس میں بیٹھ کر نیچے دیکھو تو

سوائے جنگل اور گھڈوں کے اور کچھ نظر نہیں آتا۔ شمونی کے برفستان میں سارے یورپ سے لوگ اسکیٹنگ کے لئے آتے ہیں۔ لوہے کی کھڑاؤں پہن کر اس کھیل میں برف پر پھسلتے ہیں اور جو ماہر ہوتے ہیں وہ اپنے کرتب دکھاتے ہیں۔ نوجوان فرانسیسی سیکڑوں کی تعداد میں ہر سال یہاں اسکیٹنگ کرنے آتے ہیں۔

میں نے فرانس کے سب بڑے شہر دیکھے ہیں جن کی تفصیل اگر بیان کروں تو انھیں پر ایک مستقل کتاب ہو جائے۔ لیون، مارسلیز، بوردو اور استراس بورگ سب اپنی اپنی مقامی خصوصیات رکھتے ہیں۔ فرانس میں حکومت کی طرح علم و تہذیب میں بھی انتہائی مرکزیت پائی جاتی ہے۔ ملک میں بہت ساری یونیورسٹیاں ہیں اور ہر یونیورسٹی میں دو ایک چوٹی کے لوگ ہوتے ہیں۔ پھر کچھ عرصے کے بعد سننے میں آتا ہے کہ وہ سوربون آگئے۔ بعض یونیورسٹیاں نہایت قدیم ہیں اور ان کی شاندار روایات ہیں جیسے گرے نوبل یونیورسٹی۔ یہ چھوٹی سی جگہ ہے لیکن یہاں کا منظر نہایت دلفریب اور آب وہوا نہایت عمدہ ہے۔ میرا دل وہاں لگا اور میں وہاں ہفتہ عشرہ ٹھہرا۔ لیکن وہاں بھی یہ سننے میں آیا کہ سائنس اور آرٹس کے قابل ترین پروفیسر کچھ عرصہ ہوا پیرس چلے گئے۔ پیرس جس طرح حسن اور دولت کو اپنی طرف کھینچتا ہے اسی طرح علم و حکمت کو بھی کھینچتا ہے۔ یہ کوئی بری بات نہیں۔ قومی زندگی کا دھارا اس طرح اپنی پوری قوت اور توانائی سے بہتا رہتا ہے۔ اضلاع کی حسین ترین لڑکیوں کی شادی پیرس کے نوجوانوں سے ہوتی ہے اور اضلاع میں جو لوگ دولت کماتے ہیں وہ پیرس میں ضرور اپنی جائداد رکھتے ہیں اور اکثر تو وہیں بود و باش اختیار کر لیتے ہیں۔

ساحلی علاقے | میں نے تعطیلوں میں فرانس کے ساحلی علاقوں کی بھی سیر کی۔ دو ویل

نیس اور بیارٹز میں جا کر رہا۔ ان میں نیس اور بیارٹز مجھے بہت پسند آئے۔ نیس میں سمندر اور پہاڑ دونوں کا لطف ملتا ہے۔ یہاں کی پہاڑیوں کا سلسلہ کوہستانِ ایلپس تک چلا گیا ہے۔ پھر بحر روم کا نیلگوں پانی جس نے یونانیوں، رومنوں اور عربوں کو ہمیشہ اپنی طرف کھینچا، آج بھی وہ ویسا ہی نیلگوں ہے جیسا کہ قدیم مصریوں اور فنیقیوں کے زمانے میں تھا۔ نیس نہایت ہی صاف ستھرا شہر ہے۔ یہاں کی آب و ہوا معتدل ہے۔ سردیوں کے موسم میں شمالی یورپ کے دولتمند لوگ یہاں آ کر رہتے ہیں۔ بیارٹز کی آب و ہوا بھی معتدل ہے۔ پری نیز کے کوہستان کے ایک طرف فرانس ہے اور دوسری طرف اسپین۔ بیارٹز فرانسیسی سرے پر واقع ہے اور سین سبستیان اسپین کی سرحد پر نہایت پر فضا مقام ہے۔ بیارٹز خلیج بسکے کے کنارے پر واقع ہے۔ یہاں کا سمندر بڑی بڑی چٹانوں سے بھرا پڑا ہے جو ایک زمانے میں پری نیز کے کوہستان کا حصہ تھیں۔ جب سمندر میں موجیں اٹھتی ہیں تو یہ چٹانیں پانی میں چھپ جاتی ہیں اور ان پر موجوں کے تھپیڑے اس زور سے پڑتے ہیں کہ جھاگ سے سارا سمندر سفید نظر آنے لگتا ہے۔ اسی وجہ سے فرانسیسی اس علاقہ کو "ساحل سیمیں" (کوت دار جان) کہتے ہیں۔ نپولین سوم اور اس کی ملکہ یوجی نی کو بیارٹز بیحد پسند تھا۔ ان کی توجہ سے یہاں نہایت خوبصورت عمارتیں بنائی گئیں اور امیروں نے بھی یہاں اپنے لئے مکان تعمیر کروائے تاکہ جب بادشاہ یہاں آئے تو وہ بھی یہیں رہیں۔ ایڈورڈ ہفتم شہنشاہِ انگلستان کو بھی بیارٹز بہت پسند تھا۔ شہزادگی کے زمانے میں اس کے عشق و محبت کے معاملات اسی جگہ سے منسوب ہیں۔

میں ایک پارٹی کے ساتھ پری نیز کے کوہستان کی سیر کے لئے گیا تھا اور سین سبستیان میں جو اسپین میں ہے ایک روز قیام رہا۔ ہسپانوی حسن اپنی علیحدہ شان رکھتا ہے۔ یہاں کے مردوں اور عورتوں کے انداز میں جتنی مشرقیت ہے اتنی یورپ کی کسی

دوسری قوم میں نہیں پائی جاتی۔ اس میں کوئی تعجب کی بات اس لئے نہیں کہ صدیوں یہاں عرب خون کی آمیزش رہی۔ یہاں کی خواتین کو دیکھ کر اقبال نے یہ شعر کہا تھا:۔

آج بھی اس دیس میں عام ہے چشمِ غزال
اور نگاہوں کے تیر آج بھی ہیں دل نشیں

لاطینی نسل کے لوگ لاطینی نسل کے دوسرے ملکوں کی خواتین کی طرح ہسپانوی خواتین میں بھی نسوانی کشش بے پناہ ہے۔ میں نے پیرس میں بھی انھیں دیکھا اور سین سبستیان میں بھی وہ اکثر وبیشتر درمیانی قد کی ہوتی ہیں۔ فربھی کی طرف مائل لیکن بالکل بھبس نہیں بلکہ عام طور پر گٹھی ہوئی کاٹھی کی۔ رنگ گورا، بال اور آنکھیں سیاہ، باتوں میں لوچ، چال میں لچک اور ٹھک، جب کسی سے بات کرتی ہیں تو زبان کے ساتھ آنکھیں اور ہاتھ بھی چلتے ہیں۔ لاطینی نسل کی آبادی جس سرعت سے بڑھتی ہے شمالی یورپ کی اقوام کی نہیں بڑھتی۔ فرانس اس سے مستثنیٰ ہے۔ تو یہاں بھی فطرت نے اپنے امکانات کا دروازہ بند نہیں کیا۔ جب خود انسان اپنی بڑھوتی نہیں چاہتا اور اس راہ میں طرح طرح کے اڑنگے لگاتا ہے تو بیچاری فطرت کیا کرے۔ وہ الگ کھڑی تماشا دیکھتی ہے کہ دیکھیں کب تک۔ چنانچہ آبادی کی کمی فرانس کے لئے ایک قومی مسئلہ بن گیا ہے۔ اطالوی، ہسپانوی اور شمالی افریقہ کے عرب مزدور اگر ہاتھ نہ بٹائیں تو فرانس کے کارخانے بند ہو جائیں۔

حال ہی کے زمانے میں اٹلی کے لاکھوں خاندان فرانس کی سرزمین پر آکر آباد ہوئے اور یہیں کے ہو رہے ہیں۔ ان کے بعد اسپین والوں کا نمبر ہے۔ شمالی افریقہ کے عرب نسل کے لاکھوں افراد نے بھی فرانس کو اپنا وطن بنا لیا۔ اس طرح گذشتہ ڈیڑھ صدی میں جب سے کہ فرانس کی آبادی میں اضافہ نہیں ہوا، پڑوسی ملکوں نے اپنی فالتو آبادی

کو ادھر منتقل کردیا جس کی وجہ سے فرانسیسی تمدن اپنی چمک دمک برقرار رکھ سکا۔
ہر چیز کی طرح احتیاج کے بھی آداب ہیں۔ فرانس بڑا مسافر نواز اور متواضع ملک ہے یہاں کسی قسم کا نسلی فرق و امتیاز نہیں برتا جاتا جیساکہ جرمنی، انگلستان اور امریکہ میں برتا جاتا ہے۔ اس کی ایک توجیہ یہ بھی کی جاسکتی ہے کہ اہلِ فرانس چاہتے ہیں کہ خود تو عیش کریں اور پڑوسی ان کی صنعت و حرفت کو چلائیں تاکہ ان کا زندگی کا معیار اپنی جگہ پر قائم رہے۔ اگر آبادی بہت زیادہ بڑھ جائے تو یہ معیار قائم نہ رہ سکے اور اگر بالکل کم ہو جائے تو بھی اس میں کھنڈت پڑ جائے۔ یہ بات فرانسیسی تہذیب کی دل پذیری اور عظمت پر دلالت کرتی ہے کہ باہر سے آنے والے بہت جلد اصلی باشندوں کے ساتھ گھل مل کر جذباتی ہم آہنگی پیدا کر لیتے ہیں۔ مزاج اور روایات کے لحاظ سے بحرِ روم کی لاطینی اقوام کے لئے دوسروں کے مقابلے میں یہ زیادہ آسان ہے۔ میں سمجھتا ہوں جنوبی فرانس کی بیشتر آبادی ان اطالوی لوگوں کی اولاد ہے جو پچھلی چند صدیوں میں وہاں آکر آباد ہوئے اور اپنی زندگی کو اپنے نئے وطن کے ساتھ پوری طرح وابستہ کر دیا۔ شمال و مشرق کی آبادی میں المانوی عنصر نمایاں ہے۔ علمِ انسان کے ماہروں کی رائے ہے کہ فرانس میں نارڈک، الپائن اور میڈیٹرے نین نسلیں تاریخ کے مختلف دوروں میں آکر آباد ہوتی رہیں۔ صدیوں کے تاریخی عمل سے یہ ایک ہو گئی ہیں۔ یہاں کے اصلی باشندے گال تھے۔ رومن چند ہزار کی تعداد میں آئے تھے اس لئے نسلی اعتبار سے ان کے آنے سے کوئی خاص اثر نہیں پڑا۔ ان کے آنے سے قبل فرانس میں میڈی ٹرے نین نسل موجود تھی جو اہلِ فرانس کی نسلی ساخت کا اساسی عنصر ہے۔ لیکن رومن لوگوں نے فرانس کی تہذیب اور زبان پر بڑا گہرا اثر ڈالا جو آج بھی نمایاں ہے۔

پیرس فرانس کی تاریخ میں پیرس کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اور کوئی شہر اس ملک میں پیرس کے پاسنگ کا نہیں۔ پیرس کے بعد سب سے بڑے شہر لیون اور مارسلیز ہیں جن کی آبادی پندرہ بیس لاکھ کے لگ بھگ ہے۔ ان کے برخلاف پیرس کی آبادی پچاس لاکھ سے اوپر ہے۔ یہ علم و فن اور صنعت و حرفت کا مرکز ہے۔ اہلِ فرانس کو بجا طور پر پیرس پر فخر ہے۔ یہاں ان کی ذہنی اور مادی زندگی اپنے کمال کی صورت میں نظر آتی ہے۔ پیرس یونیورسٹی (سوربون) یہیں ہے، نوتر دام کا کلیسا یہیں ہے، ببلیوتک ناسیونال یہیں ہے، لوور کا عجائب خانہ یہیں ہے، اودیون، پیلے رویال، اوپرا اور اوپرا کومک یہیں ہیں، فنون لطیفہ کی نمائش کے سالون یہیں ہیں، علم و فن کے تحقیقاتی انسٹیٹیوٹ اور سوسائٹیاں یہیں ہیں، فرنچ اکیڈمی یہیں ہے، شان زلیزے یہیں ہے، کارتیے لاطین یہیں ہے، پھر یہاں کی شاہراہیں (بلوارین) اور اوے نیوز اور باغ اور چمن بندیاں ایسی دل پذیر ہیں کہ ان کی مثال کہیں اور ڈھونڈے سے نہیں ملے گی۔ شہر سے کچھ فاصلے پر ورسائی کا شاندار محل ہے جسے لوئی چودھویں نے بنوایا تھا اور وہ جب تک زندہ رہا پیرس نہیں، ورسائی اس کا دارالسلطنت رہا، بالکل اسی طرح جیسے اکبر بادشاہ نے فتح پور سیکری بنوایا اور اسے اپنا دارالسلطنت بنایا تھا۔ ورسائی کے محل کا باغ اور فوارے دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ محل فرانسیسی نشاۃ ثانیہ کے کلاسکی طرز کے مطابق تعمیر ہوا۔ کمروں میں دیواری تصاویر کی رنگا رنگی ہے اور باہر بڑے بڑے مجسمے نصب ہیں۔ محل کے ہر کمرے میں منقش آرائشی پردے آویزاں ہیں جو گوبلان میں تیار ہوتے ہیں۔ چینی کے نقش و نگار کے برتن ہر جگہ رکھے نظر آتے ہیں جو ورسائی کے قریب سیور کے کارخانے میں بنتے ہیں۔ لوئی چودھویں کا سارے یورپ میں طوطی بولتا تھا۔

اسے کیا خبر تھی کہ کچھ عرصے بعد اس کے بنوائے ہوئے شاہی محل میں جرمن فوجیں فاتحانہ داخل ہوں گی اور اس کے جانشین شیشوں والے ہال میں دب کر معاہدہ کرنے پر مجبور ہوں گے۔ ورسائی کے محل نے یہ ڈراما ۱۸۷۱ء میں دیکھا۔ اس پیڑھی کے بعض نوجوانوں نے اس ذلت کا انتقام لینے کا عہد کیا تھا۔ ان میں ایک کلے مانسو بھی تھا۔ ان نوجوانوں کا یہ عہد تھا کہ الساس لورین کا علاقہ جرمنی سے واپس لے کے چھوڑیں گے۔ کلے مانسو اپنے اس عہد کی نسبت اور ان مقاصد کی نسبت جو اس کے سامنے تھے ایک جگہ اس طرح ذکر کرتا ہے: "اس کا ذکر کبھی نہ کریں لیکن اس کے متعلق سوچیں ہمیشہ"۔ پہلی جنگِ عظیم کے بعد پھر دوبارہ اسی محل میں صلح نامہ ورسائی پر دستخط ہوئے۔ اس دفعہ شکست خوردہ جرمنی نے دب کر معاہدہ کیا جس کی رو سے السا س لورین کا صوبہ فرانس نے واپس لے لیا۔ کلے مانسو نے فرانس کی طرف سے اس معاہدے پر دستخط ثبت کیے۔ غرضکہ اس شاہی محل نے تاریخ کے بڑے اونچ نیچ دیکھے ہیں اور آج بھی اس کے در و دیوار فرانسیسی قوم کی زندہ دلی اور نفاست کا تماشا دیکھ رہے ہیں۔ یہیں گراں تریانو میں بیٹھ کر لوئی چودھویں کی ملکہ مادام دے مینتنان گل و گلزار کا تماشا دیکھتی تھی۔ یہیں پیتی تریانون میں بیٹھ کر ماری آن توانت فواروں سے نکلتی ہوئی نہین دھاروں کے پیچ و خم کا نظارہ کرتی تھی۔ نپولین اول کو بھی یہ محل عزیز تھا اور کبھی کبھی وہ یہاں آکر ٹھہرتا تھا۔ یہاں سے اس کے جو احکام صادر ہوتے تھے ان کی آواز باز گشت یورپ کے ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک گونجتی تھی۔

میں پیرس کو نہ صرف فرانس بلکہ یورپ کے تمام شہروں کا سرتاج سمجھتا ہوں۔ اہلِ فرانس کی تاریخ کا، چاہے یہ ماضی کی ہو یا حال کی، یہ شہر مرکز رہا ہے یہیں ساری

ادبی اور فنی تحریکیں پیدا ہوئیں اور یہیں انقلاب نے جنم لیا جس نے فرانسیسیوں کی زندگی کی کایا پلٹ دی اور یورپ کے دوسرے ملکوں کو بھی متاثر کیا۔ پیرس میں قدم قدم پر فرانسیسی تاریخ نظروں کے سامنے پھر جاتی ہے۔ اہلِ فرانس کو اپنی تاریخ پر بڑا ناز ہے۔ یورپ کے کسی ملک کے پڑھے لکھے لوگ اپنی تاریخ پر اس قدر سنجیدگی اور متانت سے گفتگو نہیں کرتے جیسے کہ فرانسیسی کرتے ہیں۔ تاریخ کے واقعات کی تعبیر و توجیہہ کی نسبت ایک ہی خاندان کے مختلف افراد میں رائے کا اختلاف ہوتا ہے۔ خاص طور پر بوڑھوں اور نوجوانوں کی رائے میں یہ اختلاف نمایاں صورت اختیار کر لیتا ہے جیسا کہ میں نے بعض نجی دعوتوں میں دیکھا جن میں مختلف پیڑھیوں کے لوگ شریک تھے۔ خوب بحثا بحثی رہتی ہے، مگر اس سے دلوں کی محبت میں کوئی فرق نہیں آتا۔

پیرس کی تعریف و توصیف ہر زمانے کے فرانسیسی شاعروں اور ادیبوں نے کی ہے۔ وکٹر ہیوگو نے پیرس کو اپنی متعدد نظموں کا موضوع بنایا۔ ایک جگہ کہتا ہے: "پیرس تو سارا عالم ہے"، اپنے ناول "بدنصیب" میں بھی اس نے پیرس کی تعریف کی ہے۔ پروست اور آندرے ژید اور دوسرے جدید عہد کے ناول نگاروں کے کردار زیادہ تر پیرس ہی کی زندگی سے ماخوذ ہیں۔ حال کے لکھنے والوں میں ژول رومین نے اپنے ناول "نیک ارادے کے لوگ" میں پیرس کو اپنے ہیرو کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ وہ پیرس کو اتنا بڑھاتا ہے کہ یہاں کے رہنے والے خود اس شہر کے آگے حقیر اور ہیچ نظر آنے لگتے ہیں جیسے کہ وہ حشرات الارض ہوں۔ پیرس کی سڑکوں کا شور و غوغا، قہوے خانوں اور رقص گاہوں کی ہماہمی، علم و فن کے مرکزوں کی برگزیدہ سنجیدگی، ان سب کا ذکر اقتضائے حال کے مطابق ہے۔ بعض

جگہ تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ناول نگار کے تخیل نے پیرس کے رخِ زیبا کو سامنے رکھ کر نثر میں غزل سرائی کی ہے اور اس نازنین ہزار شیوہ کی رعنائیوں اور دلپذیر اداؤں کے گن گائے ہیں جو گذشتہ دو ہزار سال سے اہلِ فرانس کی نظر کا تارہ ہے جس طرح اٹلی کی ساری شاہراہیں روم میں آکر ملتی ہیں اسی طرح اہلِ فرانس کی زندگی کا رخ پیرس کی طرف مُڑتا ہے۔ ان کی مادی اور روحانی زندگی یہیں سے فیض حاصل کرتی ہیں۔

پہلی جنگ عظیم کے بعد سے فرانسیسی ادب میں مایوسی اور غم کا عنصر نمایاں ہو گیا ہے۔ میں نے اپنے ایک فرانسیسی دوست سے، جو ادب پر وسیع نظر رکھتے تھے، اس کی وجہ پوچھی اور کہا کہ اب آپ نے جرمنی کو شکست دیدی اور آپ لوگوں کو السس لورین واپس مل گیا، اب کس بات کا غم ہے۔ تو کہنے لگے کہ یہ غم زندگی کی تھکاوٹ کا ہے۔ یہ بات دل کو لگی۔ جب گفتگو کا سلسلہ چھڑا تو میں نے کہا کہ یہ تھکاوٹ کا احساس اس لئے ہے کہ اب نئی نسل کے سامنے سوائے عیش کوشی کے اور کوئی زندہ اور متحرک مقصد نہیں جس کی خاطر وہ جوکھوں میں پڑے۔ مثال کے طور پر میں نے اس زمانے کے مشہور ادیب آندرے ژید کے "روزنامچے" (ژورنال) کا ذکر کیا جس میں وہ بار بار اس بات کا ذکر کرتا ہے کہ اس کی زندگی میں کوئی چیز ایسی نہیں جسے وہ مستقل یا یقینی کہہ سکے۔ زندگی مہم جوئی نہیں بلکہ غیر مربوط واقعات و حوادث کی داستان ہے۔ وہ حسی تجربوں کو اہمیت دیتا ہے جو انسان کو صرف عارضی مسرت بہم پہنچاتے ہیں۔

تریستان برنار اور کورتیلین نے اپنے مزاحیہ ڈراموں کے ذریعے ان روایات کو زندہ کرنے کی کوشش کی جن کا خالق مولیئر تھا۔ مزاح و تفنن عقلیت پسندی کو اعتدال پر لاتا ہے اور یہ بتاتا ہے کہ سب سے اعلیٰ آرٹ زندگی بسر کرنے کا آرٹ

ہے۔ ساشا گٹری نے بھی اپنے مزاحیہ ڈراموں سے پیرس والوں کو پہلی جنگِ عظیم کے بعد خوب ہنسایا اور دنیاوی افکار کو بھلانے کا موقع دیا۔ مجموعی طور پر انھوں نے مزاح نگاری سے فرانسیسی مزاج کے روایتی اعتدال کو برقرار رکھنے کی کوشش کی۔ لیکن پھر بھی فرانسیسی دل و دماغ کو غم سے چھٹکارا نہیں ملا۔

دراصل فرانس میں پہلی جنگ عظیم کے بعد جو ذہنی پراگندگی اور پریشان خیالی پیدا ہوئی وہ یورپین تہذیب کی اندرونی کشمکش کی غمازی کرتی ہے جس کی پرانی اور آزمائی ہوئی قدریں ایک ایک کر کے تہ و بالا ہوگئیں اور ان کی جگہ نئی قدروں نے جنم نہیں لیا۔ اس انتشاری کیفیت نے بعض ادیبوں اور فن کاروں میں روحانی قدروں کے احساس کو بیدار کیا تاکہ بگڑے ہوئے اخلاقی توازن کو پھر سے قائم کیا جائے جس کے بغیر زندگی کو اطمینان نصیب نہیں ہوتا۔

پیرس کے دورانِ قیام میں ہندوستان کے بعض اصحاب سے ملنے اور انھیں قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ پنڈت موتی لال نہرو، پنڈت جواہر لال نہرو، سری نواس آئنگر، مولانا محمد علی، محمد شعیب قریشی، عبد الرحمٰن صدیقی، پروفیسر ہمایوں کبیر، قاضی عبد الودود، سجاد ظہیر اور ملک راج آنند کے نام مجھے اس وقت یاد آتے ہیں۔

پنڈت موتی لال نہرو | پنڈت موتی لال نہرو ۱۹۲۸ء میں پریوی کونسل کے ایک مقدمے کی پیروی کے لئے لندن تشریف لائے تھے۔ وہاں سے کچھ دنوں کے لئے پیرس بھی آئے۔ پنڈت جواہر لال نہرو اس زمانے میں سوئٹزرلینڈ میں اپنی اہلیہ کے علاج کے سلسلے میں آئے ہوئے تھے۔ وہاں سے چند روز کے لئے پیرس بھی تشریف لائے تاکہ اپنے والد ماجد سے ملیں۔ پنڈت موتی لال نہرو پہلی مرتبہ دس بارہ روز اور دوسری مرتبہ

ایک ہفتہ پیرس میں ٹھہرے۔ میں اس زمانے میں پیرس میں ہندوستانی طلبا کی انجمن کا سکریٹری تھا اور مسٹر رانا صدر تھے۔ ہم دونوں پنڈت جی سے ملنے گئے اور ان سے وعدہ لیا کہ وہ ہماری انجمن کے ارکان کو خطاب کریں۔ میں نے ان کے لئے استقبالیہ ایڈریس لکھا جسے جلسے میں پڑھا۔ پنڈت موتی لال جی ہم سب لوگوں سے مل کر بہت خوش ہوئے۔ اس موقع پر انھوں نے انجمن میں بڑی عمدہ تقریر کی اور اس میں مشروط خود مختاری (ڈومینین اسٹیٹس) کا مطالبہ پیش کیا۔ انھوں نے فرمایا کہ اس سے کم پر ہم راضی نہ ہوں گے۔ اگر ہندوستان کو مشروط خود مختاری حاصل ہو گئی تو ہندوستان سلطنت برطانیہ کے اندر شامل رہے گا اور اس طرح انگلستان اور ہندوستان میں تعاون کی بہت سی راہیں کھل جائیں گی۔ ان کی تقریر کے بعد مسٹر پانیکار نے تقریر کی جو اتفاق سے اس وقت جلسے میں موجود تھے۔ آخر میں مسٹر رانا نے شکریہ ادا کیا۔

پنڈت موتی لال نہرو نے مجھ سے فرمایا کہ تم میرے ہوٹل آجایا کرو۔ چنانچہ دوسرے روز صبح سے میں پہنچ جاتا تھا۔ تقریباً دن بھر انھیں کے یہاں گزارتا تھا۔ افتخار بھی کبھی کبھی آجاتے تھے۔ لیکن چونکہ انھیں اپنی دوکان پر کام رہتا تھا اس لئے ہر روز نہیں آسکتے تھے۔ ایک روز شام کو ہم لوگ مونٹ پرناس کے مشہور ریستوران دوم میں قہوہ پینے اور وہاں کے آرٹسٹوں کو دیکھنے گئے۔ دوم میں ایک بوڑھا کانا ویٹر تھا جس کا لینن پر قرض تھا۔ لینن جب جلاوطنی کے زمانے میں مونٹ پرناس میں رہتا تھا تو قہوہ پینے کے لئے روزانہ دوم آتا تھا۔ بعض دفعہ اس کے پاس اتنے فرانک بھی نہیں ہوتے تھے کہ قہوے کی پیالی کی قیمت ادا کر سکے۔ چنانچہ یہ بوڑھا ویٹر اپنے پاس سے اسکے بل ادا کر دیتا تھا۔ مشہور تھا کہ بعد میں متعدد لوگوں نے اس ویٹر کو کہا کہ بتاؤ تمھارا

کس قدر لینن پر قرضہ ہے تاکہ اسے بیباق کر دیا جائے۔ لیکن اس نے کبھی کسی کو یہ راز نہیں بتایا۔ ہاں اس بہانے سے لوگ اسے جو بھی انعام دیتے وہ قبول کر لیتا تھا۔ پنڈت موتی لال نہرو نے بھی اسے بلا کر پانچ پونڈ دیئے۔ پہلے تو ویٹر نے قبول کرنے میں تامل کیا لیکن جب میں نے بتایا کہ پنڈت جی گاندھی جی کے ان ساتھیوں میں ہیں جو انگریزی سامراج کے خلاف لڑ رہے ہیں تو اس نے پنڈت جی کا انعام لے لیا۔ اور ان کا شکریہ ادا کیا۔ پنڈت جی نے بھی اس کا شکریہ ادا کیا کہ اس نے ان کا انعام قبول کر لیا۔ اس کی شانِ استغنا سے پنڈت جی بہت متاثر ہوئے۔

پنڈت جواہر لال نہرو

پنڈت جواہر لال نہرو سے پیرس میں ۱۹۲۸ء میں باسط انصاری کے ساتھ ملاقات ہوئی جو ڈاکٹر انصاری کے قریبی عزیزوں میں تھے اور بعد میں بمبئی کرانیکل کے اسسٹنٹ ایڈیٹر ہو گئے تھے۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے مجھے اور باسط کو اطالوی ریستوران میں ڈنر پر مدعو کیا۔ اس کے بعد ہم لوگ کارمن دیکھنے آپرا کو تک گئے۔ ڈنر کے وقت پنڈت جواہر لال نہرو سے ہندوستان کے متعلق گفتگو رہی۔ ان کے خیالات پر اس زمانے میں اشتراکیت کا اثر ہو چلا تھا لیکن ابھی تک اس کا تصور واضح نہیں تھا۔ ان کا مطالعہ زیادہ تر انگلستان کی فے بین سوسائٹی کی مطبوعات تک محدود تھا۔ میں اس کے بعد ان سے صرف ایک مرتبہ ملا جب وہ آزاد ہندوستان کے وزیر اعظم تھے۔ اس موقع پر ان سے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی نسبت بات چیت رہی۔

سری نواس آئنگر

سری نواس آئنگر جب یورپ آئے تو بالکل کھوئے سے تھے۔ وہ پہلی مرتبہ ہندوستان سے باہر نکلے تھے، اس لئے مغرب کی دنیا ان کے لئے بالکل نئی تھی۔ چونکہ وہ گوشت نہیں کھاتے تھے اس لئے ان کے واسطے کھانے کا خاص

انتظام کرنا پڑتا۔ انھیں بھی ہم لوگوں نے اپنی انجمن میں تقریر کرنے کے لئے بلایا اور ان کی خدمت میں ایڈریس پیش کیا۔ انھوں نے اپنی جوابی تقریر میں سائمن کمیشن کی مخالفت کی اور مشروط خود مختاری کے مطالبے کو بڑے مدلل انداز میں پیش کیا۔ پیرس سے وہ لندن گئے، وہاں ان کا قیام زیادہ رہا۔

محمد شعیب قریشی اور عبدالرحمٰن صدیقی کو میں ہندوستان سے جانتا تھا۔ ان سے پیرس میں بے تکلفی کی ملاقاتیں رہیں۔ خاص کر عبدالرحمٰن صدیقی سے جو اعلیٰ پائے کے انسان تھے۔ بڑے صاف گو، بڑے ہمدرد، بڑے دوست دار۔ ان سے معلوم ہوا کہ محمد علی جناح بھی اسی زمانے میں پیرس میں ہیں۔ وہ دونوں ان سے جا کر ملے۔ مسلمانوں نے نہرو رپورٹ کے خلاف جو آواز اٹھائی تھی اس سے مسٹر جناح پورا فائدہ اٹھانا چاہتے تھے۔ اس کے بعد انھوں نے ہندوستان آکر اپنے اثر کو مضبوط بنیادوں پر قائم کیا جس کا آخری نتیجہ ملک کی تقسیم کی شکل میں نمودار ہوا۔

انگلستان میں جو ہندوستانی طالب علم تھے ان میں بعض چھٹیاں گذارنے پیرس آجاتے تھے۔ چنانچہ اس طرح ان سے ملنے کا موقع ملتا تھا۔ قاضی عبدالودود بڑی پابندی سے پیرس آتے تھے۔ کیمبرج میں ان کا مضمون معاشیات اور سیاسیات تھا لیکن یورپین ادب سے انھیں خاص لگاؤ تھا، خاص کر فرانسیسی ادب سے۔ ان سے گھنٹوں ادبی اور سیاسی مسائل پر گفتگو رہتی تھی۔ انھوں نے اپنے سوئٹزرلینڈ کے قیام کے دوران میں، جہاں وہ علاج کے لئے گئے تھے، فرانسیسی اچھی خاصی سیکھ لی تھی۔ براہ راست فرانسیسی ناول اور ڈرامے پڑھ سکتے تھے۔ ادب سے دلچسپی ہم دونوں میں قدر مشترک تھی، اس لئے اچھی پٹتی تھی۔ ہندوستان آکر انھوں نے فارسی اور اردو ادب

ہیں جو تحقیق کی اس کا معیار نہایت بلند ہے۔ وہ ہمیشہ سے صداقت پسند، صاف گو اور کھرے انسان رہے ہیں۔ جس سے ملتے ہیں خلوص سے ملتے ہیں۔ جس طرح روزمرہ کی زندگی میں صداقت کے قائل ہیں اسی طرح ریسرچ میں بھی ان کا نصب العین صداقت ہے۔ اس لئے اپنی بے لاگ تنقید میں کسی کی لگی لپٹی نہیں رکھتے۔ ان کی تنقید کا معیار یورپ اور امریکہ کے ادبی نقادوں کے معیار سے کسی طرح کم نہیں ہے۔

انگلستان سے آنے والوں میں ہمایوں کبیر، سجاد ظہیر اور ملک راج آنند سے بھی ملنے کا موقع ملا۔ ہمایوں کبیر اس زمانے میں کم سخن اور کم آمیز تھے۔ البتہ اپنے مخصوص حلقۂ احباب میں بے تکلف باتیں کرتے تھے۔ ان کی گفتگو کے موضوع زیادہ تر علمی اور سیاسی ہوتے تھے۔ میں ان کی سنجیدگی اور متانت سے بہت متاثر ہوا۔ جب میں انگلستان گیا تو وہاں معلوم ہوا کہ انھوں نے آکسفورڈ میں اپنی اعلیٰ قابلیت اور خطابت کا سکہ انگریزوں پر بھی بٹھا دیا ہے۔ وہ پہلے ہندوستانی تھے جو آکسفورڈ یونین کے سکریٹری منتخب ہوئے۔ ہندوستان واپس آنے کے بعد حیدرآباد میں ان سے متعدد مرتبہ ملنے کا موقع ملا۔ ہمیشہ بڑے اخلاص اور محبت سے پیش آتے تھے اور اب بھی ان کی وضع داری میں کوئی فرق نہیں آیا۔

سجاد ظہیر سے بھی کئی مرتبہ پیرس میں ملا اور ان سے اچھی خاصی بے تکلفی رہی۔ ایک مرتبہ وہ سوربون کے قریب ریو دیو سے وارگی ایک رہائش گاہ میں ٹھہرے تھے جو میری سکونت کی جگہ سے قریب تھی۔ شوکت سے معلوم ہوا کہ سجاد ظہیر ایک پارٹی کے ساتھ آئے ہوئے ہیں۔ شوکت ہی کے ساتھ میں ان سے ملنے گیا۔ ان کے ساتھ ایک تو محمود الظفر تھے اور ایک اور کوئی طالب علم تھے جن کا نام مجھے یاد نہیں رہا۔ ایک آسٹریا کی لڑکی

بھی ساتھ تھی۔ نہایت حسین و جمیل، آنکھیں نیلگوں، سنہری بال، صحت مند، جسم گداز، سادگی اور پرکاری کی تصویر۔ میں نے پوچھا یہ تحفہ کہاں سے لائے؟ کہنے لگے خداداد ہے۔ میں نے اس جملے کی بلاغت کی داد دی اور کہا کہ آخر آپ کی زبان پر بھی خدا کا نام آ ہی گیا۔

اس زمانے میں میرے پاس رسالۂ جامعہ دہلی سے آتا تھا۔ اسی مہینے کے پرچے میں ایک مضمون روسو کے "معاہدۂ عمرانی" (سوشل کنٹرکٹ) کے متعلق میری نظر سے گذرا جس میں سوشل کنٹرکٹ کا ترجمہ "عقد اجتماعی" کیا تھا۔ اس میں ظرافت و مزاح کا پہلو نکلتا تھا۔ میں دل میں بہت ہنسا۔ دوبارہ جب سجاد ظہیر سے ملاقات ہوئی تو اس خیال سے کہ وہ بھی اردو ادب کا ذوق رکھتے ہیں، میری زبان سے بے ساختہ نکل گیا کہ "عقد اجتماعی" کا اطلاق چاہے روسو کے سوشل کنٹرکٹ پر ہوتا ہو یا نہ ہوتا ہو آپ کی پارٹی پر ضرور ہوتا ہے۔ خوب ہنسے۔ فرائن کو یہ لطیفہ سمجھانے کی کوشش کی۔ لیکن چونکہ یہ صاحبزادی انگریزی واجبی جانتی تھیں اس لئے میں نہیں کہہ سکتا کہ وہ کچھ سمجھیں یا نہیں۔ ہاں ہنسنے لگیں اور ہم سب بھی ہنس دیئے۔ سجاد ظہیر کا ادبی ذوق نہایت ستھرا ہے۔ وہ فرانسیسی ادب پر گہری نظر رکھتے ہیں اور یورپ کی مختلف ادبی تحریکوں کے متعلق ان کا مطالعہ نہایت وسیع ہے۔ اگرچہ مجھے ان کے سیاسی خیالات سے اتفاق نہیں لیکن میں انھیں مخلص انسان خیال کرتا ہوں۔ بعد میں حیدرآباد میں متعدد مرتبہ ان سے ملاقات رہی۔ چونکہ یہ ملاقاتیں بے لوث تھیں اس لئے دلچسپ رہتی تھیں۔ نہ معلوم کیوں بعض لوگوں نے میرے اور ان کے درمیان غلط فہمی پیدا کرادی۔ اب بہت دنوں سے ان سے ملنے کا اتفاق نہیں ہوا میں انھیں ہمیشہ سے ایک اچھا انسان سمجھتا ہوں۔

ملک راج آنند سے پیرس میں بڑی دلچسپ ملاقات رہی۔ لندن میں کسی دوست نے انھیں میرا پتہ دے دیا تھا۔ چنانچہ وہ پوچھتے پاچھتے میری رہائش گاہ پہنچ گئے۔ مشترک دوستوں کے متعلق عام گفتگو کے بعد کہنے لگے کہ ایک نجی معاملے میں مجھے آپ کی مدد کی ضرورت ہے۔ میں نے کہا میں حاضر ہوں فرمائیے۔ کہنے لگے چل کر فرانسیسی زبان میں میری ترجمانی کر دیجیے۔ پھر انھوں نے اس نجی معاملے کی نوعیت بتائی۔ میں نے ان کے ساتھ جا کر جو بھی مدد ممکن تھی وہ کی۔ پھر مدتوں بعد ان سے بمبئی میں ملاقات ہوئی۔ میں نے پیرس میں ان کی جو تھوڑی بہت خدمت کی تھی اس کے لئے شکر گذار تھے۔ پھر حیدرآباد اور دہلی میں ملاقات ہوتی رہی۔ انڈین کمیشن فار یونیسکو کی ایک ذیلی کمیٹی کے وہ صدر ہیں اور میں نائب صدر ہوں۔ اس سلسلے میں بھی ملنا ہوتا ہے۔ ملک راج آنند کو انگریزی زبان لکھنے اور بولنے پر غیر معمولی قدرت حاصل ہے۔ اردو ادب سے بھی لگاؤ ہے۔ اب آج کل پنجاب یونیورسٹی میں فنون لطیفہ کے پروفیسر اور للت کلا اکیڈمی کے صدر ہیں۔ انھوں نے اپنے انگریزی ناولوں میں ہندوستانی زندگی کی تصویر کشی کی ہے۔ ہندوستان کے فنون لطیفہ پر بھی انھوں نے بہت کچھ لکھا ہے۔ ان کی ہر تحریر بلند پایہ اور جاندار ہوتی ہے۔ پڑھنے کے لائق۔

مولانا محمد علی | میری سب سے زیادہ پر لطف ملاقات مولانا محمد علی سے رہی۔ جامعہ کے طالب علم کی حیثیت سے میں ہمیشہ سے ان کا مداح اور نیاز مند تھا۔ ان کے لکچروں میں بھی شریک ہوا۔ ان کے پیچھے نماز بھی پڑھی۔ مولانا ذیابیطس کے مریض تھے۔ ایک ڈنر کے موقع پر مہاراجا الور نے مولانا محمد علی سے نیاز حاصل کیا اور ان کی مسحور کن شخصیت سے بڑے متاثر ہوئے۔ جب انھیں مولانا کی بیماری کا حال معلوم ہوا تو

کچھ دنوں بعد انھوں نے انھیں مشورہ دیا کہ وہ قدرتی علاج کے لئے ان کے خرچ پر لندن چلے جائیں۔ چنانچہ مولانا یکم جون ۱۹۲۸ء کو بمبئی سے یورپ کے لئے روانہ ہو گئے۔ اس قدرتی علاج میں فاقے، مشقیں اور ریاضتیں کرائی جاتی تھیں پھلوں کے استعمال پر بھی بہت زور دیا جاتا تھا۔ مولانا لندن جاتے ہوئے کچھ دن کے لئے پیرس ٹھہر گئے تاکہ پرانے احباب سے ملاقات بھی ہو جائے اور کسی ماہر ڈاکٹر سے مشورہ بھی کر لیں۔ ان کے پاس شوکت اللہ شاہ کا پتہ تھا۔ مولانا محمد علی پیرس سے دس میل کے فاصلے پر بوبرلارین گئے جہاں شوکت رہتے تھے۔ شوکت چند ماہ کے لئے ہندوستان گئے ہوئے تھے اور اس وقت تک فرانس واپس نہیں آئے تھے۔ چونکہ ان کے نام کے خط آنا شروع ہو گئے تھے اس لئے خیال ہوا کہ دو ایک روز میں واپس آجائیں گے۔ ان کی ڈاک میں مولانا نے اپنا خط بھی دیکھا جو انھوں نے ہندوستان سے روانہ ہونے سے قبل انھیں لکھا تھا۔ بوبرلارین سے مولانا سیدھے میرے پاس پہنچے۔ اب یہ پوری داستان انھیں کے قلم سے سنئے۔ یہ اقتباس میں نے "مولانا محمد علی کے یورپ کے سفر" سے لئے ہیں:۔

"وہاں (بوبرلارین) سے پریشان ہو کر پیرس واپس آیا۔ اتفاق سے میاں باسط نے یوسف حسین سے ایک پونڈ قرض لیا تھا۔ ایک لفافہ میں اس کا ڈرافٹ بند کر کے مجھے دیدیا تھا کہ اسے مارسیلز سے ڈاک میں ڈال دیجئے گا۔ لطف یہ ہے کہ اس کا ذکر ہی نہیں کیا تھا کہ اس میں ڈرافٹ بند ہے اور ممکن تھا کہ میں اسے کھو دیتا۔ احتیاطاً وہ خط بھی اٹاچی کیس سے نکال کر ہاتھ میں لے لیا تھا۔ اس پر یوسف کا پتہ درج تھا۔ عبدالرحمٰن صدیقی نے بھی بلیرڈ پائر پر چند پتے لکھدیئے تھے ان میں بھی درج تھا۔ اور

وہ گلے میں لٹکے ہوئے "خلافت" کے تھیلے میں تھے۔ چنانچہ اب اسی پتہ پر سار بون کے پاس پہنچا۔ مکان ملا۔ گھنٹی بجائی۔ ایک عورت نے دروازہ کھولا۔ یوسف کا نام لیا تو اس نے فرانسیسی میں کچھ کہا اور سر اس طرح ہلایا کہ دل خوش ہو گیا۔ پھر اس نے بتایا کہ پانچویں منزل پر ہیں اور ابھی گھر ہی میں ہیں۔ حالانکہ کوئی گیارہ بج چکے تھے۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ لفٹ (اوپر جانے والا برقی جھولا) نہیں ہے۔ مگر خوش خوش چڑھتا گیا حالانکہ سانس مجھ سے بھی پہلے چڑھ گیا۔ کمرہ کھٹکھٹایا اور بلا اجازت کا انتظار کئے ہوئے کھولا تو میاں یوسف کا خوبصورت چہرہ نظر آیا۔ ابھی سو کر اٹھے تھے۔ لباس خواب پہنے ہوئے تھے۔ مجھ کھدر پوش کو دیکھ کر عذر کیا کہ کھدر کے کپڑے پھٹ گئے ہیں۔ ابھی لباس خواب (نائٹ ڈریس) خریدا ہے۔ میں نے کہا چلو مجھے سب سے ملواؤ اور جس کام کے لئے میں پیرس میں رک گیا ہوں اسے پورا کرواؤ۔ فوراً داڑھی بنائی، جلدی ہی میں گلا تک کاٹ لیا اور پھر منھ ہاتھ دھو کر سوٹ اور بوٹ پہن کر میرے ساتھ نیچے اترے۔ مگر اسی دن اور اسی وقت ٹیلیفون کی ڈائرکٹری میں یوسف حسین کی نظر سے شاہد سہروردی صاحب کے مکان کا نمبر گذرا جس سے معلوم ہوا کہ وہ بھی ٹیلیفون پر ہیں اس لئے گھنٹی بجا کر بات کی۔ جو جواب میں سنا کہ میں ابھی ہندوستان سے آیا ہوں تو قسمیں دلا کے اسی وقت "دیژونے" (ناشتے) پر بلایا اور خود پکانے کا اہتمام کرنا شروع کر دیا۔ وہ بھی پیرس کے باہر بوادی بولونی کی طرف رہتے ہیں۔ ایک روسی کسان کی شکستہ حال بیوہ جس کا شوہر شاید مارا گیا اور جس کی زمین چھین لی گئی ان کا کھانا پکاتی ہے۔ ایک روسی کتا جو صرف روسی سمجھتا ہے ساتھ ہے۔ راستہ میں ہم موسیو گاستان گیار کے گھر ہوتے گئے۔ یوسف کہتا

تھا کہ وہ ہمارے اب تک بڑے مداح ہیں۔ وہ بیچارے شب خوابی کے کپڑے پہنے ہوئے تھے اور شاید ابھی خط نہیں بنایا تھا۔ اس لئے نیچے سڑک پر نہیں آ سکے اور مجھے بھی اوپر آنے کی تکلیف نہ دی۔ مگر چار بجے ہوٹل آنے کا وعدہ کیا اور جب ہوٹل میں ملے تو ہمارے ساتھ چائے پی اور ایک ارمنی ریستوران میں ترکی کھانے کی دعوت بھی دی۔"

"خیر اس وقت تو ہم ان کو دیکھے بغیر شاہد سہروردی کے ہاں گئے۔ خوب مزیدار کھانا خوب پیٹ بھر کر کھایا اور خدا کا شکر ادا کیا کہ جہاز سے اترے اور اس کے ڈھیروں مگر بدمزہ کھانوں سے نجات ملی۔ کھانے کے بعد امریکہ سے آئے ہوئے دھن گوپال مکرجی ملے جنھوں نے متعدد عمدہ کتابیں تصنیف کی ہیں اور جن میں سے "مائی برادرس فیس" کی میں نے ہندوستان میں ایک انگریز سے تعریف سنی تھی اور شاہد سے بھی انگلستان کے شاہی شاعر ڈاکٹر برجز نے بہت تعریف کی تھی۔ بالکل جوان آدمی ہیں۔ مجھے بھی امریکہ آنے اور لکچر دینے کی دعوت دے رہے ہیں۔ شاہد کے ساتھ مزے مزے کی باتیں ہوئیں۔ بیچارہ بہت ہی قلیل تنخواہ پر بہت محنت اور بڑی قابلیت سے جمعیتِ اقوام کے بین الاقوامی ادبی ادارہ وغیرہ کا کام کر رہا ہے۔ واپسی پر گاستان گیار صاحب ہوٹل میں ملے۔ وہیں سے ڈاکٹر وہبی کا پتہ لگا کر ان کو ٹیلیفون دیا اور وہ آ کر ملے اور کھانا بھی ہمارے ہی ساتھ ارمنی ریستوران "حاجیان" میں کھایا۔"

"یوسف بیچارہ، اکی صبح ہی سے ساتھ ہے اور ہر وقت ساتھ رہتا ہے اور میری ترجمانی کا کام کرتا ہے۔ مگر جہاں میری دعوت ہوتی ہے ہمراہ نہیں جاتا اور سمجھتا ہے کہ مغربی طریقہ پر صرف میں ہی مدعو ہوں۔ حالانکہ ہر جگہ میزبان نے پوچھا کہ یوسف کہاں ہیں۔ وہ بھی تو مدعو تھے۔ یہی افغانی سفارت خانہ میں دوسرے دن ہوا

اور یہی رات ہمارے پرانے دوست شریف پاشا کے ہاں ہوا مگر وہی ان کو بھی ساتھ ہی لے گئے تھے اس لئے انھوں نے اپنے تئیں طفیلی نہیں سمجھا۔ خداوند کریم پوری کامیابی عطا فرمائے۔ لڑکا نہایت پیارا اور نہایت صالح اور سعادت مند ہے اور بڑی محنت سے تحقیقات میں مشغول ہے۔"

"سفیر صاحب ایران سے مل کر جب لوٹا تو اترسوں اور پرسوں کی مایوسی کے بعد کہ ٹیلیفون پر ٹیلیفون کیا اور افتخار کی دوکان "ہندوستان" کی منتظمہ پولش لیڈی جیسا تھا کی طرف سے جواب نہ ملا۔ پھر ایک بار قسمت آزمائی کی اور دو والدام سے ملنے خود گیا۔ پرسوں بھی گیا تھا مگر دوکان پر کوئی نہ تھا بند تھی۔ آج بھی ایسا معلوم ہوتا تھا۔ مگر یوسف نے دروازے کا ہینڈل گھمایا تو کھل گیا اور اندر جا کر دیکھا تو تن تنہا دو والدام براج رہے ہیں۔ سنتے ہی غریب دیوانہ وار نکل آیا اور پیرس کے بازار میں ساری خلقت نے یہ تماشا دیکھا کہ ایک ڈھیل ڈھیل بوڑھا عربی عبا اور ہندوستانی کھدر پہنے ایک فرانسیسی (بظاہر) جوان کے گالوں کو، منہ کو، بوسے دے رہا تھا اور وہ جوان اس کی داڑھی کو چوم رہا ہے۔ جب مصافحہ معانقہ اور بوس و کنار کا سلسلہ ختم ہوا تو انھیں لے کر ہوٹل آیا۔ دوپہر کو سفارت خانہ افغانستان جا ہی رہا تھا کہ یہاں کے ایک مشہور ترین ڈاکٹر صاحب کا ٹیلیفون آیا کہ بجائے کل صبح ساڑھے آٹھ بجے کے آج دو بجے آؤ۔ ان سے ڈاکٹر وہبی کے ذریعہ سے وقت مقرر کرایا تھا اور بیشتر اس کے کہ تین ہفتہ کا فاقہ کروں مناسب سمجھا تھا کہ ان کو بھی اپنا حال سنا دوں اور ان سے بھی مشورہ لے لوں۔ ان کا نام پروفیسر مارسل لابے ہے اور یہاں طب کے شعبہ میں جو چار مشہور ڈاکٹر ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہیں اور ذیابیطس کے علاج

کے ماہر ہیں۔"

"شریف پاشا کے ہاں سے پرسوں شام واپس آیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ قاضی عبدالولی خاں معہ دو صاحبزادیوں کے جو نہایت حسینہ اور جمیلہ تھیں اور جن میں سے ایک مسلمان ہے اور دوسری کو وہ نیم مسلمان اور نیم کافر کہتے ہیں مگر شاعروں کی اصطلاح میں دونوں کی دونوں کافر ہیں اور فقہ کی اصطلاح میں "عین جنات" ہیں تشریف لائے ہیں۔ ایک امریکن ہے اور دوسری آسٹرین جرمن۔ دونوں تعلیم بھی پا رہی ہیں اور آرٹ بھی سیکھتی ہیں۔ جرمن نے کل شام کو کوئی گھنٹہ بھر میں کوئلہ یعنی چاک سے میری تصویر بھی کھینچ کر عنایت فرمائی ہے۔"

"صبح ہوتے ہی عبدالولی خاں حسب وعدہ آگئے اور پھر دونوں "بچا پچی"[۱] یوسف اور شوکت بھی آگئے اور ہم اپنی آیندہ قیام گاہ دیکھنے کے لئے گئے۔ پہلی رائے خان تین بلو کی تھی مگر وہ دور ہے۔ دوسری رائے ہوئی کہ سان کلو یا بوادے بولون پیرس کے قریب یا سان ژرمین میں کمرے یا پھوس کے بنگلے کی تلاش کریں۔ اس لئے آخر الذکر کو دیکھنے گئے۔ نہایت عمدہ اور دلفریب جگہ ہے۔ پہاڑی پر جنگل ہے، دریائے سین کا کنارہ ہے مگر اس عمدہ منظر کو دیکھ کر بیوی بچے اور بھائی بہن یاد آگئے اور میری آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔"

"جب چلنے لگا تو یاد آیا کہ مہاراجا ہلکر بھی تو یہیں ہیں۔ چنانچہ ان کا پتہ دریافت کرنے کے لئے یوسف کو پاس کے ہوٹل بھیجا۔ وہ چند ہی قدم چلے ہوں گے اور ہم ٹیکسی والے سے پوچھ ہی رہے تھے کہ ایک راج جو پاس کے گھر کی دیوار درست کر رہا تھا اور جس نے

---

[۱] مولانا نے یہ لفظ بچہ کی جمع کے لئے متعدد جگہ استعمال کیا ہے۔ اس میں شفقت اور تفنن دونوں ملے جلے ہیں۔

غالباً مہاراجہ صاحب کے مکان میں کچھ کام کیا ہوگا بول اٹھا کہ مجھے معلوم ہے۔ اور ٹیکسی والے کو پورا پتہ بتا دیا۔ واقعی نہایت ہی خوبصورت تھا تو (شہر کے باہر والا مکان) خریدا ہے۔ ہمیں معلوم نہ تھا کہ مہاراجہ بھی یہیں ہیں۔ میں سمجھ رہا تھا کہ وہ نئی مہارانی کے وطن امریکہ تشریف لے گئے اور ہم بے دھڑک اندر چلے گئے۔ دربان کا مکان بند تھا، گھنٹی بجائی، کوئی نہ بولا، تب تو ہم اور بھی بے تکلف ہوکر ٹیکسی لے کر اندر چلے گئے اور مکان کو دیکھا۔ اندر کوئی نہیں معلوم ہوتا تھا تاہم دروازہ پر جاکر ہم نے گھنٹی بجائی۔ اب تو اندر سے ایک زبردست کتا دروازہ تک آیا اور تھوڑی دیر بعد ایک ہندوستانی صاحب جو غالباً کپتان برڈودے (ایڈیکانگ) تھے آئے اور دروازہ کھول کر مجھے پہچانا کہ ہو نہ ہو علی برادران میں سے ایک دیو لنے کھدر پوش ہونگے۔ اب کیا تھا ہم نے پوچھا کہ رشید ہیں تو معلوم ہوا کہ کل ہی لندن گئے ہیں اور ہمارے آنے کا سنتے ہی شاید ہم کو اوپر سے آتے دیکھ کر رشید کی لڑکی نے مٹھی بھر الائچیاں بھیجیں اور کہا کہ کیا کروں یہاں پان نہیں ورنہ پان بھیجتی رہم نے شکریہ ادا کیا اور میں نے کہا کہ نہیں کہہ سکتا کہ سلام کہلا بھیجنا زیادہ مناسب اور موزوں ہوگا یا دعا کہلا بھیجنا یا پیار۔ ڈرتے ڈرتے مہاراجہ صاحب کا حال پوچھا تو معلوم ہوا کہ تشریف رکھتے ہیں مگر زکام کے باعث ابھی خوابگاہ سے برآمد نہیں ہوئے۔ تاہم ایڈیکانگ صاحب نے خود ہی فرمایا کہ میں اطلاع کئے دیتا ہوں اور جو ارشاد ہوگا اس سے آپ کو مطلع کر دوں گا۔ بڑی دیر تک انتظار کرنا پڑا۔ یہاں تک کہ میاں شوکت کہنے لگے کہ میری آنتیں تو قل ہو اللہ پڑھنے لگیں اور قاضی صاحب نے کہا کہ مجھے دو بجے سے پہلے نیم مسلمہ نیم کافرہ کے پاس جانا ہے۔ اگر تم زیادہ رکے تو میں روانہ باشم۔ اتنے میں ڈاکٹر کوسپادی صاحب آئے اور فرمایا کہ مہاراجہ صاحب

کو زکام ہے اس لیئے میں نے آج دیر میں خوابگاہ سے نکلنے کا مشورہ دیا ہے۔ لیکن اب وقت آگیا ہے اور مہاراجہ صاحب نیچے تشریف لا رہے ہیں۔ تھوڑی دیر بعد انھوں نے پوچھا کہ چائے پیجئے گا۔ تو بچا چیچ تکلف کرنے لگے۔ میرے بہنوئی، میرے سسر، میرے سمدھی، اور اب میرے سالے بھی، نمک خوار ریاست رہ چکے ہیں۔ اس لئے میں نے کہا کہ میں تو نہیں پیونگا (حالانکہ لڑکے کہنے لگے تھے کہ صرف آپ پی لیجئے) البتہ یہ بچے بہت بھوکے ہیں۔ چنانچہ باوجود ان کے جھوٹے انکار کے ہم سب کھانے کے کمرے میں گئے اور ایک بچہ نے اور قاضی صاحب نے چائے پی۔ ابھی یہ شغل جاری تھا کہ مہاراجہ صاحب نیچے تشریف لے آئے اور مجھے بلایا۔ مہاراج کی صحت بھی خراب ہے۔ دل کی بیماری ہے، آر گے نک نہیں ہے۔ ڈیڑھ مہینے بعد سوئٹزرلینڈ جائیں گے۔ سان ژرمین سے واپس آکر ہم سب نے کھانا کھایا اور اس کے بعد مس میریا ہائیشن نے میری تصویر کھینچی۔ یہاں کے ہندوستانی تاجر موتی مسٹر راناجن غریب کو مفت میں دوران جنگ میں سان مارٹینک میں فرانسیسی حکومت نے نظر بند کر رکھا تھا اور جن سے وٹھل بھائی پٹیل صدر اسمبلی کے ساتھ ایک رات کو ملنے گیا تھا اور جو پرسوں بھی تشریف لائے تھے اور کل بھی تشریف لائے اور دیر تک بیٹھے باتیں کرتے رہے، ان کے ساتھ اور ڈاکٹر وہیں کے ساتھ مارسل لابے ڈاکٹر کے پاس گیا۔"

"کل اس قدر تھک گیا تھا کہ عشار کی نماز بھی رہ گئی۔ بستر میں داخل ہوئے بغیر ہی اخبار پڑھتا پڑھتا بطخ کے بچہ کے پر کی رضائی پر پڑا پڑا سو گیا۔ مگر الحمد للہ ساڑھے چار بجے صبح کے یعنی دراصل ساڑھے تین بجے اٹھ بیٹھا اور نماز فجر اس بار یورپ میں پہلی بار نصیب ہوئی۔ بچا چیچ اور دوالدام ٹامس کک کا نوکر اور قاضی آگئے،

اور سامان بندھوایا اور سب سے آخر میں (حسب دستور سابق) ٹامس کک کے ہاں جاکر بیس پونڈ نکلوائے تاکہ ہوٹل کے بل کے پندرہ پونڈ ادا کئے جائیں اور انعام بانجیر بخشا جائے اور لندن کے لئے کچھ روپیہ رکھ لیا جائے۔"

(مولانا محمد علی کے یورپ کے سفر ص ۱۱۱ تا ۱۲۱)

لندن میں کنور محمد اشرف، شوکت عمر اور حمید نے مولانا کے قیام کے لئے ۱۵۔ کیونڈش روڈ میں انتظام کیا تھا جو کلیپھم کامن کے قریب اچھی کھلی ہوئی جگہ ہے۔ مولانا کے لندن تشریف لے جانے کے کچھ دنوں بعد اگست ۱۹۲۸ء میں میں بھی لندن گیا تاکہ برٹش میوزیم اور انڈیا آفس لائبریری میں کام کروں۔ چونکہ اس زمانے میں تعطیل کی وجہ سے یونیورسٹی بند تھی میں نے انگلستان میں تین مہینے قیام کا پروگرام بنایا۔ لیکن کام کی وجہ سے اتنا کم وقت بچا کہ لندن کے علاوہ سوائے آکسفورڈ اور کیمبرج کے کسی اور جگہ نہ جاسکا۔ میرے ٹھہرنے کا انتظام بھی اشرف اور شوکت عمر نے وہیں کیا تھا جہاں مولانا کو ٹھہرایا تھا اور وہ دونوں بھی وہیں رہتے تھے۔ یہاں میں مولانا سے ہر لحاظ سے بہت قریب رہا۔ ان کی شفقت اور محبت میرے حال پر پہلے سے بھی زیادہ تھی۔ میں نے لندن جانے کے بعد مولانا کی خدمت میں عرض کر دیا تھا کہ میری خدمات ان کے لئے ہر وقت حاضر ہیں۔ وہ مطلق تکلف نہ کریں اور نہ یہ خیال کریں کہ میرے کام میں ہرج ہوگا۔ اب قیام لندن کی داستان بھی آپ انھیں کے قلم سے سنئے۔ حسب معمول ان کی یہ تحریریں بھی اخلاص سے بھری ہوئی ہیں۔ انھوں نے عمر بھر اخلاص کے آگے دنیوی مصلحت کو قربان کیا۔ اگرچہ اس کی وجہ سے انھیں بہت نقصان اٹھانے پڑے لیکن انھوں نے کبھی ان کی پروانہ کی۔ ان کی دوستی بھی ظاہر تھی اور دشمنی بھی

ظاہر۔ ہمارے ملک کی پبلک زندگی میں صداقت، حق گوئی اور خلوص کا نمونہ مولانا محمد علی سے بڑھ کر میری نظر میں کوئی نہیں گذرا۔ جس طرح ان کی گفتگو ہر قسم کی مصلحت بینی سے دور ہوتی تھی اسی طرح ان کے خطوط بھی ان کی بے ریا شخصیت کو منعکس کرتے ہیں۔ اپنے علاج کے متعلق سید محمد جعفری کو ۱۵ رجولائی ۱۹۲۸ء والے خط میں لکھتے ہیں:-

"صرف دو وقت کھانا کھاتا ہوں اور ممکن ہے کہ ایک ہی وقت رہ جائے۔ پھلوں کے ساتھ گوشت کی اجازت نہیں ہے۔ نمک کو وہ غیر ضروری بلکہ مضر سمجھتے ہیں اور چونکہ گوشت بلا نمک اچھا نہ معلوم ہوگا اس لئے میں نے گوشت ترک کر دیا ہے۔ اور صرف پھل اور ترکاریاں (زیادہ ترکچی مثلاً کاہو اور ککڑی) کھاتا ہوں۔ مگر چونکہ شہد اور بالائی کی اجازت ہے اس لئے کچھ برا نہیں پڑ رہتا۔ ورزش، صحیح طور پر سانس لینا اور مالش بھی جاری ہے۔ اچھا اب رخصت ہوتا ہوں۔ کل سے تین دن کا فاقہ ہوگا۔ کل صبح کھانا نکالنے کے چمچے سے ڈیڑھ چمچہ اینوز فروٹ سالٹ ناپ کر پیوں گا اور صرف پانی پر گذر ہوگی۔ شکر اب بھی بہت کم ہو گئی ہے۔ صرف ۸ رفیصدی رہ گئی ہے۔ پیاس بہت کم ہے۔ پیشاب بھی کم آتا ہے۔ ایسٹون اب نہیں ہے مگر البیومن زیادہ آرہا ہے۔ مگر ممکن ہے کہ ماہر تشریح کیمیادی نے لکھنے میں غلطی کی ہو۔ اس وقت ۶ رفیصدی ہے۔ پہلے ۱ رفیصدی تھا۔ اس قدر زیادتی بظاہر لکھنے کی غلطی معلوم ہوتی ہے۔ ۱۶ رجولائی کو پھر فاقہ کے بعد قارورہ بھیجا جائے گا۔ اس وقت معلوم ہوگا کہ کیا حالت ہے۔"

ماجد میاں کو ۱۹ راگست والے خط میں لکھتے ہیں:-

"اس بار ۶ دن کے فاقہ سے جس میں نارنگی اور انگور کا عرق پینے کی اجازت تھی میری طبیعت بہت اچھی ہو گئی اور یہی نہیں کہ شکر نہیں آئی بلکہ باوجود چربی کے تقریباً اسی

مقدار میں پائے جانے کے جو گذشتہ ہفتہ میں تھی میرے پاؤں کے تلووں میں اعصابی سوزش بالکل نہیں ہوئی۔ البتہ گذشتہ ہفتے کے دن چند نوجوان طلبا کے ساتھ رحمٰنیہ پارک میں چڑیا گھر دیکھنے کے لئے جانا ہوا اور چونکہ اس روز صبح کو بہت ہی کم پھل کھائے تھے اس لئے ان طلبا کے ساتھ چائے میں شریک ہو گیا۔ افسوس کہ یہاں شہد نہ مل سکا اور شکر کا استعمال کرنا پڑا۔ اس دن میں نے خوب ہی بد پرہیزی کر ڈالی اور مکھن، روٹی اور جیم کا بھی استعمال کیا اور کیک کے بھی دو ایک ٹکڑے کھائے۔ یہ میری پہلی بد پرہیزی تھی ورنہ نہ کبھی شکر کا استعمال کیا اور نہ کبھی جیم کا اور نہ کبھی کیک کا۔ یہاں تک کہ روٹی بھی تقریباً ڈیڑھ مہینے سے نہیں کھائی۔ گو میرے دوست احباب کو شاید اس کا یقین نہ آئے لیکن حقیقت یہ ہے کہ جب بد پرہیزی کرنا پڑی تو میں نے عمداً پیٹ بھر کر بد پرہیزی کر لی تاکہ دیکھوں اس کا اثر کیا ہوتا ہے۔ چنانچہ چند ہی گھنٹوں کے بعد سزا بھی پائی۔ پورے ایک ہفتہ کے بعد تلووں میں اعصابی سوزش پھر شروع ہوئی اور اس کا کچھ نہ کچھ اثر کل تک رہا۔ البتہ آج ایک وقت کا فاقہ کرنے کے بعد الحمد للہ وہ کیفیت بالکل دور ہو گئی اور اس شیریں تجربہ نے میرے یقین کو اور بھی پختہ کر دیا کہ میرے معالج غذا کے متعلق جو کچھ کہتے ہیں وہ یقیناً صحیح ہے۔ اس ہفتے سوائے اس بد پرہیزی کے میں نے ان کے کہنے پر اس قدر اور بھی عمل کیا کہ گوشت مطلق نہیں کھایا بلکہ سوائے تھوڑی سی ابلی ہوئی مٹر کے کوئی پکی ہوئی ترکاری بھی نہیں کھائی اور صرف پھلوں پر گذر کیا۔ مگر پھلوں میں علاوہ نارنگیوں کے اور ناشپاتیوں کے اور خوبانیوں وغیرہ کے کچھ گریاں بھی کھائی گئیں (بادام اخروٹ وغیرہ) اور لطف یہ ہے کہ کھجوریں بھی روزانہ بیس پچیس کھائی گئیں۔ اس لئے اس پرہیز میں شکایت کا ذرا بھی موقع نہ ملا۔ ارادہ ہے کہ پھر قارورہ کیمیاوی تجزیہ کے لئے

بھیجوں تاکہ معلوم ہو جائے کہ فاقہ نہ کرنے کے بعد تنکر مفقود رہتی ہے یا نہیں۔ ورزش کے معاملے میں البتہ بہت کچھ فروگذاشت ہوئی ہے لیکن آج سے ارادہ کر لیا ہے کہ دن میں کم سے کم دو تین بار ورزش ضرور کرونگا۔ ڈاکٹر صاحب کا قول ہے کہ صحیح غذا سے زیادہ صحیح ہوا کی ضرورت ہے اور جب تک اندر کی ہوا پوری طرح باہر نہ نکالی جائیگی جسم کا اندرونی حصہ صاف نہ ہوگا اور تمام ورزشیں اسی غرض سے کرائی جاتی ہیں کہ میں سانس یحج طریقے سے لے سکوں۔ چربی پوری طرح سانس لینے میں مانع ہوتی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر میری سانس لمبی ہوئی تو غذا بھی زیادہ ہضم کی جا سکے گی اور تھوڑی بہت بدپرہیزی سے بھی زیادہ نقصان نہیں پہنچے گا۔ .... میں شوکت صاحب کو بھی لکھنے والا ہوں کہ وہ بھی اب پھلوں پر گذارہ کیا کریں اور جس طرح سے میں زمین پر لوٹ لوٹ کر اور دوسری ورزشوں میں لمبی لمبی سانسیں لیا کرتا ہوں وہ بھی لیا کریں۔ میرا وزن سات سیر گھٹ چکا ہے۔ کمر چار انچ کم ہو گئی ہے اور سانس ایک سو ستر سے ترقی کر کے دو سو تک پہنچ گئی ہے۔ ان کا وزن تو یقیناً بیس پچیس سیر گھٹ جائیگا بلکہ اس سے بھی زائد۔ اور وہ تھوڑے ہی عرصے میں مصرعہ "کمر پتلی صراحی دار گردن" کے مصداق ہو جائیں گے۔"

(ص ۱۴۷)

اس خط میں مولانا نے ریجنٹس پارک کے زولاجیکل گارڈن کا ذکر کیا ہے۔ جب وہ وہاں تشریف لے گئے تھے تو شوکت عمر، اشرف اور حمید کے علاوہ میں بھی ان کے ساتھ تھا۔ ہم سبھوں نے مولانا سے ہر چند درخواست کی کہ وہ بدپرہیزی نہ کریں لیکن انھوں نے کسی کی نہ سنی۔ جب وہ گفتگو شروع کرتے تھے تو لگاتار اور متواتر بولتے تھے کہیں رکنے کا یا دم لینے کا سوال ہی نہیں تھا۔ ہم لوگوں کی مودبانہ درخواست گفتگو کے دھارے میں

رہ گئی۔ انھیں جو کرنا تھا وہی کیا۔ اس کا نقصان بھی اٹھایا جیسا کہ خود اعتراف کیا ہے۔

ایک روز مکان کی ملازمہ جو ہم سبھوں کے بستر ٹھیک کرتی تھی مجھ سے کہنے لگی کہ آج صبح بڑے حضرت کے گدے کے نیچے سے چار چاکلیٹ کو ڈھانکنے والے خالی پیکٹ برآمد ہوئے۔ کیا وہ رات میں چاکلیٹ کھاتے ہیں۔ میں نے کہا نہیں وہ میٹھا نہیں کھاتے اتفاق سے یہ چاکلیٹ تحفتہً آ گئے ہوں گے اور چونکہ انھیں شکر آتی ہے اس لئے میٹھے کی کبھی کبھی طلب ہو جاتی ہے۔ میں نے اس واقعہ کا اشرف اور شوکت عمر سے ذکر کر دیا۔ اب ہم سبھوں کی یہ صلاح ٹھہری کہ مولانا کی خدمت میں وفد کی شکل میں جائیں اور عرض کریں کہ اگر آپ کا بد پرہیزی جاری رکھنے کا ارادہ ہے تو ہمیں اجازت دیجئے کہ آپ کے ڈاکٹر کو اس کی اطلاع کر دیں تاکہ وہ اپنے علاج میں اس بد پرہیزی کی رعایت رکھے۔ اشرف مولانا کی خدمت میں زیادہ گستاخ تھے۔ انھوں نے ہم دونوں کی اس باب میں نمایندگی کی۔ اشرف نے جھجکتے ہوئے اور بڑے ادب سے مولانا کی خدمت میں عرض کیا کہ چار بڑے بڑے چاکلیٹ کھانے سے آپ کے خون اور پیشاب کی شکر بہت بڑھ گئی ہو گی۔ کہنے لگے "ایک دفعہ میں نہیں، دو دفعہ کر کے کھائے ہیں"۔ گویا ایسا کرنے سے ان کے خیال میں اس واقعہ کی ضرر رسانی کی شدت کم ہو گئی۔ یہ بات انھوں نے فطری سادگی کے ساتھ کہی جس سے مجھے ان کی مجبوری پر رحم آنے لگا۔

مولانا کو پہلے تو یہ بات ناگوار گذری کہ ہم لوگوں کو ان کی بد پرہیزی کی اطلاع کیسے ہو گئی لیکن بعد میں خود ہی سب واقعات بیان کر دیئے۔ کہنے لگے کہ مجھے میٹھے کا ہوکا ہے۔ اگر نہ کھاؤں تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے دل کو کوئی نیچے کھینچتا ہو۔ میں نے عرض کیا کہ مولانا آپ کے ڈاکٹر نے اعتدال کے ساتھ شہد کھانے کی اجازت دی ہے اگر آپ رات کو سوتے

وقت شہد کی بوتل اپنے کمرہ میں رکھ لیا کیجئے اور جب طبیعت چاہے چائے کا ایک چمچہ اس میں سے لے کر نوش فرما لیجئے۔ کہنے لگے یوسف نے بالکل ٹھیک کہا۔ آج سے یہی کروں گا۔ چند روز بعد انھوں نے اپنے معالج سے اس کی نسبت دریافت کیا تو اس نے کہا ہاں آپ شہد جب جی چاہے کھا سکتے ہیں لیکن زیادہ مقدار میں نہیں اور نہ بار بار۔ رات میں اگر مٹھاس کی طلب ہو تو ایک دفعہ کھا لیا کیجئے۔ مولانا میرے مشورے کے قائل ہو گئے۔ جب اپنے کمرے میں فرش پر لوٹ لگاتے تھے تو مجھے اپنے پاس بلا لیتے تھے اور کہتے تھے کہ دیکھو کس قسم کی حرکات مذبوحی کر رہا ہوں۔ ہم تینوں مولانا پر کڑی نگرانی رکھتے تھے۔ لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ ان کے احباب جب انھیں مدعو کرتے تھے تو وہ دل کھول کر بدپرہیزی کر دالتے تھے اور چونکہ ہم میں سے کوئی موجود نہیں ہوتا تھا اس لئے وہ سمجھتے تھے کہ ان کی بے احتیاطی کی کسی کو اطلاع نہیں ہوئی۔ لیکن اطلاع ہو یا نہ ہو انھیں فوراً اس کا نقصان اٹھانا پڑتا تھا۔ اس معاملے میں میں نے دیکھا کہ مولانا کی طبیعت بالکل بچوں کی سی تھی۔ ان کی زندگی کی بے توازنی اور بے پروائی بالآخر جان لیوا ثابت ہوئی۔ مولانا محمد علی کی سی غیر معمولی صلاحیتوں کے انسان بہت کم پیدا ہوتے ہیں۔ انھوں نے اپنی زندگی میں احتیاط اور اعتدال کو ہمیشہ ٹھکرایا، حالانکہ ان کی صحت انھیں کی متقاضی تھی۔ افسوس ہے کہ ان کی ذہانت اور ان کی اولوالعزمی سے ملک اور قوم کو جتنا فیض پہنچنا چاہئے تھا اتنا نہ پہنچ سکا۔ ان کے نزدیک جذبہ ہی ایک ایسی حقیقت تھی جو عقل کے مطابق تھی۔ جذبہ ان کی انگلی پکڑ کر انھیں مذہب اور سیاست کی وادی میں کھینچ لایا۔ اسی کے توسط سے انھوں نے اپنے وجود کی توجیہ کی جس کی توجیہ اس طور پر نہیں کی جا سکتی۔ وہ دوسروں کو باہر سے لیکن خود کو اندر سے دیکھتے تھے۔ اسی لئے ان میں وہ نفسیاتی نظر نہ پیدا ہو سکی جو

کامیاب قیادت کے لئے ضروری ہے۔ یہ زندگی کا بڑا المیہ ہے کہ زمانہ محبت کی جیسی قدر ہونی چاہئے، ویسی نہیں کرتا۔ زمانے اور محبت کی کشمکش میں زمانہ محبت کو مٹانے کے درپے رہتا ہے اور محبت اپنے آپ کو ابدیت سے وابستہ کرنے کے لئے آخر تک ہاتھ پاؤں مارے جاتی ہے۔ مولانا محمد علی کی محبت ایک ایسے بربط کے مثل تھی جس میں جذبے کے تار تھے جو فطرت اور روح کی بے شمار لرزشوں سے متحرک رہتے تھے۔

مولانا محمد علی کو سر محمد رفیق کے یہاں، جو اس زمانے میں انڈیا کونسل کے رکن تھے، سر امیر علی کے انتقال کی خبر ملی۔ شوکت عمر اور میں مولانا کے ساتھ کیونڈش روڈ سے بروک وڈ کے قبرستان روانہ ہوئے تاکہ ان کی تدفین میں شریک ہوں۔ راستے میں موٹر خراب ہو جانے کی وجہ سے ہم کچھ دیر سے وہاں پہنچے۔ سر امیر علی کے صاحبزادے وارث امیر علی مع اپنی والدہ اور خاندان کے دوسرے افراد کے وہاں موجود تھے۔ قبر پر فاتحہ پڑھنے کے بعد ہم سب ان کے پاس تعزیت کے لئے گئے۔ اس شہر خموشاں کا نام نیکروپولس ہے۔ ریل کی پٹری اندر تک آتی ہے۔ چاروں طرف احاطے کی دیوار ہے، اور اندر باغ اور کیاریاں ہیں۔ یہاں وہ ویرانی اور وحشت نہیں جو ہمارے ہندوستان کے قبرستانوں پر برستی ہے۔ پیرس کے قبرستانوں کی چمن بندی تو ایسی عمدہ ہے کہ اتوار کے روز لوگ بال بچوں سمیت وہاں تفریح کے لئے جاتے ہیں۔ بروک وڈ کے قبرستان میں ایک چھوٹا سا حصہ مسلمانوں کی قبروں کے لئے مخصوص ہے۔ ایک حصہ ہندوؤں کی قبروں کے لئے اور ایک پارسیوں کی قبروں کے لئے ہے۔ سر امیر علی نے اپنی زندگی ہی میں اپنے اور اپنے خاندان والوں کے لئے ایک قطعہ اُس طرف خرید لیا تھا جدھر مسلمان عیسائیوں کی قبریں ہیں۔ تجہیز و تکفین کا سب کام ایک کمپنی کی طرف سے انجام پایا۔ بعد

میں معلوم ہوا کہ قبر کا رُخ کس قدر ٹیڑھا تھا تو دفن کرتے وقت امام صاحب نے میت کا منھ صحیح طور پر قبلہ کی طرف موڑ دیا۔ یہاں مولانا نے ہم لوگوں کی ملاقات لارڈ ہیڈلے اور اقبال علی شاہ سے کرائی۔ جب سب لوگ روانہ ہونے لگے تو مولانا نے کہا کہ جب یہاں تک آئے ہیں تو آؤ ذرا دیکھیں کن کن لوگوں کی یہاں قبریں ہیں، ان پر بھی فاتحہ پڑھ لیں۔ چنانچہ ہم اس حصے میں جہاں مسلمانوں کی قبریں ہیں کتبے پڑھنے لگے۔ ایک قبر پر جو آغا خاں کے چچازاد بھائی آغا شمس الدین شاہ کی تھی یہ شعر آغا خاں کی طرف سے کتبے پر کندہ تھا۔

زرفتنِ تو من از عمر بے نصیب شدم　　　سفر تو کردی و من در وطن غریب شدم

اس موقع پر مولانا نے آغا خاں کی غریب الوطنی پر ایک طنزیہ جملہ کہا تھا جس کا مفہوم اپنے ۱۹ اگست والے خط میں جو ماجد میاں اور ظفر الملک کے نام ہے آگیا ہے:۔

"آغا خاں صاحب کو کون غریب کہے گا لیکن ان کی 'غریب الوطنی' اب ایک ضرب المثل ہے۔ نہ معلوم اس شعر میں کس وطن کی غربت کی طرف اشارہ ہے"۔

ہم لوگ صبح کا ناشتہ کئے ہوئے تھے اور سب کو بڑی بھوک لگ رہی تھی اب یہاں سے کھانے کی تلاش میں نکلے جس کی نسبت خط میں اس طرح ذکر ہے:۔

"ہم یہاں سے چلے تو لڑکوں کو بھوک لگی تھی۔ اس لئے ووکنگ میں داخل ہوتے ہی کاٹریج ہوٹل ملا۔ وہاں موٹر رو کی اور ہوٹل میں داخل ہو کر خان ساماں "خانم ساماں" کی تلاش کی۔ ایک میم صاحبہ جو غالباً مالکہ تھیں نکل آئیں اور پہلے تو چائے دینے کا وعدہ فرمایا لیکن جب میں آگے بڑھا اور میں نے پوچھا مصرعہ۔ کہئے کچھ اور بھی ہمت ہو گی، یہ لڑکے بھوکے ہیں۔ لنچ اب تک نہیں کھایا ہے تو انھوں نے گھبرا کر چائے دینے سے بھی انکار

فرما دیا۔ ہم سب کا قیاس ہے کہ انھیں "شیخ" سے خوف آیا اور ان کو اندیشہ ہوا کہ کہیں وہ "شیخ" اپنی عبا میں ہوٹل کے چھری کانٹے اور چمچے دبا کر نہ لے جائے۔ یا کہیں مالکہ ہی کا مالک نہ بن بیٹھے۔ میں نے۔ دو تین ہی دن ہوئے اپنے مکان سے قریب ہی سینما میں وہ فلم دیکھا جس کا "دی شیخس سن" عنوان ہے اور جس میں رڈولف ویلنٹینو آنجہانی مراقش کے ایک نوجوان "شیخ زادہ" کا پارٹ کرتا تھا۔ ان فلموں کو دیکھ کر کچھ تعجب نہیں اگر ان ممالک والے اس اندیشہ سے متردد ہوں کہ اگر "شیخ زادوں" کی دراز دستیاں یہ ہیں تو نہ معلوم خود "شیوخ" کی دراز دستیاں کیسی ہوں گی۔ جی میں آیا کہ ہوٹل کی مالکہ صاحب کو مجبور کیا جائے کہ قانون کی روسے وہ ہمارا مطالبہ مسترد نہ فرمائیں لیکن ان کی سراسیمگی پر رحم آیا اور قصبے میں آگے جا کر ایک ریسٹوران میں چائے پی گئی، سلاد کھایا گیا اور انڈوں کے آملیٹ جن کو خانساماں "ماینٹ" کہتے ہیں۔ لڑکوں کو کھلائے گئے دکچھ میں نے بھی لیا)"

(مولانا محمد علی کے یورپ کے سفر ص ۱۵۱-۱۵۵)

مولانا نے جس فلم کا اس خط میں ذکر کیا ہے اسے دیکھنے میں ان کے ساتھ گیا تھا۔ انٹرول میں جب ہم دونوں گیلری میں چہل قدمی کو نکلے تو لڑکیوں نے ہمیں چاروں طرف سے گھیر لیا اور "دی شیک اینڈ دی سن آف شیک" (شیخ اور شیخ کا بیٹا) گانے لگیں۔ مولانا کو صرف ادبی انگریزی ہی پر قدرت نہ تھی بلکہ وہ عامیانہ زبان (سلینگ) بھی بے تکلف بولتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے ان لڑکیوں کو اسی عامیانہ محاورے میں خطاب کرنا شروع کیا۔ پھر کیا تھا وہ سب ان پر لٹو ہوگئیں اور زور زور سے مل کر گانے لگیں۔ مولانا کبھی ان میں سے دو ایک کے ہاتھ پکڑ لیتے اور فراٹے سے سلینگ چھانٹتے تو ہنستے ہنستے ان کے پیٹ دُکھ جاتے۔ انٹرول ختم ہوا تو ہم لوگ پھر اپنی جگہوں پر پہنچ گئے۔

سینما کے ختم ہونے پر ایک بڑے مجمع نے مولانا کو گھیر لیا۔ لڑکیاں تھیں کہ بچھی جاتی تھیں۔ انھوں نے ایک دم سے پھر گانا شروع کر دیا۔ کچھ لڑکے بھی آگئے۔ جب لوگوں کو معلوم ہوا کہ یہ علی برادران میں سے ایک ہیں تو بڑے تعجب سے ایک دوسرے کو کہتے تھے کہ کیا عمدہ انگریزی بولتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ وہ انگریزی چاہے فصیح ہو، چاہے عامیانہ اس قدرت سے بولتے تھے کہ انگریز رشک کرتے تھے۔ پھر ان کی طبیعت میں ظرافت اور بذلہ سنجی اس بلا کی تھی اور اظہار مطالب پر ایسی قدرت تھی کہ لوگ ان کی شخصیت سے مسحور ہو جاتے تھے۔ اس واقعہ کے علاوہ بھی کئی مرتبہ میں نے دیکھا کہ انگریز پبلک مولانا کے گرد جمع ہو جاتی تھی۔ کلیپھم کامن میں بس کے اڈے پر یا ٹرک پر لوگوں کا ان کے گرد مجمع لگ جاتا تھا اور مولانا ہیں کہ بلا وقفے کے بولے چلے جا رہے ہیں، ایسے موضوعوں پر جو عوام کی دلچسپی کے ہوتے۔ انگلستان کے عوام میں ان کی ہر دلعزیزی کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ انھیں عوامی سلینگ بولنے پر ایسی غیر معمولی قدرت حاصل تھی کہ کم ہندوستانیوں کو ہوگی۔ وہ جب عوام سے گفتگو کرتے تو "کامریڈ" کے ایڈیٹر کی زبان میں نہیں بلکہ اپنے کو عوامی سطح پر لاکر۔ میں اسے قادر الکلامی کا اعجاز کہوں گا، ورنہ ایسا کم ہوتا ہے کہ کلام کی رو کو یکے بعد دیگرے مختلف سطحوں پر توڑا اور جوڑا جا سکے۔ ان کی ہر دلعزیزی میں ان کے بے تصنع والہانہ پن، بے ساختگی اور خلوص و محبت کو بھی بڑا دخل تھا جو دلوں کو اپنی طرف کھینچتا تھا اور جس کی جلوہ گری ان کی زندگی کے ہر نشیب و فراز میں رہی۔ ایسے روشن طبع، تیز ذہن، بے ریا اور مخلص لوگ اب کاہے کو پیدا ہونگے۔

ماجد میاں اور ظفر الملک کے نام اپنے خط مورخہ ۱۶ اگست ۱۹۲۸ء میں مغربی تہذیب و تمدن پر تنقید کی ہے۔ یہ زاہد خشک کے انداز میں نہیں ہے بلکہ ساتھ ساتھ

ظرافت و مزاح کے پہلو بھی نکالے ہیں۔ بے ساختہ لطافت و ظرافت ان کی انگریزی اور اردو تحریروں کی خصوصیت تھی۔ اس خط میں جن مقامات کا ذکر ہے وہاں شوکت عمر، خالد اور میں ان کے ساتھ تھے۔

"ہنڈن" میں طیاروں کے کرتب دیکھنے کے بعد شفیع کے رسٹوران میں ہندوستانی کھانا کھا کر تھیٹروں کی طرف رخ کیا مگر کہیں جگہ نہ ملی۔ "بچا چیچ" کے اصرار سے ہوبرن کے امپائر نامی میوزک ہال میں گیا اور بالکل خیال نہ رہا کہ یہاں تو محفل رقص و سرود گرم ہوتی ہوگی۔ جب وہاں پہنچ چکا تو میری آنکھوں نے پہلی بار تھیٹر میں وہ نظارہ دیکھا جو کبھی جوانی میں بھی نہ دیکھا تھا۔ یعنی چند عورتیں ٹخنوں سے لے کر رانوں تک برہنہ ہمارے یہاں کی کبوتریوں کی طرح کرتب دکھا رہی ہیں۔ جب میں تیس برس پیشتر انگلستان آیا تھا تو میوزک ہال میں ہر رقاصہ ریشم کے ٹائٹ یعنی رانوں تک موزے پہنے ہوتی تھی۔ پھر بھی ایسی رقص گاہوں میں جانا "رنگیلے پن" کی علامت تھی۔ لیکن اب تھیٹروں میں برہنگی کیوں نہ آئے جب سمندر کے کنارے ہر تفریح گاہ میں ہزاروں عورتیں مردوں کی طرح بنیان کا جانگیہ پہنے انھیں کے ساتھ تیرتی پھرتی ہیں اور اس کا نظارہ گو اب تک میں نے کسی بندرگاہ پر جا کر نہیں کیا ہے، تاہم اپنے جہازہی پر ولایت آتے وقت دو تین میم صاحبان کو تتق پر کر یچ کی حوض میں کودتے پھاندتے اور مردوں کی گردنوں پر سوار ہوتے دیکھ چکا تھا۔ آج کل ہر مصور اخبار میں ان ہزارہا "غسا بحات" کے حسن کی نمائش اور اس کا مقابلہ ہو رہا ہے۔ چنانچہ میں ہر ہفتے چند پرچے مولانا عرفان کی خدمت میں بھیج دیا کرتا ہوں کہ وہ سمجھ سکیں کہ اب نوبت کہاں تک پہونچ گئی ہے۔"

"برادران من۔ حقیقت میں اب پردہ یہاں تک اٹھ چکا ہے کہ شب عروسی بھی بے نقاب نظر آتی ہے۔ جب انگلستان کا یہ حال ہو جہاں میری طالب علمی کے زمانہ میں عورتوں اور مردوں کا ساتھ ساتھ نہانا قطعاً منع تھا، حالانکہ اس زمانہ میں عورتوں کا سارا جسم ڈھکا ہوتا تھا تو پھر آج کل پیرس میں کیا کچھ نہ ہوتا ہوگا۔ جب میں نے بچا چیچی سے سنا کہ وہ مولان روژ اور فولی برژیر جاکر اس عریانی کا نظارہ کر چکے ہیں تو میں نے بھی محض اس خیال سے کہ ع سالک بے خبر نبود زراہ و رسم منزلہا، فیصلہ کیا کہ پہلیں جاکر دیکھوں تو کیا کچھ نظر آتا ہے۔ اس سے پہلے "پاری پلنزیر" نامی رسالہ میں متعدد تصاویر دیکھ چکا تھا جن میں دو مسماتیں "وحید" اور "دہلی" نامی تھیں۔ ان کا لباس دیکھکر مجھے اس امریکن عورت کا قول یاد آیا جس نے لکھا تھا کہ "ہاں میں جانتی ہوں کہ ہندوستان کا قومی لباس کیا ہے۔ ہندوستان کا قومی لباس ایک پٹکا اور جیبی رومال ہے۔" ان غیر مستورات کے سر پر بھی ایک پٹکا تھا اور باقی جسم کے لئے ایک نہایت مختصر سا جیبی رومال رہ گیا تھا۔ اس رومال کو رومالی کی جگہ دیکھ کر بے اختیار غالب کے اس شعر میں تصرف کرنے کو جی چاہتا تھا۔

ہائے اس چار گرہ کپڑے کی قسمت غالبؔ
جس کی قسمت میں ہو معشوق کی خشتق ہوناؔ[1]

میں نہیں کہہ سکتا کہ "خشتق" کی ہجے کیا ہے۔ آج تک کبھی لکھنے کا اتفاق ہی نہیں ہوا۔

---

[1] اصل شعر یوں ہے:۔

ہائے اس چار گرہ کپڑے کی قسمت غالبؔ
جس کی قسمت میں ہو عاشق کا گریباں ہونا

مجھے تو خیال تھا کہ یہ ہمارے روہیلکھنڈ والوں کی پشتو کا ایک لفظ ہے۔ اور خ، ق، ش، ت، کا اجتماع یقیناً بخنوبہ دلالت کرتا ہے۔ لیکن "بچا چیچ" نے تصدیق کر دی کہ یہ لفظ مستعمل عام ہے بلکہ پیش پا افتادہ ہے جس کا انگریزی ترجمہ شاید یہ ہوگا "ورن تھرڈ بے آر" جو کچھ میں نے دیکھا اس کے صرف ایک حصے کی تصاویر آپ کی خدمت میں ارسال کرتا ہوں۔ اگر ان کے بلاک بھی مل جاتے تب بھی "ہمدرد" میں یہ تصاویر شائع نہ ہو سکتیں گو ایک بار شائع ہو جائیں تو یقیناً "ہمدرد" کی اشاعت "زمیندار" اور "انقلاب" سے بڑھ جائے اور ایک مجرد بے ریشے مؤلف کے تجربات شب عروسی وغیرہ کو بھی مات کر دے۔" (ص ۱۶۸ - ۱۶۹)

مولانا محمد علی کی شخصیت میں ایک طرف تو ان کا سوز و گداز اور ان کی والہانہ سپردگی اور ربودگی جاذب نظر تھی اور دوسری طرف ان کی لطیف ظرافت اور بذلہ سنجی جس میں اولوالعزمی اور مردانہ عزم و اعتماد صاف جھلکتا تھا۔ اس بذلہ سنجی میں کہیں بھی زوال آمادہ تفنن یا ضلع جگت دور دور نظر نہ آئے گی۔ یہ انداز ان کی افتاد طبع کے خلاف تھا۔ ان کی رومانیت ان کی گفتگو کے لہجے اور تحریر کے طرز میں چھپائے نہیں چھپتی جس سے ان کی انفرادیت کا اظہار ہوتا تھا۔ اسی کو غالب نے "شیوۂ گفتار" کہا ہے، جس میں سوز و گداز بھی ہے، طنطنہ اور طنز بھی، بے خوف مردانگی بھی۔ ۱۹۲۸ء میں انھوں نے نہرو رپورٹ کی مخالفت کی۔ جب کانگریس نے اس رپورٹ کو منظور کر لیا تو وہ اس سے مستعفی ہو گئے اس لئے کہ اول تو یہ کہ اس میں مکمل آزادی کے نصب العین کو منظور نہیں کیا گیا تھا اور دوسرے یہ کہ مسلمانوں کے مطالبات نہیں تسلیم کئے گئے تھے۔ جس بے خوفی سے کانگریس میں شریک ہوئے تھے اسی بے خوفی سے اس سے الگ ہو گئے۔

مصلحت بینی نہ پہلے تھی نہ بعد میں۔ آل پارٹیز مسلم کانفرنس میں شریک ہوئے اور اس کے بعد گول میز کانفرنس میں ہندوؤں اور مسلمانوں میں مصالحت کی آخر تک کوشش کرتے رہے۔ یہاں انھوں نے جو آخری تقریر کی تھی وہ اپنی خطابت اور جوشِ بیان کے لحاظ سے یادگار رہے گی۔ انھوں نے کہا تھا "میں آپ سے نوآبادی کا درجہ لینے کے لئے نہیں آیا ہوں۔ میں مکمل آزادی کے عقیدے کا پابند ہوں۔ میں آج جس مقصد کے لئے آیا ہوں وہ یہ ہے کہ میں جب اپنے ملک کو واپس جاؤں تو آزادی کا منشور میرے ہاتھ میں ہو۔ میں غلام ملک میں لوٹ کر نہیں جانا چاہتا۔ مجھے ایک غیر ملک میں جسے آزادی کا شرف حاصل ہے غربت کی موت منظور ہے۔ اور اگر آپ مجھے ہندوستان کی آزادی نہیں دیں گے تو پھر آپ کو مجھے یہاں قبر کے لئے جگہ دینی پڑے گی۔"

گول میز کانفرنس کے دوران ہی میں لندن ہائیڈ پارک ہوٹل میں چند روز زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا رہ کر مولانا دنیا سے کوچ کر گئے۔ مفتیٔ اعظم کی دعوت پر بیت المقدس میں مسجد اقصیٰ میں تدفین ہوئی۔ اس طرح ایک عرب ملک میں پیوند زمین ہو کر مولانا محمد علی نے ہندوستان کے تعلقات عربوں کے ساتھ ہمیشہ کے لئے استوار کر دیئے۔ ع۔ عمر بھر کی بے قراری کو قرار آ ہی گیا۔

کیوگارڈن اور برٹش میوزیم

لندن میں کیو گارڈن مجھے بہت پسند آیا جو تقریباً پونے دوسو ایکڑ پر پھیلا ہوا ہے۔ جسے دیکھنے کے لئے میں مولانا محمد علی کے ساتھ گیا تھا۔ پودوں کا اس سے بڑھ کر دنیا میں کوئی ذخیرہ نہیں ہے۔ نباتاتی میوزیم بھی دیکھنے کے لائق ہے۔

لندن میں میرا زیادہ تر وقت برٹش میوزیم میں گذرتا تھا۔ یہ دنیا کی سب سے بڑی لائبریریوں میں ہے۔ یہاں پچاس لاکھ کے لگ بھگ مطبوعہ کتابیں ہیں اور

قلمی نسخوں کی تعداد ۷۵ ہزار ہے جن میں ۱۸ ہزار مشرقی زبانوں کے ہیں۔ اس کی فہرستیں ۷۵ اجلدوں میں شائع ہو چکی ہیں لیکن ابھی مکمل نہیں ہوئیں۔ کبھی کبھی انڈیا آفس لائبریری بھی جاتا تھا۔ اس میں ڈھائی لاکھ مطبوعہ کتابیں اور بیس ہزار قلمی نسخے ہیں۔

بلیوتیک ناسیونال | پیرس کے قیام میں میں یا تو یونیورسٹی لائبریری میں کام کرتا تھا یا بلیوتیک ناسیونال میں جو برٹش میوزیم کی طرح دنیا کے بڑے کتب خانوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس میں مطبوعہ کتابوں کی تعداد ساٹھ لاکھ ہے اور قلمی نسخوں کی تعداد ایک لاکھ تیس ہزار۔ برٹش میوزیم اور بلیوتیک ناسیونال میں ریسٹورانٹ موجود ہیں جہاں کام کرنے والوں کو دوپہر میں ہلکا کھانا اور چائے قہوہ مل جاتا ہے۔ اس سہولت کی وجہ سے کہیں باہر نہیں جانا پڑتا۔ میں ان دونوں کتب خانوں کو تحقیق کرنے والوں کی جنت کہوں تو مبالغہ نہ ہوگا۔ یہاں کام کرنے والوں کے لئے جو سہولتیں ہیں کاش وہ ہمارے ملک کے کتب خانوں میں بھی ہوتیں۔ دہلی میں سنٹرل اورکیالوجیکل لائبریری انڈولوجی اور تاریخ پر نہایت عمدہ کتب خانہ ہے لیکن وہاں نہ کتابوں کو سلیقے سے رکھنے کی جگہ ہے اور نہ کام کرنے والوں کے بیٹھنے کے لئے کوئی موزوں انتظام ہے۔ حکومت ہند کو جلد سے جلد اس کے لئے ایک علٰحدہ عمارت بنوانی چاہئے تاکہ کتابوں کے اس عمدہ ذخیرے سے اہلِ تحقیق پورا فائدہ اٹھا سکیں۔

لنڈبرگ کی اڑان | میرے فرانس جانے کے ٹھیک ایک سال بعد ۲۱ رمئی ۱۹۲۷ء کو لابورجے کے ہوائی اڈے پر چارلس لنڈبرگ تن تنہا ۳۳ گھنٹوں کے اڑان کے بعد بحرِ اوقیانوس کو پار کر کے پہنچا۔ اس کے ہوائی جہاز میں صرف ایک موٹر تھا۔ نہ ریڈیو تھا اور نہ محافظ چھتری جس کی مدد سے جان بچانے کے لئے ہوائی جہاز سے زمین پر

کود سکتے ہیں۔ یہ عزم و ہمت اور ٹیکنالوجی دونوں کی زبردست فتح تھی۔ ۳۳ گھنٹوں میں چارلس لنڈبرگ کی ایک سکنڈ کے لئے بھی پلک نہیں جھپکی۔ اس حالت میں ساڑھے تین ہزار میل کی لگاتار اڑان ضبط و برداشت اور پامردی کا شہ کار تھا۔ مارشل فوش نے بہ نفس نفیس چارلس لنڈبرگ کو جاکر مبارکباد پیش کی۔ جدھر وہ موٹر میں نکل جاتا اُدھر عوام کا ہجوم ہو جاتا۔ اس کی جان کی حفاظت کے لئے فوج اور پولیس کو مل کر انتظام کرنا پڑا۔ پیرس کے اخباروں میں آٹھ دس روز اس کے حالات شائع ہوتے رہے۔ ہر جگہ یونیورسٹی سے لے کر قہوہ خانوں تک گفتگو کا موضوع اس کی ذات تھی۔ نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کا وہ اس وقت سب سے بڑا ہیرو تھا۔ میں نے اپنے یورپ کے دوران قیام میں کسی شخص کا اتنا شاندار استقبال نہیں دیکھا جیسا کہ پیرس میں چارلس لنڈبرگ کا ہوا۔ اس کی وجہ سمجھ میں آتی ہے۔ جدید تہذیب میں ٹیکنالوجی کا اعلیٰ مقام ہے اس لئے کہ اس کے سب کارنامے ٹیکنالوجی ہی سے متعلق ہیں۔ ہوائی جہاز میں بحر اوقیانوس کو پہلی مرتبہ پار کرنا فطرت پر انسان کی زبردست فتح تھی جس کا جشن پیرس والوں نے شایان شان طور پر منایا۔ میں نے بعض خانگی صحبتوں میں دس دس بارہ بارہ سال کے بچوں کو دیکھا کہ ان کے کوٹ کی جیبوں میں چارلس لنڈبرگ کی مختلف تصویریں ٹھسی ہوئی تھیں جنھیں انھوں نے اخباروں سے کاٹ کر بڑے شوق سے اپنے پاس رکھا تھا۔ ان میں سے ہر ایک یہی کہتا تھا کہ میں بھی ایک دن لنڈبرگ کی طرح نام پیدا کر دوں گا۔

آئی فل ٹاور | پیرس کی عام زندگی کے علاوہ جن چیزوں نے میرے تخیل کو برانگیختہ کیا ان میں ایک آئی فل ٹاور بھی ہے۔ پیرس ۱۸۸۹ء میں جو عالمگیر نمائش ہوئی تھی اس وقت

یہ مینار بنایا گیا تھا۔ اس کے بنانے والے کا نام گستاو آئی فل تھا جو اپنے زمانے کا مشہور انجینیر گذرا ہے۔ اسی کے نام پر اس مینار کا نام رکھا گیا ہے۔ اس کے بنانے میں سات ہزار ٹن لوہا لگا ہے۔ اس کی اونچائی ۹۸۴ فٹ ہے۔ سب سے اوپر کی منزل میں ایک ریستوران ہے جہاں کھانے پینے کی اشیا ملتی ہیں۔ اوپر چڑھنے کے لئے بجلی سے چلنے والا جھولا موجود ہے ورنہ ظاہر ہے کہ ادھیڑ عمر والوں اور بوڑھوں کے لئے اوپر تک پہنچنا دشوار تھا۔ انجینیری کا کمال یہ ہے کہ اتنے بڑے وزن کو ایسا تقسیم کیا ہے کہ فی مکعب فٹ اس کا ٹھوس پن اور ثقل نوعی (ڈن سٹی) بہت کم رہتے ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو اس کا توازن برقرار نہ رہتا۔ آئی فل ٹاور سارے پیرس سے نظر آتا ہے۔ اسے اہل فرانس ٹکنالوجی کی علامت خیال کرتے ہیں جس نے جدید زمین کے بطن سے جنم لیا ہے اور جو جدید تمدن کو قدیم تمدنوں سے ممتاز کرتی ہے۔

آرک دوتری اونفت | "فتح دروازہ" (آرک دوتری اونفت) بھی ایک علامتی تعمیر ہے اس کی آرائشی پٹیوں پر مجسموں کے ذریعے نیپولین کی فتوحات کو ظاہر کیا گیا ہے۔ اس محرابی دروازے کے نیچے بیچ میں "نامعلوم سپاہی" کی یاد میں بجلی سے ایک شعلہ ہر وقت لپکتا دکھائی دیتا ہے۔ یہ حب وطن کی آگ کا شعلہ ہے، جو کبھی بجھتا نہیں۔ پہلی جنگ عظیم میں جو لاکھوں فرانسیسی نوجوان کام آئے ان کی یاد کو زندہ رکھنے کے لئے یہ شعلہ فروزاں کیا گیا تھا۔ یہاں جو لوگ آتے ہیں وہ احتراماً اپنی ٹوپیاں اتار لیتے ہیں۔ "فتح دروازہ" کو اتوال (ستارہ) بھی کہتے ہیں۔ اس لئے کہ یہاں ہر طرف سے سڑکیں آکر جب ملتی ہیں تو ستارے کی شکل بنجاتی ہے۔ اس کے نواح میں امیر طبقے کی سکونت کے مکان ہیں۔ نیپولین سوم کے زمانے میں اوس مان نے شہر پیرس کو پھر سے بنانے کا بیڑا اٹھایا تھا۔ اس نے

نئے بازار اور سڑکیں بنوائیں جو آج ہمیں نظر آتی ہیں۔ آس پاس کی سب بڑی بڑی سڑکیں ایک گول چکر میں ملتی ہیں جو "فتح دروازہ" کو گھیرے ہوئے ہے، بالکل اسی طرح جیسے کسی پہیے کے آڑ کے ڈنڈے ہوں۔

مون مارتر کا کلیسا | ۱۸۷۰ء میں جرمنی سے شکست کے بعد پیرس کے کیتھولک مذہب کے ماننے والوں نے عہد کیا تھا کہ آئندہ کامیابی کی دعا کے لئے ایک کلیسا تعمیر کریں گے جو مقدس "قلب مسیح" کے نام سے موسوم ہوگا۔ فرانسیسی زبان میں اس کا نام "سیکرے کیر" ہے۔ چنانچہ ۱۸۷۳ء میں نیشنل اسمبلی نے اپنی نامذہبی پالیسی کے باوجود فیصلہ کیا کہ اس کلیسا کی تعمیر رفاہ عام کا کام ہے جس کے لئے زمین خرید لینی چاہئے۔ جنوبی فرانس کے ایک کلیسا سے ایک ۱۹ ٹن وزن کا گھنٹہ یہاں لاکر رکھا گیا۔ یہ کلیسا مون مارتر کے علاقے میں پہاڑی پر تعمیر کیا گیا ہے۔ اس پر سے ۳۰ میل کا منظر چاروں طرف بخوبی نظر آتا ہے۔ جس طرح "نوتر دام" پیرس کا قدیم ترین کلیسا ہے اسی طرح "سیکرے کیر" جدید ترین ہے جس کے طرزِ تعمیر کو دور دور سے لوگ دیکھنے آتے ہیں۔ اس کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ یہ چاروں طرف رقص خانوں، مے خانوں اور عیاشی کے اڈوں سے گھرا ہوا ہے۔ پیرس کے بہترین کیبے رے یہیں ہیں۔ گنہ گاروں کو یہ بڑی سہولت ہے کہ ادھر گناہ کئے اور اُدھر توبہ و استغفار کر آئے۔ ع۔ رند کے رند رہے ہاتھ سے جنت نہ گئی۔ غالب نے اسی مضمون کو اپنے خاص انداز میں ادا کیا ہے۔

مسجد کے زیر سایہ خرابات چاہئے
بھوں پاس آنکھ قبلۂ حاجات چاہئے

پھولوں کی بہتات | پیرس پھولوں کا شہر ہے۔ یہاں کی شاہراہوں کے دونوں طرف

درختوں کی قطاریں ہیں۔ موسم بہار میں جب ان درختوں میں پھول کھلتے ہیں تو سارا شہر دلھن بن جاتا ہے۔ پھر قدم قدم پر چمن بندیاں ہیں۔ ایوے نیو وے شان زلی زے کی چمن بندی اور یہاں کی کھلی ہوئی فضا بے مثل ہے۔ شہر سے کچھ فاصلے پر دو گلاب باغ ہیں جہاں گلابوں کی ہزاروں قسمیں نظر آتی ہیں۔ یورپ میں اور جگہ بھی لوگوں کو پھولوں کا شوق ہے لیکن فرانس میں سب سے زیادہ ہے۔ جدھر جائیے سڑک کے نکڑ پر کوئی بڑی بی پھول فروخت کرتی ہوئی نظر آئیں گی۔ جب لوگ کسی دوست سے ملنے جاتے ہیں تو پھولوں کی گلدستہ ساتھ لے جاتے ہیں۔ کسی کی شادی میں جائیں، کسی کی تعزیت یا عیادت کو جائیں، پھول ضرور ساتھ لے جائیں گے۔ شہر میں پھولوں کی بڑی بڑی دکانیں ہیں جہاں موسم کے سب پھول ہر وقت دستیاب ہوتے ہیں۔

سلوان لیوی کی نصیحت میں نے اپنے فرانس کے قیام میں بہت کچھ سیکھا۔ شروع ہی میں سلوان لیوی نے نصیحت کی تھی کہ فرانسیسی سیکھنا چاہتے ہو تو سال بھر تک پیرس میں مت رہو بلکہ نواح شہر میں کسی ایسے خاندان کے ساتھ رہو جہاں کوئی انگریزی نہ جانتا ہو۔ میں نے اس پر عمل کیا۔ دوسری نصیحت انھوں نے یہ کی تھی کہ چاہے سمجھ میں آئے یا نہ آئے اخبار اور کتابیں برابر پڑھتے رہو۔ کچھ دنوں بعد مطلب خود بخود سمجھ میں آنے لگے گا۔ چاہو تو کبھی کبھی لغت دیکھ لیا کرو۔ میں نے اس پر بھی عمل کیا اور میں نے محسوس کیا کہ سلوان لیوی کے یہ دونوں نسخے مجرب ثابت ہوئے۔ اب چالیس سال بعد جب میں ان تمام باتوں پر غور کرتا ہوں تو اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ہمارے یہاں زبان سکھانے کے طریقے نہایت ناقص ہیں۔ لفظوں کے معنی جاننا ضروری ہے لیکن انسان فکر جملوں میں کرتا ہے، لفظوں میں نہیں کرتا۔ کوشش یہ ہونی چاہیے کہ

گفتگو یا عبارت کا عام مفہوم سمجھ میں آنے لگے۔ اگر ایسا ہو جائے تو پھر آدمی خود بخود آگے بڑھنے لگتا ہے۔ کچھ عرصے بعد لفظوں اور محاوروں کے معنی میں جو نازک اور باریک فرق ہوتے ہیں وہ بھی واضح ہونے لگتے ہیں۔ بہر نوع ہم مطالب کو مجموعی طور پر اپنی گرفت میں لاتے ہیں۔ کسی کی تقریر سن کر یا کتاب پڑھ کر معانی کا اس وقت ایک مبہم سا تصور ہمارے حافظے میں محفوظ رہ جاتا ہے۔ وہ ہمارے علم کا ماخذ اسی وقت ہوتا ہے جب کہ وہ ہماری ذات کا جز بن گیا ہو۔ بچپن میں میں نے بغیر ترجمے کے قرآن پڑھا تھا۔ بغیر سمجھے ہوئے میرے ذہن میں کچھ نقوش قائم ہو گئے تھے جو ان سے کچھ زیادہ مختلف نہ تھے جو بعد میں بنے جب کہ میں نے عربی زبان کی تھوڑی بہت استعداد بہم پہنچا لی تھی۔ اسی طرح غالب کا "نسخہ حمیدیہ" جب میں نے پہلی مرتبہ جامعہ میں پڑھا تو اکثر شعروں کا مفہوم واضح نہ تھا لیکن میرے حافظے میں ان کے مبہم نقوش بن گئے تھے جو ان سے مختلف نہ تھے جو اس وقت بنے جب کہ میں غالب کو سمجھ کر پڑھنے لگا تھا۔ علم کا یہ مبہم احساس ہماری وجدانی صلاحیتوں سے سیراب ہوتا ہے۔ جب ہم کسی ماہر مصور کی بنائی ہوئی تصویر دیکھتے ہیں تو بھی اسی قسم کا مبہم احساس پیدا ہوتا ہے، چاہے اس تصویر کی تفصیلات کو ہم سمجھیں یا نہ سمجھیں۔ مجھے سوربون کی تعلیم سے اپنی ذہنی نشو ونما کا اسی قسم کا مبہم احساس پیدا ہوا جس کی وضاحت نہیں کی جا سکتی۔ یہ گونگے کے گڑ کی طرح ہے جس سے کھانے والے کو لذت تو ملتی ہے لیکن وہ کسی دوسرے کو اسے بیان نہیں کر سکتا۔ مجھے ساربون کے ساڑھے تین سال کے قیام سے یہ محسوس ہوا کہ میرا ذہن اس سے کچھ مختلف ہے جیسا اس وقت تھا جب کہ میں وہاں داخل ہوا تھا۔ دسمبر ۱۹۲۹ء میں مجھے ڈاکٹریٹ کی ڈگری ملی اور جنوری ۱۹۳۰ء میں اٹلی کے بندرگاہ جینوا سے بمبئی کے لئے روانہ ہو گیا۔ آندرے وائل جہاز پر میرے ہم سفر تھے

ان کا تقرر علی گڑھ میں ریاضی کے پروفیسر کی حیثیت سے ہوگیا تھا۔ ہندوستان میں بھی کئی مرتبہ میری ان سے ملاقات رہی۔ میں ان کی قابلیت اور ذہانت کا پیرس میں بھی معترف تھا اور جہاز پر دس بارہ دن ساتھ رہنے سے مجھے ان کی ادبی لیاقت کا علم ہوا۔ جرمن اور فرانسیسی ادب پر ان کی نظر گہری تھی اور ان کا حافظہ اتنا اچھا تھا کہ جو کچھ انھوں نے پڑھا تھا وہ سب یاد تھا جس کا وہ گفتگو کے دوران میں برجستہ حوالہ دیتے تھے۔ پروست کے بڑے مداح تھے۔ خاص کر اس کے ناول "کھوئے ہوئے زمانے کی جستجو" کے وہ حصے، جن میں شعور اور لاشعور کے مناظر ایک دوسرے کے ساتھ پیوند تھے اور جو نظروں کے سامنے اسی طرح آتے تھے جیسے آہستہ حرکت کرنے والی تصویر سینما کے پردے پر دکھائی جا رہی ہو، انھیں بہت پسند تھے۔

مشرقی نوجوانوں کی آزمائش یورپ میں مشرقی ملکوں کے نوجوانوں کو بڑی ہی کڑی آزمائش سے گذرنا پڑتا ہے، خاص کر جنسی زندگی کے باب میں۔ وہاں وہ معاشرتی بندشیں اور پابندیاں نہیں ہوتیں جن سے انھیں اپنے دیس میں قدم قدم پر سابقہ پڑتا ہے۔ اس آزادی میں بے راہ روی کا خطرہ لگا رہتا ہے۔ میرے علم میں بعض ایسے نوجوان ہیں جو اس آزادی کی تاب نہ لا سکے جو انھیں یورپ کی فضا میں ایکا ایکی نصیب ہوگئی جس کا پہلے انھیں کبھی سان گمان بھی نہ تھا۔ انھوں نے اپنے کو جنسی دلدل میں ایسا پھنسایا کہ پھر اس سے باہر نہ نکل سکے، یا اگر نکلے بھی تو اپنے کاندھوں پر ذمہ داریوں کا پشتارہ لے کر۔ مشرقی نوجوانوں کی مثال یورپ میں تشنگانِ شوق کی ہے جن کی پیاس بجھانے کے لئے قدم قدم پر سامان موجود ہے۔ دل حسن کی نیرنگیوں کا جلوہ گاہ بنجاتا ہے جس کے اردگرد ایک طلسمی ہالا ہوتا ہے جس پر جذبے اور تخیل کے نقش و نگار بنے ہوتے ہیں۔

جب شوق کو محفلِ حسن میں بار پانے کا موقع مل گیا تو وہ پھر وہاں سے اٹھنے کا نام نہیں لیتا۔ بقول حسرت۔

کوئی ان کی بزمِ جمال سے کب اٹھا خوشی سے کہاں اٹھا
جو کبھی اٹھا بھی اٹھائے سے، تو اسی طرف نگراں اٹھا

مشرقی ملکوں کے دوسرے نوجوانوں کی طرح مجھ پر بھی یہ کیفیتیں گذریں۔ شروع شروع میں اس بات کا بھی پتا نہیں چلتا کہ دل چاہتا کیا ہے۔ جذبہ شوق کی آواز ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے دل کی گہرائیوں میں سے اٹھتی ہو۔ اس میں ایسا بہاؤ ہوتا ہے کہ انسان باوجود "جگرداری" کے دعووں کے خود بخود اسی کی جانب کھنچا چلا جاتا ہے۔ خاندانی روایات اور مذہب و اخلاق غیر شعوری ہیجانوں پر روک لگاتے ہیں لیکن انھیں فنا نہیں کر سکتے۔ نوجوان کی آنکھوں کے سامنے جبلت کے تقاضے اور اخلاقی قیود ایک دوسرے کے ساتھ "آنکھ مچولی کھیلتے" نظر آتے ہیں۔ پھر یہ غیر شعوری ہیجانوں کی بھول بھلیاں ایک ایسے تاریک غار میں غائب ہو جاتی ہے جس کے اور چھور کا پتہ نہیں۔

غالب نے ایک خط میں جو مرزا حاتم علی بیگ مہر کے نام ہے اپنے عشق مجازی کی نسبت یہ نکتہ بیان کیا ہے "پینسٹھ برس کی عمر ہے۔ پچاس سال عالم رنگ و بو کی سیر کی۔ ابتدائے شباب میں ایک مرشد کامل نے یہ نصیحت کی کہ ہم کو زہد و ورع منظور نہیں، ہم مانع فسق و فجور نہیں۔ پیو کھاؤ مزے اڑاؤ مگر یہ یاد رہے کہ مصری کی مکھی بنو، شہد کی مکھی نہ بنو۔ سو میرا اس نصیحت پر عمل رہا ہے۔" یورپ کے قیام کے زمانے میں میرا عمل بھی غالب کے مرشد کامل کی نصیحت پر رہا۔ میں زہد و تقویٰ کا نہ کبھی دعویدار تھا اور نہ ہوں۔ ہاں ایسا کبھی نہیں ہوا کہ گناہ کی خلش محسوس نہ کی ہو اور توفیق عمل کی

دعا نہ کی ہو۔ معصیت کو ہمیشہ معصیت سمجھا۔ اور ایسا کبھی نہیں ہوا کہ اچھے برے کا امتیاز مٹ گیا ہو۔ یہی چیز تھی جس نے مجھے بہت سی برائیوں سے بچایا اور مجھے کبھی ایسا ملوث نہ ہونے دیا کہ میں گناہ کی دلدل میں پھنسا رہ جاتا۔ یہ اخلاقی ارادہ جو مذہب کا تحفہ ہے مجھے ہمیشہ نیچے سے اوپر لے گیا اور میرے ڈگمگاتے قدموں کو سہارا دیکر زیادہ دنوں تک ادھر سے ادھر بھٹکنے نہیں دیا۔

مغربی تہذیب کا عام تاثر میں یورپ میں جہاں کہیں گیا میں نے محسوس کیا کہ سائنس اور میکنالوجی کی ترقی کی بدولت لوگوں کے سامنے کام کے علاوہ یہ مسئلہ بھی ہے کہ اپنی فرصت کے اوقات کس طرح کاٹیں۔ ایسا لگتا ہے جیسے کام سے زیادہ فرصت کو اہمیت حاصل ہے، اگر زیادہ نہیں تو برابر تو ضرور ہے۔ فرصت کو صرف کرنے کے لئے غیر محدود مواقع فراہم ہیں کہ اپنی پسند کے مطابق جو جہاں جانا چاہے، جائے۔ کھیل تماشے سیر و تفریح، گھوڑ دوڑ، قمار بازی، تھیٹر، سینما، نغمہ و سرود کی محفلیں، کلب، غیر ملکوں کی سیاحت، غرضکہ یہ سب اپنی اپنی جگہ تہذیبی زندگی کا جزو بن گئے ہیں لیکن باوجود ان تمام سہولتوں کے باشعور لوگوں کے دلوں میں تشویش اور تردد محسوس ہوا۔ میں سمجھتا ہوں یہ تشویش و تردد اہل مغرب کی ذہنی اور جذباتی زندگی کے ساتھ پیوست ہے۔ اس کا تعلق ان کی بعض قابلِ قدر روایات سے ہے۔ ان کا باشعور طبقہ جانتا ہے کہ سائنس کی دریافتیں اور ایجادیں اضافی نوعیت رکھتی ہیں۔ یہ کوئی دائمی اور کبھی نہ بدلنے والی صداقتیں نہیں ہیں۔ آج کی صداقت کل صداقت باقی نہیں رہتی بلکہ اس کی جگہ ایک بالکل نئی صداقت ظہور میں آجاتی ہے۔ سائنس میں یہ سلسلہ اسی طرح سے برابر جاری ہے اور جاری رہے گا۔ سائنس کے خمیر میں شک اور

تردد ہے جو اسے نئی ایجادوں اور دریافتوں پر اکساتا ہے۔ علم کی دنیا کے علاوہ بھی تشویش و تردد اہلِ مغرب کی زندگی کا جُز بن گئے ہیں اور پوری مغربی تہذیب ان سے متاثر ہے۔ مغربی انسان نے اپنی ذہنی جد و جہد سے جو ٹیکنالوجی تخلیق کی ہے اس میں تعمیری امکانوں کے ساتھ تخریبی امکان بھی پوشیدہ ہیں جو مغربی تہذیب کے لئے خطرہ ہیں آن کی وجہ سے اہلِ مغرب سخت تشویش اور خوف میں مبتلا ہیں۔ وہ خود اپنی مخلوق سے ڈرنے لگے ہیں کہ نہ جانے وہ کیا تباہی بول دے۔

میں یورپ میں ایسے لوگوں سے بھی ملا جو مذہب کی حقانیت کے قائل تھے اور اسے زندگی کی سب سے زیادہ قابل قدر چیز سمجھتے تھے۔ وہ انسانی عمل کی صلاحیت کو مانتے ہوئے توفیقِ الٰہی کا سہارا ضروری خیال کرتے تھے، اس لئے کہ وہ جانتے تھے کہ عمل کی ساری صلاحیتیں دھری کی دھری رہ جاتی ہیں اگر توفیقِ الٰہی شاملِ حال نہ ہو۔ توفیقِ الٰہی کا تصور عیسائیت اور اسلام دونوں میں عقیدت کی روح ہے۔ جب بندہ اپنے خالق کو پکارتا ہے تو اسے جواب ملتا ہے۔ اگر کوئی اس سے مدد مانگتا ہے تو اس کی مدد کی جاتی ہے۔ اس عقیدے سے عمل کے میدان میں نئے نئے راستوں کی نشان دہی ہوتی ہے۔ اس سے عمل میں مضبوطی اور خود اعتمادی بھی پیدا ہوتی ہے اور خوب سے خوب تر کی طرف بڑھنے کا حوصلہ بھی۔ اس سے شخصیت کا جادو بھی جگایا جاتا ہے اور تخلیق مقاصد کی مہم بھی سر کی جاتی ہے۔ روحانی آزادی اسی کا عطیہ ہے جو انسان کے اخلاقی عمل کی بنیاد ہے۔ اگر یہ آزادی نہ ہو تو انسان فطرت کی حدود سے آگے قدم نہ بڑھا سکے اور اس سے اپنے وجود سے ماورا ہونے کی خواہش سلب ہو جائے جس کے بغیر اخلاقی ارادہ بامعنی نہیں رہتا۔ اہلِ مغرب

کی ظاہری مادی زندگی اسی روحانی سرچشمے سے سیراب ہوتی ہے۔ ان کے علم وفن کی تخلیق اور ان کی حکومت ومعاشرت کی تنظیم میں بھی اس کی کارفرمائی ہے۔

ہندوستان میں عام طور پر یہ خیال پایا جاتا ہے کہ اہل مشرق میں روحانیت ہے اور اہل مغرب کی زندگی مادیت کی دلدل میں پھنسی ہوئی ہے۔ یورپ جانے سے قبل میرا بھی یہی خیال تھا لیکن میں نے وہاں کے قیام میں جو کچھ دیکھا اس سے میری رائے بدل گئی۔ یہ سچ ہے کہ صنعتی تہذیب میں مزدور پیشہ طبقے کی ویسی حالت نہیں ہے، جیسی کہ ہونی چاہئے لیکن پھر بھی ان کی حالت ہمارے یہاں کے غریبوں سے لاکھ درجہ بہتر ہے۔ انھیں پیٹ بھرنے کو روٹی اور تن ڈھانکنے کو کپڑا میسر ہے۔ میں سمجھتا ہوں دنیا کے کسی ملک میں عوام کا غذائی معیار اتنا پست نہیں جتنا کہ ہمارے یہاں ہے اور نہ کسی ملک میں غریب طبقہ اس طرح سے میلے چیتھڑوں میں پھرتا ہے جیسا کہ ہمارے ملک میں۔

ہمارے یہاں روحانیت کے لمبے چوڑے دعوے ہیں لیکن معاشری حس بس نام ہی کو ہے۔ شہروں میں دسمبر جنوری کی کڑاکے کی سردی میں ہزاروں آدمی رات بھر آسمان کے نیچے ٹھٹھرتے ہیں لیکن ہماری معاشری حس بیدار نہیں ہوتی۔ یورپ میں کہیں ایسا ہو تو انقلاب ہو جائے۔ میں نے اپنے یورپ کے دوران قیام میں نہ لوگوں کو ٹھٹھرتے دیکھا نہ چیتھڑوں میں دیکھا اور نہ بھیک مانگتے دیکھا۔ وہاں انسانی دکھ درد کا احساس جتنا ہے ہمارے یہاں روحانیت کے دعووں کے باوجود نہیں ہے۔ اس لئے میں نے یہ رائے قائم کی جس میں چالیس سال گذرنے کے بعد بھی کوئی تبدیلی نہیں آئی کہ اہل یورپ میں ہمارے مقابلے میں انسانیت اور انسان دوستی زیادہ ہے۔ انگریزوں سے ہمارا حاکم اور محکوم کا جو غیر فطری تعلق تھا اس کی وجہ سے انسانی اقدار جو اہل یورپ

کی زندگی کا جز ہیں ہماری نظروں سے اوجھل ہو گئی تھیں۔ میں خود انگلستان دو مرتبہ گیا اور کئی مہینے وہاں قیام کیا۔ میں نے انگریزوں کو جتنا قریب سے دیکھا اتنا ہی میں ان کی عظمت کا قائل ہوا۔ اگرچہ انگریزی سامراج سے مجھے نفرت تھی لیکن میں انگلستان سے جب واپس آیا تو انگریزی کیریکٹر کا مداح بن کر آیا۔ میں نے جو رائے انگریزوں کے متعلق اس وقت قائم کی تھی اس پر میں اب بھی قائم ہوں۔ آج بھی انگریز قوم میں جو عظمت ہے وہ یورپ کی کسی دوسری قوم میں نہیں، اگرچہ معاشرتی زندگی میں میرے نزدیک فرانسیسی سب سے زیادہ مہذب ہیں۔ انھوں نے اپنے یہاں نسلی امتیاز کو جس طرح سے مٹا دیا یورپ کی کوئی قوم نہیں مٹا سکی۔ انگلستان میں ایک ہندوستانی کبھی اتنا بے تکلف نہیں ہو سکتا جتنا کہ فرانس میں۔ اس لئے میں پیرس کو مغربی تہذیب کا سب سے بڑا مرکز سمجھتا ہوں۔ میں جرمنی میں بھی ایک مہینہ رہا۔ ڈرسڈن میں طلبا کی بین اقوامی کانفرنس میں شرکت کے لئے گیا تھا۔ وہاں سے برلن گیا۔ ایک ہفتہ وہاں رہا۔ پھر ہائیڈل برگ گیا جہاں میرے چھوٹے بھائی محمود میاں ڈاکٹریٹ کی تیاری کر رہے تھے۔ ان کے ساتھ دو ہفتے قیام رہا۔ جرمن لوگ بھی مشرق کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھتے تھے۔ میں جس زمانے کا ذکر کر رہا ہوں وہ ہٹلری طوفان سے پہلے کا ہے۔ جرمنوں کے متعلق میں نے یہ رائے قائم کی کہ وہ بھولے لوگ ہیں۔ بلا کے محنتی، بڑے جفاکش، انہماک سے کام کرنے والے۔ سائنس، ٹیکنالوجی اور صنعت و حرفت میں انھوں نے جو ترقی کی ہے وہ حیرت انگیز ہے۔ یہ سب کچھ ان کی غیر معمولی محنت اور مشقت کا نتیجہ ہے۔ بلا شبہہ ان میں انگریزوں اور فرانسیسیوں کے مقابلے میں توانائی اور قوت عمل زیادہ ہے لیکن ان کی ساری سرگرمی اور ریل پیل یک طرفہ ہے۔ ان کے ہاں وہ توازن نہیں جو انگریزوں میں ہے۔ ان میں انگریزوں کی سی

چلت پھرت، ہشیاری اور معاملہ فہمی ہیں۔ دنیوی معاملات میں انگریزوں کی سوجھ بوجھ جرمنوں اور فرانسیسیوں سے زیادہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بین اقوامی سیاست میں وہ دونوں کو باری باری سے مات دیتے رہے ہیں۔ انگریزوں کی قوم قدیم سے تجارت پیشہ ہے اسلئے وہ تدریج اور مفاہمت کے اصول کو عملی زندگی میں برتنا جانتی ہے۔ ان کے یہاں ادب اور سیاست دونوں میں جوش اتنا نہیں جتنا کہ دھیما پن پایا جاتا ہے۔ وہ جو قدم اٹھاتے ہیں سوچ سمجھ کر، تجربے کی روشنی میں اٹھاتے ہیں۔ ان کی پوری تاریخ میں اعتدال اور افادی ذہنیت کا اظہار ملتا ہے۔ ان کی دوستی یا دشمنی کسی سیاسی اصول کی وجہ سے نہیں ہوتی بلکہ عملی اور افادی محرک کی بنا پر۔ جہاں اصول پرستی ہوگی وہاں جوش و خروش کا ہونا لازمی ہے، جس سے انگریزی مزاج ابا کرتا ہے۔ فرانسیسی جب جمہوریت کا دعویدار ہوتا ہے تو اپنے بادشاہ کی گردن کاٹ دیتا ہے، مگر انگریز جمہوریت کا دعویدار بھی ہے اور اس نے شاہی کو بھی برقرار رکھا، چاہے علامتی طور ہی پر کیوں نہ ہو۔ فرانسیسی مزاج میں منطقی پن ضرورت سے زیادہ ہے حالانکہ زندگی سب کچھ ہے سوائے منطق کے جرمن لوگوں میں اصول پرستی ضرورت سے زیادہ ہے، جو ادعائی رنگ اختیار کرلیتی ہے۔ جرمنوں اور فرانسیسیوں دونوں نے جمہوری پارلیمانی نظام انگلستان سے مستعار لیا لیکن دونوں ملکوں میں انکی صورت مسخ ہوگئی۔ سیاسی نظام یا معاشری ادارے ایک ملک سے دوسرے ملک میں اسی وقت منتقل ہو سکتے ہیں جبکہ فضا اسکے لئے سازگار ہو۔ لیکن دوسری جگہ جانے کے بعد انکی صورت کا تھوڑا بہت بدلنا لازمی ہے جو مقامی حالات کا اقتضا ہے۔

یورپ کی مختلف قوموں میں ظاہری یکسانیت کے باوجود ان کی مقامی روایات موجود ہیں جو ان کی زندگی میں رچی ہوئی ہیں۔ جب وہ بیرونی ادارے قائم کرنے کی کوشش کرتی ہیں تو یہ مقامی روایات اُبھر آتی ہیں اور انھیں اپنا رنگ دینے کی

کوشش کرتی ہیں۔ انیسویں صدی میں یورپ کے اکثر ملکوں میں پارلیمانی نظام حکومت قائم کرنے کی کوشش کی گئی لیکن کہیں بھی اسے کامیابی نصیب نہیں ہوئی۔ جہاں تھوڑی بہت کامیابی ہوئی وہاں ایک دم سے بادِ مخالف کا ایسا جھکڑ آیا کہ سارا تانا بانا بکھر گیا۔ اس طرح جہاں سے چلے تھے پھر وہیں پہنچ گئے۔ یہی تجربہ اب مشرقی قوموں میں دہرایا جا رہا ہے۔ اس کے عملی نتائج ابھی تاریخ کے پردے میں چھپے ہوئے ہیں اس لئے ان پر پہلے سے کوئی حکم نہیں لگایا جا سکتا لیکن اتنا یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ مشرقی ملکوں میں بھی پارلیمانی نظامِ حکومت، جو انگریزوں کی دین ہے، اس شکل و صورت میں قائم نہیں رہ سکے گا جو انگلستان میں ہے۔ دنیا کی کوئی قوم تاریخی عمل کو یک بہ یک ظہور میں نہیں لا سکتی۔ اس میں قومی احوال کے لحاظ سے تصرف پذیری لازمی ہے تاریخ کی اس دھوپ چھاؤں میں قومیں اپنی تقدیر بناتی اور بگاڑتی ہیں۔

ساتواں باب (۷)

دیارِ تلنگ

ہندوستان واپسی میں فرانس سے جنوری ۱۹۳۳ء کے آخری ہفتہ میں ہندوستان واپس آیا۔ بمبئی سے سیدھا دہلی روانہ ہوا۔ ذاکر میاں کے ساتھ ہفتہ عشرہ ٹھہر کر راس مسعود مرحوم سے ملنے علی گڑھ گیا۔ جب راس مسعود سے پیرس میں ملاقات ہوئی تھی تو انھوں نے اصرار سے کہا تھا کہ علی گڑھ ضرور آنا۔ میرے دوست آندرے وائل بھی وہاں پہنچ چکے تھے۔ میں نے سوچا چلو، دیکھیں ان کا کیا حال ہے۔ علی گڑھ میں دو روز ٹھہر کر وہیں سے تین روز کے لئے اپنے آبائی وطن قائم گنج گیا۔ راس مسعود کی بڑی باغ و بہار شخصیت تھی۔ ان کی ذات میں مشرقی اور مغربی دونوں رنگ پہلو بہ پہلو نظر آتے تھے۔ بڑے خوش گفتار تھے۔ انگریزی اور اردو دونوں زبانیں نہایت خوبی سے بولتے تھے۔ علم مجلس کے ماہر تھے۔ ایسے کہ کم لوگ ہوں گے۔ ادبی ذوق نہایت ستھرا تھا۔ فرانسیسی زبان بلا تکلف بولتے تھے۔ انھیں میوسے اور ہیوگو کی بعض نظمیں یاد تھیں جنھیں بڑے شوق سے ٹھمک ٹھمک کر سناتے تھے۔ ان کے ساتھ دوپہر کا کھانا کھایا۔ کئی گھنٹے بہت لطف سے گذرے۔ وہاں سے رشید احمد صدیقی کے پاس گیا۔

میں ان سے ہندوستان اور وہ مجھ سے فرانس کا حال دریافت کرتے رہے۔

حیدرآباد دہلی واپس آکر چند ہفتے یہاں ٹھہرا اور مارچ کے شروع میں حیدرآباد چلا گیا۔ اکبر یار جنگ کے مکان پر ترپ بازار میں میرا قیام تھا۔ مولوی عبدالحق کو جب میرے حیدرآباد پہنچنے کی اطلاع ملی تو وہ اکبر یار جنگ کے یہاں تشریف لائے۔ مجھ سے کہنے لگے "میں انگلش اردو ڈکشنری کا کام کر رہا ہوں۔ اگر تمھارا جی چاہے تو تم بھی اس میں شریک ہو جاؤ اور میرے ساتھ قیام کرو۔" میں نے کہا "بہت اچھا، میں حاضر ہوں۔" انھوں نے اکبر یار جنگ سے میرے جانے کی اجازت لے لی۔ دوسرے دن صبح ان کی موٹر مجھے لینے پہنچ گئی۔ مولوی صاحب نجار اہل پر خدیو جنگ کے مکان میں فروکش تھے۔ پہلے اس مکان میں جسے حیدرآباد میں عام طور پر "بھوت بھون" کہتے تھے، پروفیسر اسپیٹ رہتے تھے۔ جب انھیں بیگم پیٹھ میں مکان مل گیا تو مولوی صاحب نے یہ مکان کرائے پر لے لیا۔ یہاں وہ کئی سال رہے۔ گرمی کی تعطیل میں اورنگ آباد چلے جاتے تھے جہاں اس وقت تک انجمن ترقی اردو کا دفتر تھا۔ اپریل میں جب وہ اورنگ آباد تشریف لے گئے تو میں بھی ان کے ساتھ گیا۔ کچھ دنوں بعد وہاں ڈاکٹر سید عابد حسین اور پروفیسر محمد مجیب بھی آ گئے۔ ہم سب روزانہ صبح ۹ بجے سے ایک بجے تک اور پھر سہ پہر میں ۵ بجے سے مغرب تک انگلش اردو ڈکشنری کے ترجمے پر نظرثانی کرتے تھے۔ میں وسط جولائی میں مولوی صاحب کے ساتھ حیدرآباد آ گیا اور عابد صاحب اور مجیب صاحب دہلی روانہ ہو گئے۔ یہاں پھر ڈکشنری کا کام شروع ہو گیا۔ اب میں تنہا مولوی صاحب کے ساتھ نظرثانی کے کام میں شریک تھا۔ کبھی کبھی ہاشمی فریدآبادی آ جاتے تھے۔ مولوی صاحب کے خاص دوستوں میں سراج الحسن تھے جو اس زمانے میں ہائی کورٹ کے جج

تھے۔ مولوی صاحب نے ان سے میرا تعارف کرایا۔ وہ میرے کاندھے پر ہاتھ رکھکر کہنے لگے :" میاں، اگر حیدر آباد میں خوش رہنا اور ترقی کرنا چاہتے ہو، تو کام مت کرنا۔ کام کرنے والے کی پوچھ گچھ ہوتی ہے اور لوگ دشمن ہو جاتے ہیں۔ نہ کرنے والے مزے میں رہتے ہیں " مولوی صاحب ان کے سامنے قہقہہ مار کر کہنے لگے :" وہ ان کے کہنے پر نہ جانا۔ یہ دل لگی میں اسی طرح کی باتیں کرتے ہیں " ڈاکٹر سراج الحسن بڑے دلچسپ آدمی تھے۔ خورد و نوش کے شوقین، چہ غم قسم کے انسان۔ وہ عقل پرستی میں فرانسیسی قاموسیوں (ان سائیکلو پیڈیسٹ) کے بڑے قائل تھے۔ والٹیر کے بھی مداح تھے۔ ان سے مولوی صاحب کے یہاں ہر دوسرے تیسرے روز شام کے وقت ملاقات رہتی تھی۔ شام میں جب ان کے شغل کا وقت قریب آتا تو ان کا ملازم عبداللہ آکر کہتا "حضور دوا پی لیجئے"، چونکہ ان کے پیروں پر فالج کا اثر تھا اس لئے چلنے میں دشواری ہوتی تھی۔ چار چھ قدم ہٹ کر زینے کی آڑ میں ہو جاتے اور شغل ختم کر کے پھر مولوی صاحب کے پاس آ بیٹھتے۔ اسے میں ان کی شرافت سمجھتا ہوں کہ وہ مولوی صاحب پر یہ بات ظاہر نہیں کرنا چاہتے تھے کہ وہ شراب پینے جا رہے ہیں۔ اور یہ مولوی صاحب کی عالی ظرفی تھی کہ باوجود اس کے کہ وہ جانتے تھے کہ وہ کس غرض سے اٹھ کر جا رہے ہیں، انھوں نے اپنی لاعلمی کو برقرار رکھا اور کبھی اسے ظاہر نہیں ہونے دیا کہ وہ سب کچھ جانتے ہیں۔ دونوں بزرگ ایک دوسرے کے ساتھ عزت و توقیر سے پیش آتے تھے۔ کبھی کبھی ڈاکٹر سراج الحسن کے ساتھ ان کی چھوٹی بچی بھی آتی تھی جس سے مولوی صاحب بہت محبت کرتے تھے۔ جب ڈاکٹر سراج الحسن اپنے شغل کے لئے چلے جاتے تو مولوی صاحب بچی کے لئے پھل اور میوہ لاکر دیتے۔ کبھی کبھی بچی ان کے ساتھ ان کے کمرے

میں چلی جاتی جہاں ایک دیواری الماری میں پھل چنے رہتے تھے۔ مولوی صاحب کو پھلوں کا بہت شوق تھا۔ کشمیر اور دہلی سے برابر پارسلیں آتی رہتیں اور ان کی الماری ہمیشہ بھری پُری رہتی تھی، بچی ایک دن ان سے کہنے لگی: "مولوی صاحب، آپ کی دوکان میں بڑے اچھے اچھے پھل ہیں"۔ مولوی صاحب بہت ہنسے۔ ڈاکٹر سراج الحسن جب واپس آئے تو انھیں بچی کا یہ فقرہ سنایا اور اس کی ذہانت کی تعریف کی۔ ڈاکٹر سراج الحسن نے کہا کہ "اتنے پھل سوائے پھلوں کی دوکان کے اور کہاں ہو سکتے ہیں"۔ ہم سب ہنسنے لگے۔ یہ بچی اب مسز سعادت علی خاں ہیں جو ترکی میں ہمارے سفیر ہیں۔

اکتوبر ۱۹۳۰ء میں جب ابن حسن مرحوم، جو عثمانیہ یونیورسٹی کے شعبۂ تاریخ میں ریڈر تھے، دو سال کی تعلیمی رخصت پر انگلستان گئے، تو میرا ان کے قائم مقام کی حیثیت سے تقرر ہوا۔ دو سال کے قریب ہونے والے تھے کہ علی یار خاں (موجودہ علی یاور جنگ) جو اس وقت پروفیسر تھے، ناظم معلوماتِ عامہ (ڈائرکٹر آف انفارمیشن) ہو کر چلے گئے، تو ان کے سلسلے میں میں کام کرتا رہا۔ پھر جب ابن حسن مرحوم کا انتقال ہو گیا تو میں ان کی جگہ مستقل ہو گیا۔ پروفیسر ہارون خاں شروانی ہمارے صدرِ شعبہ تھے۔ اُس وقت تاریخ اور سیاسیات کا ایک ہی شعبہ تھا، بعد میں یہ دونوں شعبے الگ الگ ہو گئے۔

مجھے خوشی تھی کہ مجھے عثمانیہ یونیورسٹی میں کام کرنے کا موقع ملا اس لئے کہ میں عرصے سے اس غیر معمولی علمی تجربے کے متعلق سنتا رہا تھا۔ یورپ کے دورانِ قیام میں محی الدین قادری زور سے ملاقات رہی اور ان سے یہاں کے تفصیلی حالات معلوم ہوئے۔ وہ وحید الدین سلیم کے خاص شاگرد اور اپنے استاد کے بے حد مداح تھے۔ لندن سے پی۔ایچ۔ڈی کرنے کے بعد ادارۂ ادبیاتِ اردو قائم کر کے دکن میں اردو کی بڑی خدمت انجام

دی۔ دکنی اردو کے متعلق ان کی تحقیقات کی قدر و قیمت مسلم ہے۔ افسوس کہ ستمبر ۱۹۶۲ء میں سری نگر میں ان کا انتقال ہو گیا، جہاں وہ یونیورسٹی میں صدر شعبۂ اردو کی خدمت انجام دے رہے تھے۔

عثمانیہ یونیورسٹی | میں نے عثمانیہ یونیورسٹی میں جب کام شروع کیا تو آرٹس کے علاوہ سائنس کے تمام مضامین کی تعلیم اردو کے ذریعے ہوتی تھی۔ دارالترجمہ ۱۴ اگست ۱۹۱۷ء کو قائم ہوا اور وضع اصطلاحات اور ترجموں کا کام عثمانیہ یونیورسٹی کے شروع ہونے سے قبل ہو رہا تھا۔ ۲۸ اگست ۱۹۱۹ء کو عثمانیہ یونیورسٹی کا افتتاح آغا منزل میں ہوا جہاں آجکل اسٹیٹ بنک آف حیدرآباد ہے۔ توپ کا سانچہ اور اس کے قرب و جوار میں متعدد عمارتیں کرائے پر لی گئیں۔ آغا منزل کے علاوہ لیاقت منزل، قانون منزل اور کتب خانے کی عمارتیں تھیں جن میں مختلف شعبے تقسیم کر دیئے گئے تھے۔ تاریخ کی تعلیم قانون منزل کے ایک حصہ میں ہوتی تھی۔ میں نے جب کام شروع کیا تو عبدالرحمٰن خاں پرنسپل کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ ان سے قبل ڈاکٹر عبدالستار صدیقی اس خدمت پر تین سال رہ چکے تھے۔ یونیورسٹی کے ابتدائی تین سالوں میں راس مسعود اور مہدی یار جنگ نے بھی عارضی طور پر انتظامی کام سنبھالا تھا۔ دارالترجمہ میں نہایت لائق اور تجربہ کار عالموں کو رکھا گیا جن میں مولانا عبدالماجد دریابادی، مرزا محمد ہادی رسوا، قاضی تلمذ حسین، مولانا عبداللہ عمادی، محمد الیاس برنی اور سید ہاشمی فریدآبادی کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

وضع اصطلاحات کے لئے جو کمیٹیاں بنائی گئی تھیں ان میں ماہرین فن کے علاوہ دو اصحاب زبان کے ماہروں کی حیثیت سے شریک ہوتے تھے، ایک سید علی حیدر

طباطبائی اور دوسرے مولوی وحید الدین سلیم۔ یہ دونوں اپنے اپنے رنگ میں منفرد تھے۔ سید علی حیدر طباطبائی سے، جنھیں اعلیٰحضرت نے حیدر یار جنگ کے خطاب سے نوازا تھا، مجھے نیاز حاصل کرنے کا موقع ملا لیکن بدقسمتی سے مولوی وحید الدین سلیم کا میرے حیدرآباد پہنچنے سے کچھ عرصہ قبل انتقال ہو چکا تھا۔ سید علی حیدر طباطبائی نے اپنی جوانی کا زمانہ واجد علی شاہ کے ساتھ کلکتہ کے مٹیا برج میں گذارا تھا۔ لکھنؤ کے اعلیٰ طبقے کی صحبتیں اٹھا چکے تھے۔ عربی اور فارسی کی اعلیٰ استعداد رکھتے تھے۔ ان کی شستہ اردو سند کا درجہ رکھتی تھی۔ انھوں نے جو شرح دیوان غالب شائع کی اسے بڑی مقبولیت حاصل ہوئی۔ خود بھی اچھے شاعر تھے۔ انگریزی بھی سیکھ لی تھی۔ چنانچہ گرے کی ایلی جی (نوحے) کو انھوں نے اردو کا جامہ پہنایا اور اس کا نام "گورِ غریباں" رکھا۔ یہ نظم بجا طور پر اردو کی اعلیٰ پایے کی نظموں میں شمار ہوتی ہے۔ مرزا محمد ہادی رسوا بھی لکھنؤ کی ٹکسالی زبان پر سند مانے جاتے تھے۔ ان کا ناول "امراؤ جان ادا" اردو کے چوٹی کے ناولوں میں ہے۔ انھیں فلسفے میں بھی درک تھا۔ لیکن انھوں نے فلسفے کی کتابوں کے جو ترجمے کیے وہ بڑے بوجھل ہیں۔ آسانی سے سمجھ میں نہیں آتے۔ مولانا عبد الماجد دریابادی کے ترجمے اس کے برخلاف سلیس اور شستہ ہیں اور ان میں ادبی چاشنی ہے جو مولانا کی ہر تحریر کی خصوصیت ہے۔ مولوی وحید الدین سلیم دہلی اسکول کی نمایندگی کرتے تھے۔ میں نے ان لوگوں سے جنھوں نے دار الترجمہ کی ابتدائی کمیٹیوں میں شرکت کی تھی سنا ہے کہ مولوی وحید الدین سلیم اپنی قدرتی ذہانت اور جودتِ طبع کے باعث سب پر چھا جاتے تھے۔ ان کے حالات مجھے مولوی عبد الحق اور دوسرے پروفیسروں سے معلوم ہوئے۔ وہ عثمانیہ یونیورسٹی میں اردو کے پروفیسر اور عربی اور فارسی کے جید عالم تھے۔ اعلیٰ درجے کے اخبار نویس

اور بلند پایہ کے انشا پرداز تھے۔ وضع اصطلاحات کے معاملے میں کوئی شخص ان کی ہمسری نہیں کر سکتا تھا۔ نئے نئے لفظ بنانے میں انھیں خاص ملکہ تھا اور اس باب میں جس مہارت بالغ نظری اور اصابت رائے کا اظہار کرتے تھے اس کی مثال نہیں ملتی۔ وہ اردو زبان کی فطرت اور اس کے مزاج سے خوب واقف تھے "وضع اصطلاحات علمیہ" ان کا ایسا علمی کارنامہ ہے جو ہمیشہ قدر کی نگاہ سے دیکھا جائیگا۔ ان کے مضامین اور نظموں کے مجموعے "افادات سلیم" اور "افکار سلیم" کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔

جوشؔ ملیح آبادی ناظر ادبی کی خدمت پر مامور تھے۔ ان کا کام یہ تھا کہ ترجموں پر ادبی لحاظ سے ایک نظر ڈال لیں جو ترجمے وہ دیکھ چکے تھے ان میں سے بعض میرے پاس فنی نظر ثانی کے لئے آئے۔ میں نے دیکھا کہ جوشؔ صاحب نے ان پر بڑی اچٹتی ہوئی نظر ڈالی تھی۔ مجھے ان ترجموں کے ادبی استقام پر بھی رائے دینی پڑی۔ بعض ترجموں میں چالیس پچاس صفحوں پر کہیں دو ایک جگہ جوشؔ صاحب پنسل سے نشان لگا دیتے اور کبھی اپنی رائے بھی لکھ دیتے تھے۔ جہاں کہیں انھوں نے اپنی رائے لکھی تھی مجھے اس سے اتفاق تھا لیکن انھوں نے اپنا فرض جس محنت سے ادا کرنا چاہئے تھا، نہیں ادا کیا۔ یہ شکایت میرے علاوہ اور دوسرے پروفیسروں کو بھی تھی۔ ویسے میں جوشؔ صاحب کو اعلیٰ پایہ کا شاعر سمجھتا تھا لیکن مجھے ان سے اقبال کی شاعری کے متعلق اختلاف تھا اور یہ اختلاف ہمیشہ قائم رہا۔ وہ اقبالؔ کو بڑا شاعر تسلیم کرنے سے انکار کرتے تھے اور میں اسے اپنے دور کا اردو کا سب سے بڑا شاعر مانتا ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ جوشؔ صاحب کو غالباً یہ بات ناگوار تھی کہ لوگ اقبال کی اتنی تعریف کیوں کرتے ہیں، یہ حق تو ان کا ہے۔ میں اسے ان کی سادہ لوحی پر محمول کرتا ہوں۔ دیرپا اور سچی عظمت نہ کسی کے

پروپیگنڈے سے مانی جاتی ہے اور نہ دبائی جاتی ہے۔ اگر کسی میں جوہر قابل ہے تو وہ خود چمک اٹھتا ہے۔ جوش صاحب کے ہاں لفظوں کا خزانہ بہت وسیع ہے اور وہ ان کے استعمال پر پوری قدرت رکھتے ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ بعض دفعہ لفظوں کی بہتات اور معانی کی کمی کے باعث ان کے کلام میں تصنع پیدا ہو جاتا ہے۔ شاعرانہ اخلاص لفظوں کی غیرضروری بہتات اور ان کی دھن گرج کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ بایں ہمہ اردو والوں نے جوش صاحب کی قدردانی ان کی زندگی میں جتنی کی ہے۔ اتنی سوائے اقبال کے اور کسی کی نہیں ہوئی۔ وہ یقیناً اسی کے مستحق ہیں اور انھیں اس پر قانع رہنا چاہئے۔

مولوی عبدالحق | میں عثمانیہ یونیورسٹی کا اصلی بانی مولوی عبدالحق کو سمجھتا ہوں۔ جب حیدر نواز جنگ (سر اکبر حیدری) ایجوکیشن سکریٹری ہوئے تو مولوی عبدالحق نے جو ان کے مزاج میں دخیل تھے، اردو زبان کے ذریعے سے اعلیٰ تعلیم دینے کی تجویز ان کے روبرو پیش کی۔ حیدر نواز جنگ کی تحریک پر میر عثمان علی خاں نظام ریاست حیدرآباد نے اس تجویز کو شرفِ قبولیت بخشا۔ سب سے پہلے یہ سوال پیدا ہوا کہ اردو میں اعلیٰ معیار کی علمی کتابیں تالیف و ترجمہ کرائی جائیں۔ چنانچہ سررشتۂ تالیف و ترجمہ جو عام طور پر دارالترجمہ کے نام سے مشہور ہے قائم کیا گیا۔

مولوی عبدالحق نے اپنے ایک خط میں بتایا ہے کہ عثمانیہ یونیورسٹی کا خیال کیسے پیدا ہوا: ”آپ پوچھیں گے کہ اس کی ابتدا کیسے ہوئی۔ ہوا یہ کہ ایک بار سر اکبر اورنگ آباد آئے اور میں نے ان کی صدارت میں ایک تقریر مروجہ تعلیم اور طریقۂ تعلیم پر کی اور اس سے وہ بہت متاثر ہوئے۔ اس کا اعتراف خود انھوں نے اپنی ایک تقریر میں کیا جو انھوں نے اورنگ آباد کے ایک سالانہ جلسے میں کی تھی۔ .... وہ نورس (کالج کا رسالہ)

میں چھپی تھی۔۔۔۔۔۔ ۔۔خیر، حیدری صاحب تو آمادہ ہوگئے۔ وہ خود اس کی تحریک نہیں کر سکتے تھے۔ البتہ ان کے سامنے یہ تحریک آئے تو وہ کارروائی کرنے کو تیار تھے۔ الما لطیفی (ڈائرکٹر تعلیمات) کے ذریعے اس تحریک کو پیش کرنا خلافِ مصلحت تھا۔ وہ اس کے مخالف تھے۔ اس زمانے میں دارالعلوم کے پرنسپل مولوی حمید الدین مرحوم تھے، انھوں نے میرے متواتر اصرار پر یہ عہدہ قبول کیا تھا۔ میں نے انھیں ہنچال بنا لیا اور ان سے کہا کہ آپ بحیثیت پرنسپل دارالعلوم یہ تحریک کیجئے۔ انھوں نے کہا تم لکھ دو میں دستخط کر دوں گا۔" میں نے ہوم سکریٹری کے نام چند سطریں لکھ کر درخواست پیش کر دی۔ ہوم سکریٹری اس وقت سر اکبر حیدری تھے آب بموجب انگریزی محاورے کے گیند لڑھکنا شروع ہوئی۔ مجھے اورنگ آباد سے اسپشل ڈیوٹی پر بلایا گیا۔ کام دھیرے دھیرے شروع ہوا۔ عرضداشت جو اعلیٰ حضرت کی بارگاہ میں منظوری کے لئے پیش کی گئی تھی وہ میری ہی لکھی ہوئی تھی۔"

مولوی عبدالحق اپنی ذات سے انجمن تھے۔ وہ علی گڑھ سے بی۔اے پاس کرنے کے بعد ۱۸۹۵ء میں حیدرآباد آئے اور مدرسۂ آصفیہ کے ہڈ ماسٹر مقرر ہوئے۔ یہ مدرسہ سر افسر الملک کے ایما پر ان کے داماد ممتاز یار الدولہ نے خاص طور پر فوجیوں کے بچوں کی تعلیم کے لئے قائم کیا تھا۔ کچھ عرصے اس اسکول کے ہڈ ماسٹر رہنے کے بعد وہ انسپکٹر آف اسکولز اور پھر ڈویژنل انسپکٹر آف اسکولز مقرر ہو گئے، عثمانیہ یونیورسٹی کے قیام کے بعد انھیں دارالترجمہ کا ڈائرکٹر (ناظم) مقرر کیا گیا۔ یہاں سے وہ اورنگ آباد کالج کی پرنسپلی پر گئے اور مولوی وحید الدین سلیم کے انتقال پر عثمانیہ یونیورسٹی میں اردو کے صدر شعبہ ہوئے۔

مولوی عبدالحق ۱۹۱۲ء میں انجمن ترقی اردو کے اعزازی سکریٹری مقرر ہوئے۔ یہ انجمن ۱۹۰۱ء میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی ایک شاخ کے طور پر قائم ہوئی تھی۔ مولوی صاحب نے انجمن کے بے جان قالب میں نئی روح پھونک دی۔ ان کی مستعدی، انہماک اور سچی لگن نے انجمن کی کمزور بنیادوں کو مضبوط کر دیا۔ انھوں نے ۱۹۲۱ء میں سہ ماہی "اردو" نکالنا شروع کیا جو اعلیٰ معیار کا رسالہ تھا اور وہ اب بھی کراچی سے نکلتا ہے۔ اس میں پہلی مرتبہ اردو زبان پر تحقیقاتی مضامین شائع ہوئے۔ چند سال بعد سہ ماہی رسالہ "سائنس" بھی جاری ہوا جس کا مقصد یہ تھا کہ سائنٹفک علوم پر اردو میں مضامین لکھائے جائیں اور اردو داں لوگوں کو ان علوم سے روشناس کرایا جائے۔

صداقت شعاری مولوی صاحب کا فطری جوہر تھا جس کا اظہار وہ بے باکی سے کرتے تھے اور ایسا کرنے میں کبھی مصلحت کا خیال نہیں کرتے تھے۔ جو لوگ مصلحت کا زیادہ خیال رکھتے ہیں انھیں وہ منافق کہتے تھے۔ ان کی سیرت کا ایک اور وصف ان کی دریا دلی اور فیاضی تھی۔ وہ عزیزوں، دوستوں طالبعلموں پر بیدریغ خرچ کرتے تھے۔ نادار طلبا کی وہ بلا امتیاز مذہب و ملت کھلے دل سے امداد کرتے تھے۔ دکن میں ایسے طلبا کی کافی تعداد موجود ہے جن کی انھوں نے امداد کی اور جن میں سے بعض آیندہ اعلیٰ عہدوں پر فائز ہوئے۔ مولوی عبدالحق کی مہمان نوازی اور دسترخوان کی وسعت مشہور تھی۔ بلا مبالغہ ہر روز کوئی نہ کوئی نیا مہمان ان کے یہاں آتا تھا۔ ان کے دسترخوان پر سادہ اور لذیذ کھانے اور طرح طرح کی مٹھائیاں اور پھل سیرچشمی کے ساتھ صرف ہوتے تھے۔ مولوی صاحب کے کردار کی یہ خصوصیت تھی کہ جس کے موافق ہوتے، دل سے موافق ہوتے اور اس کے لئے سب کچھ کرنے کو آمادہ

رہتے۔ ان کی مخالفت بھی ڈھکی چھپی نہیں تھی۔ جس کے مخالف ہوتے وہ جانتا تھا کہ وہ اس کے مخالف ہیں۔ ان کے ہاں درمیانی راستہ اور مصلحت آمیز طریق کار نہ تھا۔ ہمیشہ دو ٹوک بات کرتے تھے، لگی لپٹی رکھنا جانتے ہی نہ تھے۔ ان کی سیرت کا ایک اور نمایاں وصف یہ تھا کہ وہ ارادے کے پکے اور نہایت مستقل مزاج تھے۔ دشواریوں سے کبھی گھبراتے نہیں تھے بلکہ ان کا خندہ پیشانی سے مقابلہ کرتے تھے۔ شکوہ شکایت اپنی شان کے خلاف سمجھتے تھے۔

مولوی صاحب نے انجمن ترقی اردو کا دفتر اورنگ آباد میں رابعہ دورانی کے مقبرے کے پاس جسے بی بی کا روضہ کہتے ہیں قائم کیا تھا اور وہیں ایک عمارت میں انجمن کا مطبع بھی تھا۔ یہ مقبرہ اورنگ آباد شہر کے ایک سرے پر کوہستانی سلسلے کے قریب واقع ہے جسے تاج محل کے نمونہ پر بنایا گیا تھا۔ فرق یہ ہے کہ تاج محل سنگ مرمر کا ہے اور یہ اینٹ چونے کا۔ میں نے گرمیوں کی کئی چھٹیاں یہاں گذاریں۔ نہایت پر فضا مقام ہے۔ یہ کوہستانی سلسلہ ایلورا اور اجنٹا تک چلا گیا ہے۔ کبھی کبھی قریب کے پہاڑوں میں سے تیندوے کے دھاڑنے کی آواز سنائی دیتی ہے۔ میں نے ایلورا اور اجنٹا کی سیر پہلی مرتبہ ۱۹۳۰ء میں کی جب کہ مولوی صاحب کے ساتھ انگلش اردو ڈکشنری کی نظرثانی کے لئے اورنگ آباد گیا تھا۔ مولوی صاحب کو اورنگ آباد بہت پسند تھا۔ وہ حیدرآباد میں رہتے تھے تب بھی ان کا دل اورنگ آباد میں اٹکا رہتا تھا۔ وہاں کی ہوا اور پانی کا اکثر ذکر کرتے تھے۔ کہتے تھے کہ جیسی صاف ہوا اورنگ آباد کے کوہستانوں میں ہے ایسی ہندوستان بھر میں کہیں نہیں ہے۔

اورنگ آباد میں مولوی عبدالحق کے معمولات یہ تھے۔ وہ صبح اندھیرے منھ

پَو پھٹنے سے پہلے پہاڑوں کی سیر کو نکل جاتے تھے۔ گھنٹہ بھر کی سیر کے بعد آکر نہاتے، ناشتہ کرتے اور پھر کام پر بیٹھ جاتے، جس کا سلسلہ ایک بجے اور کبھی ڈیڑھ بجے تک چلتا تھا۔ دوپہر کے کھانے کے بعد قیلولہ کرتے، لیٹے لیٹے حقہ پیتے اور کوئی کتاب پڑھتے جاتے۔ ٹھیک ساڑھے چار بجے چائے پیتے، اور اس کے کچھ دیر بعد پھر کام شروع ہو جاتا۔ چائے کے ساتھ نمکین، خشک میوہ اور مٹھائیاں ہوتیں۔ دہلی کا سوہن حلوا اور حبشی حلوہ بہت پسند تھا۔ چائے پر التزام کے ساتھ یہ دونوں حلوے موجود ہوتے لیکن وہ خود بہت تھوڑا کھاتے تھے۔ ان کی پارسلیں دہلی کے شاہی حلوائی کے یہاں سے برابر آتی رہتی تھیں۔ ہال میں کھانے کی بڑی میز بچھی تھی، جس کے ارد گرد سب لوگ جو ڈکشنری کی نظرِ ثانی میں شریک تھے بیٹھتے تھے اور کوئی شخص مغرب سے قبل اپنی جگہ سے نہیں ہلتا تھا۔ مولوی صاحب کا ملازم رستم تھوڑے تھوڑے وقفے سے حقہ بھر کر لاتا اور ان کے قریب رکھ دیتا۔ مولوی صاحب حقے کے لئے لکھنؤ سے نہایت عمدہ قسم کا تمباکو منگاتے تھے جس کی خوشبو سے سارا ہال مہک جاتا تھا۔ میں خود حقہ نہیں پیتا تھا لیکن مجھے تمباکو کی خوشبو اچھی لگتی تھی۔ مولوی صاحب مالوے سے بھی تمباکو منگاتے تھے اور اس کی بہت تعریف کرتے تھے۔ کہتے تھے کہ لکھنؤ کی تمباکو کے مقابلے میں مالوے کی تمباکو تیز ہوتی تھی۔ اس میں لطافت پیدا کرنے کے لئے بعض اجزا اپنے یہاں اس میں ملواتے تھے۔ مولوی صاحب کا حقے کا اہتمام ان کے کھانے کے اہتمام سے کم نہ تھا۔ ان کے حقے کی گڑگڑاہٹ سے بعض دفعہ موسیقی کا زیر و بم پیدا ہو جاتا تھا۔ صبح کے ناشتے اور سہ پہر کی چائے کے علاوہ رات کا کھانا کھاتے تھے۔ میں نے انھیں دوپہر میں کبھی کھانا کھاتے نہیں

دیکھا۔ دوپہر میں سنگترہ کے عرق کا ایک گلاس پیتے تھے اور اس کے ساتھ کچھ پھل کھا لیتے تھے۔ اورنگ آباد اور جالندھر کے سنگترے بہت پسند تھے۔ کہتے تھے کہ یہ ناگپور کے سنگتروں سے بہتر ہیں، اس لئے کہ ان میں لطیف چاشنی ہوتی ہے،

مولوی عبدالحق اردو زبان کے عاشق تھے۔ ان کی ساری عمر اس کے بنانے، سنوارنے اور اس کی خدمت میں صرف ہوئی۔ اپنی طویل عمر کی بدولت انھوں نے سید احمد خاں، محسن الملک، نذیر احمد اور حالی جیسے بزرگوں کا زمانہ بھی دیکھا اور بعد میں خوردوں کا زمانہ بھی دیکھا۔ بزرگوں کی روحانی تاثیر اور فیضان سے انھوں نے اپنی زندگی کا ڈول ڈالا۔ میں ان سے پہلی مرتبہ ۱۹۲۵ء میں جامعہ ملیہ اسلامیہ میں ملا تھا۔ اس وقت ان کی داڑھی کھچڑی تھی۔ کئی لوگوں نے کہا کہ وہ دہلی کی دسمبر کی سردی میں بھی ٹھنڈے باسی پانی سے نہاتے ہیں۔ اس پر مجھے تعجب ہوا۔ پھر جب ان سے ۱۹۳۰ء میں ملاقات ہوئی تو ان کی داڑھی میں سفید بال کالے بالوں پر غلبہ پا چکے تھے۔ پھر چند سال بعد کالے بال اکّا دکّا رہ گئے۔ آخر میں ان کی داڑھی برف کی طرح سفید بھک ہوگئی۔ مولوی عبدالحق کی شخصیت ان کی گول سفید براق داڑھی کے ساتھ کم و بیش پچیس سال تک ایسی وابستہ رہی کہ اس کے بغیر ان کا تصور ہی ممکن نہ تھا۔ وہ لوگ جن کی عمر اب پچاس سے متجاوز ہے انھوں نے مولوی صاحب کو ہمیشہ بوڑھا ہی دیکھا۔ یہ مشہور تھا کہ شہر اورنگ آباد کے دو بڑے اونچے پائے کے عاشق ہوئے ہیں اور وہ دونوں بوڑھے تھے۔ ایک اورنگ زیب دوسرے مولوی عبدالحق۔ اس میں شبہہ نہیں کہ یہ دونوں بوڑھے اورنگ آباد پر جان چھڑکتے تھے اس لئے کہ شہر اورنگ آباد ان مقاصد کے حصول

میں ممد و معاون تھا جو دونوں کے پیش نظر تھے۔ یہ بھی صحیح ہے کہ یہ دونوں بوڑھے تھے لیکن جب انھوں نے اورنگ آباد سے عشق شروع کیا، اس وقت وہ بوڑھے نہ تھے! اورنگ زیب ادھیڑ عمر کا تھا اور مولوی عبد الحق تو جوان تھے، اور جوان بھی ایسے کہ انھوں نے صرف اردو زبان سے اپنا ناتا جوڑا اور عمر بھر پیکرِ وفا بنے رہے۔ چونکہ دونوں نے بڑی عمر پائی اس لئے ان کے دور کے جوانوں کے نزدیک ان کی شخصیتیں بڑھاپے کے ساتھ نتھی ہوگئیں، جیسے وہ کبھی جوان رہے ہی نہ ہوں۔ اگر کوئی اورنگزیب یا مولوی عبد الحق کی جوانی کی تصویر دکھائے تو لوگ تعجب کرتے ہیں کہ یہ معمول سے ہٹ کر ہے۔ اورنگزیب کی طرح مولوی عبد الحق کی جوان ہمتی پر بھی بڑھاپے کا کوئی اثر نہ ہوا۔ آخر تک ان کی قوتِ ارادی نے طبعی انحطاط و ضعف کے سامنے جھکنے سے انکار کیا۔ مولوی عبد الحق نے اردو زبان کی ترویج اور بقا کے لئے جب مجاہدہ شروع کیا تو اس وقت ان کی عمر ۵۰ کے لگ بھگ تھی۔

مولوی صاحب نے اردو کے شبینہ مدارس قائم کرنے کی جو مہم شروع کی تھی اس کے سلسلے میں سارے ملک کا دورہ کیا اور بڑھاپے میں سفر کی صعوبتیں خندہ پیشانی کے ساتھ برداشت کیں۔ یہ واقعہ ہے کہ اگر کسی کو اپنے مقصد کی لگن اور انہماک اور محویت ہو تو اس کے حصول میں جو تکلیف اور زحمت اٹھانی پڑتی ہے اس کی طرف دھیان نہیں جاتا۔ مولوی صاحب کی محویت کا یہ عالم تھا کہ اپنے کام کے آگے نہ وہ تھکاوٹ کو مانتے تھے اور نہ عمر کے طبعی تقاضوں کو جوان کے نزدیک بے حقیقت تھے۔ ان کے لئے صرف ایک حقیقت تھی اور وہ تھی اردو کی خدمت۔ عثمانیہ یونیورسٹی میں گرمیوں کی چھٹی ہو چکی تھی، ایک دن مجھ سے کہنے لگے ”جنوبی ہند کے

دورے پر اگر میرے ساتھ چلتے ہو، تو چلو۔" میں تیار ہو گیا۔ یہ ان کا بڑا طوفانی دورہ تھا۔ شروع میں اوٹی میں پروفیسر اسپیٹ کے ساتھ دو ہفتے ٹھہرے۔ اسپیٹ مولوی صاحب کے پرانے دوست تھے۔ عثمانیہ یونیورسٹی میں انگریزی کے پروفیسر رہ چکے تھے۔ ملازمت ختم ہونے پر اپنی نوجوان اینگلو انڈین بیوی اور بچوں کے ساتھ اوٹی میں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی۔ ان کا وسیع بنگلہ نہایت خوش نما جگہ پر تھا۔ مولوی صاحب نے ان کے دو کمرے کرایے پر لے لیے اور کھانے کا اپنا علیحدہ انتظام رکھا۔ ان کا باورچی بشیر ہمارے ساتھ تھا جس کے ہاتھ کا کھانا مولوی صاحب کو بے حد پسند تھا۔ جہاں کہیں جاتے وہ ضرور ساتھ جاتا تھا۔ اوٹی کے قیام کے دوران ہی میں کوئم بٹور اور آس پاس کے علاقوں میں شبینہ مدارس قائم کیے۔ اس دورے میں جنوبی ہند کے متعدد چھوٹے چھوٹے مواضع اور قصبات میں اردو کے شبینہ مدارس قائم کیے اور مقامی اہلِ خیر کی مدد سے ان کے اخراجات کا انتظام کیا۔ انجمن نے بھی کچھ تھوڑی بہت مدد دینے کا یقین دلایا۔ مدراس والے افضل العلماء ڈاکٹر عبد الحق سے بڑی مدد ملی۔ انھیں کے ذریعے سے جنوبی ہند کے مختلف مقامات کے لیے تعارفی خطوط حاصل کیے تھے، اس لیے کہ ان سب علاقوں میں مسلمان اُن کی بہت عزت کرتے تھے۔ مولوی صاحب ڈاکٹر عبد الحق کے بڑے مداح تھے۔ حالانکہ دونوں میں نام اور گول داڑھی کے سوا بظاہر بہت کم چیزیں مشترک تھیں لیکن حقیقت میں ان دونوں کا ذہن ان تہذیبی قدروں کے متعلق صاف تھا جن کا مکمل اظہار اردو زبان کے ذریعے سے ہوا۔ اس کے علاوہ یہ دونوں دریا دل، سیر چشم اور مہمان نواز تھے۔ دونوں مخلص اور دوست پرور تھے۔ مختلف مقامات میں مدارس

ب ۲

شبینہ قائم کرنے کے لئے جو جلسے منعقد ہوئے ان میں مولوی صاحب کی فرمائش پر میں نے لوگوں کو مخاطب کیا اور مولوی صاحب کے مشن اور ان کے مقاصد کی تشریح کی۔ ڈو ایک جگہ خود مولوی صاحب نے بھی تقریر کی۔ مولوی صاحب تقریر کم کرتے تھے، لیکن جب کرتے تھے تو بڑی پُر اثر ہوتی تھی اس لئے کہ اس میں ان کے اخلاص اور ان کی غیر معمولی جد وجہد کا عکس لوگوں کو صاف نظر آتا تھا۔ اور اکثر اوقات تو بغیر تقریر کے بھی ان کی شخصیت ان کے مقاصد کو ظاہر کر دیتی تھی جنوبی ہند کے دورے سے مجھے اس بات کا اندازہ ہوا کہ اردو کے بقا اور تحفظ کے لئے مولوی صاحب جو مساعی کر رہے ہیں ان کی وجہ سے انھیں پیرانہ سالی میں کس قدر زحمت برداشت کرنی پڑتی ہے۔ یہ انھیں کا دل گردہ تھا کہ سال دو سال نہیں برسوں اسی طرح وہ ہندوستان کے کونے کونے میں مارے مارے پھرے اور عوام تک اپنا پیغام پہنچایا۔ میں نے محسوس کیا کہ باوجود ان کی عقل پرستی کے ان پر بے خودی کا عالم طاری تھا جس کی وجہ سے انھیں سوائے اپنے مقصد کے دوسری چیزوں کی سُدھ بُدھ باقی نہیں رہی تھی۔ انھوں نے اب تک اپنی زندگی بڑے آرام و آسائش سے گذاری تھی۔ مگر اب انھیں اس کی بھی پروا نہیں رہی تھی۔ شروع میں وہ اپنے باورچی بشیر کو اپنے ساتھ لے جاتے تھے لیکن بعد میں تنہا سفر کرنے لگے۔ کبھی کوئی کام کرنے والوں میں سے ساتھ ہو گیا تو ہو گیا۔

۱۹۳۹ء میں ناگپور میں بھارتیہ ساہتیہ پریشد کا جو اجلاس ہوا اس میں قومی زبان کا مسئلہ درپیش تھا۔ اس کی روداد مولوی صاحب ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔

"اُس بس بھرے شہر میں بھارتیہ ساہتیہ پریشد کے اجلاس کے موقع پر گاندھی جی

اور ان کے ساتھیوں سے بڑا معرکہ ہوا۔ وہ ہندی کے حق میں تھے اور میں ہندوستانی کی حمایت میں۔ میں نے بہت کہا "آپ ہندوستانی فرمائیے میں آپ کے ساتھ ہوں"۔ میں نے کہا کہ نیشنل کانگریس کا ریزولیوشن ہے کہ ملک کی زبان ہندوستانی ہوگی کہنے لگے وہ ریزولیوشن بھی تو میں نے ہی بنایا تھا۔ اس جلسے میں انڈین نیشنل کانگریس کے تین جیتے جاگتے پریسیڈنٹ موجود تھے جو بت بنے بیٹھے تھے۔ ایک کے بھی منھ سے کچھ نہ پھوٹا اور کسی نے میری کیا کانگریس کے ریزولیوشن کی بھی تائید نہ کی۔ آخر میں حضرت مہاتما نے فرمایا "میں ہندی نہیں چھوڑ سکتا"۔ تو میں نے کہا "ہم اردو کیسے چھوڑ سکتے ہیں"، ہم ہندی اتھوا ہندوستانی کے دھوکے میں نہیں آسکتے۔ ہم لفظوں کو نہیں عمل کو دیکھنا چاہتے ہیں"۔

مولوی عبدالحق دل سے اسلامی اصول کی عظمت کو مانتے تھے۔ ویسے عقلیت پسند تھے اور مذہب کی ظاہری رسوم کی پابندی کو غیر ضروری سمجھتے تھے۔ اصل میں ان کا مذہب اردو کی خدمت تھا جس کے لئے انھوں نے اپنی پوری زندگی وقف کر دی۔ اس کے معیار سے وہ خیر و شر کا حکم لگاتے تھے۔ وہ بات کے دھنی اور وعدے کے سچے تھے۔ اپنی جرأت اور ہمت سے ہر مشکل کو آسان بنا لیتے تھے۔ ان کا جوشِ عمل، انہماک، استقلال اور بے باکی سید احمد خاں کی صحبت کا نتیجہ تھا اور متانت، سادگی اور پختگی حالی کی صحبت کا۔ سید احمد خاں کی ہمہ گیر شخصیت نے عمل کے مختلف میدانوں میں اپنی شہ سواری کے جوہر دکھائے لیکن مولوی عبدالحق نے اپنی مساعی کو صرف اردو کی بقا و تحفظ کے لئے محدود رکھا۔ سید احمد خاں کے عمل کی وسعت اور ہمہ گیری کو وہ سراہتے تھے اور انھیں فوق الانسان خیال کرتے تھے جس کا اظہار انھوں نے

متعدد مرتبہ میرے سامنے کیا کہتے تھے کہ سید احمد خاں کی ذہنی توانائی اور قوتِ عمل بے نظیر تھی۔ ایسے لوگ اب نہیں پیدا ہوں گے۔ سید احمد خاں کے بعد وہ سب سے زیادہ حالی کے مداح تھے۔ میں نے ایک دفعہ باتوں باتوں میں کہہ دیا کہ حالی کی مسدس اور ان کی نظموں کی تو تعریف نہیں کی جا سکتی لیکن ان کی غزل ذرا پھیکی ہے۔ انھوں نے نہ صرف میری رائے سے اختلاف کیا بلکہ بُرا مانا۔ وہ غزل میں بھی حالی کو داغ اور امیر مینائی سے بہتر سمجھتے تھے۔ میں ان کی اس رائے سے متفق نہیں تھا۔ لیکن میں نے اس کا ان کے سامنے اظہار نہیں کیا، اس لئے کہ وہ اس معاملے میں کچھ سننے کے لئے تیار نہ تھے۔ ان کے فرمانے پر میں نے حالی کی غزلیں بڑے غور سے پڑھیں اور میں نے محسوس کیا کہ واقعی مولوی صاحب جو کہتے تھے اس میں بڑی حد تک صداقت تھی۔ حالی کے یہاں اعلیٰ درجے کا تغزل موجود تھا۔ مثلاً یہ شعر:۔

تعزیر جرمِ عشق ہے بے صرفہ محتسب ۔۔۔ بڑھتا ہے اور ذوقِ گناہ یاں سزا کے بعد

ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں ۔۔۔ اب دیکھئے ٹھہرتی ہے جا کر نظر کہاں

اک عمر چاہئے کہ گوارا ہو نیشِ عشق ۔۔۔ رکھی ہے آج لذتِ زخمِ جگر کہاں

بے قراری تھی سب امید ملاقات کے ساتھ ۔۔۔ اب وہ پہلی سی درازی شبِ ہجراں میں نہیں

وہی ہے واعظ نے کن آداب کی تکلیف نہ پوچھ ۔۔۔ ایسے الجھاؤ تری کاکلِ پیچاں میں نہیں

مولوی عبدالحق نے اردو زبان و ادب کی خدمت میں اپنی عمر کے ساٹھ سال سے اوپر گذارے۔ اردو کے قدیم ادب کو وہ پہلی مرتبہ منظرِ عام پر لائے اور اس طرح اردو کی عمر میں اضافہ کیا۔ انھوں نے اپنی تحقیق میں تنقیدی شعور کو سمویا اور تنقید میں تحقیق کی صحت اور گہرائی پیدا کی۔ اپنے ہمعصروں کے جو سوانحی خاکے انھوں نے

کھینچے ہیں ان میں تنقید اور تخلیق ایک دوسرے میں سما گئی ہے۔ ان کے خطبات میں زبان و ادب کے مسائل کے علاوہ سیاسی اور سماجی امور پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ ان کی خاص تصانیف یہ ہیں۔ قواعد اردو، انگریزی اردو ڈکشنری، چند ہمعصر مقدمات عبدالحق، نصرتی، سب رس، مرحوم دہلی کالج، اردو کی پیدایش اور نشو و نما میں صوفیاے کرام کا کام، مرہٹی زبان پر فارسی کا اثر۔ برسوں سے اردو زبان کا ایک جامع لغت ترتیب دے رہے تھے جو مکمل نہ ہو سکا۔ اگر اس کی تکمیل ہو جائے تو اردو زبان کی اس سے بڑھ کر اور کوئی خدمت نہیں ہو سکتی۔

میں نے پوری غیر جانب داری سے مولوی عبدالحق کے کاموں کا جائزہ لینے کی کوشش کی ہے۔ یہ ضرور ہے کہ ان کے ذکر کے ساتھ میرے حافظے میں ایسی یادیں ابھرتی ہیں جن کا جذبات سے تعلق ہے۔ میں انھیں اپنا محسن سمجھتا ہوں۔ میرے حال پر انکی ہمیشہ شفقت اور عنایت رہی ہیں نے ان کی صحبت میں بہت کچھ سیکھا جس کا اعتراف کرنا میں اپنا فرض خیال کرتا ہوں۔ شروع میں تقریباً ایک سال میں ان کے ساتھ رہا۔ جب میں نے علحدہ مکان کرایہ پر لے لیا تو بھی ان سے برابر تعلق قائم رہا۔ دسمبر ۱۹۳۰ء میں وہ میری شادی میں شرکت کے لیے قائم گنج تشریف لائے تھے۔ وہاں کے سیدھے سادے پٹھانوں سے مل کر وہ بہت خوش ہوئے اور ان میں سے بعض کی سدھاوٹ اور سادگی کے متعلق بعد میں بھی ذکر کرتے تھے۔ وہ خود بے ریا اور بے تصنّع انسان تھے اور اس طرح کے دوسرے لوگوں کو پسند کرتے تھے۔ قائم گنج کے بیڑا اور سرکے کی فرمایش کرتے رہتے تھے۔ جب تک حیدرآباد میں رہے یہ دونوں چیزیں میں قائم گنج سے منگا کر ان کی خدمت میں پیش کرتا تھا۔ کہتے تھے ایسے بیڑے کہیں

نہیں ہوتے۔ اسی طرح سرکے کی بھی بہت تعریف کرتے تھے۔ کہتے تھے کہ اُرد کی دال کے ساتھ یہ سرکہ خاص مزہ دیتا ہے۔ سرکے میں بھی لبھیڑے خاص طور پر پسند تھے جو لسوڑے کی قسم کا ایک پھول ہے اور قائم گنج میں کثرت سے ہوتا ہے۔ سرکے میں پڑکر اس میں خاص مزہ پیدا ہو جاتا ہے۔ ویسے ہمارے یہاں سرکے میں آم بھی ڈالتے ہیں، مگر ان میں لبھیڑے کا مزہ نہیں آتا۔ آم کے مزے میں وہ سوندھاپن نہیں ہوتا جو سرکے میں پڑے ہوئے لبھیڑے میں ہوتا ہے۔

مولوی عبدالحق کی عمر کا بڑا حصہ حیدرآباد کے جاگیردارانہ ماحول میں گذرا لیکن انھوں نے نہ اپنی علمی صلاحیتوں کو سلب اور نہ اپنے دماغ کی جودت کو زنگ آلود ہونے دیا۔ انھوں نے انجمن ترقی اردو اور عثمانیہ یونیورسٹی کے ذریعے سے ان مقاصد کو فروغ دینے کی کوشش کی جو انھیں عزیز تھے۔ یعنی اردو زبان کی ترویج اور اس کا تحفظ۔ انھوں نے اپنے شخصی اثر کو ذاتی فائدے کے بجائے انجمن ترقی اردو کے لئے استعمال کیا اور ناساعد حالات کا بڑی پامردی سے مقابلہ کیا۔ اقبال کی نظم "مرد بزرگ" کے یہ شعر ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے انھیں کے لئے لکھے گئے ہوں:۔

پرورش پاتا ہے تقلید کی تاریکی میں — ہے مگر اسکی طبیعت کا تقاضا تخلیق
انجمن میں بھی میسر رہی خلوت اسکو — شمعِ محفل کی طرح سب سے جدا سب کا رفیق
مثل خورشیدِ سحر فکر کی تابانی میں — بات میں سادہ و آزادہ معانی میں دقیق
اس کا انداز نظر سارے زمانے سے جدا — اسکے احوال سے واقف نہیں پیرانِ طریق

مذہب کے معاملے میں مولوی صاحب کا مسلک رواداری تھا اور وہ بڑے وسیع مشرب تھے۔ ان کے دستوں میں ہر مذہب اور ہر فرقے کے لوگ شامل تھے۔ ہوش

بلگرامی سے مولوی صاحب کے تعلقات اچھے نہ تھے۔ انھوں نے اس کا بدلا اس طرح لیا کہ "مشاہدات" میں واقعات کو توڑ مروڑ کے مولوی صاحب پر یہ اتہام لگایا کہ وہ شیعوں کے خلاف تعصب برتتے تھے۔ حالانکہ دنیا جانتی ہے کہ ان کے تعلقات شیعہ حضرات سے نہایت درجہ مخلصانہ تھے۔ نواب عماد الملک آخر تک ان کے قدردان رہے۔ مولوی صاحب ہر معاملے میں ان سے مشورہ کرتے تھے اس لئے کہ وہ نہ صرف ان کے قدر دان تھے بلکہ انجمن ترقی اردو کے صدر بھی تھے۔ اسی طرح ڈاکٹر سراج الحسن سے ان کی دانت کاٹی دوستی تھی۔ دونوں ایک دوسرے کی عزت کرتے تھے۔ اگر ڈاکٹر سراج الحسن دوسرے تیسرے دن مولوی صاحب سے نہ ملتے تو انھیں چین نہ پڑتا تھا۔ اسی طرح مولوی صاحب ان کے یہاں برابر جاتے رہتے تھے۔ اعظم یار جنگ مولوی چراغ علی۔ سید علی بلگرامی۔ خواجہ غلام الثقلین، نواب مہدی نواز جنگ اور ڈاکٹر سید عابد حسین ان سب سے ان کے تعلقات مخلصانہ تھے اور یہ سب صاحبان شیعہ تھے۔ پھر ہوش بلگرامی کا یہ دعویٰ کہ مولوی صاحب کے دل میں شیعوں کے خلاف تعصب تھا حقیقت پر مبنی نہیں ہے۔ جس واقعے کا ہوش بلگرامی نے مشاہدات (ص ۱۳۵) میں ذکر کیا ہے وہ میرے سامنے کا ہے۔ ہوا یوں کہ مولوی صاحب نے مہاراجا کشن پرشاد کی فرمایش پر ان کی دعوت کی جس میں دوسرے معززین بھی مدعو تھے مہاراجا صاحب صدر اعظم کی حیثیت سے جب بھی اورنگ آباد کے دورے پر جاتے تو مولوی صاحب ان کی بڑی پر تکلف دعوت کیا کرتے تھے۔ مولوی صاحب کی دعوتوں کے کھانے مہاراجا بہادر کو بہت مرغوب تھے۔ جب مولوی صاحب حیدرآباد آگئے تو انھوں نے مہاراجا بہادر کی کوئی دعوت نہیں کی اس لئے کہ مولوی صاحب کے بنجارہ اہل

والے مکان میں گنجائش بہت کم تھی۔ لیکن جب مہاراجا نے خود فرمائش کی تو مولوی صاحب نے دعوت کا انتظام کیا۔ اگرچہ مہاراجا بہادر کو اچھی طرح معلوم تھا کہ مولوی صاحب سر اکبر حیدری کے خاص لوگوں میں ہیں جو اب صدر اعظم تھے، لیکن بایں ہمہ ان کے قدیم تعلقات پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑا۔ مہاراجا کشن پرشاد ہمیشہ ان کے دلی قدر دان رہے۔ مہاراجا بہادر کی یہ فرمائش بھی تھی کہ کھانے کے بعد مجرا ہو۔ چنانچہ اس کوچے کے کسی واقف کار کے ذریعے سے مولوی صاحب نے دو گانے والیوں کو شہر سے بلوایا۔ میں مولوی صاحب کے پاس دعوت شروع ہونے سے آدھ گھنٹہ پہلے بیٹھا ہوا تھا جب کہ ان کے ملازم رستم نے آکر کہا کہ "گانے والیاں آگئی ہیں انھیں کہاں بٹھاؤں؟" مولوی صاحب نے میرے سامنے فرمایا کہ "جس مکان میں شیرو اور بشیر رہتے ہیں اس کے برآمدے میں بٹھادو"۔ رستم نے جب یہ بات شیرو سے کہی تو اس نے کہا کہ یہاں تو ہمارے بیوی بچے ہیں۔ گانے والیوں کو باورچی خانے کے پیچھے چبوترہ پر بٹھادو۔ چنانچہ رستم نے انھیں وہاں بٹھادیا۔ یہ چبوترہ باورچی خانے کے پیچھے اور اس کمرے کے سامنے تھا جسے ہوش بلگرامی عاشور خانہ کہتے ہیں۔ ممکن ہے کسی زمانے میں یہ عاشور خانہ رہا ہو لیکن اب عرصے سے یہ مولوی صاحب کا مہمان خانہ تھا۔ میں نے خود اصغر گونڈوی اور پنڈت برجموہن دتاتریا کیفی کو ٹھہرتے دیکھا ہے۔ پنڈت کیفی تو یہاں کم و بیش ایک سال رہے اور کسی نے کبھی کوئی اعتراض نہیں کیا۔ ہوش بلگرامی کا یہ دعویٰ کہ مولوی صاحب نے گانے والیوں کو ٹھہرانے کے لئے عاشور خانے کی طرف اشارہ کرکے کہا کہ "یہ جگہ ان کے لئے موزوں ہوسکتی ہے"، صریح بہتان ہے۔ افترا پردازی کو بعض لوگوں نے فن لطیف بنا دیا ہے۔ دراصل ہوش بلگرامی کو مولوی صاحب سے یہ شکایت تھی کہ انھوں نے

انھیں کبھی کوئی اہمیت نہیں دی۔ شمالی ہند سے بعض نہایت قابل لوگ دکن آئے جنھوں نے یہاں بڑی خدمات انجام دیں۔ لیکن بدقسمتی سے ایسے لوگ بھی آکر اعلیٰ عہدوں پر فائز ہوگئے جو شمالی ہندوستان میں نائب تحصیلدار بھی نہیں ہو سکتے تھے۔ در اصل انھیں کی وجہ سے شمالی ہندوالے دکن میں غیر مقبول ہوئے اور اسی سے ملکی تحریک کو فروغ پانے کا موقع ملا جو بالآخر اپنے جائز حدود سے متجاوز ہوگئی۔

مولوی عبدالحق ایلورا اور اجنٹا کے آرٹ کے بڑے مداح تھے۔ انھیں کے کہنے پر میں پہلی مرتبہ چند دوستوں کے ساتھ وہاں گیا۔ اس کے بعد اپنے دکن کے دوران قیام میں پھر دو مرتبہ وہاں جانا ہوا۔ مجھے فنون لطیفہ سے ہمیشہ سے بڑی دلچسپی رہی ہے۔ میں جب یورپ میں تھا تو آرٹ گیلریز میں اکثر جایا کرتا تھا۔ اجنٹا کی دیواری تصویریں دیکھ کر میں بہت متاثر ہوا۔ یہ چوتھی صدی قبل مسیح سے لے کر چھٹی صدی عیسوی تک وقتاً فوقتاً بنائی گئی تھیں۔ ان کے بنانے والے بدھ مت کے ماننے والے بھکشو تھے جن کی زندگی کا مقصد دنیا تج کر اپنے مذہب کی تبلیغ و اشاعت تھا۔ یہ بھکشو اجنٹا کی خانقاہ میں عبادت و ریاضت میں اپنا وقت گذارتے تھے۔ یہ خانقاہ بھی تھی اور علم کا مرکز بھی جہاں دور دور سے علم کے پیاسے اپنی پیاس بجھانے آتے تھے۔ اس خانقاہ میں چار ہزار سے زیادہ بھکشوؤں کی رہائش کا انتظام تھا۔ ان رہائشی حجروں میں روشنی ذرا دیر کو آگئی تو آگئی ورنہ دن بھر اندھیرا رہتا ہے۔ شاید وہ روح کی روشنی کی خاطر اس تاریکی کو برداشت کرتے تھے۔ بعض اور دوسرے مذاہب کی عبادت گاہوں میں بھی تاریکی کو روشنی پر ترجیح دی جاتی ہے۔ غالباً اس لئے کہ تاریکی میں دھیان نہیں بٹتا۔

اجنٹا، اورنگ آباد سے ۵۰ میل پر ایک گاؤں ہے۔ یہاں پہاڑوں کو کاٹ کر

غار بنائے گئے ہیں جن کی دیواروں اور چھتوں کو نقش و نگار سے آراستہ کیا ہے۔ ان تصویروں میں مہاتما بدھ کی زندگی کے حالات جنھیں جاتک کہتے ہیں، رنگ اور خطوط کی زبان میں بیان کئے ہیں۔ اس کے ساتھ مصوروں نے اپنے زمانے کی معاشرت کے مختلف رُخ بھی بڑی چابکدستی سے پیش کئے ہیں۔ ان تصویروں کے بنانے کا سلسلہ تقریباً ایک ہزار سال تک جاری رہا۔ ۲۸ غار ہیں جنہیں چار ہیں چیتیہ ہیں۔ چیتیہ سے مراد ایسا مندر ہے جہاں بدھ بھکشو مل کر عبادت کرتے تھے۔ باقی چوبیس غاروں میں وہار ہیں جس کے معنی خانقاہ کے ہیں۔ ان میں بیچ میں بڑا کمرہ اور بازوؤں میں چھوٹے چھوٹے رہائش کے حجرے ہیں۔ نیچے دریا بہتا ہے۔ جن لوگوں نے اس مقام کو خانقاہ کے لئے منتخب کیا تھا ان کے ذوق کی داد دینی چاہئے۔ میں یہاں صرف چند غاروں کی تصویروں کا ذکر کروں گا جن کے تاثرات میری یادداشتوں میں تحریر ہیں۔

غار نمبر ا میں بودھی ستوا کو عبادت و ریاضت کی حالت میں دکھایا ہے۔ یہ مہاتما بدھ کی زندگی کا وہ زمانہ ہے جب انھیں روحانی روشنی حاصل نہیں ہوئی تھی۔ ایک روز وہ ایک انجیر کے درخت کے تلے گیان دھیان میں مصروف تھے کہ مار (ہلاکت کا دیوتا) نمودار ہوا جس کے ساتھ اس کی تین حسین بیٹیاں تھیں جو دل ربائی اور رعنائی میں ایک سے ایک بڑھ کر تھیں۔ جب وہ لگاوٹ بازی کرنے اور بدھ کے قریب آنے لگیں تو مہاتما بدھ کے روحانی تصرف سے ان کا حسن بدصورتی میں تبدیل ہوگیا۔ یہ وار خالی گیا تو ناچنے والیاں آئیں اور تھرک تھرک کر مہاتما بدھ کو اپنی طرف مائل کرنے کی کوشش کرنے لگیں۔ ناچنے والیوں کا جسم درخت کی شاخوں کی طرح لچک رہا تھا۔ وہ سب مہاتما بدھ پر اپنے غمزہ و ناز کے تیر چلا رہی تھیں۔ ان تمام باتوں کا بدھ پر کوئی اثر

نہیں ہوا۔ اس آزمایش کے بعد وہ روشنی نمودار ہوئی جس کے مہاتما بدھ عرصے سے تلاشی تھے۔ بدھیستو کی تصویر نہایت حسین ہے۔ اس میں مردانہ سے زیادہ نسوانی حسن کی جھلک نظر آتی ہے۔ اسی غار میں ایک بادشاہ، اسکی ملکہ اور دربار کا منظر بھی ہے۔ اونچے طبقے کی عورتوں کی چھاتیاں باریک انگیا سے ڈھکی ہوئی ہیں لیکن نچلے طبقے کی سب عورتیں تقریباً برہنہ ہیں، بس دراجی سی ایک دھجی ناف کے نیچے ہے۔ ان کے بال گوندھنے کے طریقے بھی جداگانہ ہیں۔ بادشاہ گھوڑے پر سوار ہے۔ اوپر چتر شاہی ہے۔ مورچھل کی جنبش بھی ظاہر کی ہے جس میں فن کار نے حقیقت پسندی کا کمال دکھایا ہے۔ یہ دونوں چیزیں شاہی کی علامتیں ہیں۔ ایک شخص ایرانی لباس میں نظر آتا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ اس زمانے میں بھی دکن کے حکمرانوں کے ایران کے ساتھ تعلقات تھے۔ دو عورتیں کھمبے کے سہارے کھڑی ہیں۔ ایک کی انگلی ٹھڈی پر ہے، دوسری کی آنکھوں اور چہرے سے تحیر کا اظہار ہو رہا ہے۔ وہ رقص کرنے والیوں کی حرکات وسکنات پر پسندیدگی اور تعجب ظاہر کر رہی ہیں۔ ان کے پیچھے نوعمر لڑکیاں بڑے شوق سے رقص دیکھ رہی ہیں۔ مار کے ساتھ جو شیاطین کا گروہ ہے ان کی حرکات وسکنات سے وحشت ٹپکتی ہے۔ ان میں سے ایک دونوں ہاتھوں کی انگلیاں منھ کے اندر ڈال کر اپنے گالوں کو چیرتا اور بڑی ڈراؤنی صورت بناتا ہے۔ بعض شیاطین اپنی زبانیں منھ کے باہر نکالے ہوئے ہیں جو سانپ کی زبان کی طرح لپلپا رہی ہیں۔

ایک جگہ ایک مرد اور عورت راز و نیاز کی باتیں کر رہے ہیں۔ مرد کے جسم سے مردانگی ظاہر نہیں ہوتی۔ اس کے جسم میں پٹھے نام کو نہیں بلکہ اس طرح کی گولائی اور ابھار ہیں جیسے کہ عورت کے جسم میں ہوتے ہیں۔ عورت کی چھاتیاں بڑی بڑی، گول

اوپر ابھری ہوئی ہیں۔ دونوں ایک دوسرے سے بھڑی ہوئی ناف کے نیچے دونوں رانوں کے اوپر تک ایک کپڑا لپٹا ہے۔ ممکن ہے یہ میاں بیوی یا عاشق و معشوق ہوں۔ دونوں کے سروں پر مکٹ ہیں۔ عورت کے گلے میں موتیوں کا گلوبند اور کنٹھ مالا ہے۔ مرد کے گلے میں موتیوں کی لڑی ہو۔ عورت کے کانوں میں جھمکے اور مرد کے کانوں میں بندے ہیں۔ دونوں کے بھج بند بندھے ہیں۔ عورت کا بھج بند بانہہ کے اوپر اور مرد کا کہنی کے قریب ہے۔ یہ غالباً اس زمانے کا دستور ہوگا۔

غار نمبر ۱ میں ایک شہزادی کے انتقال کا دردناک منظر پیش کیا ہے۔ قصہ یہ ہے کہ اس کا شوہر مہاتما بدھ کا مرید ہوگیا۔ بھکشو کے لئے ضروری ہے کہ وہ دنیا ترک کر دے اور بیوی بچوں سے علیحدگی اختیار کرے۔ باوجود مہاتما بدھ سے عقیدت رکھنے کے شہزادہ اپنی اہلیہ سے چھپ چھپ کر ملتا رہا لیکن جب مہاتما بدھ نے تاکید کی کہ جنسی زندگی روحانی ترقی کی راہ میں رکاوٹ ہے اس لئے اس سے احتراز لازم ہے، تو شہزادہ مجبور ہوگیا اور اس نے اپنی بیوی سے تعلق منقطع کر لیا۔ شہزادی پر شوہر کی جدائی کا اتنا اثر ہوا کہ وہ سخت بیمار ہوگئی اور بالآخر مرگئی۔ مصور نے شہزادی کی رحلت کا منظر بڑی حقیقت پسندی سے دکھایا ہے۔ شہزادی کے قریب ایک چھوٹی لڑکی ملول بیٹھی ہے جو اس کی بیٹی معلوم ہوتی ہے۔ وہ اپنی ماں کو سہارا دے رہی ہے۔ نوکرانیاں پنکھا جھل رہی ہیں۔ ان کے چہروں سے بھی غم کا اظہار ہوتا ہے۔ ایک طبیب شہزادی کے بستر کے قریب بیٹھا ہے جس کے چہرے سے بجائے غم کے مایوسی کا اظہار ہو رہا ہے۔ وہ ہر چیز کو خارجی حیثیت سے دیکھتا ہے، جذبات سے بالکل علیحدہ ہو کر۔ نوکرانی جو مورچھل کر رہی ہے اس سے بڑی احتیاط ظاہر ہوتی ہے کہ کہیں زیادہ زور سے نہ جھل دے کہ مریضہ کو ناگوار ہو۔

اوپر کی طرف ایک بندر ہے وہ بھی اداس ہے، غالباً وہ مرنے والی شہزادی کا منظور نظر ہے۔ وہ جھانک کر اسے دیکھتا اور پھر پیچھے ہٹ جاتا ہے۔ اسی طرح جو مور دکھایا ہے وہ بھی گردن لمبی کر کے مریضہ کو دیکھ رہا ہے۔ مصور نے رنج وغم کی کیفیت جانوروں پر بھی طاری کر دی ہے۔ بالآخر شہزادی کا انتقال ہو گیا جسے مصور نے دیکھنے والوں کے تخیل پر چھوڑ دیا کہ اگر ایسے حالات پیدا ہوں تو ان کا لازمی انجام موت ہوگا۔

غار نمبر ۱۷ میں ایک شہزادی سنگار میں مشغول ہے۔ عام طور پر اس کو "کالی شہزادی" کہتے ہیں۔ اس کے ہاتھ میں آئینہ ہے جس میں وہ اپنا چہرہ دیکھ رہی ہے۔ سینے پر باریک کپڑے کی اونچی انگیا ہے جس کے نیچے پیٹ نظر آتا ہے۔ سر پر جواہرات کا مکٹ ہے، گلے میں کنٹھا، مالا، بازوؤں میں بھج بند، پاؤں میں پازیب، ناف کے نیچے رانوں تک ایک ٹپکا ہے جس میں جواہرات جڑے ہیں۔ قریب جو نوکرانیاں کھڑی ہیں ان کے جسم نیم عریاں ہیں۔ ان کے جسم کا گداز مسحور کن ہے۔ ان کی چھاتیاں ایک دوسرے سے بھڑی ہوئی وزن دار معلوم ہوتی ہیں جیسے کپیوں میں امرت رس بھرا ہو۔ ہونٹ موٹے موٹے ہیں جن سے لذت پرستی کا اظہار ہوتا ہے، جیسے ان پر بوسے مچل رہے ہوں۔ صناعوں نے دیدہ و دانستہ اعلیٰ طبقے کی گھروالیوں کے مقابلے میں نوکرانیوں کے جسموں کو شہوت انگیز انداز میں پیش کیا ہے۔ ممکن ہے اس کی تہہ میں بھکشوؤں کے ذاتی تجربے کی کارفرمائی ہو اور ان کی رسائی یہیں تک رہی ہو۔

ایک اپسرا (حور) سامنے برآمدے میں داخل ہوتی ہے۔ اس کے سر پہ ایک ترچھا بانکی وضع کا مکٹ ہے جس پر جواہرات ٹکے ہیں اور اسی مکٹ میں سے جھومر باہر کو

پیشانی پر لٹکتا ہوا دکھایا ہے۔ گلے میں کنٹھ مالا اور موتیوں کی لڑیاں ہیں۔ نیچے کی لڑی میں سے چھوٹی چھوٹی لڑیاں لٹک رہی ہیں۔ کانوں میں گول وضع کے آویزے ہیں۔ ہاتھوں میں فیروزی رنگ کا دست بند ہے۔ اپسرا آسمانی ہستی ہے لیکن آرٹسٹ نے اسے اس طور پر پیش کیا ہے جس سے جنسی جذبات برانگیختہ ہوں۔ اس کی چھاتیاں بڑی بڑی، گول اور اوپر کو اٹھی ہوئی ہیں آپسرا کی آنکھیں نیم وا ہیں جیسے وہ مدہوشی کی حالت میں ہو۔ چہرہ مہرہ دلکش، ناک ستوان، دہانہ چھوٹا، جوانی کے نشہ میں چور۔ غرضکہ آرٹسٹ نے اس آسمانی ہستی میں روحانیت ظاہر کرنے کے بجائے لذت پرستی دکھائی ہے۔ یہ اپسرائیں راجا اندر کے دربار سے دنیا میں لذت کی تلاش میں آتی تھیں جس طرح یونانی دیوتا زیوس آسمانی دیویوں کو چھوڑ کر دنیا کی عورتوں سے عشق لڑانے آتا تھا۔ بعض اوقات اندر ان اپسراؤں کو عبادت گذار زاہدوں کے بہکانے کے لئے بھیجتے تھے جیسے وشوامتر کے پاس ایک اپسرا بھیجی گئی تھی جس کے بطن سے شکنتلا نے جنم لیا تھا۔ کالیداس نے اپنے مشہور ناٹک میں اس مضمون کو شاعرانہ آب و رنگ میں سمو کر بڑے دل کش انداز میں پیش کیا ہے۔

یہ بات لحاظ کے قابل ہو کہ اجنٹا کی تصویریں بدھ بھکشوؤں نے بنائی تھیں جو دنیا تج چکے تھے اور تجربہ، نفس کشی اور ترک علائق کے اصول پر عمل پیرا تھے۔ ان تصویروں میں مہاتما بدھ کی زندگی کو پیش کرنے کے ساتھ اس زمانے کی معاشرت اور رہن سہن کو بھی تفصیلی طور پر ظاہر کیا ہے۔ اونچے طبقے اور نچلے طبقے کا فرق صاف نظر آتا ہے۔ ان تصویروں کو دیکھنے سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ لوگ جو تجرد کی زندگی بسر کرتے تھے ان کے اعصاب پر عورت اس قدر کیوں سوار تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ دنیا میں

جہاں کہیں اور جب کبھی رہبانیت اختیار کی گئی تو اس کا یہی ردعمل ہوا۔ اجنٹا کی تصویروں کے اصل ہیرو مہاتما بدھ ہیں، بایں ہمہ نسوانی حسن کی دل کشی اور نسوانی جسم کے ابھاروں گولائیوں کو جس اہتمام اور مبالغے کے ساتھ ظاہر کیا ہے اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ بھکشو فن کار عورت کے قدر دان تھے اور اسے اپنی نظروں سے کبھی اوجھل نہیں ہونے دیتے تھے، جبھی تو اجنٹا کے غاروں میں دیواروں پر ہزاروں عورتیں اپنی پوری دلربائی اور رعنائی کے ساتھ دکھائی گئی ہیں۔ نسوانی غمزہ و ادا کی کوئی ایسی صورت نہیں جو ان تصویروں میں موجود نہ ہو، جنسی لذت اندوزی کا کوئی ایسا پہلو نہیں جسے فن کاروں نے نمایاں نہ کیا ہو۔ یہ اس تعلیم کا ردعمل تھا جو تجرد اور رہبانیت سکھاتی تھی۔ اس طرح وہ مذہبی فلسفہ جو زندگی کے حقائق کو تسلیم کرنے سے انکار کرتا ہے، زندگی اس کے ماننے والوں سے انتقام لیتی ہے۔ ان کے ذہن اور جذبات میں ایسی الجھنیں پیدا ہونا لازمی ہے جن سے عمل کا توازن برقرار نہیں رہ سکتا۔ بدھ بھکشوؤں کی جنسی محرومی نے تزکیۂ نفس کے روحانی مرکزوں کے درو دیوار کو ایسے مناظر سے آراستہ کرنے پر مجبور کیا جن میں لذت پرستی ہر وقت ان بھکشوؤں کو گھور گھور کر دیکھتی تھی جو ترک دنیا کرکے عبادت و ریاضت اور دھیان گیان کے لئے اجنٹا کی خانقاہ میں داخل ہوئے تھے۔

ان تصویروں میں زندگی کا ہر پہلو دکھایا ہے۔ بلندی اور پستی، محبت اور نفرت، لطافت اور کثافت، خوبصورتی اور بدصورتی، حسرت اور غم، کامرانی اور ناکامی، رحم اور بے رحمی، افلاس اور دولت مندی سب ہی کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ ان میں راکشس بھی ہیں اور اپسرائیں بھی، سنیاسی بھی ہیں اور عشرت پسند دنیادار بھی۔ شاندار جلوسوں کی گھما گھمی اور دھوم دھام بھی ہے اور موت کے آگے انسان کی بے بسی

بھی۔ ان میں ہر ایک اپنا کردار بڑی خوبی سے ادا کر رہا ہے جیسے کہ وہ اس کے لئے بنا ہو۔ بھنے اور بھنیاں، گدھ، مور، بندر، ہرن، ہاتھی سب اپنی اپنی جگہ جاندار اور متحرک دکھائے گئے ہیں جن میں اصلیت کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ یہ تصویریں اپنے زمانے کی معاشری زندگی اور لوگوں کے سوچنے کے انداز کا آئینہ ہیں۔ موسیقی کے آلات، برتن، ہتھیار، لڑائی کے طریقے، لباس، زیور، رہن سہن کے طور طریقے سب نظروں کے سامنے آجاتے ہیں تو ھاروں اور چیتیاؤں کی چھتوں پر آرائشی تصویریں ہیں۔ ان میں پھول، پھل، چڑیاں، جانور، انسان اور آسمانی ہستیاں سب ملے جلے ہیں۔ فن کاروں کو ہیئت پر پوری قدرت حاصل ہے۔ کہیں کہیں مزاحیہ اور پُر تفنن موضوعوں سے سپاٹ پن کو دور کیا ہے۔ اگرچہ ان سب تصویروں کی تہ میں مذہبی جذبے کی کارفرمائی ہے لیکن ایسا لگتا ہے جیسے فن کاروں نے اپنے موضوعوں کے حسن کو وجدانی طور پر محسوس کر کے اپنی فنی تخلیق کی ہے۔ کہیں نسوانی جسم کی قدرتی لچک دکھائی ہے، کہیں حسن کی بے شعوری کا منظر ہے اور کہیں اشارے کنائے اور غمزہ وادا بڑی چابکدستی سے دکھائے ہیں۔ پس منظر میں پہاڑ، میدان، جنگل، باغ، دریا، شہر، جیسا موقع ہو دکھائے گئے ہیں۔ تناسب اور وحدت ہر تصویر میں آشکارا ہے، جو حقیقت اور اصلیت کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے۔

یہ آرٹسٹ عورت کے جسم کو تزئین و آرائش کے لئے ہی نہیں بلکہ خاص موضوع کے طور پر طرح طرح سے پیش کرتے ہیں، بڑے انہماک اور نسوانی جسم کی تفصیلات کے متعلق اپنی غیر معمولی واقفیت کے ساتھ۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ عورت ان کا سب سے زیادہ دل پسند موضوع ہے جس کے اظہار میں انھوں نے اپنی ساری فنی اور تخلیقی اپج صرف کی ہے۔ عورت کو وہ جہاں کہیں پیش کرتے ہیں حسن و تناسب کی علامت کے طور پر، چاہے قصے

میں اس کی ضرورت ہو یا نہ ہو وہ کھینچ تان کر کے اسے ضرور لے آتے ہیں۔ عورت کو وہ اس طرح پیش کرتے ہیں جیسے پھولوں کو۔ راجاؤں اور راجکماروں کے گرد عورتوں کا جمگھٹا رہتا ہے، بالکل اسی طرح جیسے وہ گلے کے ہار ہوں کہ انھیں علحدہ نہ کیا جا سکے۔ محلات میں ان کے وجود سے زیب و زینت ہے، سڑکوں کی چہل پہل اور گہما گہمی انھیں کی بدولت ہے۔ مکانوں کی کھڑکیوں سے وہ جھانکتی ہوئی نظر آتی ہیں، کہیں بیٹھی ہوئی کہیں کھڑی ہوئی۔ کہیں وہ بھکاری کو دروازے پر آکر بھیک دے رہی ہیں۔ انھیں اس طرح پیش کرنے میں لازمی طور پر مذہبی دیومالا سے متعلق کوئی محرک نہیں ہوتا۔ بایں ہمہ فن کار کسی نہ کسی بہانے سے انھیں لے آتا ہے اس لئے کہ ایسا کرنے میں اسے دلی مسرت محسوس ہوتی ہے، ایسی مسرت جو عبادت و ریاضت میں بھی نہیں ملتی۔ کہیں ان کی ٹولیاں یا گچھے دکھائے ہیں جیسے پھولوں کے گجرے ہوں۔ کہیں وہ تنہا نظر آتی ہیں جیسے کھلا ہوا پھول تنہا اپنے وجود سے مشامِ جان کو معطر کرتا ہو۔ فن کار اپسراؤں کو بھی، جو آسمانی ہستیاں ہیں، دنیوی عورتوں کے رنگ میں دکھاتا ہے، اس لئے کہ یہی رنگ اس کے جذبے کو تسکین دیتا ہے۔ یہ اپسرائیں کہیں سنگار کر رہی ہیں، کہیں خوابِ استراحت میں ہیں، کہیں وینا والوں کو دیکھ کر ان کے چہروں سے تحیر و استعجاب نمایاں ہے۔ ان کی انگلیاں لمبی، نازک اور رنگیلی ہیں اور جسموں کی حرکت متوازن اور پرسکون ہے۔ لیکن اس ظاہری سکون کے تلے جذبات کا طوفان ٹھاٹھیں مارتا محسوس ہوتا ہے جو چھپائے نہیں چھپتا۔ فن کار کی نظر اس اندرونی طوفان کی ہر موج پر ہے۔

بعض جگہ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے نسوانی حسن و جمال نے فن کار کو بالکل مسحور کر لیا ہو۔ وہ عورت کے جسم کی ہر تفصیل کو دکھاتا ہے۔ وہ اس کے سر کے ہر موڑ، جسم

کے ہر خم اور ابھار کو، اس کی لمبی لمبی پلکوں کی نیزہ بازی اور اس کی تیکھی چتون کے ہر انداز کو بڑے شوق سے ظاہر کرتا ہے۔ وہ بڑی دیدہ ریزی سے اس کے بال بنانے کی وضع، مانگ پٹی اور کنگھی چوٹی کی سج دھج کو اس طرح اپنے موقلم سے دکھاتا ہے جیسے وہ انکی ہر تفصیل سے باخبر ہو۔ وہ اپنے نسوانی موضوع کو پُر تکلف زیوروں سے آراستہ کرتا ہے تاکہ اس کی رعنائی اور دل ربائی میں اضافہ ہو۔ بھکارن جو بھیک مانگ رہی ہے وہ بھی نسوانی حسن کے تمام انداز و ادا سے لیس ہے۔ اس کے جسم کو ایسا بنایا ہے جیسے اس کی جوانی پھٹی پڑتی ہو۔ ان مصوروں کے نزدیک نسوانی حسن میں طبقہ واری فرق و امتیاز نہیں۔ یہ حسن جہاں بھی ہے کامل ہے۔ عورت ان کے لئے محض ایک انسانی فرد نہیں بلکہ ایک عالمگیر اصول ہے جو اپنے جسم کے پیچ و خم میں سارے عالم کی رعنائی اور حسن کو چھپائے ہوئے ہے۔ وہ اپنے چاؤ اور لبھاؤ میں، اپنی توجہ اور تغافل میں، اپنے غمزہ و ادا میں، اپنے وجود کے اس عالمگیر اصول کو کبھی ترک نہیں کرتی۔ وہ مرد کی طرح کہیں ذلیل و حقیر نہیں دکھائی گئی۔ فن کار کے نزدیک وہ پھول کے مثل ہے جو کھلا ہوا ہو، نہ کہ پژمردہ و پامال۔ ان تصویروں میں توازن، نرمی اور سکون کا اظہار ہوتا ہے۔ فن کاروں نے رنگوں میں سیاہ، سبز، زرد، سنہری، نارنجی، عنابی، فالسائی، دھانی، بادامی، گلابی اور گیروے سب ہی کو حسب موقع استعمال کیا ہے۔ اس کا بھی اہتمام ہے کہ روشنی پوری تصویر پر اچھی طرح پھیلتی اور اس میں نفوذ کرتی رہے تاکہ اس کی فنی خوبی دوبالا ہو جائے اور دیکھنے والوں کے فریب نظر میں کمی یا کوتاہی نہ پیدا ہو۔ غاروں کی جن تصویروں تک روشنی نہیں پہنچتی وہاں وہ مجبور رہے۔ ایسی حالت میں چراغ کی روشنی سے کام لیا جاسکتا ہے جس میں تصویروں کی طلسمی اثر آفرینی کہیں زیادہ ہو جاتی ہے۔ رات کے اندھیرے

میں چراغوں کی روشنی ان دیواری تصویروں کو پُراسرار بنا دیتی ہے۔ ریاضت کرنے والے جب اپنے دھیان گیان سے نظر اوپر اٹھاتے ہوں گے تو ان تصویروں کی پُراسرار دنیا میں اپنے کو گم کر دیتے ہوں گے۔

اورنگ آباد سے آٹھ میل پر ایلورا کے غار ہیں جو اجنٹا کے غاروں کی طرح پہاڑ کاٹ کر بنائے گئے ہیں۔ ان غاروں کی قطار ایک میل سے زیادہ لمبی چلی گئی ہے۔ ان میں جو بت اور مجسمے ہیں وہ بدھ مت، جین مت اور برہمنی مذہب سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان میں کیلاش کا مندر سب سے زیادہ شاندار اور فنی لحاظ سے اہمیت رکھتا ہے۔ یہ ۱۶۴ فٹ لمبا ۱۰۶ فٹ چوڑا اور ۹۰ فٹ اونچا ہے۔ اس کی دیواروں اور چھتوں کو پہاڑ کاٹ کر ان پر نقش و نگار اور مجسمے کھود کھود کر بنائے ہیں۔ اس مندر کو کرشن اول نے جو آٹھویں صدی عیسوی میں راشٹر کوٹ خاندان کا راجا تھا، بنوایا تھا۔ اس کی چھت کو سولہ ستون تھامے ہوئے ہیں۔ شیو جی کے رقص کے مختلف مجسمے ہیں۔ پاروتی کے مجموں میں فن کاروں نے بڑی چابکدستی کا ثبوت دیا ہے۔ مہایوگی کی حیثیت سے شیو ایک جگہ مراقبے کی حالت میں کنول کے پھول پر بیٹھے ہوئے دکھائے گئے ہیں۔ اُن کے دونوں طرف موسیقار اپنا فنی کمال دکھا رہے ہیں۔ کیلاش میں مہابھارت کی جنگ کا منظر بھی پتھر کو کاٹ کر بڑی خوبی سے دکھایا ہے۔ کہیں کہیں ستونوں پر مردوں اور عورتوں کے بوس و کنار (میتھونا) کا منظر پیش کیا ہے۔ مندر کے شہ نشین کے دونوں طرف بڑے بڑے ہاتھی ہیں اور اندر مقدس سانڈ (نندی) کا مجسمہ ہے۔ ان سب کی جسامت حیرت انگیز ہے۔ دس اوتاروں کے غار میں ہندو دیوتاؤں اور دیویوں کے بت ہیں۔ ایلورا کے غاروں سے معلوم ہوتا ہے کہ آہستہ آہستہ ہندو دھرم بدھ مت کی جگہ لے رہا ہے۔

بدھ مت میں اگرچہ انسانی مساوات کے اصول کو تسلیم کیا گیا تھا اور ذات پات کے فرق کو مٹا دیا تھا لیکن اس کے باوجود اسے برہمنیت کے ہاتھوں شکست اٹھانی پڑی جسکی مذہبی اور سماجی تنظیم کا دارومدار ہی اونچ نیچ کے اصول پر تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ قضا و قدر نے بھارت ماتا سے پوچھا کہ تمھیں رہبانیت منظور ہے یا ذات پات کا فرق وامتیاز، تو بھارت ماتا نے ثانی الذکر کو ترجیح دی۔ رہبانیت تو زندگی کے تقاضوں سے انکار کرتی ہے۔ ذات پات کا نظام زندگی کے لئے کتنا ہی غیر فطری کیوں نہ ہو، زندگی سے انکار نہیں کرتا چاہے اسے مسخ کر ڈالتا ہو۔ اس کی سب سے بڑی کوتاہی یہ ہے کہ وہ انسانیت کے احترام کی نفی کرتا ہے۔ برہمنیت کے عروج کے بعد جس طرح بدھ مت کی خانقاہیں ہر جگہ ویران ہوگئیں، اجنٹا اور ایلورا کے غار بھی صدیوں کس مپرسی میں پڑے رہے، ان مندروں میں صدیوں جنگلی جانوروں اور چمگادڑوں کا مسکن رہا۔ سب سے پہلے ایک انگریز افسر نے جو شکار کھیلنے گیا تھا ایک گڈریئے کی مدد سے اجنٹا کے غاروں کا پتہ چلایا۔ حکومت نظام نے زر کثیر خرچ کر کے اجنٹا اور ایلورا کے غاروں کو صاف کرایا۔ نہ صرف صاف کرایا بلکہ ان کی مرمت کے لئے فرانس اور اٹلی سے ماہروں کو بلایا جن کی مساعی کی بدولت وہ اس حالت پر پہنچے جس میں اب ہم انھیں دیکھتے ہیں، ڈاکٹر غلام یزدانی ناظم آثار قدیمہ کی خدمات کا اس ضمن میں اعتراف کرنا ضروری ہے جنھوں نے بعد میں اجنٹا کی تصاویر کی نقلیں نہایت عمدہ اور دیدہ زیب کئی جلدوں میں شائع کرائی تھیں جن میں تصویروں کے اصلی رنگ موجود ہیں۔

خود اورنگ آباد میں الگ الگ تین جگہ غاروں کے مجموعے ہیں جن میں دیواری تصاویر ہیں جن کا بدھ اور جینی دیومالا سے تعلق ہے۔ لیکن وہ اجنٹا کی تصویروں کے

سامنے ہیچ ہیں بعض غاروں میں حسین مجسمے بھی ہیں۔ ایک جگہ مجسموں کے ذریعے سے رقص کا منظر پیش کیا ہے جو فنی لحاظ سے اعلیٰ درجے کا ہے۔ میں مقبرہ رابعہ دورانی سے ان غاروں کو دیکھنے چند احباب کے ساتھ پیدل گیا تھا۔ یہ جگہ جہاں یہ غار واقع ہے ویسے خوش منظر ہے۔ چاروں طرف کوہستانی سلسلہ ہے لیکن یہاں وہ شادابی نہیں جو اجنٹا میں ہے۔ دور دور سبزے اور درختوں کا نام نہیں۔ اگر آدمی نہ ہوں تو درختوں کی صحبت ہی غنیمت ہوتی ہے، جہاں یہ بھی نہ ہوں وہاں خاک دل لگے۔ پہاڑوں کے خاکستری رنگ میں ویرانہ پن اور اداسی کا احساس اور زیادہ بڑھ جاتا ہے جبکہ اجنٹا میں آدمی کا دل لگتا ہے یہاں نہیں لگتا بلکہ وحشت ہوتی ہے۔ اجنٹا میں شادابی ہے۔ یہاں ہر طرف بنجر پہاڑ ہیں کہیں نزدیک پانی نہ ہونے کی وجہ سے نہ گھاس ہے نہ درخت، نہ چڑیوں کی چہچہاہٹ، نہ انسانوں کی آبادی۔ اجنٹا کے چاروں طرف گدڑ نئے جانوروں کو چراتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ یہاں ہُو کا عالم ہے، دور دور نہ آدم نہ آدم زاد۔

میں نے حیدرآباد میں ماں صاحب کے تالاب پر ایک مکان کرائے پر لے لیا تھا۔ یہ تالاب گولکنڈہ کے راستے میں واقع ہے۔ قطب شاہی ملکہ حیات بخش بیگم نے اس تالاب کا منظر دیکھنے کے لئے اس کے کنارے ایک حجرہ بنوایا تھا جو اب تک موجود ہے۔ مجھے چونکہ تاریخی مقامات دیکھنے کا شوق تھا اس لئے اورنگ آباد سے واپسی کے بعد میں بعض احباب کے ساتھ گولکنڈہ کے کھنڈر دیکھنے گیا۔ بڑے شاندار کھنڈر ہیں۔ عجیب بات ہے کہ یہاں ویرانی میں بھی دل لگتا ہے، وحشت بالکل نہیں ہوتی۔ میں دوسروں کی نسبت نہیں کہہ سکتا لیکن میرا یہ ذاتی تجربہ ہے۔ میں نے محسوس کیا کہ ان کھنڈروں کے در و دیوار مجھ سے کچھ کہنا چاہتے ہیں۔ میں نے ان کے اشاروں کو سمجھا اور ان سے عبرت حاصل کی۔

گولکنڈہ گولکنڈہ کی تاریخ کو جانے بغیر حیدرآباد کو نہیں سمجھا جا سکتا۔ اس لئے میں اسکے متعلق چند باتیں یہاں پیش کرتا ہوں۔ جب بہمنی سلطنت میں انتشار پیدا ہوا تو احمدنگر، برار اور بیجاپور کی طرح گولکنڈہ بھی آزاد ہوگیا۔ سلطان قلی قطب شاہ نے جو پہلے تلنگانہ کا صوبیدار تھا، جسے اس زمانے میں طرفدار کہتے تھے، گولکنڈہ کے قلعے کو مستحکم کر کے اس کے اردگرد شہر آباد کر لیا۔ گولکنڈہ کا قلعہ جس ڈھلوان پہاڑی پر واقع ہے وہ آس پاس کی سب پہاڑیوں سے اونچی ہے۔ اس کے اردگرد میدان ہے اس لئے اسکی بلندی اور بھی نمایاں ہوگئی ہے۔ شہر اور قلعے کی حفاظت کے لئے پختہ فصیل بنوائی گئی۔ سلطان قلی قطب شاہ کے جانشینوں نے گولکنڈہ میں شاندار محلات تعمیر کرائے اور اور یہاں کی آبادی میں بہت اضافہ ہوا۔ یہ شہر ہندوستان بھر میں جواہرات کی تجارت کی سب سے بڑی منڈی تھا اور ملک کے ہر حصے سے تاجروں کا یہاں جمگھٹا رہتا تھا محمد قلی قطب شاہ اپنی شہزادگی کے زمانے میں شکار کے لئے موسی ندی کو پار کر کے جایا کرتا تھا۔ وہاں موضع چچلم کی ایک نوخیز سبزفام تلنگن سے اس کی آنکھ لڑ گئی۔ عشق کی پینگیں ایسی بڑھیں کہ شہزادہ راتوں کو دریا تیر کے اپنی محبوبہ سے ملنے جانے لگا۔ اس کے والد ابراہیم قطب شاہ کو جب اس کا علم ہوا تو اس نے دریا پر پل بنوا دیا جو پرانے پل کے نام سے مشہور ہے اور آج بھی موجود ہے۔ بعض نئے پل گر گئے لیکن یہ اپنی جگہ قائم و برقرار ہے اور ایک تماشائی کی حیثیت سے زمانے کے نشیب و فراز اور سلطنتوں کے عروج و زوال کا مشاہدہ کر رہا ہے۔ اس نے بادشاہوں اور شہزادوں کو گذرتے دیکھا، افسروں اور پیادوں کو دیکھا، ولیوں اور درویشوں کو دیکھا، عیش و عشرت کے متوالوں اور گنہ گاروں کو بھی دیکھا۔ ہر کوئی چند لمحوں میں اس پر سے گذر گیا، کوئی ٹھہرا نہیں۔ یہ

ٹھہرنے کی جگہ ہی نہیں۔ دکن کی تاریخ میں یہ گذرگاہ ایک علامتی ہستی بن گئی ہے، خود زندگی کی علامت جسے قرار نہیں جسے ثبات نہیں، جس کی شانیں ہر آن بدلتی رہتی ہیں۔

جب محمد علی قطب شاہ حکمراں ہوا تو اس نے چچلم کے قریب ایک شہر کی بنا ڈالی جس کا نام اپنی محبوبہ بھاگ متی کے نام پر بھاگ نگر رکھا۔ جب بھاگ متی اس کے محل میں بیگم کی حیثیت سے داخل ہوئی تو اسے حیدر محل کے خطاب سے نوازا اور اسی مناسبت سے بھاگ نگر کا نام بدل کر حیدرآباد کر دیا۔ آہستہ آہستہ حیدرآباد کی آبادی بڑھتی گئی اور گولکنڈہ ویران ہوتا گیا۔ اس زمانے میں قاعدہ تھا کہ بادشاہ جہاں رہتا تھا وہیں امیر امرا اور تاجر اور دوسرے دولت مند لوگ بھی اپنے مکان بنواتے تھے۔ حیدرآباد کو آباد کرنے کی اصلی وجہ یہ تھی کہ گولکنڈہ کی آبادی بہت بڑھ گئی تھی اور اب شہر میں مزید وسعت کی گنجایش نہیں رہی تھی۔ آب وہوا کی خرابی کی وجہ سے کئی دفعہ وبا پھیل گئی۔ حیدرآباد کی بنا ۱۵۹۰ء میں پڑی۔ موسیٰ ندی کے کنارے محلات تعمیر ہوئے۔ شہر کے بیچ میں چار مینار کی عمارت ہے جہاں سے چاروں طرف سیدھی سڑکیں نکالی گئیں۔ یہ شہر ایک خاص نقشے اور منصوبے کے مطابق بنایا گیا تھا۔ چار بازار بنائے گئے، جن میں چودہ ہزار دکانیں تھیں جہاں زندگی کی ساری ضروریات دستیاب ہوتی تھیں۔ آبادی کی ضرورتوں کا خیال رکھتے ہوئے مدرسے، حمام، مسجدیں، سرائیں اور شفاخانے بنوائے گئے۔

چار مینار کے شمال میں برابر برابر فاصلوں پر چار محرابیں ہیں جن کے درمیان گلزار حوض ہے۔ یہ علاقہ چار کمان کہلاتا ہے۔ اس کے مغربی جانب شاہی محل تعمیر ہوئے جن میں داد محل اور خداداد محل کے نام ہمعصر تاریخوں میں ملتے ہیں لیکن ان کے آثار اب موجود نہیں۔ چار مینار کے قریب مکہ مسجد ہے جس کی تعمیر ۷۵ سال میں مکمل ہوئی۔ فرانسیسی

سیاح تیورنیے جب حیدر آباد آیا اس وقت تک یہ مسجد مکمل نہیں ہوئی تھی۔ اسی حالت میں دیکھ کر اس نے لکھا تھا کہ اگر یہ پوری ہو گئی تو دنیا کی سب سے بڑی مسجدوں میں شمار ہوگی۔ حیدر آباد کی شہرت اور یہاں کی عمدہ آب و ہوا کی اپنوں اور پرایوں سب نے تعریف کی ہے۔ فرشتہ نے جو محمد قلی قطب شاہ کا ہمعصر تھا حیدر آباد کے متعلق لکھا ہے کہ یہ شہر ہندوستان میں بے مثل ہے۔ اسی طرح فرانسیسی سیاحوں میں تورینے اور تیونے نے اس شہر کی خوبصورتی اور یہاں کے لوگوں کی سلیقہ مندی کو سراہا ہے۔ خافی خاں اور مآثر عالمگیری کا مصنف محمد ساقی نے جو گولکنڈہ کے محاصرے میں اورنگزیب کے ہمراہ تھا، حیدر آباد کی آب وہوا، یہاں کی سرسبزی اور شادابی اور نسوانی حسن کی تعریف کی ہے۔ خافی خاں کہتا ہے کہ اگر حسینانِ دکن کی رعنائی، ملاحت اور سبز فامی کا ذکر تفصیل سے کروں تو اس کی خوبی بیان کرنا میری دسترس سے باہر ہے۔ محمد ساقی کہتا ہے کہ سرزمین دکن بہشت کے مثل ہے۔ یہاں جو "راحتِ چشم و آرام جاں" میسر ہے وہ کہیں اور نہیں۔ دکن کی معتدل آب و ہوا باہر سے آنے والے کو اپنی طرف کھینچتی اور اپنا گرویدہ بنا لیتی تھی۔

آصف جاہی حکمرانوں کے عہد میں بھی حیدر آباد کی ترقی ہوئی۔ چار مینار کے قریب ہی چو محلہ اور پرانی حویلی ہیں جن میں آصف جاہی حکمرانوں کی رہائش تھی۔ اردگرد امیروں کے محلات ہیں جو وسیع علاقوں کو گھیرے ہوئے ہیں اور جن کی وسعت کا اندازہ ان کے اندر جا کر ہوتا ہے، باہر سے نہیں ہو سکتا۔ حیدر آباد اور سکندر آباد کی چھاؤنی کے درمیان حسین ساگر ہے جس کے منظر کی عمدگی جاذبِ نظر ہے۔ آصف جاہ سابع کے عہد میں پتھر گٹی میں نیا بازار بنایا گیا اور عثمانیہ یونیورسٹی کی تعمیر ہوئی جس کی عمارتیں سارے ہندوستان میں اپنی نظیر آپ ہیں۔ یہ عمارتیں گرے نائٹ پتھر کی ہیں جو یونیورسٹی کے ایک میل کے حلقے کے اندر چٹانوں کو کاٹ کر

نکالا گیا ہے۔ آرٹس کالج میں پتھر کو چکنا کر کے لگایا ہے جس کے باعث اس عمارت میں خاص شان اور چمک پیدا ہو گئی ہے جس کا مقابلہ ہندوستان کی اور کوئی عمارت نہیں کر سکتی۔ فنی لحاظ سے یہ عمارت اسلامی اور ہندوی طرز تعمیر کا حسین امتزاج ہے۔ اس کے علاوہ اس میں جدید زمانے کی تمام ضروریات کا بھی پورا لحاظ رکھا گیا ہے۔ یہ دنیا کی بہترین عمارتوں میں شمار ہونے کے لائق ہے۔

عثمانیہ یونیورسٹی

میرے زمانے میں عثمانیہ یونیورسٹی کے اساتذہ میں ایک سے ایک قابل شخص موجود تھا۔ چونکہ اعلیٰ علوم کو اردو زبان کے ذریعے سے طلبہ کو پڑھانا مقصود تھا اس لئے ارباب اقتدار کی یہ کوشش تھی کہ ملک کے ہر حصے سے بہترین لوگوں کو جمع کیا جائے اور اگر قابل ملکی ملیں تو انہیں دوسروں پر ترجیح دی جائے۔ پروفیسر محمد حسین، پروفیسر علی یار خاں، ڈاکٹر خلیفہ عبد الحکیم، ڈاکٹر مظفر الدین قریشی، پروفیسر حسین علی خاں، پروفیسر ہارون خاں شیروانی، پروفیسر جمیل الرحمٰن، ڈاکٹر ابن حسن، ڈاکٹر نور اقبال قریشی، ڈاکٹر عبد الحق، ڈاکٹر نظام الدین، ڈاکٹر سید عبد اللطیف، مولوی مناظر احسن گیلانی، مولوی عبد الباری ندوی، مولوی الیاس برنی، ڈاکٹر رضی الدین، ڈاکٹر ولی الدین، ڈاکٹر جعفر حسن، ڈاکٹر اشورناتھ ٹوپا، ڈاکٹر میر سیادت علی، ڈاکٹر سید حسین، ڈاکٹر حمید اللہ، پروفیسر کشن چند اور پروفیسر عبد القادر کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ ان میں اکثر سے یونیورسٹی میں ملاقات رہتی تھی۔ میرے خاص تعلقات ڈاکٹر خلیفہ عبد الحکیم سے تھے۔ ان سے پہلی مرتبہ مجھے مولوی عبد الحق کے یہاں ملنے کا موقع ملا تھا۔ وہ میرے بڑے بھائی عابد حسین خاں کے ۔ ایم۔ اے۔ او۔ کالج میں ہم جماعت رہ چکے تھے اس لئے مجھ سے بڑی شفقت سے ملتے تھے اور ان کی یہ شفقت آخر تک برقرار رہی۔ میں بھی ان کا ادب کرتا تھا۔ لیکن خلیفہ صاحب کا مزاج

کچھ ایسا تھا کہ وہ بڑے چھوٹے کا زیادہ لحاظ نہیں کرتے تھے۔ ظرافت اور بذلہ سنجی کی ترنگ میں وہ کسی کو نہیں چھوڑتے تھے، بلکہ بعض اوقات خود اپنے اوپر بھی پھبتی کس دیتے تھے۔ جس محفل میں بیٹھتے، سب کی توجہ کا مرکز بن جاتے تھے۔ شگفتہ مزاجی کا یہ حال تھا کہ اگر انھیں مستقل باغ و بہار کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا۔ وہ عثمانیہ یونیورسٹی کے قیام کے بعد ہی حیدرآباد آگئے تھے اور صدر شعبۂ فلسفہ کی حیثیت سے انھوں نے اپنی قابلیت اور ذہانت کا سکہ بٹھا دیا تھا۔

خلیفہ عبدالحکیم | میں خلیفہ صاحب کو اپنی پیڑھی کے ذہین ترین لوگوں میں شمار کرتا ہوں۔ ان کی بذلہ سنجی اور ظرافت، ان کی ذہانت اور جودت طبع کی رہین منت تھی۔ ٹھس قسم کا آدمی چاہے وہ کتنا ٹھوس ہو بذلہ سنج نہیں ہو سکتا۔ پھر خلیفہ صاحب کو اپنے اوپر اس قدر اعتماد تھا کہ وہ بڑے سے بڑے آدمی سے بھی مرعوب نہیں ہوتے تھے۔ سب نے دیکھا کہ جب ڈاکٹر رادھا کرشنن اور ان کے دوسرے رفقا یونیورسٹی ایجوکیشن کمیشن کے سلسلے میں عثمانیہ یونیورسٹی آئے تو خلیفہ صاحب کی گفتگو کا ان اصحاب کے ساتھ بھی وہی انداز تھا جس کے ہم لوگ عادی تھے۔ ایک زمانے میں سر اکبر حیدری کا حیدرآباد میں طوطی بولتا تھا۔ جب کبھی وہ عثمانیہ یونیورسٹی کے اسٹاف کلب آتے تو خلیفہ صاحب ان سے اسی طرح بے تکلفی سے گفتگو کرتے جس طرح وہ دوسروں سے معمولاً کیا کرتے تھے۔ یہ نہیں کہ دوسروں کی طرح اپنی بات میں احتیاط کریں کہ کہیں کوئی الٹی سیدھی، اول جلول منھ سے نہ نکل جائے، جو کہیں سنبھل کر، اونچ نیچ دیکھ کر، اور ناپ تول کر کہیں۔ خلیفہ صاحب کی اس بے تکلفی کی وجہ سے حیدرآباد کے بعض نواب انھیں پسند نہیں کرتے تھے اور انھیں ان میں کبھی مقبولیت حاصل نہیں ہوئی کیونکہ یہ طبقہ آزادی سے ناآشنا تھا اور ایسے سب لوگ جن کا شعار آزادی اور

صاف گوئی تھا ان کی نظریں کھٹکتے تھے۔ یہ بات ان کے جاگیرداری ماحول میں خلاف معمول تھی۔ لیکن خلیفہ صاحب کو ان کی مطلق پروا نہ تھی۔ ان کے کردار میں حیدرآباد کے جاگیردارانہ ماحول سے کوئی فرق نہیں پیدا ہوا۔

وہ لوگ جن کا خیال ہے کہ فلسفے کے پروفیسر اور محقق کو بڑا ہی سنجیدہ اور خشک انسان ہونا چاہیے، انھیں خلیفہ صاحب سے مل کر مایوسی ہوتی تھی۔ ان بے تخیل اصحاب کی سمجھ میں یہ بات کبھی نہیں آئی کہ فلسفہ اور خوش مذاقی ایک دوسرے کے منافی نہیں ہیں۔ فلسفی ہونے کے علاوہ خلیفہ صاحب کو ادبیات کا بھی خاص ذوق تھا۔ انگریزی، فرنچ اور جرمن ادب پر ان کی نظر گہری تھی۔ مجھ سے فرنچ ادیبوں کے متعلق اکثر گفتگو رہتی تھی بعض اوقات مجھے یہ دیکھ کر تعجب ہوتا تھا کہ ان کی معلومات کس قدر وسیع تھیں اور ادبی تخلیقات کی نسبت ان کی رائے کس قدر متوازن اور صائب ہوتی تھی۔

جس زمانے میں عثمانیہ یونیورسٹی کا اسٹاف کلب نوبت پہاڑ کے دامن میں واقع تھا تو شام کو ٹینس کے بعد بیٹھک ہوتی تھی۔ کبھی علمی اور ادبی گفتگو ہوتی، کبھی ملکی اور مقامی سیاست پر تنقید کی جاتی اور کبھی پھکڑ چلتا، خالص پھکڑ جس میں کسی دوسرے محرک کی آمیزش نہ ہوتی۔ ان محفلوں میں خلیفہ صاحب کی ذات کو خود بخود مرکزی حیثیت حاصل ہو جاتی تھی۔ خلیفہ صاحب کا خطاب پھکڑ میں اکثر ڈاکٹر عبدالحق سے رہتا تھا جو عربی زبان و ادب کے پروفیسر تھے اور اپنے فن میں باکمال تھے۔ عربی زبان پر جیسا عبور انھیں حاصل تھا ہندوستان میں کم لوگوں کو ہوگا، تحریر اور تقریر دونوں میں۔ وہ بھی پھکڑ میں خلیفہ صاحب سے کم نہ تھے۔ ان کا رنگ گہرا سیاہ تھا، ایسا سیاہ جس میں کچھ اودا پن آجاتا ہے۔ خلیفہ صاحب ان کے برخلاف گورے چٹے، سرخ سفید کشمیری تھے۔ کلب والے دونوں کو بلیک اینڈ

وہائٹ کہا کرتے تھے۔ رنگ وروپ میں دونوں ایک دوسرے کی ضد تھے لیکن ہیکڑی کی حد تک دونوں کے مذاق میں اتحاد تھا۔ جب ان دونوں میں نوک جھونک چلتی تو کلب کے دوسرے ممبر تماشائیوں کی طرح لطف اندوز ہوتے۔ ایسا محسوس ہوتا کہ ٹکر برابر کی ہے۔ ممکن ہے کبھی کوئی سیر رہا ہو تو دوسرا سوا سیر۔ اسٹاف کلب جب نوبت پہاڑ سے اٹھ کر پہلے حیدرگڑھ اور پھر اڈگیسٹ چلا گیا تو یہ دلچسپ محفلیں درہم برہم ہوگئیں جن کی یاد لوگوں کے دلوں میں عرصے تک رہی۔ کئی مرتبہ کوشش ہوئی کہ پرانا نقشہ جمے لیکن نہ جم سکا ملک کی تقسیم کے بعد تو یہ انتشار مکمل ہوگیا۔

خلیفہ صاحب کی بذلہ سنجی اور ظرافت میں بلا کی اپج اور جودت طبع کا اظہار ہوتا تھا۔ ان کی باتوں میں کبھی تلخی نہیں پیدا ہوتی تھی۔ ان کا مذاق پروفیسر ہارون خاں شیروانی سے بھی اکثر اوقات چلتا رہتا تھا جو تاریخ کے صدر شعبہ تھے۔ وہ خلیفہ صاحب کے پرانے ساتھی تھے۔ دونوں عثمانیہ یونیورسٹی کے اسٹاف میں ایک ہی دن شریک ہوئے۔ خلیفہ صاحب کہتے تھے کہ دونوں کی شادی بھی ایک ہی تاریخ میں ہوئی اور دونوں کے ہاں ایک ہی دن لڑکے پیدا ہوئے۔ مجھے معلوم نہیں مذاق میں کہتے تھے یا یہ امر واقعہ تھا۔ پروفیسر ہارون خاں شیروانی دوسرے اصحاب کے مذاق کی تاب نہ لا کر غصے ہوجاتے تھے اور کبھی اتنے غصے ہوتے کہ اٹھ کر چلے جاتے تھے۔ لیکن خلیفہ صاحب کے مذاق سے وہ بھی لطف اندوز ہوتے تھے۔ وہی باتیں جو خلیفہ صاحب کہتے تھے اگر کوئی دوسرا کہتا تو پھر اس کی خیر نہ تھی۔ میں نے متعدد مرتبہ پروفیسر ہارون خاں شیروانی کو کہتے ہوئے سنا کہ "بھئی، خلیفہ کی بات میں ڈنک نہیں ہوتا"۔ پروفیسر ہارون خاں شیروانی سے جب علی گڑھ میں ملاقات ہوئی اور خلیفہ صاحب کے انتقال کا ذکر آیا تو میں نے دیکھا کہ ان کی آنکھیں اشک آلودہ ہوگئی ہیں۔

اسٹاف کلب کے علاوہ بھی مجھے خلیفہ صاحب کو نزدیک سے دیکھنے کا موقع ملا۔ میں حیدرگوڑہ میں عرصے تک ان کے پڑوس میں رہا۔ اکثر ان سے ملاقات رہتی تھی۔ ان صحبتوں میں ان کی گفتگو کا انداز مختلف ہوتا تھا۔ شگفتہ مزاجی تو ان کی فطرت میں تھی اور خشک مزاجی کی ان سے کبھی توقع نہیں ہوسکتی تھی۔ جس طرح بذلہ سنجی میں وہ بات میں بات پیدا کرتے تھے اسی طرح جب سنجیدہ علمی مسائل پر گفتگو کرتے تو معنی آفرینی کی عجب عجب صورتیں نظر آتیں۔ ہر بات میں ان کی غیر معمولی خداداد ذہانت کا اظہار ہوتا تھا۔ وہ دوسروں کے چبے چبائے نوالوں سے ہمیشہ احتراز کرتے اور جو بات کہتے اس میں ذاتی اپج اور اجتہاد کا رنگ ہوتا۔ ان کی نظر مغربی اور اسلامی فلسفے پر بہت وسیع تھی اور ایسا محسوس ہوتا تھا کہ انھوں نے دونوں کا تقابلی مطالعہ بڑی گہری نظر سے کیا ہے۔ فلسفے اور ادب پر انھوں نے بہت کچھ پڑھا تھا اور ان کے متعلق کوئی ایسا دقیق مسئلہ نہ تھا جس پر وہ رائے نہ رکھتے ہوں پھر ان کی یہ رائے محض اوپری معلومات پر مبنی نہ تھی بلکہ وہ مسائل کی تہ تک پہنچتے تھے اور گفتگو کے دوران میں اپنی ذہانت سے بہت سی ایسی ضمنی باتوں کی نشاندہی کرتے تھے جن پر اکثر لوگوں کی نظر نہیں پڑتی۔ مجھے بھی ان مسائل سے دلچسپی تھی اس لئے یہ گفتگوئیں گھنٹوں جاری رہتیں۔ چونکہ مجھ پر شفقت فرماتے تھے اس لئے کہتے تھے "آپ کو تاریخ کے شعبے کے بجائے فلسفے کے شعبے میں ہونا چاہیئے"۔ یہ بات انھوں نے مجھ سے کئی مرتبہ کہی جسے میں نے ہمیشہ ان کی شفقت پر محمول کیا۔ ایک دفعہ یوم اقبال کے جلسے میں میری تقریر ہوئی جسے انھوں نے پسند کیا۔ جلسے کے بعد کہنے لگے "آپ کو فلسفہ کے شعبے میں آجانا چاہیئے"۔ میں نے کہا، "پروفیسر ہارون خاں شیروانی سے آپ بنٹ

لیجے رگا۔" ہنسنے لگے۔

خلیفہ صاحب کا بیڈ روم اور لائبریری ایک ہی کمرے میں تھی جس میں ایک بہت لمبا چوڑا مچھر دان جو نصف کمرے میں پھیلا ہوا تھا لگا رہتا تھا تاکہ اس کے اندر بیٹھ کر مکھیوں اور مچھروں سے بچاؤ ہو سکے۔ جب ان سے ملنے جاتا تو وہیں بلا لیتے تھے۔ ان کے پاس متعدد موٹے موٹے فائل تھے جن میں انھوں نے اسلامی فلسفہ اور مذہب کے متعلق اپنی یادداشتیں رکھی تھیں۔ بعض اوقات انھیں کھولتے اور مجھے کچھ عبارتیں سناتے جن کا تعلق اس موضوع سے ہوتا جس پر گفتگو ہو رہی ہو۔ یہ مسئلہ کئی سال تک جاری رہا۔ میں اکثر کہتا کہ آپ ان یادداشتوں کی ترتیب و تہذیب کر کے شائع کرا دیجئے۔ کہتے کہ ہاں، اس کا بھی وقت آئے گا۔ مجھے یہ دیکھ کر مسرت ہوئی کہ پاکستان جانے کے بعد ان کی تخلیقی صلاحیت جو حیدرآباد میں نہ معلوم کیوں گھٹ کر رہ گئی تھی، پوری طرح بروئے کار آئی اور انھوں نے اعلیٰ پائے کی متعدد تصانیف شایع کیں جو فلسفے اور ادب دونوں پر محیط ہیں۔ ان کی تصانیف میں "اسلامک آئیڈیالوجی"، "حکمت رومی" "افکار غالب"، اور "افکار اقبال"، خاص اہمیت رکھتی ہیں۔ اگر ان کتابوں کی ترتیب کے وقت وہ ان پر کڑی ناقدانہ نظر ڈالتے تو وہ اعادہ و تکرار باقی نہ رہتی جو اب ان میں ہے۔ بایں ہمہ ان کی سب تصانیف فکر انگیز ہیں۔ پھر اس کے علاوہ ادارہ ثقافت اسلامیہ کے ڈائرکٹر کی حیثیت سے انھوں نے جو کام کیا وہ یادگار رہے گا۔ یہ ادارہ بہترین عطیہ ہے جو ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم نے اپنے وطن کی خدمت میں پیش کیا ہے۔

مجھے اپنے حیدرآباد کے دوران قیام میں بعض مشہور ادیب، شاعر اور انشا پردازوں سے ملنے کا موقع ملا مثلاً حیدر یار جنگ، نظم طباطبائی، فصاحت جنگ جلیل، جوش ملیح آبادی

فانی بدایونی، مرزا آہادی رسوا، فرحت اللہ بیگ اور آغا حیدر حسن۔ میرے زیادہ تعلقات فرحت اللہ بیگ اور آغا حیدر حسن سے رہے۔ مرزا فرحت اللہ بیگ دہلی کی ٹکسالی نکھری ہوئی زبان لکھتے تھے۔ "مضامین فرحت" کی متعدد جلدوں میں انھوں نے ہر قسم کے مضامین شامل کئے ہیں، سنجیدہ اور مزاحیہ دونوں۔ "نذیر احمد کی کہانی کچھ ان کی اور کچھ میری زبانی"، پڑھنے کے لائق سوانحی خاکہ ہے۔ موضوع کے لحاظ سے ان کے طرز تحریر میں تھوڑی بہت تبدیلی آجاتی ہے لیکن بنیادی طور پر ان کے اسلوب کا رنگ برقرار رہتا ہے۔ مولوی نذیر احمد کے بعد مرزا فرحت اللہ بیگ اس زمانے میں دہلی کی خالص، بے میل، پاکیزہ اردو کی نمایندگی کرتے ہیں، ان کا انداز بیان سادہ، شستہ اور سلیس ہے جو علمی مطالب ادا کرنے کے لئے نہایت موزوں ہے۔ انھیں محاوروں کے استعمال پر غیر معمولی قدرت حاصل ہے۔ پھول والوں کی سیر میں انھوں نے بہادر شاہ ظفر کے زمانے کے دلی والوں کی جیتی جاگتی تصویر کھینچ دی ہے۔ ان کے طنزیہ مضامین میں مشرقیت کو انسانیت سے ہم آمیز کیا گیا ہے۔ وہ خود بڑے زندہ دل اور شگفتہ مزاج انسان تھے۔ ان کی تحریر میں انکی بھی خوش طبعی کی جھلکیاں صاف نظر آتی ہیں۔ انھوں نے بزم اردو قائم کی جس کے جلسے ہر مہینے ہوا کرتے تھے۔ ان جلسوں میں کوئی نہ کوئی مقالہ پڑھتا تھا یا شاعر اپنا کلام سناتے تھے۔

آغا حیدر حسن | آغا حیدر حسن دہلی کی بیگماتی زبان کے ماہر ہیں۔ میں سمجھتا ہوں وہ اس فن میں یکتا ہیں اور ان کا اسلوب منفرد ہے۔ ان کی ہر تحریر میں نئے نئے لفظ ملتے ہیں جن سے لوگ عام طور پر واقف نہیں ہوتے۔ اگر ان لفظوں کو جمع کیا جائے تو ان کی تعداد سیکڑوں تک پہنچے گی۔ ان میں سے اکثر ایسے ہیں جو مروجہ لغات میں بھی نہیں

ملیں گے۔ میں نے ان سے کئی مرتبہ کہا کہ اپنے مضمون اکٹھا کر کے چھپوا دیجیے۔ ہاں ہاں کہتے تھے لیکن کیا کچھ نہیں۔ ان کے پاس ان کے سب مضمونوں کی نقلیں بھی موجود نہیں انھوں نے گذشتہ چالیس سال میں بہت کچھ لکھا ہے۔ اگر کوئی ان مضمونوں کو جمع کر کے شائع کر دے تو اردو زبان کی بڑی خدمت ہو گی۔ ان کا لفظوں کا ذخیرہ غیر معمولی طور پر وسیع ہے۔

آغا صاحب کی گفتگو کا انداز بھی مخصوص ہے۔ ان کی لچھے دار باتیں، ان کا نرم اور نازک لہجہ اور دلکش انداز بیان سننے والوں کو دہلی کی قدیم حویلیوں اور قلعہ معلیٰ کی صحبتوں میں پہنچا دیتا ہے۔ وہ ہر محفل میں طوطیِ ہزار داستان کی طرح چہکتے ہیں۔ حیدر آباد کے اعلیٰ طبقے میں بہت مقبول ہیں اور ان لوگوں میں ان کی بڑی مانگ ہے۔ لوگ انھیں پکڑ لے جاتے ہیں اور دنوں مہمان رکھتے ہیں، صرف ان کی باتوں سے محظوظ ہونے کے لئے۔ بے شر انسان ہیں۔ ان کے منھ سے کبھی کسی کی برائی نہیں سنی۔ امیروں کے علاوہ معمولی لوگوں سے بھی ان کا یارانہ ہے۔ اسکول کے استادوں سے لے کر پائگاہ کے امیروں تک سب یہ سمجھتے ہیں کہ ان سے بڑھ کر ان کا کوئی اور مخلص دوست نہیں۔ اس میں ان کی کوئی ریاکاری نہیں بلکہ ان کی میٹھی زبان کا صدقہ ہے کہ ہر کوئی جس سے وہ ملتے ہیں انھیں اپنا یارِ غار سمجھتا ہے۔ میں اسے ان کی سیرت کی بڑی خوبی سمجھتا ہوں۔ بعض دفعہ میں نے دیکھا کہ دو ایسے شخصوں کے ساتھ ان کے دوستانہ تعلقات ہیں جو آپس میں ایک دوسرے کے سخت مخالف ہیں۔ آغا صاحب کبھی ایک کے سامنے دوسرے کا ذکر نہیں کرتے اور کبھی ذکر آ جائے تو چپ رہتے ہیں۔ ان کی زبان سے کسی کی غیبت نہیں سنی۔ پائگاہ کے امیروں کے علاوہ سالار جنگ

اور سر اکبر حیدری کے یہاں باریاب تھے۔ سالار جنگ سے ان کا پھکڑ مذاق بھی چلتا تھا جس کی تہ میں نواب صاحب کے جنسی معرکوں کی طرف ضرور کوئی نہ کوئی اشارہ کنایہ ہوتا تھا۔ وہ سالار جنگ کے رازداروں میں تھے۔ ان کے ساتھ مذاق میں چاہے کچھ بھی کہہ لیں لیکن دوسروں سے ان کے راز افشا نہیں کرتے تھے۔ میں اسے آغا صاحب کی عالی ظرفی اور شرافت سمجھتا ہوں۔ آخری زمانے میں سر اکبر حیدری اور لیڈی حیدری کچھ ان سے بدظن ہو گئے تھے لیکن آغا صاحب کی زبان سے ان کے خلاف کبھی ایک لفظ سننے میں نہیں آیا۔ سر اکبر حیدری کی نسبت کہتے تھے، وہ میرے محسن ہیں۔ انھیں کی مدد سے میرے قدم حیدرآباد میں جمے۔ علی گڑھ سے انٹرمیڈیٹ کر کے تلاش روزگار میں حیدرآباد پہنچے تو راس مسعود نے ان کا تعارف سر اکبر حیدری اور لیڈی حیدری سے کرا دیا۔ چنانچہ سر اکبر حیدری کی دلچسپی کی وجہ سے انھیں پولیس کے محکمے میں سب انسپکٹری کی خدمت پر مامور کیا گیا اور اضلاع میں کسی مقام پر تعیناتی عمل میں آئی۔ آغا صاحب نے اپنی خدمت کا جائزہ لیا اور چند مہینے ہی کارگذار رہے تھے کہ ایک رات چوروں نے خود ان کے مکان پر دھاوا بول دیا اور جو کچھ تھا سب اٹھا لے گئے۔ آغا صاحب نے بڑے مزے سے چوروں کا قصہ ایک روز مجھے سنایا۔ کہتے تھے کہ میں نے اندھیرے میں کچھ آدمیوں کو ادھر اُدھر چلتے پھرتے دیکھا تو میں اپنی چارپائی کے نیچے چھپ گیا۔ اس پر میں نے کہا کہ اگر آپ چارپائی پر خاموش لیٹے رہتے تو چور پاگل تو تھے نہیں کہ خواہ مخواہ آپ سے چھیڑ چھاڑ کرتے۔ کہنے لگے اگر کرتے تو میں ان کا کیا بگاڑ لیتا۔ اس پر انھوں نے گلستان سعدی کی وہ کہانی سنائی کہ ایک دفعہ کوئی لومڑی پریشان حال بھاگی چلی جارہی تھی کسی نے پوچھا کیوں اتنی پریشان ہے۔ کہنے لگی کہ شتر بچے

کو گرفتار کر رہے ہیں۔ اس پر سوال کرنے والے نے پوچھا تجھے کیا ڈر ہے۔ تجھے بھلا کوئی کیوں شتر بچہ سمجھنے لگا۔ اس پر لومڑی نے جواب دیا کہ اگر کوئی سمجھ لے، تو میں کیا کرلوں گی۔ یہ کہانی بیان کرتے جاتے تھے اور سعدیؒ کی حکمت اور دنیاوی عقل کی تعریف کرتے جاتے تھے۔ میں نے ہنس کر کہا کہ آپ یہ سنجیدگی سے کہہ رہے ہیں یا مذاق سے۔ کہنے لگے اللہ کی قسم مذاق نہیں ہے۔ میں نے کہا قسم کی کیا ضرورت ہے۔ آپ جو فرما رہے ہیں میں اسے مانتا ہوں۔

جب راس مسعود کو آغا صاحب کے چارپائی کے نیچے چھپنے کا قصہ معلوم ہوا تو انھوں نے ان سے استعفا دلوا کر تعلیمات میں نظام کالج میں مامور کرا دیا۔ آخر تک وہیں رہے اور لکچرر کی حیثیت سے پنشن لی۔ استاد کی حیثیت سے بے حد مقبول تھے۔ کالج کے علاوہ امتحان کے زمانے میں طلبہ پڑھنے کے لئے ان کے مکان پر بھی آتے تھے۔ وہ بڑی خندہ پیشانی اور محبت سے ان کے ساتھ پیش آتے تھے۔

آغا صاحب کو قدیم اشیا اور نوادر جمع کرنے کا حد سے بے حد شوق ہے۔ انھوں نے مجھے کئی بار اپنا ذخیرہ دکھایا۔ ان کے پاس نہایت قیمتی نوادر ہیں جو ٹین کے بکسوں میں بند پڑے ہیں۔ ان کے کتب خانے میں عہد مغلیہ کی قلمی تاریخوں کے علاوہ قدیم دکنی اردو کے بعض نایاب نسخے ہیں۔ ان میں سے "قصۂ دل افروز و دلبر" مصنفہ عیسوی خاں کو آج کل ڈاکٹر مسعود حسین خاں ایڈٹ کر رہے ہیں۔ عنقریب یہ کتاب شائع ہو جائیگی۔ یہ کل کتھا کے کچھ بعد کی ہے۔ آغا صاحب نے بڑی خندہ پیشانی سے اس کا قلمی نسخہ مسعود کو ایڈٹ کرنے کے لئے دیدیا اور صرف اتنا کہا کہ "اگر کتاب شائع ہونے سے پہلے میں مر جاؤں تو میرے وارثوں کو دیدینا" وہ جانتے ہیں کہ دنیا میں اس کتاب کا صرف یہی ایک نسخہ ہے جو بے بہا ہے۔ لیکن صرف

ان ذاتی تعلقات کی وجہ سے جو ان میں اور مجھ میں ہیں اور مسعود کی اہلیت کو دیکھتے ہوئے انھوں نے بلاتکلف یہ کتاب مسعود کے حوالے کر دی۔ میں اسے ان کی شرافت اور علم دوستی پر محمول کرتا ہوں۔ قلمی کتابوں کے علاوہ آغا صاحب کے پاس مغل قلم کی نایاب تصویریں ہیں جن میں سے بعض جہانگیر اور شاہجہاں کے عہد کی ہیں۔ مغلیہ عہد کی مردانہ اور نسوانی پوشاکیں ہیں۔ کئی سو نہایت عمدہ تسبیحیں ہیں جن میں بعض قیمتی پتھروں کی بنی ہوئی ہیں۔ مرزا غالبؔ کی ایک انگوٹھی ہے جو بیش بہا ہے۔ وہ اسے کبھی کبھی پہن کر ہمارے ہاں آتے تھے۔ کئی دفعہ میں نے دیکھا وہ اس انگوٹھی کو بوسہ دیتے تھے اور پیشانی سے لگاتے تھے۔ وہ غالب کو غزل اور اس کی نثر دونوں کو اردو زبان و ادب کی معراج سمجھتے ہیں۔

آغا صاحب سے جب میں پہلی مرتبہ ملا تو ان کی داڑھی مونچھ صاف تھی۔ کچھ عرصے کے بعد انھوں نے چھوٹی فرنچ کٹ داڑھی رکھ لی جو کئی سال رہی۔ پھر ایک روز دیکھا کہ داڑھی پھر صاف ہو گئی۔ عرصے تک یہ کہنا مشکل تھا کہ ان کا شمار داڑھی منڈوں میں کیا جائے یا داڑھی والوں میں۔ کئی کئی روز وہ خط نہ بنواتے جس کی وجہ سے چہرے پر کھونٹیاں، کھونٹیوں کی حد سے بڑھ جاتی تھیں۔ کبھی انھیں تھوڑے تھوڑے وقفے سے صاف کرا دیتے اور کبھی انھیں ہفتہ عشرہ تک یوں ہی رہنے دیتے۔ میں نے اس کی وجہ دریافت کی تو کہنے لگے "یہ میں ٹرنر کو چڑھانے کے لئے کرتا ہوں۔" ٹرنر نظام کالج کا پرنسپل تھا جس سے ان کی اَن بَن رہا کرتی تھی۔ ان کی لوچ دار باتوں کی لطافت کو وہ نہیں سمجھ سکتا تھا اس لئے کہ انگریزی میں ان کی صورت مسخ ہو جاتی تھی اور اس سے غلط فہمیاں پیدا ہوتی تھیں۔ چنانچہ اس نے انھیں اس الزام میں کہ وہ کلاس میں لڑکوں سے مذاق کرتے ہیں، خدمت سے برطرف کر دیا تھا۔ کچھ عرصے کے بعد چند با اثر لوگوں

کے بیچ میں پڑنے سے وہ اپنی خدمت پر بحال ہوئے۔ آغا صاحب کا مخصوص انداز بیان ہے جس کی قدر وہی لوگ کر سکتے ہیں جو اس تہذیبی پس منظر سے واقف ہوں جس کے سایے میں ان کی ابتدائی زندگی گذری تھی۔ آغا صاحب جب ٹرنر سے انگریزی میں گفتگو کرتے تھے تو اسی انداز بیان کا چربہ انگریزی میں اتارنا چاہتے تھے جسے ٹرنر سمجھنے سے قاصر تھا اور اسی وجہ سے اس نے ان کی نسبت اچھی رائے قائم نہیں کی۔ ٹرنر کو چڑانے کا دور بھی گذر گیا اور آغا صاحب نے پنشن لے لی۔ اب انھوں نے سوپ سی لمبی چوڑی داڑھی رکھ لی ہے جو ان کی جامہ وار کی شیروانی اور کامدانی کی تشش گوشیہ ٹوپی پر خوب کھلتی ہے۔ تسبیح ہر وقت ہاتھ میں رہتی ہے، چاہے گھر میں تخت پر بیٹھے ہوں یا کہیں باہر جا رہے ہوں۔ ان کے نزدیک ان کے وظائف تیر بہدف ہیں۔ وہ مجھ سے کہتے تھے کہ ان کے داماد معظم جو پولیس ایکشن کے بعد کئی سال تک بڑی مصیبت اور پریشانی میں مبتلا رہے، ان وظائف کی بدولت قید سے رہا ہوئے اور بعد میں یونیسکو کے نظم و نسق میں انھوں نے عروج حاصل کیا۔ آج کل آغا صاحب اپنے داماد اور بیٹی کے ساتھ پیرس میں کئی سال سے براج رہے ہیں۔ بعض لوگوں نے مشہور کر دیا کہ انھوں نے پیرس میں کسی بیوہ سے عقد کر لیا ہے۔ دہلی کے ایک ماہنامے نے یہ خبر چھاپ دی لیکن مجھے یقین نہیں آیا۔ اب وہ ستر کے پیٹے میں ہیں بھلا یہ کون سی عمر شادی رچانے کی ہے۔ اگر خبر صحیح نکلی تو انھیں ان کی اس جوان ہمتی پر مبارک باد دونگا۔ خواجہ غلام السیدین حال ہی میں پیرس گئے تھے۔ وہ آغا صاحب سے ملے تھے۔ ان کا بیان ہے کہ آغا صاحب سے پیرس کے اعلیٰ طبقے کی بعض خواتین کو بڑی عقیدت ہو گئی ہے اور وہ اُن سے اسی طرح ملتی ہیں جیسے مرید اپنے پیر سے۔ یہ آغا صاحب کی زندگی کا بالکل نیا رنگ ہے۔ دیکھئے

کیا رنگ لاتا ہے۔

آیئے اب حیدرآباد کی چند اور شخصیتوں سے ملاقات کریں:۔

مسز سروجنی نائیڈو — مسز سروجنی نائیڈو کو میں نے سب سے پہلے ۱۹۱۶ء میں ایم۔اے۔او کالج کے یونین میں دیکھا تھا اور ان کی تقریر سنی تھی۔ میں اس زمانے میں گورنمنٹ ہائی اسکول میں پڑھتا تھا۔ ان کے ساتھ ان کی چھوٹی صاحبزادی لیلامنی بھی تھیں۔ ان کی تقریر کا موضوع ہندو مسلم اتحاد تھا۔ مجھ میں اتنی صلاحیت تو نہیں تھی کہ ان کی انگریزی تقریر کو اچھی طرح سے سمجھ سکتا لیکن اتنا مجھے یاد ہے کہ وہ اپنا سیدھا ہاتھ اوپر اٹھاکر تقریر کرتی تھیں جیسے اپنے جذبات کو ہاتھ کے اشارے سے ظاہر کر رہی ہوں۔ تقریر کے وقت ان کی شخصیت کا جادو لوگوں کو مسحور کر لیتا تھا۔ اقبال احمد سہیل نے اس موقع پر فارسی اور اردو میں ان کی تعریف میں قصیدے پڑھے تھے جن میں سے مجھے دو شعر یاد رہ گئے ہیں۔

سرزد اگر تلاطمے بجانِ شیخ وشاب زد — تبسمش تکلمے ہکلش ترنمے

اخلاص کا نذرانہ تفریق کی قربانی — آئی ہیں مسز نائیڈو دانش گہِ ملی میں

اس کے بعد کانگریس کے جلسوں میں دور سے ان کے درشن ہوئے۔ پھر حیدرآباد میں مجھے ان سے نیاز حاصل کرنے کے مواقع حاصل ہوئے۔ جب کبھی وہ حیدرآباد تشریف لاتیں تو میں ان سے ملنے جاتا تھا۔ دو مرتبہ وہ بھی غریب خانہ پر تشریف لائیں۔ ان کے مکان پر اکثر چائے کی دعوتیں ہوتی رہتی تھیں جن میں مجھے یاد فرماتی تھیں۔ انھیں دعوتوں میں مجھے امرناتھ جھا، کرشنا سوامی مدالیار، سر تیج بہادر سپرو، مسٹر اور مسز رستم جی اور عثمان سبحانی سے ملنے کا موقع ملا۔ جس زمانے میں بہادر یار جنگ اور کانگریس کے لیڈر نرسنگ راؤ

میں مصالحت کی بات چیت ہو رہی تھی، انھوں نے مجھے بلوایا اور کہا کہ اس نازک موقع پر تمھیں گفتگو کی کامیابی کے لئے پوری کوشش کرنی چاہیے۔ چنانچہ ان کے فرمانے کے بموجب میں بہادر یار جنگ سے اس سلسلے میں ملا اور میں نے کوشش کی کہ مفاہمت کی کوئی صورت نکلے۔ لیکن یہ حیدر آباد کی بدقسمتی تھی کہ ایسا نہ ہوا اور دونوں فرقوں میں کشیدگی بڑھتی گئی۔ یوم اقبال کے جلسوں میں بھی جب وہ حیدر آباد میں ہوتیں تو ضرور شریک ہوتی تھیں۔ وہ اردو اچھی طرح سمجھتی تھیں۔ میری ہمت افزائی کے لئے انھوں نے ایک مرتبہ یہ بھی فرمایا کہ میں تمھاری تقریر سننے کے لئے آئی ہوں۔ میں نے ان کے اس فرمانے کو ان کی شفقت پر محمول کیا۔

مسز سروجنی نائیڈو کے مزاج میں بعض اوقات عجب قسم کا تضاد محسوس ہوتا تھا۔ کسی کو سخت سست کہیں گی اور فوراً ہی مہربانی اور ملائمت کا اظہار کریں گی۔ اپنی رائے میں انتہائی شدت ظاہر کریں گی اور فوراً ہی مسئلے کا دوسرا پہلو خود ہی پیش کر دیں گی جس کا انداز مفاہمانہ ہوگا۔ قومی جذبے کے اظہار میں انتہائی نقطۂ نظر پیش کرتے ہوئے لب و لہجہ کو بدل کر عالمگیر دردمندی کا اظہار کرنے لگیں گی گویا وہ قومیت کی تنگ دلی سے بالاتر جگ نواسی ہیں جس کا وطن ساری دنیا ہے۔ اب گفتگو میں قوم کے بجائے پوری انسانیت مرکزی نقطہ بن جائے گی۔ مسز نائیڈو کو دلسوزی کے ساتھ ساتھ طنز و تعریض میں خاص ملکہ تھا۔ جب کسی کا خاکہ اڑاتی تھیں تو لفظوں میں اس کی ہو بہو تصویر کھینچ دیتی تھیں۔ میں نے اکثر اوقات ان خاکوں میں ہمدردی کی کمی محسوس کی لیکن میں سمجھتا ہوں کہ طعن و طنز میں ان کی نیت بخیر ہوتی تھی۔ باتوں کی زد میں اگر کوئی آتا ہے تو آجائے۔ وہ کسی کی توہین نہیں کرنا چاہتی تھیں۔ ان کا طنز سخن گسترانہ انداز کا

ہوتا تھا۔ میں نے بعض دفعہ محسوس کیا کہ جب ان پر طنز و تعریض کی مزاجی کیفیت (موڈ) کا غلبہ ہوتا تو بڑے بڑوں کو نہیں چھوڑتی تھیں ۔ ایک دفعہ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے اجلاس کا منظر بڑی تفصیل سے بیان کرنے لگیں کہ اس مجمع میں پنڈت نہرو، ڈاکٹر انصاری اور مولانا ابوالکلام آزاد کے سوا کوئی مہذب انسان نظر نہیں آتا ۔ ان ارکان میں سے اکثر تکیے کی ٹیکی لگا کر ایک ٹانگ دوسری ٹانگ پر رکھ کر بیٹھتے ہیں، بلا لحاظ اس امر کے کہ اس حالت میں دھوتی میں جسم کے وہ حصے جو پوشیدہ رہنے چاہئیں دکھائی دیتے ہیں۔ اس پر خاص طور پر زور دیتی تھیں کہ ان لوگوں کو اس کا بھی خیال نہیں ہوتا کہ جلسے میں خواتین شریک ہیں۔ پھر ان لوگوں کے نام بھی گناتی تھیں جن میں بعض چوٹی کے لیڈر شامل تھے ۔میں اس جگہ ان کے نام دہرانا مناسب نہیں سمجھتا۔ کٹی کانگریسی تھیں لیکن خوش لباس لوگوں کو پسند کرتی تھیں ۔ انھیں شکایت تھی کہ عام لوگ مہاتما گاندھی کی تقلید میں غیر شائستہ ہوتے جا رہے ہیں ۔جس طرح کوئی فن کار اپنی رنگ میں اپنی تصویر کے کسی خاص پہلو کو نمایاں کرنا چاہتا ہے تو گہرے مبالغہ آمیز رنگوں سے اس کا اظہار کرتا ہے ، اسی طرح بعض اوقات مسز نائیڈو اپنے طنز و تعریض میں مبالغے سے کام لیتی تھیں۔ وہ شاعر تھیں اس لئے ان کے یہاں بغیر مبالغے کے حسن ادا کی جلوہ گری نہیں ہو سکتی تھی ۔میں سمجھتا ہوں ہر حالت میں ان کی نیت بخیر تھی ۔ وہ نہ تو کسی کی دل آزاری چاہتی تھیں اور نہ کسی کو ذلیل کرنا ان کا مقصود تھا۔ اصل میں وہ باتیں کرنے کی بڑی شوقین تھیں یہ سب امور ان کے انداز بیان کی مختلف شانیں تھیں ۔ ان کا مقصد مبالغے سے حقیقت کو مسخ کرنا نہیں تھا بلکہ وہ جو کچھ کہتی تھیں زیبِ داستان کے لئے ہوتا تھا جس کا حق انھیں شاعر کی حیثیت

سے حاصل تھا۔ وہ بلا تکان گفتگو کرتی تھیں جس کے موضوع ہر آن اُن کی مزاجی کیفیت کے مطابق بدلتے رہتے تھے۔ جس محفل میں بھی ہوں، چھا جاتی تھیں اور ان کی ذات مرکزی نقطہ بن جاتی تھی۔ اپنی پسند اور ناپسند کو آمرانہ انداز میں ظاہر کرتی تھیں گویا کہ اس معاملے میں ان کی رائے کے ماسوا اور کوئی رائے ممکن نہیں ہے۔ وہ یہ فرض کر لیتی تھیں کہ دوسرے بھی ان کے ہم خیال ہیں۔

مسز نائیڈو کی تخلیقی صلاحیت کا اظہار خطابت کے ذریعے ہوا۔ وہ چھوٹے قد کی تھیں لیکن جب تقریر کرتی تھیں تو ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے کچھ لمبی ہو گئی ہوں۔ یہ ان کی خطابت کا فریب نظر تھا۔ تقریر کے بعد پھر وہی بوٹا سا قد سامنے آ جاتا تھا۔ انھیں انگریزی زبان پر غیر معمولی قدرت حاصل تھی۔ جتنی دیر وہ بولتی تھیں سننے والے مسحور ہو جاتے تھے لیکن تقریر کے ختم ہونے کے بعد حافظے پر زور ڈالنا پڑتا تھا کہ آخر انھوں نے کہا کیا! اس میں شبہہ نہیں کہ ہندو مسلم اتحاد اور وطن کی آزادی پر ان کی تقریریں ولولہ انگیز ہوتی تھیں اور ان کی خطابت نے ملک میں آزادی کے جذبہ کی پرورش میں بڑی مدد دی۔ وہ ہمیشہ برجستہ تقریر کرتی تھیں۔ ان کی تقریر شروع میں مدہم ہوتی تھی، پھر آہستہ آہستہ آواز بلند ہوتی جاتی تھی اور لفظوں کے قافلے یکے بعد دیگرے ان کی بارگاہ خطابت میں اپنی خدمات پیش کرنے لگتے تھے۔ جتنی آواز بلند ہوتی تھی اتنی ہی روانی بڑھتی جاتی تھی۔ میں نے مسز اینی بیسنٹ کی تقریر بھی سنی ہے۔ وہ بھی شروع میں بڑی دھیمی آواز سے بولتی تھیں، جیسے کوئی موسیقی کا ماہر دھیمے سروں میں اپنا رنگ چھیڑے۔ پھر آہستہ آہستہ آواز اونچی ہوتی جاتی تھی لیکن اونچی ہونے پر بھی وہ مسز نائیڈو کی تقریر کے مقابلے میں دھیمی رہتی تھی۔ مسز اینی بیسنٹ آہستہ

آہستہ اپنے دلائل کو سامعین کے دل نشین کرنا چاہتی تھیں، جیسے کسی دعوے کا ثبوت پیش کر رہی ہوں جسے وہ چاہتی تھیں کہ ان کی طرح دوسرے بھی مان لیں۔ اس کے برخلاف مسز نائیڈو روانی مقرر تھیں۔ ان کا مقصد کوئی بات ثابت کرنا نہ تھا، اسلئے کہ وہ جس موضوع پر تقریر کرتی تھیں وہ پہلے سے بلا دلیل کے ثابت تھا اور ان کے عقیدے کا جز تھا۔ ہندو مسلم اتحاد یا وطن کی آزادی ایسے حقائق تھے جنھیں ثابت کرنے کے لئے کسی دلیل کی ضرورت نہ تھی، اس لئے ان کی تقریر تمام تر جذباتی ہوتی تھی جس کا تعلق دماغ کے مقابلے میں دل سے زیادہ ہوتا تھا۔

شہزادی در شاہوار | شہزادی در شہوار ترکی کے آخری خلیفہ سلطان عبد المجید خاں کی صاحبزادی ہیں۔ ۱۹۳۰ء میں ان کی شادی شہزادہ برار اعظم جاہ کے ساتھ اور شہزادی نیلوفر کی شادی شہزادہ معظم جاہ کے ساتھ جنوبی فرانس کے شہر نیس میں ہوئی جہاں آخری خلیفہ کا معزولی کے بعد قیام تھا۔ شہزادی در شہوار بڑے رکھ رکھاؤ اور سوجھ بوجھ کی خاتون ہیں۔ ادب اور فلسفے سے خاص لگاؤ ہے۔ انگریزی، فرانسیسی، ترکی اور اردو بلا تکلف بولتی ہیں۔ ان کے چہرے پر شاہی رعب کے ساتھ خاص قسم کا شرمیلا پن کھیلتا رہتا ہے۔ سرو قامت، بلند و بالا، نقشہ کھڑا، کتابی چہرہ، ماتھا چوڑا، آنکھیں بڑی بڑی نیلی اور روشن۔ آنکھوں کے نیچے ابھری ہوئی ہڈیاں جن سے چہرے کی نزاکت اور نکھر آئی ہے۔ ان کی دلنواز شخصیت میں دبدبہ اور نسوانی نزاکت آنکھ مچولی کھیلتے نظر آتے ہیں۔ سب سے الگ رہنے پر بھی سب سے قریب رہتی ہیں۔ متانت میں دردمندی قدرتی طور پر ہم آمیز ہے جس میں تصنع نام کو نہیں۔ کم سخن ہیں لیکن اگر چاہیں تو فلسفے اور ادب کے جدید ترین رجحانوں اور سائنس کی دریافتوں اور ایجادوں کے متعلق

گفتگو کرسکتی ہیں گفتگو بھی ایسی کہ پروفیسر اس پر رشک کریں جب کسی کی طرف دیکھتی ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے اُنکی آنکھوں کی غیر معمولی روشنی ایکسرے کیطرح انسان کے اندرونی کیرکٹر کے خدوخال میں نفوذ کر گئی ہے۔ اکثر اوقات لوگوں کے متعلق اپنی رائے قائم کرنے میں غلطی نہیں کرتیں۔ ان کی ٹھوڑی نمایاں اور نازک گولائی لئے ہوئے ہے جس سے ان کے ارادے کی مضبوطی کا اظہار ہوتا ہے۔ ان کا رنگ گورا، بال بھورے، پیچھے کی طرف مڑے ہوئے رہتے ہیں۔ کبھی کبھی بالوں کو چوٹیوں میں گوندھ کر اوپر سمیٹ لیتی ہیں۔ ان کی قوتِ ارادی کا اظہار ان کے ورق کی طرح باریک سرخ ہونٹوں سے بھی ہوتا ہے۔ ان کی ناک کلاسکی انداز کی لمبی، ستوان، سرے پر ذرا مڑی ہوئی ہے۔ یہ اسی قسم کی ناک ہے جو سلطان محمد فاتح قسطنطنیہ کی تصویر میں نظر آتی ہے۔ درشہوار کی صورت میں بھی اس فاتح کی مشابہت جھلکتی ہے جس کا خالدہ ادیب خانم نے بھی ذکر کیا ہے۔

شہزادی درشہوار کو گھوڑے کی سواری کا بڑا شوق ہے۔ اکثر شام میں بحار اہل کی طرف نکل جاتی تھیں۔ یہاں کچھ فاصلے پر انھوں نے ایک حوض بنوایا تھا اور یہیں ایک محل تعمیر کرانے کا ارادہ تھا لیکن بعد میں جب سیاسی حالات بدلے تو انھوں نے یہ خیال ترک کر دیا اور علی نواز جنگ کے انتقال کے بعد ان کا مکان اپنی رہائش کے لئے خرید لیا۔

مجھے دو سال شہزادی درشہوار کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ میں حیدرآباد کے زنانہ کالج میں ایم، اے کو تاریخ پڑھاتا تھا اور اس کے لئے ہفتے میں دو مرتبہ وہاں جاتا تھا۔ اس زمانے میں اس کالج کی پرنسپل رقیہ بیگم (بیگم زین یار جنگ) تھیں۔ ایک روز جب میں کلاس میں لیکچر دے رہا تھا تو ان کا پرچہ ملا کہ کلاس کے بعد مجھ سے مل

لیجیے گا۔ چنانچہ میں ان سے دفتر میں جاکر ملا۔ میں کرسی پر بیٹھا ہی تھا کہ رقیہ بیگم نے کہا "میں آپ کو کچھ تکلیف دینا چاہتی ہوں"۔ میں نے کہا فرمائیے۔ کہنے لگیں "میں نے شہزادی درشہوار سے آپ کا ذکر کیا تھا۔ انکی اور میری خواہش ہے کہ آپ شہزادہ مکرم جاہ کے ٹیوٹر ہو جائیں"، پھر کہنے لگیں "آپ انکار نہیں کریں گے اس لئے کہ میں شہزادی صاحبہ سے وعدہ کر چکی ہوں کہ آپ کو ضرور آمادہ کر لونگی"۔ یہ سب باتیں اس قدر اچانک طور پر ہوئیں کہ مجھے سوچنے اور اپنے احباب سے مشورہ کرنے کا موقع تک نہ ملا۔ میں نے کہا "شہزادی صاحبہ کی اور آپ کی جو خوشی ہے اسے پورا کرنا میں اپنا فرض سمجھتا ہوں"۔ رقیہ بیگم نے اسی وقت شہزادی درشہوار کو ٹیلیفون کیا اور انھیں اطلاع دی کہ ہم لوگ ان کی خدمت میں حاضر ہو رہے ہیں۔ بلاوسٹا محل پہنچے تو سامنے ہی شہزادہ برار اعظم جاہ سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ انھیں سلام کرتے ہوئے آگے بڑھے شہزادی درشہوار کے پرائیوٹ سکریٹری ساتھ تھے۔ وہ ہم دونوں کو اوپر لے گئے۔ ایک وسیع کمرے میں جہاں صوفے بچھے ہوئے تھے ہمیں بٹھایا۔ دو تین منٹ بعد ہمیں شہزادی صاحبہ کے ڈرائنگ روم میں لے گئے۔ وہاں جاکر بیٹھے ہی تھے کہ شہزادی صاحبہ تشریف لے آئیں۔ رقیہ بیگم نے میرا تعارف کرایا۔ کہنے لگیں "میں نے آپ کے متعلق سنا ہے کہ آپ فرانسیسی زبان بہت اچھی بولتے ہیں"۔ پھر فوراً وہ اصل مسئلے کی طرف پلٹ آئیں اور کہنے لگیں "میری خواہش ہے کہ آپ مکرم جاہ کے استاد ہو جائیے"۔ میں نے عرض کیا "میرے لئے یہ بات فخر کا موجب ہوگی"۔ ہم باتیں کر ہی رہے تھے کہ مکرم جاہ آگئے شہزادی صاحبہ نے ان سے میرا تعارف کرایا۔ مکرم جاہ نے مجھ سے فرانسیسی میں گفتگو شروع کردی اب شہزادی صاحبہ بھی فرانسیسی بولنے لگیں۔ پھر رقیہ بیگم کی طرف

دیکھ کر کہنے لگیں: "معاف کیجئے میں بھول گئی کہ آپ فرانسیسی نہیں جانتی ہیں"۔ اس کے بعد ساری گفتگو انگریزی میں ہوتی رہی۔ عثمانیہ یونیورسٹی کا حال پوچھتی رہیں کہتی تھیں کہ اردو کو ذریعۂ تعلیم بنانا اچھا ہے لیکن انگریزی سے بھی تعلق رکھنا ضروری ہے کہ بغیر اس کے علوم کی اعلیٰ ریسرچ اور سائنس اور ٹکنالوجی میں جو دنیا میں ترقی ہو رہی ہے اس سے واقفیت نہیں حاصل ہو سکتی۔ میں نے ان کے اس خیال کی تائید کی اور بتایا کہ عثمانیہ یونیورسٹی میں ہم نے ڈگری کورس تک انگریزی زبان لازمی رکھی ہے اور ہمارے طالب علموں کا انگریزی کا معیار اچھا خاصہ ہے۔

میں نے پیچھے آکر عزیز احمد کو، جو اس زمانے میں شہزادی صاحبہ کے سکریٹری تھے۔ اپنا پروگرام لکھا دیا کہ ہفتے میں تین روز فلاں وقت آؤں گا۔ ذاکر میاں کو لکھا کہ وہ ایک استاد جامعہ سے مستعار دے دیں، چنانچہ انھوں نے مولوی حفیظ الدین کو حیدرآباد بھجوا دیا۔ میں نے ان کے ذمے اردو کی تعلیم کر دی اور دوسرے مضامین کے لئے حیدرآباد ہی کے استادوں کو مقرر کیا۔ چند ماہ بعد جب شہزادی صاحبہ کشمیر جانے لگیں تو چھ مہینے کے لئے میری خدمات عثمانیہ یونیورسٹی سے پولٹیکل ڈیپارٹمنٹ میں منتقل ہو گئیں ہم لوگ کشمیر میں پانچ ماہ رہے اور واپسی پر ایک مہینہ بمبئی میں قیام رہا۔ حیدرآباد اکتوبر میں واپسی ہوئی تو میں نے حسب سابق اپنا کام عثمانیہ یونیورسٹی میں شروع کر دیا اور جز وقتی طور پر مکرم جاہ کی تعلیم بھی جاری رہی۔ میں انھیں ہندوستان اور یورپ کی تاریخ پڑھاتا تھا۔ میں نے ان کے لئے عام معلومات کی ایک چھوٹی سی لائبریری جمع کر لی تھی۔ انھیں پڑھنے اور اپنی معلومات بڑھانے کا شوق تھا۔ خاص کر میکانک سے انھیں بڑی دلچسپی تھی۔ چنانچہ میں نے اس موضوع پر کافی کتابیں منگوائیں تھیں۔ انھوں نے ان تعلیمی مواقع سے

پورا فائدہ اٹھایا جو شہزادی صاحبہ نے پیدا کئے تھے۔ مجھے یہ سن کر مسرت ہوئی کہ بعد میں انھوں نے آکسفورڈ یونیورسٹی میں اپنی اعلیٰ تعلیم کی تکمیل کی اور اب وہ نظام ٹرسٹ کا انتظام کر رہے ہیں۔ انھیں علمی اور رفاہی کاموں سے خاص دلچسپی ہے۔ کچھ عرصے کے بعد ان کے چھوٹے بھائی مفخم جاہ نے بھی آکسفورڈ سے ڈگری لی۔ وہ فلسفے اور ادب کا خاص ذوق رکھتے ہیں۔ اس سے ان کی والدہ کی دانش مندی کا اظہار ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنے دونوں صاحبزادوں کو اعلیٰ تعلیم دلائی تاکہ وہ موجودہ زندگی کے مسائل کو بہتر طور پر سمجھ سکیں اور جدید تقاضوں سے عہدہ برآ ہو سکیں۔ شہزادی درشہوار بڑی سوجھ بوجھ کی خاتون ہیں۔ روشن خیال، معاملہ فہم، مردم شناس۔ ان کی ہر بات میں متانت اور وقار نمایاں رہتا ہے۔ میں نے دیکھا کہ یورپین خواتین ان کے سامنے چھوکریاں معلوم ہوتی تھیں، کیا بہ اعتبار شکل و صورت اور کیا باعتبار سیرت و کردار۔ وہ جس محفل میں ہوں سب سے نمایاں نظر آتی ہیں اور لوگوں کی نظر انھیں کی طرف جمی رہتی ہے۔

سر اکبر اور لیڈی حیدری | سر اکبر حیدری نے ہوم سکریٹری، فانس سکریٹری، فانس منسٹر اور صدر اعظم کی حیثیت سے ریاست حیدرآباد کی خدمت انجام دی۔ وہ ایک روشن خیال شخص تھے۔ نظم و نسق کے ماہر کی حیثیت سے ان کا مقام بلند تھا۔ انھوں نے اپنے حسنِ انتظام سے حیدرآباد کی مالیات کو مضبوط بنیادوں پر قائم کیا جس کا اثر پورے نظم و نسق پر پڑا اور ریاست کی مرفہ حالی میں اضافہ ہوا۔ مولوی عبدالحق سے ان کے گہرے تعلقات تھے۔ چنانچہ انھیں کے کہنے پر سر اکبر حیدری نے عثمانیہ یونیورسٹی کے قیام کی عرضداشت حکمرانِ دکن کی خدمت میں پیش کی تھی تاکہ اس جامعہ میں قدیم و جدید، مشرقی و مغربی علوم و فنون کا امتزاج اس طور پر کیا جائے کہ موجودہ نظامِ تعلیم کے نقائص دور ہو کر جسمانی،

دماغی اور روحانی تعلیم کے قدیم و جدید طریقوں کی خوبیوں سے پورا فائدہ اٹھایا جائے۔ احیائے علوم و فنون کا اثر جامعہ کی چار دیواری تک محدود نہیں رہا بلکہ اہلِ دکن کی زندگی کے ہر شعبے میں ظاہر ہوا۔ سر اکبر حیدری کا یہ کارنامہ ہمیشہ یادگار رہے گا۔ ریاست حیدرآباد کے مالیاتی وسائل ہی اسی قابل تھے کہ اس عظیم تعلیمی تجربے کے بار کو اٹھا سکتے۔

سر اکبر حیدری کے ایما پر ملک کی صنعتی ترقی کے لئے ایک فنڈ قائم کیا گیا اور حکومت نے صنعت و حرفت کی سرپرستی کی۔ جو گھریلو صنعتیں ناقدری کی وجہ سے دم توڑ رہی تھیں از سرِ نو زندہ ہو گئیں۔ ان میں سنگاریڈی کے ریشمی کپڑے، بیدر کے ظروف، کریم نگر کا چاندی سونے کا کام اور زردوزی، لنگم پیٹ کے پیتل کے برتن، دولت آباد کا کاغذ، اورنگ آباد کا مشروع اور الایچہ، دیورکنڈہ اور چڑیال کے رومال اور ساڑیاں اور دھوتیاں، ناندیڑ کے سیلے وغیرہ کی قدیم اور مشہور صنعتیں شامل ہیں۔ ان کے علاوہ کپڑے کے چھ کارخانے قائم کئے گئے۔ لوہے، سیمنٹ، ادویہ، سگریٹ اور صابون کے کارخانوں کی حکومت نے امداد کی۔ یہ سب کچھ سر اکبر حیدری کی ترقی پذیر حکمت عملی کا نتیجہ تھا۔

سر اکبر حیدری نے اپنی صدارت عظمیٰ کے زمانے میں کمیٹی اصلاحات قائم کی تاکہ اس امر کی تحقیق کر کے سفارشیں پیش کرے کہ ملک کے مختلف مفادات اور حکومت کے مابین زیادہ مؤثر اشتراک عمل کی کیا صورت ممکن ہے جو ریاست کے حالات کے مدنظر موزوں اور قابلِ عمل ہو اور جس سے حکومت رعایا کی ضروریات اور جذبات سے ہمیشہ واقف رہ سکے۔ اس کمیٹی نے ۱۳ دسمبر ۱۹۳۸ء کو اپنی رپورٹ پیش کی۔ اس رپورٹ کی مخالفت کی وجہ سے حکومت نے اسے کچھ عرصے کھٹائی میں ڈالے رکھا۔ پھر دوسری جنگ عظیم چھڑ جانے کی وجہ سے اس کی سفارشوں پر عمل نہ ہو سکا۔ اس کمیٹی نے سفارش کی تھی کہ مقننہ میں ہندوؤں

اور مسلمانوں کا تناسب برابر رکھا جائے اور مفاداتی نمایندگی کے اصول کا تجربہ کیا جائے جس کی رو سے بجائے اس کے کہ مقررہ علاقوں کی جانب سے نمایندے منتخب ہوں مختلف پیشوں کی بناپر انتخاب ہو۔ مثلاً کاشتکاروں کے نمایندے کاشتکار ہوں، مزدوروں کے نمایندے مزدور ہوں اور اسی طرح وکیلوں کی نمایندگی وکیل اور ساہوکاروں کی نمایندگی ساہوکار کریں۔ یہ بھی سفارش کی گئی تھی کہ ہر محکمے کی ایک آئینی مشاورتی کمیٹی ہو جس میں سرکاری اور غیر سرکاری ارکان کی تعداد برابر ہو۔ اگرچہ ان سفارشوں کو قانونی شکل دی گئی لیکن ایک تو دوسری جنگ عظیم کی وجہ سے اور دوسرے ریاست میں ان اصلاحات کے خلاف بعض حلقوں میں احتجاج کے باعث ان کو نافذ نہیں کیا گیا۔ ان اصلاحات کی تجویز کے باعث سر اکبر حیدری کی مقبولیت اور ہر دلعزیزی کم ہو گئی، اس لئے کہ یہ نہ ہندوؤں کے لئے قابل قبول تھیں، نہ مسلمانوں کے لئے۔ دونوں نے ان اصلاحات کو اپنے مخصوص وجوہ کی بناپر رد کر دیا۔ سر اکبر حیدری رواداری اور انسان دوستی کے اصول کے علم بردار تھے۔ وہ فرقہ واری تعصب سے بالاتر تھے۔ انھوں نے جن دستوری اصلاحات کا خاکہ بنایا تھا انھیں وہ ملک کے مفاد کے لئے ضروری خیال کرتے تھے۔

لیڈی حیدری اپنی مخصوص شخصیت اور اپنا منفرد کردار رکھتی تھیں۔ وہ نہایت روشن خیال خاتون تھیں۔ نہ اتنی ترقی پسند کہ خواہ مخواہ ہر بات میں مغرب کی نقالی کریں نہ ایسی قدامت پسند کہ لکیر کی فقیر بنی رہیں اور بدلتے ہوئے تقاضوں کی طرف سے آنکھیں بند کر لیں۔ وہ اپنے شوہر کی طرح اس تبدیلی کی نمایندگی کرتی تھیں جو بتدریج عمل میں آئے۔ اس طرح جمود سے باہر نکل کر اپنے ذاتی اوصاف و کردار کا تحفظ ممکن ہے۔

لیڈی حیدری بڑی سنجیدہ اور متوازن خاتون تھیں۔ لانبا قد، رعب دار چہرہ،

کھلتا ہوا گندمی رنگ، آنکھیں چہرے کے تناسب سے چھوٹی تھیں۔ نہایت منتظم تھیں۔ ان کے گھر کے انتظام کی تعریف میں نے کئی مرتبہ مولوی عبدالحق سے سنی جو ان کے یہاں اکثر جایا کرتے تھے۔ لیڈی حیدری مولوی صاحب کی خدمات کی معترف اور ان کی دلی قدردان تھیں ایک مرتبہ مجھے بھی مولوی صاحب کے ساتھ ان کی یہاں ناشتہ پر جانے کا اتفاق ہوا تھا۔ میں نے دیکھا کہ مولوی عبدالحق سے ان کی گفتگو کا انداز نہایت بے تکلفی کا تھا جیسا گھر کے آدمیوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ مولوی صاحب سر اکبر اور لیڈی حیدری دونوں پر فقرے چست کرتے تھے۔ جن کی معنویت کو سر اکبر غالباً نہیں سمجھتے تھے، لیکن لیڈی حیدری اچھی طرح سمجھتی تھیں اور خوب ہنستی تھیں۔ مولوی صاحب انجمن ترقی اردو کے بہت سے کام لیڈی حیدری کے ذریعے سے نکلواتے تھے اس لئے کہ اگر وہ کسی بات پر جم جاتیں تو سر اکبر حیدری اس کی تکمیل کرانے کی کوئی نہ کوئی صورت ضرور نکال لیتے تھے۔ میں نے ناشتے کی میز پر محسوس کیا کہ لیڈی آمنہ حیدری کی گفتگو کا انداز تحکمانہ تھا اور سر اکبر حیدری ان سے اس طرح بات کرتے تھے جیسے ایک نیازمند شوہر کو کرنی چاہئے۔ ان کے ایما پر خواتین کے لئے "لیڈی حیدری کلب" قائم ہوا جس کی تعمیر پر حکومت حیدرآباد نے کافی روپیہ خرچ کیا۔ یہ ایک نہایت کارآمد ادارہ ہے جو لیڈی حیدری کی توجہ سے وجود میں آیا۔ ان کی توجہ اور سرپرستی سے حیدرآباد کے یتیم خانے کو بھی حکومت نے بڑی امداد دی اور اس کی عالیشان عمارتیں بنوائیں۔ خاص طور پر اس یتیم خانے میں لڑکیوں کے رہن سہن اور تربیت کی طرف لیڈی حیدری نے خاص توجہ دی جس سے وہاں کے انتظام میں کارکردگی پیدا ہوئی۔ انھیں ہر قسم کے رفاہ عام کے کاموں سے دلچسپی تھی اور کام کرنے والوں کی ہمت افزائی کرتی تھیں۔

سالار جنگ سوم

سالار جنگ کے خاندان کا ریاست حیدرآباد کی تاریخ سے قدیم تعلق ہے۔ ان کے دادا سالار جنگ اوّل (مختار الملک) کو جدید حیدرآباد کے نظم و نسق کا بانی کہا جائے تو درست ہوگا۔ ان کی وزارت عظمیٰ کے زمانے میں جسے اس وقت دار المہامی کہتے تھے محکمۂ مال، محکمۂ عدالت اور محکمۂ پولیس کی اصلاح ہوئی اور ریاست کے انتظام کو جدید اصول پر قائم کیا گیا۔ اس مقصد کی تکمیل کے لئے انھوں نے شمالی ہند کے بعض نہایت قابل اور تجربہ کار لوگوں کی خدمات حاصل کیں۔ جن میں محسن الملک، وقار الملک، عماد الملک اور مولوی چراغ علی (اعظم یار جنگ) خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان کے صاحبزادے میر لائق علی کچھ عرصے مدار المہام رہے۔ سالار جنگ سوم ۱۹۱۲ء میں میر عثمان علی خاں کے وزیر اعظم مقرر ہوئے۔ دو سال کے بعد وہ اس خدمت سے سبکدوش ہو گئے۔ اس کے بعد سے انھوں نے ایک معمولی شہری کی زندگی گذاری لیکن ہر شہری کی زندگی میں کوئی نہ کوئی مقصد ہوتا ہے چاہے وہ چھوٹا ہو یا بڑا لیکن ان کی زندگی مقصد سے عاری تھی۔

سالار جنگ کی بے مقصد زندگی میں اگر کوئی مقصد دکھائی دیتا تھا تو وہ ذاتی مسرت کا حصول تھا۔ اس کے لئے وہ روپیے سے ہر چیز خریدنا چاہتے تھے۔ خوبصورت تصویریں، عمدہ مجسمے، اعلیٰ درجہ کے نوادر و عجائب، نسوانی حسن۔ انھیں فنون لطیفہ کا ذوق تھا۔ انھوں نے جو نادر اشیا جمع کی تھیں وہ سب سالار جنگ میوزیم میں موجود ہیں۔ ان میں بعض تو وہ ہیں جو انھیں خاندانی ورثے میں پہنچیں لیکن اکثر و بیشتر انھوں نے خود خریدیں۔ ان کے ہاں اشیا کو حاصل کرنے اور جمع کرنے کے شوق نے جدید جذبے کی شکل اختیار کر لی تھی۔ جتنی لطیف اور حسین اشیا سالار جنگ

نے جمع کیں شاید ہی کسی ایک شخص نے اپنی زندگی میں کی ہوں۔

مجھے سالارجنگ کے ہاں متعدد مرتبہ دعوتوں میں شرکت کا موقع ملا۔ میں نے محسوس کیا کہ نواب صاحب کی جن لوگوں سے بے تکلفی نہ تھی ان سے ذرا جھینپتے تھے اور زیادہ باتیں کرنے سے کتراتے تھے۔ جن سے بے تکلفی ہوتی ان سے زیادہ تر آرٹ کے نوادر و عجائب کی گفتگو رہتی تھی۔ میرے سامنے وہ بدرالحسن اور آغا حیدر حسن سے بڑی بے تکلفی سے گفتگو کرتے تھے۔ آغا صاحب سے ان کا مذاق ہوتا تھا۔ انھیں وہ تم سے مخاطب کرتے تھے حالانکہ وہ دوسروں سے ہمیشہ آپ سے مخاطب کرتے تھے۔ سالارجنگ اور آغا حیدر حسن میں ایک قدر مشترک یہ تھی کہ دونوں کو تصویروں اور نوادر و عجائب کا شوق تھا، نواب صاحب کو بڑے پیمانے پر اور آغا صاحب کو اپنی بساط کے مطابق چھوٹے پیمانے پر۔ آغا صاحب سے ان کی بے تکلفی کا یہ عالم تھا کہ کبھی تو سب کے سامنے ان سے تو تڑاق پر اتر آتے اور کبھی گلے میں باہیں ڈال لیتے۔ نواب صاحب کے درباریوں میں بعض کو یہ بے تکلفی ناگوار ہوئی اور انھوں نے لگائی بجھائی کر کے نواب صاحب کو آغا صاحب سے بدظن کر دیا۔ لیکن یہ واقعہ نواب صاحب کی زندگی کے آخری چند سالوں کا ہے۔ ویسے ان کے تعلقات آغا صاحب سے ہمیشہ بے تکلفانہ رہے۔

سالارجنگ میں مضبوط ارادے کی کمی تھی۔ چونکہ طبیعت میں تلون تھا اس لئے وہ کسی ایک بات پر دیر تک قائم نہیں رہتے تھے۔ گفتگو میں بھی میں نے محسوس کیا کہ وہ کسی ایک مسئلے پر زیادہ دیر تک توجہ نہیں دیتے تھے۔ ایک بات کرتے کرتے اس میں کوئی دوسری غیر متعلق بات شروع کر دیتے تھے جس سے ان کی سیرت اور ذہن کا انتشار ظاہر ہوتا تھا۔ سوائے جمالیاتی لذت اندوزی کے انھوں نے اپنے سامنے کوئی اور

مقصد نہیں رکھا عمر بھر حسن و عشق کی تپلیاں جمع کرتے رہے۔ اس میدان میں عمل میں کورے رہے

علی نواز جنگ ریاست حیدر آباد کے بڑے کامیاب اونچے پایے کے انجینیر تھے، اپنے فن میں سارے ہندوستان میں مانے ہوئے۔ جب برٹش گورنمنٹ سندھ میں سکھر برج بنوا رہی تھی تو ان کی خدمات حکومت نظام سے مستعار لی گئی تھیں۔ انھوں نے ریاست حیدر آباد کے وسائل آبپاشی کو ترقی دی جس سے رعایا کو بڑا فائدہ ہوا۔ علی نواز جنگ نے اپنی صلاحیتوں کو ملک کی مادی مرفہ حالی کو ترقی دینے کے لئے استعمال کیا اور جو کام ان کے زمانے میں ہوا وہ یادگار رہے گا کروڑوں روپیے کے خرچ سے پرانے شکستہ تالابوں کو از سر نو تعمیر کیا گیا تاکہ کاشتکاروں کو آبپاشی کی سہولت ہو۔ اس کے علاوہ متعدد نئے تالاب تعمیر ہوئے۔ نظام ساگر سے دو لاکھ ستر ہزار ایکڑ زمین زیر کاشت لائی گئی۔ حمایت ساگر اور عثمان ساگر کے پانی سے حیدر آباد کی آبادی کو پینے کا پانی صاف کرکے مہیا کیا جاتا ہے۔ ان کے علاوہ پوچارم، فتح نہر، پالیر، سنگ بوبالم، پائل مرچیڈ اور نارائن پلی میں جو پانی کے خزانے بنائے گئے ہیں ان سے لاکھوں ایکڑ زمین سیراب ہو رہی ہے۔ حکومت نظام نے آبپاشی کی ترقی پر بے دریغ روپیہ صرف کیا تاکہ ملک کے زرعی امکانات کی ترقی ہو۔ اس کام کی تکمیل میں علی نواز جنگ کی اہلیت اور لیاقت سے بڑی مدد ملی۔

آزادی سے پہلے جب پنڈت جواہر لال نہرو کے ایما پر کانگریس نے پلاننگ کمیٹی بنائی تو علی نواز جنگ کو اس کا رکن مقرر کیا تاکہ ان کے وسیع تجربے سے جو رفاہ عام کے کاموں میں انھیں حاصل تھا، پورا ملک فائدہ اٹھا سکے۔ اس کمیٹی کی فنی لحاظ سے مختلف ذیلی کمیٹیاں بنا دی گئی تھیں جن میں ایک کے وہ صدر تھے۔ اس زمانے میں میں بنجارا ہل پر ان کے مکان کے قریب ہی رہتا تھا۔ جب کمیٹی کے لئے اپنی رپورٹ لکھ رہے تھے تو

مجھے بلا بھیجتے تھے اور کہتے تھے کہ میں نے جو کچھ لکھا ہے اس پر تنقید کرو۔ اس طرح میں نے ان کی پوری رپورٹ ان کی زبانی سنی تھی۔ اپنے فن پر ان کی معلومات بہت وسیع تھیں۔ خدمت سے سبکدوش ہوئے عرصہ ہو چکا تھا لیکن بایں ہمہ انھوں نے اپنا مطالعہ جاری رکھا اور جدید ترین دریافتوں اور حالات سے باخبر تھے۔ حافظہ نہایت عمدہ تھا اور ریاضی کے فارمولے ان کے نوک زبان تھے۔ ان کا تمامتر فن علم ریاضی کی عملی تفسیر تھی جس پر وہ پوری طرح حاوی تھے۔

حکومت مدراس اور حکومت حیدرآباد کے سمجھوتہ سے جب تنگ بھدرا کی اسکیم تیار ہوئی تو کئی سال تک پانی کی تقسیم کی تفصیلات طے کرنے کے لئے دونوں حکومتوں میں مباحث جاری رہے۔ علی نواز جنگ نے ان مواقع پر حکومت حیدرآباد کی بڑی قابلیت سے نمایندگی کی، ایسی کہ ان کی فنی لیاقت کا لوہا مدراس کے انجینیر اور وزیر بھی مان گئے۔ ایک دفعہ جب وہ اسی قسم کی گفتگو کے لئے مدراس گئے تو محمود حسن ان کے ساتھ تھے جو اس زمانے میں پی ڈبلو۔ ڈی میں اسسٹنٹ سکریٹری تھے۔ کہتے تھے کہ حکومت مدراس کی طرف سے وہاں کے چیف انجینیر کے علاوہ راجہ گوپال آچاری نے کمیٹی میں شرکت کی تھی اور خود اپنی حکومت کے مقدمے کو پیش کیا تھا، حیدرآباد کی طرف سے علی نواز جنگ کافی تھے۔ فنی لیاقت میں مدراس کے انجینیروں میں ان کی ٹکر کا کوئی آدمی نہ تھا۔ پھر خود انکی شخصیت ایسی تھی کہ وہ کسی بڑے سے بڑے آدمی سے مرعوب ہونا نہیں جانتے تھے جس طرح راجاجی کی وہ عزت کرتے تھے اسی طرح راجاجی ان کا احترام کرتے تھے اور ان کی فنی قابلیت کو سب کے سامنے سراہتے تھے۔ بعد میں بھی دونوں میں نہایت اچھے تعلقات قائم رہے۔ ۲۸ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو حکومت ہند سے انتظام جاریہ کی بابت گفتگو کرنے کے لئے

جو وفد بھیجا جا رہا تھا علی نواز جنگ بھی اس کے رکن تھے۔ لیکن اتحاد المسلمین نے اس بنا پر کہ معاہدے کا جو مسودہ دہلی بھیجا جا رہا ہے، وہ حیدرآباد کے مفاد کے خلاف ہے ارکان وفد کو جانے سے روکنے کے لئے ان کے مکانوں کے گرد ہزاروں آدمیوں کو جمع کر دیا۔ نواب چھتاری کی کوٹھی کے گرد پانچ ہزار کے قریب اور علی نواز جنگ کے بنجارا ہل والے مکان کے گرد ایک ہزار آدمی جمع ہو گئے تاکہ وہ انھیں اس روز صبح کے ہوائی جہاز سے دہلی نہ جانے دیں۔ علی نواز جنگ کو اتحاد المسلمین کی اس حرکت پر سخت افسوس تھا۔

علی نواز جنگ دکن کے ان فرزندوں میں تھے جنھوں نے رفاہ عام کے کاموں میں اپنی عمر عزیز صرف کی اس لئے لوگ ان کے مرنے کے بعد بھی ان کا نام محبت اور احترام سے لیتے اور ان کی خدمات کا اعتراف کرتے ہیں۔ علی نواز جنگ مذہبی آدمی نہ تھے۔ وہ زندگی اور اس کے مسائل کو خالص علمی اور عقلی نقطۂ نظر سے دیکھتے تھے۔ لیکن وہ سچے انسان دوست تھے۔ حیدرآباد میں مسلمانوں پر پولیس ایکشن کے وقت جو زیادتیاں ہوئیں ان سے ان کے دل کو بڑا دکھ ہوا۔ وہ ہر وقت ان کی نسبت ذکر کرتے اور کہتے تھے کہ غلط قیادت نے یہ روز بد دکھایا۔ وہ نظام اور ریاست حیدرآباد کے سچے بہی خواہ تھے۔

مہدی نواز جنگ میں ۱۹۳۰ء میں حیدرآباد گیا تو اس وقت مہاراجا سرکشن پرشاد صدر اعظم تھے۔ وہ اپنی فیاضی اور وسیع مشربی کے باعث حیدرآباد میں غیر معمولی طور پر ہر دلعزیز تھے۔ باب حکومت کے معتمد نواب مہدی نواز جنگ میں بھی مہاراجا کی خوبیاں آ گئی تھیں۔ وہ بھی نہایت خلیق، ملنسار اور حق پسند ہیں۔ نخوت و رعونت چھو کر بھی نہیں گئی۔ میں پہلی مرتبہ ان سے مولوی عبد الحق کے ساتھ ملا تھا۔ میں نے اس وقت ان کے مزاج اور ان کی سیرت کے متعلق جو رائے قائم کی تھی اس پر آج تک چھتیس سال

گذرنے کے بعد بھی قائم ہوں۔ مولوی صاحب سے ان کے مخلصانہ تعلقات تھے۔ مہدی نواز جنگ ان کا بڑا احترام کرتے تھے۔ اس زمانے میں بنجارا ہل پر صرف چند مکان بنے تھے۔ نواب مہدی نواز جنگ نے اپنے لئے جو مکان بنوایا تھا وہ اپنے طرز میں بالکل انوکھا ہے۔ وہاں جو بڑی بڑی چٹانیں پڑی تھیں ان پر مکان کی بنیاد رکھی گئی اور انھیں ایک دوسرے سے ایسی ہنرمندی سے ملایا کہ باید وشاید۔ یہ عجیب وغریب مکان ہے۔ باہر سے دیکھیے تو کسی مہاتما کی کٹیا معلوم ہوتی ہے۔ اندر جائیے تو کسی صاحب ذوق امیر کی رہائش گاہ نظر آتی ہے۔

مہدی نواز جنگ نے گیارہ سال بڑی شان سے باب حکومت کی معتمدی کے فرائض انجام دیئے۔ شاید ہی کبھی ایسا ہوا ہو کہ کابینہ (کیبنٹ) نے ان کی رائے کے خلاف کوئی فیصلہ کیا ہو۔ مہاراجا بہادر ان کی معاملہ فہمی اور اصابت رائے کے قدردان تھے اور ان پر پورا اعتماد کرتے تھے۔ میرے شروع کے زمانے میں دو معاملے بڑے معرکے کے باب حکومت میں پیش ہوئے تھے۔ ایک تو جامعہ ملیہ اسلامیہ کی گرانٹ کا اور دوسرے انجمن ترقی اردو کی امداد کا۔ انگریز ارکان کی مخالفت کے باوجود مہدی نواز جنگ نے دونوں معاملے اپنے حسب منشا طے کرائے۔ اس سے ان کی غیر معمولی انتظامی قابلیت، اثر ورسوخ اور بلند خیالی کا پتہ چلتا ہے۔

وہ شروع ہی سے نیشنلسٹ خیال کے ہیں۔ انھیں جنگ آزادی کے مقاصد سے ہمیشہ ہمدردی رہی۔ جامعہ والوں کے ہمیشہ سے مداح ہیں۔ ڈاکٹر انصاری کا بڑی عقیدت سے ذکر کیا کرتے تھے۔ بعد میں بھی جب دہلی آتے تو ان کی قبر پہ فاتحہ پڑھنے ضرور جاتے تھے۔ زمانے نے بہت سی کروٹیں بدلیں لیکن مہدی نواز جنگ اپنے خیالات پر مضبوطی

سے قائم رہے۔ یہ بڑی بات ہے۔ اس سے ان کے کردار کا اصلی جوہر ظاہر ہوتا ہے۔

سر اکبر حیدری کی صدارت عظمیٰ کے زمانے میں وہ میونسپل کمشنر اور بعد میں محکمۂ کامرس کے سکریٹری رہے۔ آزادی کے بعد وہ متواتر آٹھ سال آندھرا پردیش گورنمنٹ میں وزیر تھے۔ آخر میں گجرات کے گورنر ہوئے اور گذشتہ سال وہاں سے اپنے عہدے کی مدت پوری ہونے پر سبکدوش ہوئے ہیں۔ جس عہدے پر رہے کامیاب اور سرخرو رہے۔

نواب مہدی نواز جنگ میں بعض قابل قدر انسانی خوبیاں ہیں جو ان کی کامیابی اور ہردلعزیزی کی ضامن رہی ہیں۔ وہ سخی ہیں، دوسروں کی مدد کرنے میں کبھی دریغ نہیں کرتے۔ وہ اپنی فیاضی کی وجہ سے کبھی کبھی مقروض بھی ہوئے۔ لیکن انھوں نے کبھی اس کی پروا نہیں کی۔ مردم شناس ہیں۔ میں سمجھتا ہوں وہ لوگوں کو پہچاننے میں کبھی غلطی نہیں کرتے۔ بامروت ہیں۔ خلیق ہونے کے ساتھ سچے اور کھرے ہیں۔ انھیں خوشامد سے نفرت ہے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ خدا نے انھیں دردمند دل دیا ہے۔ وہ عوام کے سچے خیرخواہ ہیں اور ان کی خدمت کا جذبہ رکھتے ہیں۔ اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں کہ وہ جس قدر خود کو عوام سے قریب لاتے ہیں اتنے ہی عوام اپنے کو ان سے قریب سمجھتے ہیں۔ چونکہ حیدرآباد تلگو بولنے والوں کا علاقہ ہے۔ نواب مہدی نواز جنگ نے تلگو زبان بڑی محنت سے سیکھ لی۔ وہ اس زبان میں گفتگو کے علاوہ جلسوں میں تقریر بھی کرتے ہیں۔ انھوں نے کچھ مرہٹی بھی سیکھی تھی۔ انھیں زبانیں سیکھنے کا غیر معمولی ملکہ حاصل ہے۔ مقامی زبانیں انھوں نے اس لئے سیکھیں تاکہ ان کے ذریعے سے عوام الناس سے قریب آجائیں اور کوئی اجنبیت باقی نہ رہے۔ عوام سے قریب ہونے کے باعث وہ ان کے دکھ درد کو سمجھتے ہیں۔ انھوں نے حیدرآباد میں کینسر اسپتال قائم کروایا۔

نیلوفر اسپتال جس میں عورتوں اور بچوں کے امراض کا علاج ہوتا ہے، وہ بھی انھیں کی مساعی کا رہین منت ہے۔ امداد باہمی کی تحریک کو حیدرآباد میں فروغ دیا اور اس کی انجمنیں اور ادارے قائم کیے۔ خاندانی منصوبہ بندی کے کام میں گہری دلچسپی لیتے ہیں۔ ان کے یہ سب کام عوام کی بھلائی کے لیے ہیں۔ کسر نفس کا یہ عالم ہے کہ کبھی شہرت کے طالب نہیں ہوئے۔

میں نے بعض دفعہ ان کے مکان پر پرانی وضع کے اہل علم کو دیکھا۔ وہ ان کے ساتھ بے حد تعظیم و تکریم سے پیش آتے تھے۔ یہ سب لوگ انھیں اپنا ہمدرد سمجھ کر ان کے پاس آتے ہیں۔ واقعی وہ ان کے ہمدرد ہیں اور ان سے جو کچھ بن پڑتا ہے ان کی خدمت کرتے ہیں۔ چاہے قرض لینا پڑے لیکن ان کی داد و دہش میں کمی نہیں آتی۔ بھلا اس زمانے میں کون ایسا کرتا ہے۔ یہ تو نفسی نفسی کا زمانہ ہے۔ اس میں نواب مہدی نواز جنگ جیسے اشخاص کا دم غنیمت ہے۔ کچھ دنوں بعد اس سیرت و کردار کے لوگوں کو آنکھیں ڈھونڈیں گی اور وہ کہیں نظر نہ آئیں گے۔

پولیس ایکشن کے بعد حیدرآباد کے مسلمانوں پر بڑی بپتا پڑی تھی اور ان کی حیثیت بے کس مظلوموں کی ہو کر رہ گئی تھی۔ ان کی عزت لٹی، دولت لٹی، وقار لٹا، سب کچھ لٹنے کے بعد بھی وہ زندہ رہے۔ نواب مہدی نواز جنگ کو اس بات کا شدید احساس ہوا اسلئے کہ وہ خلقی طور پر دردمند اور انصاف پسند ہیں۔ وہ اس گنگا جمنی تہذیب کے قدردان ہیں جو دکن میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے میل ملاپ سے وجود میں آئی۔ اردو زبان اس تہذیب کا سب سے نمایاں مظہر ہے۔ چنانچہ نواب مہدی نواز جنگ نے گذشتہ سالوں میں ان سب اداروں کی سرپرستی کی جن کے پیش نظر اردو کی بقا ہے۔ حیدرآباد اسلامی علوم کا بھی مرکز رہا ہے۔ یہ علوم بھی اب بےکسی کے باعث جان توڑ رہے ہیں۔

نواب مہدی نواز جنگ نے ان سب اداروں کی بھی سرپرستی کی جو ان علوم کے لئے وقف ہیں۔ ایسا کرنا ان کی انصاف پسند طبیعت کا فطری تقاضا ہے۔ اس سے ان کے نیشنل ازم کی چمک دمک کم نہیں ہوتی بلکہ اس میں اور چار چاند لگ جاتے ہیں۔ ان کا نیشنل ازم آزادی کے بعد کا نہیں بلکہ اس سے پہلے کا ہے اس لئے وہ ہر اس شخص کی آنکھ میں آنکھ ڈال کر بات کرسکتے ہیں جس کے نزدیک قوم پرستی کے معنی سپاٹ یکسانیت اور اقلیتوں کو ان کے حقوق سے محروم کرنے کے ہیں جو انھیں دستورِ ہند نے عطا کئے ہیں۔ دستورِ ہند نے کثرت میں وحدت کے اصول کو اہل ملک کے سامنے پیش کیا ہے جسے سمجھنا اور برتنا چاہیے۔ نواب مہدی نواز جنگ ان لوگوں میں ہیں جو اس اصول کی اہمیت کو سمجھتے ہیں۔ وہ نیشنلسٹ ہونے کے ساتھ عدل پسند، حق شناس اور خدا ترس ہیں۔

نواب مہدی نواز جنگ کو فنون لطیفہ سے خاص لگاؤ ہے۔ وہ حیدرآباد کی آرٹ سوسائٹی کے بانیوں میں ہیں۔ عرصے تک حکومت ہند کی للت کلا اکیڈیمی کے صدر رہے۔ کلاکاروں، شاعروں اور عالموں کی ان کے یہاں بڑی آؤ بھگت ہوتی ہے۔ ایک زمانے میں میں نے ان کے یہاں بیدری ظروف کے اعلیٰ درجے کے نمونے دیکھے تھے۔ ویسے پھر کبھی نظر نہ آئے۔ پوئیٹری سوسائٹی کے جلسے بھی انکے دولت خانے پر ہوئے۔ المانوی شاعر گوئٹے کی صد سالہ تقریب بڑی شان سے ان کے یہاں منائی گئی تھی جس کا منظر میری آنکھوں کے سامنے پھر رہا ہے۔ اس میں نواب نظامت جنگ نے نہایت عمدہ تقریر کی تھی جس میں مغربی ادب کی رومانی تحریک پر تبصرہ کیا تھا۔

جو چیز نواب مہدی نواز جنگ کو موجودہ زمانے کے دوسرے سیاست کاروں سے

ممتاز کرتی ہے وہ ان کی ہمہ جہتی دلچسپیاں ہیں۔ وہ نظم ونسق کے ماہر ہونے کے ساتھ اچھے انسان اور سچے انسان دوست ہیں۔ ان کے یہاں باتیں کم اور عقل زیادہ ہے۔ توقع ہے کہ ان کے وسیع تجربے اور اصابت رائے سے نہ صرف آندھرا پردیش کے باشندے بلکہ تمام اہلِ ملک عرصے تک مستفید ہوتے رہیں گے۔ میں انھیں دکن کے مایۂ ناز سپوتوں میں شمار کرتا ہوں جن کی دلنواز شخصیت کے نقوش آیندہ بھی زندہ رہیں گے۔

بیگم مہدی نواز جنگ کو بھی رفاہ عام کے کاموں اور فنون لطیفہ سے خاص لگاؤ ہے۔ وہ نہایت روشن خیال اور سلیقہ مند خاتون ہیں۔ حیدرآباد میں متعدد معاشری اصلاح کے کاموں سے ان کا تعلق ہے۔

شہر حیدرآباد | حیدرآباد شہر میں قدیم اور جدید کا منظر ایک ہی وقت میں ساتھ ساتھ دکھائی دیتا ہے۔ موٹر کے بازو میں جھٹکہ چلا جارہا ہے، ہچکولے کھاتا ہوا، جس طرح صدیوں پہلے چلا کرتا تھا۔ شروع میں جب وہاں گیا تو جھٹکے ہر طرف نظر آتے تھے۔ اسے صندوق نما کہیں تو غلط نہ ہوگا۔ ان کے گھوڑے شمالی ہند کے یکوں کے گھوڑوں سے بھی کمزور ہوتے تھے۔ بس ہڈی چمڑا، قدمیں چھوٹے چلیں تو لڑکھڑاتے ہوئے، ڈگمگاتے ہوئے۔

بازار میں جائیے تو پتھر گٹی کی اونچی وسیع دکانیں ہیں اور قریب ہی دوسرے بازاروں میں چھوٹی چھوٹی دوکانیں ہیں جن میں غالباً قطب شاہیوں کے زمانے سے اب تک نہ یادہ تبدیلی نہیں ہوئی۔ پتھر گٹی کا بازار میر عثمان علی خاں کے زمانے میں بنا ہے، جتنا بنا ہے نہایت شاندار ہے۔ یہاں کپڑے، بساط خانے اور مختلف اشیا کی دوکانیں ہیں۔ دکانیں اندر سے سجی ہوئی ہیں، شیشے کی الماریوں میں عمدہ سامان کی نمایش نظر افروز ہے۔ پتھر گٹی کے آس پاس گلیوں میں چھوٹی چھوٹی دکانیں ہیں جہاں دکان دار آلتی پالتی مارے گاہکوں

کے انتظار میں اس طرح بیٹھے رہتے ہیں جیسے ان کے بزرگ سیکڑوں برس پہلے بیٹھا کرتے تھے۔
دکان بھی وہی، گو دام بھی وہی۔ کہیں رنگ برنگ کے کپڑے لٹک رہے ہیں، کہیں قسم قسم
کے برتن چنے رکھے ہیں۔ مکہ مسجد کے پاس پھول والوں کی دکانیں ہیں جہاں ہر قسم کے پھول
ملتے ہیں اور بے کھلی کلیاں بھی جن کے ہار کسی نازنین کے گلے کی زینت بنیں گے۔ ان کے پاس
نہر کنوں کی دکانیں ہیں جو اپنے آبا و اجداد سے یہی پیشہ کرتے آئے ہیں۔ ان سے ملی ہوئی
دستار بنانے والوں کی دکانیں ہیں۔ جب میں حیدرآباد گیا تو افضل گنج میں پھلوں کا بازار
تھا لیکن بعد میں وہ اٹھ کر معظم جاہی مارکیٹ میں چلا گیا جو پورا کا پورا پتھر کا بنا ہوا ہے۔
پتھر بھی گرے نائٹ جو حیدرآباد کے نواح میں کثرت سے دستیاب ہوتا ہے اور ہمارے
ملک میں پتھر کی جو مختلف قسمیں ملتی ہیں ان میں سب سے عمدہ اور زیادہ دیرپا ہے۔

لاڈ بازار میں جو چار مینار کے قریب ہے چوڑیوں کے جوڑے، زردوزی، گوٹا کناری،
اگربتی، عود لوبان، ایک جگہ سب مل جاتا ہے۔ صرافے میں سونے چاندی کا کام ہوتا ہے
پتھر کے شیر جائیے تو ہر قسم کی پرانی چیزیں مل جائیں گی۔ کارچوب کا پرانا سامان، پرانے کپڑے
زنانے بھی مردانے بھی، جامہ وار کی شیروانیاں ایک سے ایک اعلیٰ، چینی کے برتن،
شیشے کا سامان، جھاڑ فانوس، جو چاہئے خرید لیجئے۔ کلکتہ اور بمبئی کے تاجر یہاں سے اونے
پونے سامان خرید کر اپنے یہاں لے جا کر خوب نفع کماتے تھے۔ چوک میں ہر قسم کے پرندے
بکتے ہیں۔ مرغی انڈے کے علاوہ لَطے، تیتر، بٹیر، طوطے، مینا، کوّے۔ میں نے پوچھا کوّے کون
خریدتا ہے۔ اس کا جواب یہ ملا کہ انھیں صدقے پر چڑھانے کے لئے لے جاتے ہیں۔ چڑھا کے
چھوڑ دیتے ہیں یہیں سڑک سے ذرا ہٹ کر پیدل چلنے کے راستے پر کباڑی اپنے سامان
کے ساتھ بیٹھے نظر آتے ہیں۔ جمعرات کے بازار میں بھی کباڑ خانے کے علاوہ بعض دفعہ

پرانی قلمی کتابیں بھی سستے داموں مل جاتی ہیں۔ میر عالم کی منڈی میں سبزی ترکاری، اور عثمان گنج اور محبوب گنج میں غلہ، دالیں، گھی، تیل، مسالے اور شکر ملتی ہیں۔ گنج کے پاس سے گذر جاؤ تو مسالوں اور مرچوں کی ایسی دھانس ہوتی ہے کہ کھانسی کا ٹھسکہ لگ جائے اور چھینک پر چھینک آنا شروع ہو جائے۔ مجھے ان لوگوں پر تعجب ہوتا تھا جو وہاں کی ہوا میں صبح سے شام تک رہتے ہیں۔ ایک دو دن نہیں مستقل طور پر۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ انسان میں مطابقت پذیری کی کوئی حد اور انتہا نہیں۔ اس کے جسمانی قویٰ ہر حالت کو برداشت کر سکتے ہیں۔ گنج کی دکانوں پر جو لوگ بیٹھتے ہیں وہ اکثر میلے کپڑوں میں نظر آتے ہیں لیکن مجھے معلوم ہوا کہ ان میں سے بعض لکھ پتی ہیں۔ ان کا کام ہی ایسا ہے کہ انھیں میلا رہنا پڑتا ہے، کتنا ہی صاف رہنا چاہیں نہیں رہ سکتے۔

نظام کے متعدد محل ہیں جن میں سب سے اہم "فلک نما" ہے۔ یہ محل اصل میں امیر پائیگاہ وقار الامراء نے بنوایا تھا جسے نظام میر محبوب علی خاں نے خرید لیا تھا۔ نظام نے شروع ہی سے اسے وائسرائے ہند، انگلستان کے شاہی خاندان اور یورپ کے دوسرے ملکوں کے شاہی خاندانوں کے افراد کی رہائش کے لئے مخصوص کر دیا تھا۔ اس میں ڈیوک آف ونڈسر، جب وہ پرنس آف ویلز تھے ٹھہرے تھے۔ آسٹریا کے آرچ ڈیوک فرڈیننڈ اور میر محبوب علی خاں میں نشانہ بازی کا مقابلہ اسی محل میں ہوا تھا جبکہ ڈیوک یہاں ٹھہرا ہوا تھا۔ آرچ ڈیوک فرڈیننڈ سارے یورپ میں بے خطا نشانہ لگانے میں مشہور تھا لیکن اسے میر محبوب علی خاں سے مات کھانا پڑی۔ ایک حیدرآبادی روپیہ ہوا میں اوپر اچھالا گیا جس پر آرچ ڈیوک فرڈیننڈ نے پہلے نشانہ لگایا جو خطا ہو گیا۔ پھر میر محبوب علی خاں نے بندوق سے فائر کیا تو ٹھیک نشانہ پر بیٹھا۔

آرچ ڈیوک فرڈیننڈ نے ان کی استادی اور مہارت کا لوہا مان لیا۔ اس نشانہ بازی کی تصویریں اب بھی موجود ہیں۔ اس واقعہ کا چرچا حیدرآبادی اب تک کرتے ہیں۔ ہماری والدہ بھی اس واقعہ کو بڑے فخر سے بیان کیا کرتی تھیں۔

"فلک نما" کے علاوہ آصف جاہی حکمرانوں کا اصلی محل چو محلہ کہلاتا ہے، جو اگرچہ بیچ شہر میں ہے لیکن اس کے اندر وسیع باغ اور سبزہ زار پھیلے ہوئے ہیں۔ چو محلے میں مختلف حکمرانوں کے زمانے میں اضافے ہوتے رہے۔ اب اس میں چار الگ الگ محل ہیں۔ جوبلی ہال کے بننے کے پہلے چو محلے میں نظام نذرانہ لینے کی رسم ادا کرتے تھے۔ پرانی حویلی دیسے تو قطب شاہیوں کے زمانے کا محل ہے لیکن آصف جاہی حکمرانوں نے اسے از سر نو بنوایا۔ اور پرانی بنیادوں پر نئی عمارت کھڑی کر دی یہ محلات جس طرز زندگی کی نمایندگی کرتے ہیں وہ خود حیدرآباد میں عرصے سے قصۂ پارینہ ہو گئی تھی۔ میر عثمان علی خاں شہزادگی کے زمانے سے کنگ کوٹھی میں رہتے ہیں جس کے ارد گرد اونچی دیوار بنی ہوئی ہے اور پھاٹک پر ہر وقت پہرہ رہتا ہے۔ پھاٹک پر جو کنوس کا پردہ پڑا رہتا ہے وہ اس وقت اٹھایا جاتا ہے جب نظام باہر جائیں یا جب وہ واپس آئیں۔ میں نے دیکھا کہ اس پردے پر اکثر اوقات بڑے بڑے پیوند لگے ہوتے تھے جو باہر سڑک پر آنے جانے والوں کو کفایت شعاری کا مستقل سبق دیتے تھے۔ میں نے ہمیشہ اس پردے کو علامتی (سمبولک) خیال کیا اور واقعی وہ تھا بھی ایسا ہی کیونکہ وہ نظام کی زندگی کی عکاسی کرتا تھا۔ کفایت شعاری کا اشتہار اس سے بہتر ممکن نہ تھا میں سمجھتا ہوں دکن کے مسلمانوں کو اس سبق کی سخت ضرورت تھی جو اپنی فضول خرچی کیلئے بہانے تلاش کیا کرتے تھے۔

قطب شاہیوں، مغلوں اور آصف جاہی حکمرانوں نے مل کر کم و بیش چھ سو سال دکن پر حکومت کی۔ یہاں کی تاریخ کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ یہاں ایک ملی جلی گنگا جمنی تہذیب نے جنم لیا جس کی ساخت میں یہاں کی آبادی کے مختلف عناصر برابر کے شریک تھے۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں ہر زمانے میں رعایا کے مختلف طبقوں میں اتحاد و ارتباط نظر آتا ہے۔ حیدرآباد میں کچھ عرصے قبل تک تو یہ حال تھا کہ باہر سے آنے والے کو پتا نہیں چلتا تھا کہ کون ہندو ہے اور کون مسلمان۔ لوگوں کی شکل و صورت اور معاشرت میں بڑی حد تک یکسانیت پائی جاتی تھی۔

اس میں شبہ نہیں کہ زراعت، تجارت، ساہوکارہ اور ٹھیکہ داری زیادہ تر ہندوؤں کے پاس تھیں اور ملک کی بیشتر دولت ان کے قبضے میں تھی اس لئے وہ خوش تھے۔ دکن میں ۱۹۳۷ء تک امن و امان قائم رہا۔ اس سال کانگریس، آریہ سماج اور ہندو مہاسبھا نے ستیہ گرہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس کے ایک سال قبل انڈین نیشنل کانگریس نے جو اب تک دیسی ریاستوں کی سیاست سے الگ رہی تھی، ریاستوں میں براہ راست اپنا کام شروع کر دیا اور ذمہ دار حکومت کو نصب العین قرار دیا۔ حیدرآباد میں جو ستیہ گرہ ہوئی اس میں برطانوی ہند کے لوگوں نے بھی شرکت کی۔ چونکہ فرقہ واری فضا بگڑ رہی تھی اس لئے کانگریس ستیہ گرہ سے دست بردار ہو گئی۔ آریہ سماج اور ہندو مہاسبھا نے کچھ دنوں ستیہ گرہ جاری رکھی لیکن کانگریس کے علیحدہ ہو جانے کے بعد یہ تحریک کمزور پڑ گئی۔ حکومت حیدرآباد نے مفاہمت کا راستہ صاف کرنے کے لئے سب قیدیوں کو رہا کر دیا۔

ملک کی آزادی | کوئی پون سو برس تک اہل ہند کے بہترین دل و دماغ رکھنے والوں نے

ملک کو بیرونی سامراج سے آزاد کرانے کے لئے اپنی ساری صلاحیتیں وقف کر دیں۔

شروع میں انگریزی تعلیم یافتہ متوسط طبقے کی طرف سے حکومت کے روبرو درخواستیں گذرانی گئیں، احتجاجیں کی گئیں، منت وسماجت سے بھی کام لیا گیا۔ اس کے بعد اعتدال پسند سیاست کے ماہروں نے اہل ملک کے دستوری حقوق سے حکومت کو آگاہ کرنے کی کوشش کی کچھ دنوں دہشت پسندی کی زور آوری رہی خاص کر بنگال میں۔ پھر گاندھی جی کی سربراہی میں ترک موالات کی تحریک شروع ہوئی۔ خلافت کی تحریک کے توسط سے ہندوستان کے مسلمانوں نے بھی ملکی سیاست میں قدم رکھا۔ ان کی تیز رفتاری نے ترک موالات کی تحریک میں جوش اور تیزی پیدا کر دی۔ آزادی کا جذبہ سارے ملک میں عام ہوگیا۔ ہزاروں نوجوانوں نے اپنی تعلیم ترک کر کے ملک و قوم کی خدمت کو اپنا نصب العین بنایا۔ بہت سوں نے قید و بند کی کڑیاں جھیلیں بعض نے آزادی کی دیوی پر اپنی جانیں تک نثار کر دیں۔ یہ انقلابی تحریک اتار چڑھاؤ کے مختلف دوروں سے گذری۔ آزادی کے جذبے کو چاہے عارضی طور پر حکومت دبانے میں کامیاب ہوئی ہو لیکن اسے جڑ بنیاد سے اکھاڑ نہ سکی۔ اس کشمکش میں پچیس سال بیت گئے۔ آزادی کی تحریک نے اہل ہند میں جو خودشناسی پیدا کی اس کی چمک دمک کم ہونے کے بجائے اس عرصے میں برابر بڑھتی گئی۔

دوسری جنگ عظیم کے دوران میں آزادی کے خیالات نے ہندوستانی فوج میں بھی راہ پائی۔ جو اب تک بلا چون و چرا حکومت کا آلہ کار بنی ہوئی تھیں مسٹر چرچل جو برطانیہ کے وزیر اعظم تھے اہل ہند کی آزادی کے مخالف تھے لیکن جنگ ختم ہوتے ہی لیبر پارٹی برسر اقتدار آگئی جس کے لیڈر مسٹر ایٹلی تھے۔ لیبر پارٹی کو اہل ہند کے سیاسی

مقاصد سے ہمدردی تھی۔ اس جماعت نے فیصلہ کیا کہ اب وقت آگیا ہے کہ برطانوی حکومت اپنے ان وعدوں کو پورا کرے جو اہل ہند سے وقتاً فوقتاً کئے گئے تھے۔ کابینی مشن نے بھی اپنی رپورٹ میں ہندوستان کی خودمختاری کی سفارش کی لیکن اب سوال یہ تھا کہ ہندوستان کی مرکزی حکومت کی ذمہ داری کسے سونپی جائے؟ کانگریس کے علاوہ مسلم لیگ بھی سیاست کے میدان میں آچکی تھی۔ سارے ملک میں ان دونوں سیاسی جماعتوں میں سخت کشمکش شروع ہوگئی۔ مسٹر جناح کی قیادت مسلمانوں کی حد تک مسلم تھی۔ پاکستان کے مطالبے کو مسلم لیگ نے اپنا نصب العین قرار دیا۔ ۱۹۴۶ء میں کانگریس اور مسلم لیگ کے نمائندوں کی ملواں عارضی حکومت مرکز میں قائم ہوئی جس کے وزیراعظم پنڈت جواہر لال نہرو تھے مسلم لیگ کی طرف سے لیاقت علی خاں اس عارضی حکومت میں وزیر مالیات مقرر ہوئے۔ انھوں نے جو پہلا بجٹ پیش کیا اس کی بعض تجویزوں سے کانگریسی ممبروں کو اختلاف تھا اس لئے کہ ان کی چوٹ زیادہ تر سرمایہ داروں پر پڑتی تھی۔ یہ اختلاف برابر بڑھتا گیا۔ بالآخر پنڈت جواہر لال نہرو اور سردار پٹیل اسی نتیجے پر پہنچے کہ کانگریس اور مسلم لیگ کے نمائندوں کا مل کر حکومت چلانا ممکن نہیں ہے۔ اچھا ہے، پاکستان کا مطالبہ مان لیا جائے۔ گاندھی جی آخر تک ملک کی تقسیم کی مخالفت کرتے رہے۔ لیکن اس خیال سے کہ اگر پاکستان کے مطالبے کو نہ مانا گیا تو پورے ملک کی آزادی حاصل کرنے میں تاخیر ہوگی، کانگریس نے ملک کی تقسیم کے اصول کو تسلیم کر لیا۔ چنانچہ پارلیمنٹ نے جون ۱۹۴۷ء کو قانون آزادی ہند منظور کر لیا جس کی رو سے ہندوستان اور پاکستان کی خودمختار حکومتیں وجود میں آجائیں گی جنھیں اختیار ہوگا کہ اپنی اپنی دستور ساز جماعتوں کے ذریعے مستقبل کی حکمرانی کے لئے دستور بنائیں۔

اس قانون میں اس بات کی بھی صراحت تھی کہ ہندوستان میں برطانوی حکومت کے ختم ہونے پر دیسی ریاستیں خود مختار ہو جائیں گی اس لئے کہ برطانوی بالادستی باقی نہیں رہیگی ریاستوں کو اختیار ہوگا کہ ہندوستان اور پاکستان میں سے جس کے ساتھ چاہیں اپنے دستوری تعلقات استوار کریں۔

لیبر حکومت نے لارڈ ویول کے جانشین لارڈ مونٹ بیٹن کو مجاز کیا کہ وہ ہندوستان کی تقسیم کو جون ۱۹۴۸ء تک مکمل کریں۔ لارڈ موصوف نے اس مدت سے پہلے ہی ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو اس کام کی تکمیل کردی اور ہندوستان اور پاکستان کی دو علیحدہ حکومتیں قائم ہو گئیں۔ تقسیم سے پہلے اور اس کے بعد پنجاب میں بڑا خون خرابہ ہوا۔ چھ لاکھ کے قریب جانیں ضائع ہوئیں پنجاب، سندھ، صوبہ سرحدی اور بنگال کے علاوہ ہندوستان کے دوسرے حصوں میں سب ملاکر ڈیڑھ کروڑ کے لگ بھگ لوگوں نے ترک وطن کیا۔ بڑی بے سروسامانی کی حالت میں اپنا سب کچھ چھوڑ کر اپنی جانیں بچا کر ایسے قتل وغارت اور اتنے وسیع پیمانے پر ترک وطن کی مثال تاریخ میں ڈھونڈے سے نہیں ملتی۔ پناہ گزینوں کے مسئلے کا حل آسان نہ تھا۔ ہندوستان اور پاکستان کی حکومتوں کو عرصے تک اپنی پوری توجہ اسی کی جانب منعطف کرنی پڑی۔ پناہ گزینوں کی زندگی میں جو نفرت اور تلخی پیدا ہو گئی اس کو مٹانا کسی کے بس کی بات نہیں۔ زمانہ ہی ان ذہنی اور روحانی زخموں کو مندمل کر سکتا ہے۔ ملک کی تقسیم کے وقت جو ہولناک واقعات پیش آئے وہ ہمارے زمانے کا کوئی شخص فراموش نہیں کر سکتا۔

سیاست کے نشیب و فراز | بہادر یار جنگ اور ایم نرسنگ راؤ میں دو مرتبہ مفاہمت کی

گفت وشنید ہوئی لیکن چونکہ دونوں کے سیاسی نصب العین ایک دوسرے سے بالکل الگ تھے اس لئے اس کی کامیابی کی کوئی صورت نہ نکل سکی۔ اس اثنا میں حکومت نظام نے ۲۲ ستمبر ۱۹۳۷ء کو آئنگار کمیٹی مقرر کی تاکہ ملک کے مختلف طبقوں اور مفادوں اور حکومت کے درمیان اشتراک عمل کی تجاویز پیش کرے۔ اس کمیٹی نے ۳۱ راگست ۱۹۳۸ء کو اپنی سفارشیں پیش کیں جن کی بنا پر حکومت نے جدید دستوری اصلاحات منظور کیں۔ ان کے بموجب اشتراک عمل کے لئے نمائندگی کا جو طریقہ اختیار کیا گیا وہ اس سے مختلف تھا جو برطانوی ہند میں تھا۔ یہ مفاداتی نمائندگی کا اصول تھا جس کا مطلب یہ ہے کہ بجائے اس کے کہ مقررہ علاقوں کی جانب سے نمائندگی ہو مختلف پیشوں کی بنا پر اہل ملک کو مقننہ کے لئے اپنے نمائندے منتخب کرنے کا حق دیا گیا۔ حکومت نے یہ اصول مان لیا کہ مقننہ میں ہندوؤں اور مسلمانوں کا تناسب برابر رکھا جائے۔ ان اصلاحات سے ریاست کے ہندو اور مسلمان دونوں غیر مطمئن رہے۔ ۱۹۳۹ء میں دوسری عالمگیر جنگ شروع ہو جانے کے باعث حکومت نے ان اصلاحات کا جاری کرنا ملتوی کر دیا۔ جنگ کے دوران میں تمام سیاسی اور دستوری معاملے ٹھنڈے پڑ گئے۔ جنگ ختم ہونے پر برطانوی حکومت نے کانگریس اور مسلم لیگ سے اقتدار منتقل کرنے کی جو گفت و شنید شروع کی اس وقت حیدرآباد میں فرقہ واری فضا بھر مسموم ہو گئی۔ آریہ سماجی تنظیم کے جواب میں مسلمانوں نے مجلس اتحاد المسلمین قائم کی جس کے صدر بہادر یار جنگ تھے۔ انھوں نے سات آٹھ سال کی لگاتار محنت سے مسلم عوام میں اپنی قیادت منوالی تھی۔ اتحاد المسلمین جو شروع میں معاشری اور مذہبی اصلاح کے لئے قائم ہوئی تھی آہستہ آہستہ سیاسی جماعت بن گئی اور اس کی شاخیں اضلاع میں بھی پھیل گئیں۔ جب

بہادر یار جنگ کا حرکت قلب بند ہونے سے اچانک انتقال ہوگیا تو ابوالحسن سید علی ان کے جانشین ہوئے۔ وہ ایک کامیاب وکیل اور سلجھے ہوئے شخص تھے لیکن وہ اس محدود دائرے سے باہر نہ نکل سکے جو بہادر یار جنگ کی صدارت کے زمانے میں بن گیا تھا یعنی ذمہ دارانہ حکومت سے اختلاف، بالادستی (پیراموئنٹسی) کی مخالفت اور حیدرآباد کی آزادی کا مطالبہ۔ کانگریس کا یہ دعویٰ تھا کہ آزادی حاصل ہونے کے بعد ہندوستان کی جدید حکومت ہر معاملے میں برطانیہ کی جانشین ہوگی اور تمام ریاستوں کے اندرونی معاملات میں اس کو اسی طرح کی بالادستی (پیراموئنٹسی) کے اختیارات حاصل ہوں گے جو برطانیہ کو حاصل تھے۔

اس دعوے کا ٹراونکور کے دیوان سر سی۔ پی راماسوامی آیر نے یہ جواب دیا کہ برطانوی حکومت نے بعض ریاستوں کو، جن میں حیدرآباد اور ٹراونکور شامل ہیں، فتح نہیں کیا اور صدیوں سے ان کی خود مختارانہ حیثیت مسلمہ چلی آتی ہے۔ برطانوی حکومت نے معاہدوں کے ذریعے سے ان ریاستوں سے اپنے دستوری تعلقات استوار کئے تھے۔ اب اگر برطانیہ ہندوستان کی حکومت سے دست بردار ہونا چاہتا ہے تو ہندوستانی ریاستوں کی وہی حیثیت بحال ہو جائے گی جو برطانوی حکومت سے معاہدے کرنے کے قبل انھیں حاصل تھی۔ اس پر کانگریس کی طرف سے کہا گیا کہ برطانوی حکومت اور دیسی ریاستوں کے معاہدے مساوات کے اصول پر مبنی نہیں ہیں۔ جن میں برطانوی حکومت یک طرفہ طور پر تغیر و تبدل نہ کرسکتی ہو۔ اس کے ماسوا گذشتہ ایک صدی کے عملدرآمد اور رواج نے تمام ریاستوں کو برطانوی حکومت کا محکوم بنا دیا ہے۔ اس کی تائید میں لارڈ ریڈنگ

کے اس خط کا حوالہ دیا گیا جو انھوں نے نظام کو لکھا تھا جس میں صراحت کے ساتھ یہ جتا دیا گیا تھا کہ "کوئی والیِ ریاست برطانوی حکومت کے ساتھ مساویانہ طریقے پر گفت وشنید کرنے کا دعویٰ کرنے میں حق بجانب نہیں ہے۔ تاج کی برتری صرف معاہدوں ہی پر مبنی نہیں ہے بلکہ ان سے علحدہ ہو کر بھی قائم ہے۔" بٹلر کمیٹی کی رپورٹ کا بھی کانگریس کی جانب سے حوالہ دیا گیا جس میں اس دعوی کی تردید کی گئی تھی کہ برطانوی حکومت سے تعلق پیدا کرتے وقت دیسی ریاستیں خود مختار تھیں۔ حقیقت یہ ہے کہ کسی ریاست کو بھی بین اقوامی حیثیت حاصل نہ تھی۔ وہ سب مغلیہ حکومت، مرہٹہ اقتدار یا سکھ شاہی کے تابعِ فرمان یا باجگذار تھیں جن میں سے انگریزوں نے چند کو باقی رہنے دیا اور بعض دوسری ریاستیں ایسی بھی ہیں جو خود انگریزی حکومت کی قائم کی ہوئی ہیں۔ کانگریس نے یہ بات واضح کر دی تھی کہ ریاستی باشندوں کی مرضی کے بغیر انھیں کسی کے حوالے نہیں کیا جا سکتا۔ انگریزی حکومت نے بھی جواب تک دیسی ریاستوں کے ساتھ معاہدوں کے مطابق اپنے عملدرآمد کی صورت گری کرتی رہی تھی ان سب معاہدوں کو پس پشت ڈال کر انھیں ان کی قسمت پر چھوڑ دیا تاکہ وہ خود نئے حالات سے مطابقت کرنے کی جد وجہد کریں۔ کابینی مشن نے ۱۲ مئی ۱۹۴۶ء کو والیانِ ریاست کو مطلع کر دیا تھا کہ جب برطانوی حکومت ہندوستان کے تسلط سے دست بردار ہو گی تو بالادستی (پیرامونٹسی) کے اختیارات جو اسے حاصل ہیں وہ جانشین حکومت کو منتقل نہیں کیے جائیں گے بلکہ ان کا خاتمہ ہو جائے گا اور ریاستیں اس دستوری حیثیت پر عود کر آئیں گی جو معاہدوں کے قبل انھیں حاصل تھی۔ کابینی مشن کی اس سفارش کو ۱۹۴۷ء کے قانون آزادی ہند کی دفعہ ۷ میں صراحت سے

بیان کیا گیا ہے۔ اس میں یہ توقع ظاہر کی گئی تھی کہ تمام ریاستیں ہندوستان اور پاکستان کی جدید مملکتوں میں سے کسی ایک میں شامل ہو کر اپنا جائز مقام حاصل کریں گی۔ پارلیمنٹ میں وزیر ہند نے بھی صراحت سے کہا کہ جب دونوں نئی مملکتیں قائم ہونگی تو اس وقت ریاستیں اپنی اپنی قسمت کی مالک ہو جائیں گی۔ انھیں اس کی آزادی ہوگی کہ وہ نئی مملکتوں میں سے کسی ایک کے ساتھ اشتراک کریں یا ان سے علحدہ رہیں۔ اس ضمن میں برطانوی حکومت ان پر کسی قسم کا دباؤ نہیں ڈالے گی۔

ان حالات میں نظام نے ۱۱ جون ۱۹۴۷ء کو حیدرآباد کی آزادی کا فرمان صادر کیا جس میں اس امر کی صراحت تھی کہ پاکستان میں شرکت ریاست کی ہندو رعایا کو اور ہندوستان میں شرکت مسلمان رعایا کو ناپسند ہے اس لئے حیدرآباد آزاد رہ کر دونوں مملکتوں سے دوستانہ تعلقات قائم رکھے گا اور ہندوستان چونکہ ہمسایہ مملکت ہے اس لئے اس سے تمام ضروری امور میں تعاون کیا جائے گا۔ ۱۱ جولائی ۱۹۴۷ء کو نواب صاحب چھتاری، علی یاور جنگ اور سر والٹر مانکٹن پر مشتمل ایک وفد تاج کے نمایندے لارڈ مونٹ بیٹن سے گفت و شنید کے لئے دہلی روانہ ہوا۔ بعد میں اس وفد میں دو عوامی وزرا عبدالرحیم اور پنگل وینکٹ رامارڈی کو بھی شامل کیا گیا۔ تعجب ہے کہ اس وقت کی وزارت نے یہ محسوس نہیں کیا کہ اس اعلان آزادی سے آیندہ کتنی سیاسی پیچیدگیاں پیدا ہوں گی اور یہ بیل منڈھے نہیں چڑھے گی۔ یہ گفتگو نتیجہ خیز نہ رہی۔ دو ماہ کے بعد لارڈ مونٹ بیٹن تاج کے نمایندے کے بجاے ہندوستان کے گورنر جنرل بننے والے تھے۔ اس لئے ظاہر ہے کہ وہ کوئی ایسا سیاسی اقدام نہیں کر سکتے تھے جو کانگریس کی حکومت کو منظور نہ ہو۔ نظام اور مونٹ بیٹن میں خط و کتابت کا سلسلہ

بعد میں بھی جاری رہا۔ مونٹ بیٹن کا اصرار تھا کہ چونکہ ریاست حیدرآباد ہر طرف سے ہندوستانی علاقوں سے گھری ہوئی ہے اس لئے اسے ہندوستان میں جلد سے جلد شرکت کر لینی چاہیئے۔ ان حالات میں آزادی کا اعلان غیر ضروری اور بے موقع تھا۔ ایک طرف تو حکومت ہند اس کی وجہ سے حیدرآباد سے بدظن ہو گئی اس لئے کہ وہ کسی طرح بھی اس کی آزاد حیثیت برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ دوسرے یہ کہ حیدرآباد کی اسٹیٹ کانگریس نے اس سے اختلاف کرتے ہوئے تخریبی کارروائیوں کے پروگرام پر عمل شروع کر دیا تھا۔ تیسرے یہ کہ اتحادالمسلمین کو اس سے اپنا اثر بڑھانے میں مدد ملی اور اس جماعت نے غیر حقیقی آزادی کے نعروں سے عوام کو گمراہ کیا۔ چونکہ ان نعروں میں جذباتی اپیل تھی اس لئے ان کے سامنے سنجیدگی اور معاملہ فہمی کو نیچا دیکھنا پڑا۔ اس اعلان کے بعد ہی حیدرآباد کی سرحدوں پر ہنگاموں اور قتل و غارت گری کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اس کے علاوہ معاشی ناکہ بندی کے پروگرام کو بھی عمل میں لایا گیا جس کے باعث اہلِ حیدرآباد کو سخت پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ آزادی کے اعلان کی ذمہ داری اس وقت کی کابینہ پر ہے۔ اگر اسی پر اعلیحضرت کو اصرار تھا تو کابینہ کے ان ارکان کو مستعفی ہو جانا چاہیئے تھا جو اصولی طور پر اس سے متفق نہیں تھے۔ تاکہ لوگ غلط فہمی میں مبتلا نہ ہوتے۔

اب قاسم رضوی اتحادالمسلمین کے صدر بن چکے تھے۔ نواب صاحب چھتاری کو مجبور کر کے امور دستوری کا محکمہ علی یاور جنگ سے لے کر معین نواز جنگ کے حوالے کر دیا گیا۔ اس طرح علی یاور جنگ کا تعلق آئندہ وفد کی رکنیت اور گفت و شنید سے نہ رہا۔ نظام نے ان کی جگہ سر سلطان احمد کو وفد کا رکن مقرر کیا۔ علی نواز جنگ بھی نئے وفد میں شریک کئے گئے۔ اس نئے وفد نے ۱۹۴۷ء کے ستمبر اور اکتوبر کے مہینوں

میں گفت و شنید جاری رکھی۔ مونٹ بیٹن کے اثر سے سردار پٹیل معاہدۂ انتظام جاریہ کی تکمیل کے لئے تیار ہو گئے تھے۔ جب معاہدہ کا مسودہ نظام کے دستخط کے لئے آیا تو قاسم رضوی کنگ کوٹھی میں طلب کئے گئے۔ انھوں نے معاہدۂ نظام جاریہ کی مخالفت کی اور نظام کو مشورہ دیا کہ اس پر دستخط کرنے سے انکار کر دیں۔ اس پر سر والٹر مانکٹن اور سر سلطان احمد نے نظام کی خدمت میں وفد کی رکنیت سے اپنا استعفا پیش کر دیا۔

ایگزیکیٹیو کونسل میں جب معاہدے کا مسودہ پیش ہوا تو جن ارکان نے اس کی مخالفت کی تھی انھیں کو نظام نے حکومتِ ہند سے گفت و شنید کے لئے ۱۳ ستمبر کو دہلی بھیجا۔ یہ وفد معین نواز جنگ، عبد الرحیم اور پنگل وینکٹ راما ریڈی پر مشتمل تھا۔ ان تینوں میں کوئی بھی ایسا نہ تھا جو عملی سیاست کا تجربہ رکھتا ہو۔ مونٹ بیٹن نے سوائے چند معمولی لفظی تبدیلیوں کے سابقہ مسودے میں کسی قسم کی اہم ترمیم قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ بالآخر نظام نے ان حالات میں معاہدۂ انتظام جاریہ (اسٹینڈ اسٹل اگیری منٹ) پر دستخط کر دیئے۔ اس معاہدے کی مدت اس کی تکمیل کی تاریخ سے ایک سال رکھی گئی۔ اس کی رو سے امور خارجہ، دفاع اور رسل و رسائل اسی بنیاد پر قائم رہیں گے جس پر برطانوی ہند اور نظام کے درمیان ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء سے قبل عمل ہوتا تھا۔ سوائے جنگ کی حالت کے حیدرآباد میں حکومت ہند اپنی فوج نہ رکھے گی۔ اگر ملک میں اندرونی شورش ہو جائے تو حکومت ہند نظام کی فوجی امداد کرے گی۔ حکومت ہند نے یقین دلایا کہ وہ بالادستی (پیراموئنٹسی) کے اختیار کو استعمال نہیں کرے گی۔ حیدرآباد اور دہلی میں ایجنٹ جنرل رہیں گے۔ اگر معاہدے سے متعلق دونوں

حکومتوں میں اختلاف پیدا ہو تو ثالثی کے ذریعے سے اس کا تصفیہ کرایا جائیگا۔ لارڈ مونٹ بیٹن کو توقع تھی کہ اس معاہدے کی بنا پر آیندہ ایک مستقل معاہدہ تشکیل پا سکے گا اور چونکہ حیدرآباد کا مفاد ہندوستان سے وابستہ ہے اس لئے امید ہے کہ سال ختم ہونے سے پہلے ہی حیدرآباد ہندوستان میں شریک ہو جائے گا۔

معاہدۂ انتظام جاریہ (اسٹینڈ اسٹل ایگریمنٹ) کا جو مسودہ پہلے تیار ہوا تھا اسکے متعلق محمد علی جناح سے مشورہ کرنے کے لئے نظام نے علی یاور جنگ اور عبدالرحیم کو کراچی بھیجا تھا۔ محمد علی جناح نے جو عملی سیاست کا وسیع تجربہ رکھتے تھے قطعی طور پر کہا کہ حیدرآباد کو اس ایک سال کے معاہدے کو قبول کر لینا چاہئے اور اس عرصے میں غیر مسلموں کا زیادہ سے زیادہ تعاون اور اشتراکِ عمل حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اس معاہدے پر دستخط ہونے سے پہلے لایق علی صدر اعظم مقرر ہو چکے تھے۔ وہ انجینیر تھے۔ علی نواز جنگ کے کہنے پر انھوں نے اپنی ملازمت سے مستعفی ہو کر تجارت شروع کی جس میں انھیں غیر معمولی کامیابی حاصل ہوئی۔ انھوں نے حیدرآباد کنسٹرکشن کمپنی اور کاغذ سازی اور شکر سازی کے کارخانوں کو بڑی قابلیت اور سوجھ بوجھ سے چلایا۔ لیکن تجارت اور چیز ہے اور سیاست اور چیز۔ وہ سیاست کی ابجد سے بھی واقف نہ تھے۔ انھوں نے جو کونسل بنائی اس میں اونچے پائے کا کوئی شخص بھی موجود نہ تھا جو سیاسی الجھنوں کو سلجھانے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ خود صدر اعظم اور کونسل، اتحادالمسلمین کے اشارے پر چلتی تھی۔ اتحادالمسلمین حکومت ہند سے مستقل معاہدہ کرنے کے خلاف اور حیدرآباد کی آزادی کو مضبوط بنیادوں پر قائم کرنے کی حامی تھی۔ وہ بھول گئی کہ انگریزوں کے زمانے میں حیدرآباد کب آزاد تھا کہ اب ان کی جانشین حکومت کے زمانے میں آزاد

رہ سکتا۔ اب وزارت اور قیادت دونوں ایسے راستے پر پڑ گئے جو سوائے تباہی کے اور کسی طرف جا ہی نہیں سکتا تھا۔ انھوں نے حیدرآباد کی فوج کو مضبوط کرنے کے لئے جنرل العیدروس کو چیکوسلواکیا اور فرانس بھیجا تاکہ وہاں سے اسلحہ خریدیں۔ آسٹریلوی ہوا باز سڈنی کاٹن کے ذریعے سے بھی یورپ کے مختلف ملکوں سے اسلحہ حاصل کرنے کی کوشش کی گئی۔ لیکن بھلا چلتووں سے کبھی جھیل بھری ہے۔ اتحاد المسلمین کی قیادت، جس نے حقیقت سے آنکھیں بند کر لی تھیں، بالآخر پوری ریاست کو لے ڈوبی۔

رضاکار تنظیم کی بنا بہادر یار جنگ نے ڈالی تھی۔ چونکہ وہ خود خاکسار تحریک سے وابستہ رہ چکے تھے اس لئے انھوں نے اس نئی تنظیم میں خاکساروں کے بعض اصول اختیار کئے۔ قاسم رضوی کی صدارت کے زمانے میں حیدرآباد کی سرحدوں پر جو ہنگامے ہو رہے تھے انھیں روکنے کے لئے رضاکاروں کی تنظیم کو استعمال کیا گیا اس لئے کہ ریاست میں پولیس کی تعداد کافی نہیں تھی۔ پست اقوام کے بعض قائدوں نے اتحاد المسلمین سے اتحاد کر لیا تھا لیکن یہ اتحاد ایک بڑا دھوکا تھا۔ انھوں نے رضاکاروں کی آڑ لے کر اونچی ذات کے ہندوؤں سے ان کی پرانی زیادتیوں کا بدلہ لینا شروع کر دیا جس کی وجہ سے بعض اضلاع میں ابتری پیدا ہو گئی۔ رضاکاروں نے بھی بعض جگہ رعایا پر مظالم کئے۔ اس پر حکومت ہند نے اصرار کیا کہ رضاکار تنظیم کو جب تک ختم نہیں کیا جائے گا مستقل معاہدے کے لئے گفت و شنید نہیں ہو سکتی کیونکہ اسکی وجہ سے ملک کا امن و امان تباہ و برباد ہو رہا ہے۔ حیدرآباد کی حکومت کسی حالت میں بھی اس شرط کو ماننے کے لئے تیار نہ تھی۔ غرض کہ دونوں حکومتوں میں اختلاف کی خلیج بڑھتی گئی۔ قاسم رضوی نے بعض ایسی اشتعال انگیز تقریریں کیں جن کی بنا پر حکومت ہند کی خفگی بجا طور پر بڑھ گئی۔ حکومت ہند

کی خفگی بڑھنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اتحادی قیادت نے کمیونسٹ پارٹی سے ساز باز شروع کر دیا تھا۔ چنانچہ حکومت حیدر آباد نے ۴ مئی ۱۹۴۸ء کو کمیونسٹ تنظیم سے امتناعی احکام اٹھائے۔ اتحادی ذہنیت کے اخباروں کا لب و لہجہ کمیونسٹوں کے متعلق بدل گیا تھا۔ کمیونسٹ پارٹی نے کھلم کھلا ذمہ دار حکومت کے قیام اور حیدر آباد کی ہند یونین میں شرکت کی مخالفت شروع کر دی اور یہ دعویٰ پیش کیا کہ ایسا کرنے سے عوام کے مفاد کو نقصان پہنچے گا۔ کمیونسٹ پارٹی نے یہ ہدایات جاری کیں کہ اگر ہند یونین کی فوج حیدر آباد کے حدود میں داخل ہو تو عوام کو اس کا ڈٹ کر مقابلہ کرنا چاہیئے۔ (منشی دی اینڈ آف ان ایرا ص ۱۵۴) اس سے اتحادی قیادت اس غلط فہمی میں مبتلا ہو گئی کہ عوام اس کے ساتھ ہیں حالانکہ یہ زبردست فریب نظر تھا جس کا سب کو خمیازہ بھگتنا پڑا۔

نظام نے پھر سر والٹر مانکٹن کی خدمات حاصل کیں تاکہ وہ حکومت ہند سے گفت و شنید کا راستہ صاف کرنے میں مدد دیں لیکن سردار پٹیل نے ان سے صاف کہہ دیا کہ حیدر آباد میں جب تک اندرونی امن و امان قائم نہ ہوگا کوئی گفتگو نتیجہ خیز نہیں ہو سکتی۔ حکومت ہند نے حیدر آباد پر معاہدۂ انتظام جاریہ کی خلاف ورزی کا الزام لگایا۔ اس اثنا میں حکومت ہند نے عالمی رائے عامہ کو اپنے موافق کرنے کے لئے پروپیگنڈے پر بیدریغ روپیہ خرچ کیا اور حیدر آباد میں جو اندرونی خلفشار کی کیفیت پیدا ہو رہی تھی سے خوب اچھالا تاکہ آئندہ فوجی کارروائی کے لئے وجہ جواز پیدا ہو جائے۔

مونٹ بیٹن جون ۱۹۴۸ء میں گورنر جنرلی کے عہدے سے سبکدوش ہونے والے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ ہندوستان سے جانے سے پہلے حیدر آباد کے معاملے میں یکسوئی حاصل ہو جائے۔ سر والٹر مانکٹن سے ان کے ذاتی تعلقات تھے۔ حیدر آبادی وفد کے رکن

کی حیثیت سے ان سے پوری مدد ملنے کی توقع تھی۔ لیکن بڑی مشکل یہ آن پڑی تھی کہ لائق علی اور وفد کے دوسرے ارکان ان کا مشورہ ماننے کو تیار نہ تھے۔ حکومت ہند نے مستقل معاہدے کا جو مسودہ تیار کیا تھا اس میں یہ درج تھا کہ حکومت حیدرآباد دفاع، امور خارجہ اور رسل رسائل کے محکموں میں حکومت ہند کے قانون کو نافذ کرے گی۔ حیدرآباد کی فوج کی تعداد بیس ہزار مقرر کر دی گئی اور کہا گیا کہ اگر حیدرآباد میں کوئی ناگہانی صورت پیدا ہو تو حکومت ہند اپنی فوج حیدرآباد میں متعین کرے گی اور اس امر کا فیصلہ بھی حکومت ہند کرے گی کہ آیا ایسی صورت پیدا ہو گئی ہے یا نہیں۔ حیدرآباد میں ایک عارضی حکومت قائم کی جائے گی جس کی کابینہ میں نصف تعداد غیر مسلموں کی ہوگی۔ یہ عارضی حکومت ایک دستور ساز اسمبلی بنائے گی جس کا انتخاب علاقہ واری اصول پر ہوگا۔ اس کے ارکان میں ۶۰ فیصدی غیر مسلم ہوں گے۔ دستور ساز اسمبلی عارضی حکومت کو ختم کر کے نئی کابینہ بنائے گی جس میں ۶۰ فیصدی ارکان غیر مسلم ہوں گے۔ جدید دستور کے نافذ ہونے کے پانچ سال کے بعد حیدرآباد حکومت ہند میں شرکت اختیار کرے گا۔ رضاکار تنظیم فوراً ختم کر دی جائے گی۔ حیدرآبادی وفد نے بیشتر تجاویز کو قبول کر لیا تھا مگر حیدرآباد میں ایگزیکٹیو کونسل نے انھیں رد کر دیا۔ نظام نے ۱۶ جون ۱۹۴۸ء کو مونٹ بیٹن کو تار کے ذریعے یہ مزید ترمیم پیش کی کہ دستور ساز اسمبلی میں مختلف فرقوں کا تناسب بعد میں (نظام) طے کروں گا۔ معاہدے میں معاشی اور مالیاتی آزادی کی ایک دفعہ شامل کرنے اور دونوں حکومتوں میں اختلاف کی صورت میں ثالثی کی دفعہ کا اضافہ بھی تجویز کیا گیا۔ مونٹ بیٹن ان حالات سے بہت دل شکستہ ہو گئے اس لئے کہ وہ واقعی یہ چاہتے تھے کہ انگلستان جانے سے پہلے نظام کے ساتھ ایسا معاہدہ

ہو جائے جس کی رو سے ان کی تھوڑی بہت حیثیت برقرار رہ سکے اور ان کے اور حکومت ہند کے درمیان جو تنازعہ ہے وہ دوستانہ اور پرامن طریقے سے طے ہو جائے۔

ماؤنٹ بیٹن ۲۱ جون ۱۹۴۸ء کو راجا گوپال اچاریہ کو گورنر جنرل کے عہدے کا جائزہ دیکر انگلستان روانہ ہو گئے۔ چونکہ سر مرزا اسمٰعیل کے نئے گورنر جنرل سے ذاتی تعلقات تھے اس لئے نظام کے ایما پر انھوں نے سمجھوتے کی آخری کوشش کی جس کی تفصیل مرزا سر نے اپنی کتاب "میری پبلک زندگی" (مائی پبلک لائف) میں دی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ جب میں نے حکومت ہند کے عہدہ داروں سے حیدرآباد کے معاملے کے متعلق گفتگو کی تو انھوں نے کہا کہ اب معاہدے کے مسودے پر غور کرنے کا وقت گذر گیا۔ اب تو نظام کو بھی دوسری ریاستوں کی طرح دستاویز شرکت پر دستخط کرنے چاہئیں۔ سر مرزا اسمٰعیل نے نظام کو لکھا کہ اگر آپ معاہدے کو قبول کرنے پر آمادہ ہوں تو میں حکومت ہند کو اس بات پر راضی کرنے کی کوشش کروں کہ گفت وشنید کو منقطع نہ کیا جائے۔ حکومت ہند کو اصرار تھا کہ حیدرآباد کے موجودہ حالات میں سکندرآباد میں ہندوستانی فوج کا رہنا ضروری ہے۔ نظام اس بات کو کسی صورت میں ماننے کو تیار نہ تھے، اسلئے معاملہ وہیں کا وہیں رہا اور مصالحت کی کوئی صورت نہ نکل سکی۔ سر مرزا نے لکھا ہے کہ چونکہ نظام کی حیثیت اس وقت اپنے محل میں اتحاد المسلمین کے بے بس قیدی کی سی تھی اس لئے وہ کوئی معقول تجویز منظور نہیں کر سکتے تھے۔ (میری پبلک زندگی ص ۱۲۵)

گورنر جنرل راجا گوپال اچاری نے بھی نظام کو متعدد خطوط لکھے لیکن حیدرآباد کا معاملہ ناسمجھی اور ناعاقبت اندیشی کی دلدل میں ایسا پھنس گیا تھا کہ وہ اس سے نہ نکل سکا اور جو قدم بھی اٹھا وہ ٹریجڈی کی تکمیل کی طرف اٹھا۔ ۱۳ ستمبر ۱۹۴۸ء کو

ہندوستانی فوج نے حیدرآباد پر حملہ کر دیا اور تین دن کے اندر حیدرآبادی فوج نے ہتھیار ڈال دیئے۔

حکومتِ ہند کی فوج کشی سے ایک ہفتہ قبل ۵ ستمبر ۱۹۴۸ء کو عثمانیہ یونیورسٹی کے شعبۂ سیاسیات میں ایک سیمی نار منعقد ہوا تھا جس کا موضوع تھا "حیدرآباد کی خودمختاری پرانے دستاویزوں کی روشنی میں"۔ اس کی صدارت پروفیسر ہارون خاں شیروانی نے کی تھی۔ اس میں عثمانیہ یونیورسٹی کے متعدد پروفیسر اور اونچے درجوں کے طالب علم شریک تھے۔ صدر جلسہ نے مجھ سے بھی تقریر کی فرمائش کی۔ میں نے اپنی تقریر میں اس بات کی وضاحت کی کہ عہدِ حالیہ میں حیدرآباد کی آزادی برائے نام رہی ہے اس لئے کہ عملدرآمد کی رو سے حیدرآباد نے برطانوی حکومت کی سیادت (پیرامونٹسی) کو ہمیشہ تسلیم کیا۔ سیاست میں اصل چیز عمل درآمد ہے جسے محض نظری اور قانونی اصول پر ترجیح حاصل ہوتی ہے۔ حیدرآباد کی تاریخ میں ڈیڑھ سو سال کے عملدرآمد سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ حکومت ہند نے بیسیوں معاملات میں مداخلت کی جسے گوارا کیا گیا۔ خارجی امور تو ہمیشہ سے پوری طرح برطانوی حکومت کے ماتحت رہے ہیں اگر حیدرآباد پوری طرح آزاد اور خودمختار تھا، تو اس نے یہ کڑوا گھونٹ کیوں پیا اور خارجی امور مکمل طور پر برطانوی حکومت کے سپرد کیوں کر دیئے؟ اس سے حیدرآباد کی خودمختاری کی حدود دکھایا چلتا ہے۔ دراصل حیدرآباد کی خودمختاری بس اسی حد تک تھی جس حد تک برطانوی حکومت چاہتی تھی۔ ملک کے اندرونی نظم ونسق میں بھی تاج برطانیہ کا نمائندہ نظام کو وقتاً فوقتاً مشورہ دیتا تھا، ایسا مشورہ جس پر عمل کرنا لازمی تھا۔ صدر جلسہ نے اپنی تقریر میں میرے خیالات کی تائید کی۔ اکثر مقررین کی تقریریں میرے

خیالات کی مخالفت میں تھیں۔ میں ابھی حال میں حیدرآباد گیا تھا تو میں نے پروفیسر ہارون خاں شیروانی سے اس سیمی نار کی کارروائی کی تصدیق کرالی۔ ان کے پاس اس جلسے کی کارروائی کی تحریری یادداشت بھی موجود ہے جو انھوں نے مجھے دکھائی اس سیمی نار کے دو روز بعد ڈاکٹر رضی الدین وائس چانسلر عثمانیہ یونیورسٹی میرے مکان پر تشریف لائے اور کہنے لگے کہ عنقریب حیدرآباد پر فوج کشی ہونے والی ہے جسے روکنے کے لئے حکومت حیدرآباد اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل میں اپنا مقدمہ پیش کرنے کے لئے ایک وفد بھیجنا چاہتی ہے۔ چونکہ سلامتی کونسل کا اجلاس پیرس میں ہو رہا ہے اور وفد میں کوئی شخص فرانسیسی جاننے والا نہیں اس لئے آپ ان کے ساتھ چلے جائیے۔ میں نے معذرت کی کہ یہ سیاسی معاملہ ہے جس میں میرا پڑنا مناسب نہیں ہے۔ میں سمجھا، بات آئی گئی ہوئی۔ لیکن دوسرے روز ڈاکٹر رضی الدین پھر میرے یہاں تشریف لائے اور اصرار کیا کہ اگر میں ترجمان کی حیثیت سے وفد کے ساتھ جاؤں تو اس میں کوئی ہرج نہیں ہے۔ اس سے وفد کو بڑی مدد ملے گی۔ ڈاکٹر رضی الدین نے مجھ سے اپیل کی کہ حیدرآباد پر یہ بڑا سخت وقت پڑا ہے، اس وقت جو بھی مدد ہو سکے اس سے دریغ نہ کرنا چاہئے۔ چنانچہ ان کی اس اپیل پر میں جانے کے لئے آمادہ ہوگیا۔ ۱۰ ستمبر ۱۹۴۸ء کو وفد کے دو ارکان معین نواز جنگ اور پست اقوام کے لیڈر شیام سندر روانہ ہوئے۔ میں وفد کا رکن نہیں تھا۔ لیکن ترجمان کی حیثیت سے میں بھی ان کے ہمراہ کراچی روانہ ہوگیا۔ دوسرے روز قائد اعظم محمد علی جناح نے رحلت فرمائی اس لئے کراچی سے فوراً روانگی نہ ہو سکی۔ ۱۳ ستمبر کو ہم پیرس روانہ ہوئے۔ راستہ ہی میں یہ خبر سنی کہ ہندوستانی فوجیں حیدرآباد کی سرحدوں میں داخل ہوگئیں۔ ظہیر الدین احمد اور معین نواز جنگ

پہلے سے پیرس میں موجود تھے اور سلامتی کونسل میں حیدر آباد کا مقدمہ پیش کر چکے تھے۔
حیدر آبادی وفد نے سلامتی کونسل سے مقدمے پر بحث کی تاریخ مقرر کرنے کی درخواست کی۔
چنانچہ ۱۶ ستمبر سماعت کی تاریخ مقرر ہوئی معین نواز جنگ نے حیدر آباد کا مقدمہ پیش
کیا اور فوجی حملے کی جتنی تفصیل اس وقت تک مل سکی تھی بیان کی اور درخواست
کی کہ سلامتی کونسل حیدر آباد کی مدد کرے۔ ہندوستان کی طرف سے سرراما سوامی مدالیار
نے حیدر آباد کی آزادانہ حیثیت کو چیلنج کرتے ہوئے بتایا کہ حیدر آباد کا معاملہ گھریلو نوعیت
کا ہے اسے سلامتی کونسل میں پیش نہ ہونا چاہئے۔ ۱۸ ستمبر کو ہندوستانی افواج کا حیدر آباد
پر قبضہ ہو گیا اور وہاں ملٹری گورنمنٹ قائم ہو گئی۔ اسی روز نظام کی طرف سے سلامتی
کونسل کے سکریٹری کو تار ملا کہ حیدر آباد کا مقدمہ واپس لیا جاتا ہے۔ لیکن چونکہ حیدر آبادی
وفد نے کہا کہ انھیں ابھی تک کوئی ہدایات اس ضمن میں موصول نہیں ہوئی ہیں اسلئے ۲۰ ستمبر کو اس مسئلہ
پر پھر بحث ہوئی سرراما سوامی مدالیار نے کہا کہ چونکہ نظام نے مقدمہ واپس لے لیا ہے اسلئے حیدر آبادی وفد
کی کوئی قانونی حیثیت باقی نہیں رہی۔ نظام نے ۲۲ ستمبر کو سکریٹری سلامتی کونسل کو پھر ایک تار دیا کہ مقدمہ
واپس لیا جاتا ہے۔ اس میں یہ بھی بتایا گیا کہ جس وزارت نے وفد بھیجا تھا وہ تحلیل ہو چکی ہے اور زمام حکومت
اب میرے ہاتھ میں ہے۔ جو وفد روانہ کیا گیا تھا اسے اب ریاست کی جانب سے کوئی اختیار باقی نہیں رہا۔
اس پر ہندوستانی وفد نے نمایندگی کی کہ حیدر آباد کا مقدمہ ایجنڈے پر سے خارج کر دیا جائے۔ ہندوستان نے ۷ اکتوبر
کو پیرس سے اپنا وفد واپس بلا لیا۔ حیدر آباد کا مقدمہ اگرچہ سلامتی کونسل کے ایجنڈا پر باقی رہا لیکن اسکی عملی اہمیت
ختم ہو گئی۔ حکومت حیدر آباد نے سلامتی کونسل سے عدل و انصاف کی جو توقعات قائم کی تھیں
وہ سب فریب نظر ثابت ہوئیں، کیونکہ اقوام متحدہ میں حیدر آبادی وفد پہنچنے سے
قبل ہی ہندوستانی فوج نے حیدر آباد پر حملہ کر دیا تھا اور تین روز میں حیدر آبادی فوج

نے ہتھیار ڈال دیئے تھے۔ حیدرآباد کی قسمت کا فیصلہ ہندوستان ہی میں معقولیت پسندی سے ممکن تھا۔ حکومت حیدرآباد کا یہ خیال کہ اسے اقوام متحدہ سے مدد ملے گی بین اقوامی سیاسی حالات سے لاعلمی کا نتیجہ تھا۔

فوجی حکومت | فوجی حکومت کے ابتدائی چند ہفتوں میں سوائے شہر حیدرآباد کے باقی ساری ریاست میں قتل وغارت کا بازار گرم رہا۔ ہزاروں مسلمان قتل ہوئے اور ان کی کروڑوں روپیے کی جائداد تلف ہوئی۔ مس پدمجا نائیڈو نے اس زمانے میں لوک سبھا کی ممبر تھیں حیدرآباد کی دردناک داستان اپنے رفقا کو سنائی تو اس پر پنڈت جواہر لال نہرو نے حالات کی تحقیق کے لئے پنڈت سندر لال کی سرکردگی میں ایک وفد حیدرآباد روانہ کیا۔ اس وفد نے پوری ریاست کا دورہ کیا اور ایک تفصیلی رپورٹ مرتب کرکے حکومت ہند کے سامنے پیش کی جس میں اصل حقیقت کو بے نقاب کیا۔ پنڈت سندر لال نے مجھے زبانی بتایا کہ ملٹری گورنمنٹ نے حکومت ہند کو جو رپورٹ دی تھی اس میں لکھا تھا کہ پوری ریاست میں ڈھائی سو آدمی مارے گئے۔ حالانکہ پنڈت جی کی تحقیقات کے مطابق مقتولین کی تعداد چالیس ہزار کے لگ بھگ تھی جس کے اعداد و شمار انھوں نے اپنی رپورٹ میں پیش کئے تھے۔ حیدرآباد کے بعض انصاف پسند کانگریسی لیڈروں نے بھی جنھوں نے اضلاع کا دورہ کیا تھا، پنڈت سندر لال کے بیان کی پوری تائید کی۔ ان میں مسٹر نرسنگ راؤ ایڈیٹر، رعیت، جو بعد میں آندھرا پردیش کی حکومت کے وزیر ہوئے، شامل ہیں۔

ملٹری گورنمنٹ کے قائم ہونے کے بعد حیدرآباد کو بھی دوسری ریاستوں کی طرح انڈیا یونین میں شامل کر لیا گیا۔ ملٹری گورنر نے اپنے ایک خط کے ذریعے سے

نظام کو یقین دلایا کہ ان کے اعزاز و مراتب آئندہ بھی برقرار رہیں گے۔ ان کی ذات کے لئے ۵۰ لاکھ روپیے سالانہ اور ۲۵ لاکھ ان کے متعلقین کے لئے منظور کئے گئے۔ صرفِ خاص کو ریاست میں ضم کر دیا گیا۔ حیدرآباد کے المیہ کی ذمہ داری قیادت اور وزارت دونوں پر عائد ہوتی ہے۔ ان کے علاوہ سردار پٹیل اور مسٹر منشی کے غیر ہمدردانہ رویے کو بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ یہ دونوں اگر واقعی چاہتے تو ایسی صورت یقیناً ممکن تھی کہ انڈیا یونین کی برتری بھی باقی رہتی اور حکومت آصفیہ کا وقار بھی نئے حالات سے مطابقت کر کے قائم رہتا۔ مسٹر منشی نے اپنی کتاب "دی انڈ آف ان ایرا" (ایک عہد کا خاتمہ) میں فخریہ لہجے میں لکھا ہے کہ جب ہندوستان کے مشہور مورخ ڈاکٹر آر۔سی مجمدار نے میرے حیدرآباد جانے کا ذکر اپنے کسی دوست سے کیا تو اس نے کہا "نظام پر مجھے ترس آتا ہے"۔ ڈاکٹر مجمدار نے پوچھا کیوں؟ اس پر ان کے دوست نے کہا "بس اب نظام کا خاتمہ ہے" (ص ۶) اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ لوگ جو مسٹر منشی کے خیالات سے واقف تھے یہ بات جانتے تھے کہ وہ حکومت ہند اور نظام میں کوئی معاہدہ نہیں ہونے دیں گے۔ اور آصف جاہی حکومت کو ختم کر کے چین لیں گے۔ ایک طرف ان کی اور دوسری طرف حیدرآباد کی وزارت اور قیادت کی تنگ دلی نے مفاہمت کی کوششوں کو کامیاب نہ ہونے دیا۔ حیدرآباد کے معاملے میں پنڈت جواہر لال نہرو کی پالیسی پر سردار پٹیل کی حکمت عملی کو غلبہ حاصل رہا جس کے باعث حکومت ہند چالیس ہزار معصوم انسانوں کے قتل کی ذمہ دار ٹھہرتی ہے۔ یہ مہاپاپ اس حکومت کے سر رہا جس نے گاندھی جی کی اخلاقی قدروں کو اپنا مطمح نظر بنایا تھا۔ اگر حکومت ہند ذرا صبر و تحمل سے کام لیتی تو یقیناً حیدرآباد کی حکومت سے مصالحت کی کوئی نہ کوئی صورت نکل آتی اور دونوں میں مستقل معاہدہ

ہو جاتا۔ یہ اسی طرح کی بے صبری اور جلد بازی تھی جس کی طرف مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنی کتاب "ہندوستان نے آزادی حاصل کرلی" (انڈیا ونس فریڈم) میں اشارہ کیا ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ اگر ملک کی تقسیم میں جلدی نہ کی جاتی تو اس کا امکان تھا کہ مفاہمت کی کوئی نہ کوئی صورت نکلتی اور تقسیم کی نوبت ہی نہ آتی (ص ۱۸۴) انھوں نے پنڈت جواہر لال نہرو کو بتایا کہ مسلم لیگ نے کابینی مشن کی تجویز کو منظور کرلیا ہے جس کی بنا پر ہندوستان کے سیاسی مسئلے کا حل ممکن ہے۔ اگر ہم نے ملک کی تقسیم کے اصول کو مان لیا تو اس کی ذمہ داری مسلم لیگ اور کانگریس دونوں پر عاید ہوگی (ص ۱۸۶) لارڈ مونٹ بیٹن نے یقین دلایا تھا کہ میں تقسیم کے وقت کسی قسم کی بدامنی یا قتل وغارت فوج کی مدد سے نہ ہونے دونگا۔ لیکن ان کی یقین دہانی دھری کی دھری رہ گئی اور دنیا نے قتل وغارت کا ایسا خونی منظر دیکھا جس کی مثال تاریخ میں نہیں ملتی۔ مولانا آزاد اس معاملے میں لارڈ ویول کے ہمخیال تھے کہ برطانوی حکومت کو کانگریس اور مسلم لیگ میں سمجھوتہ کرانے کے بعد ہندوستان کی حکومت سے سبکدوش ہونا چاہئے۔ اسی بنا پر لارڈ ویول اپنی خدمت سے مستعفی ہوے اس لئے کہ اٹلی کی حکومت نے ان کی رائے کو نہیں مانا۔ مولانا آزاد نے لکھا ہے کہ لارڈ ویول کی راے کو آیندہ واقعات نے صحیح ثابت کیا۔ اگر دو سال کے لئے آزادی ملتوی کردی جاتی تو اس کا امکان تھا کہ مسلم عوام خود ملک کی تقسیم کی مخالفت کرتے اور اہل ہند کو تقسیم ملک کے المیہ سے دوچار نہ ہونا پڑتا (ص ۲۰۷)

نئے جمہوری انتظام میں ریاست حیدرآباد کا پرانا ڈھانچا تو برقرار نہیں رہ سکتا تھا لیکن اگر دانشمندی سے سیاسی الجھنوں کو سلجھانے کی کوشش کی جاتی تو اس ریاست کی بعض قابلِ قدر روایات باقی رہ جاتیں اور مسلمانوں پر جو بیتا پڑی اس کے برے اثرات

بہت کچھ کم کئے جا سکتے تھے۔ تغیر اور انقلاب آئینِ دہر ہے۔ دنیا ڈھلتی پھرتی چھاؤں ہے۔ بڑی بڑی سلطنتیں نہ رہیں تو ریاست حیدرآباد کی کیا ہستی تھی۔ لیکن تاریخ میں یہ ہوا ہے کہ تغیر اور انقلاب کے بطن سے زندگی کے جو نئے اصول جنم لیتے ہیں دانش مند لوگ ان سے مطابقت کرنا سیکھ لیتے ہیں۔ اگر وہ ایسا نہ کریں تو باقی نہ رہ سکیں۔ افسوس ہے کہ اہلِ حیدرآباد زندگی کے نئے احوال اور تقاضوں کو نہ سمجھ سکے اور اپنے آپ کو ان کے سانچے میں نہ ڈھال سکے۔ بھلا حیدرآباد قومیت کی اس قوت کا کیسے مقابلہ کر سکتا تھا جو عالمگیر نوعیت رکھتی ہے اور جس کے سامنے برطانوی سامراج تک کو گھٹنے ٹیکنے پڑے۔ یہ اسی اصول قومیت کا کرشمہ ہے کہ گذشتہ اٹھارہ سالوں میں ایشیا اور افریقہ کے تقریباً سب ملک ایک ایک کر کے آزاد ہو گئے جو سامراجی شکنجے میں جکڑے ہوئے تھے۔

آصف جاہی حکومت کا خاتمہ

مجھے حیدرآباد کی تباہی اور آصف جاہی خاندان کی حکمرانی ختم ہونے کا سخت افسوس تھا۔ نہ صرف یہ کہ میں حیدرآباد میں پیدا ہوا تھا بلکہ جذباتی طور پر میں نے اپنے آپ کو حیدرآباد سے وابستہ کر لیا تھا۔ ہمارے خاندان کا تین پشتوں سے دکن سے تعلق رہا تھا۔ دادا، چچا، والد اور میں خود وہاں رہے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب میر محبوب علی خاں کے انتقال کی خبر ہم لوگوں کو قائم گنج میں معلوم ہوئی تھی تو ہماری والدہ کے آنسو نکل آئے تھے۔ ان کی زبانی ہم نے میر محبوب علی خاں کی سخاوت اور فیاضی کے قصے سنے۔ حیدرآباد کا فیض عام تھا۔ ملک کے تعلیمی ادارے، چاہے وہ ہندوؤں کے ہوں یا مسلمانوں کے، حیدرآباد کی طرف امید کی نظر اٹھاتے تھے اور یہ نظر کبھی وہاں سے مایوس واپس نہیں آتی تھی۔ سارے ملک میں نظام کی داد و دہش کا چرچا تھا۔ پھر عثمانیہ یونیورسٹی نے اردو زبان کی جو خدمت انجام دی اس کی

وجہ سے اس زبان کے بولنے والے حیدرآباد کا احسان کبھی فراموش نہیں کر سکتے۔
میں نے اپنے دورانِ قیام میں بارہا یہ محسوس کیا کہ اگر واقعی ملک کے کسی حصے میں متحدہ ہندوستانی تہذیب کے نقش و نگار دکھائی دیتے ہیں تو وہ صرف دکن میں۔

ریاست حیدرآباد میں تلنگی، مرہٹی اور کنڑی زبانیں مختلف علاقوں میں بولی جاتی تھیں تاہم وہاں کوئی لسانی جھگڑے نہ تھے، نہ آپس میں بیگانگی تھی۔ اردو زبان ان تینوں علاقوں کے لئے اتصالی کڑی کا حکم رکھتی تھی۔ لوگوں کے رہن سہن اور تمدن میں یک رنگی پیدا ہو گئی تھی۔ یہ نہیں کہ مقامی خصوصیات فنا ہو گئی ہوں۔ ان کے باقی رہنے کے باوجود ریاست کے مختلف زبانیں بولنے والے ایک مشترک مقصد میں اپنے آپ کو شریک خیال کرتے تھے۔ سر مرزا اسمٰعیل جب کچھ عرصے کے لئے ریاست کے صدر اعظم ہوئے تو انھوں نے اس بات کو محسوس کیا جس کا انھوں نے اپنی کتاب میں اظہار کیا ہے، وہ لکھتے ہیں: "میں نے ریاست حیدرآباد میں ہندو مسلم اتحاد کا منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ یہاں کی معاشرتی اور سرکاری زندگی میں ہندو مسلم تہذیب کا امتزاج تھا۔ یہاں کسی شخص کو دیکھ کر یہ کہنا مشکل تھا کہ وہ ہندو ہے یا مسلمان۔ لوگوں کا لباس ایک ہی طرح کا تھا اور وہ سب اردو زبان بولتے تھے۔ چنانچہ جو لوگ مجھ سے ملنے آتے تھے ان سے میں یہ نہیں پوچھتا تھا کہ وہ ہندو ہیں یا مسلمان بلکہ میں ان سے نام دریافت کرتا تھا تاکہ معلوم ہو جائے کہ وہ کون ہیں۔" (مائی پبلک لائف ص۱۰۳)
سر مرزا بڑے بالغ نظر اور تجربہ کار ماہر نظم و نسق تھے۔ انھوں نے حیدرآباد کے مختلف لوگوں میں جن کے مذاہب جداگانہ تھے اور جن کی زبانیں ایک دوسرے سے بالکل الگ تھیں تہذیبی وحدت دیکھی اور اس پر انھوں نے اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا۔

دراصل پورا ملک زندگی بسر کرنے کا یہ سلیقہ حیدرآباد سے سیکھ سکتا تھا۔ اس کے حصے
بخرے کر کے حکومت ہند نے ملک کی کوئی خدمت نہیں کی۔ دراصل اس سے لسانیاتی
فتنے کو شہ ملی۔ آندھرا میں، بمبئی میں، پنجاب میں اس کی وجہ سے کتنی الجھنیں پیدا ہوئیں۔
نہ معلوم آیندہ یہ ہماری قومی زندگی میں اور کیا گل کھلائے۔ پورے ملک کا مفاد تو اسمیں
تھا کہ اسٹیٹس یا صوبے ملی جلی اور مخلوط آبادی پر مشتمل ہوتے تاکہ مختلف عناصر ایک دوسرے
کے ساتھ زندگی گذارنے کا سلیقہ سیکھتے۔ اگر ہر صوبہ یک لسانی ہوگا تو لازمی طور پر
اس میں علیحدگی کا جذبہ پرورش پائے گا گویا کہ وہ ایک آزاد تہذیبی وحدت ہے۔
آج مہاراشٹرا اور میسور کا جو حد بندی کا جھگڑا ہے اس نے یہی رنگ اختیار کر لیا ہے۔
بہر حال حیدرآباد کے ٹکڑے کرنے کا فیصلہ نافذ ہو چکا اب یہ تو آیندہ تاریخ بتائے گی کہ
یہ فیصلہ کہاں تک دانش مندی پر مبنی تھا۔

حیدرآباد کی قیادت اور وزارت کی غلطی یہ تھی کہ اس نے ان انقلابی حالات
کا ٹھیک اندازہ نہیں لگایا جو انگریزوں کے ہندوستان سے جانے اور ملک میں جمہوری
اور پارلیمانی نظام حکومت قائم ہونے سے ظہور میں آئے۔ اگر حیدرآباد کی حکومت، حکومت ہند
کے منشا کے مطابق معاہدہ کر لیتی تو اس تباہی کی نوبت نہ آتی جو بعد میں آئی اور جو تبدیلیاں
ہوتیں بتدریج عمل میں لائی جاتیں۔ اس عرصے میں حیدرآباد کے مسلمان بڑی حد تک نئے
احوال سے مطابقت کر لیتے اور انھیں جن مصائب کا سامنا کرنا پڑا اس کی نوبت نہ آتی۔
ظاہر ہے کہ بیسویں صدی میں کوئی اقلیت مستقل طور پر اکثریت کی مرضی کے خلاف حکومت
نہیں کر سکتی، خصوصاً ایسی حالت میں جبکہ چاروں طرف جمہوریت کا دور دورہ ہو اور
پارلیمانی نظام حکومت رائج ہو جیسا کہ ہندوستان میں ہے۔ ایک ہی ملک میں مطلق العنانی

اور جمہوریت کا پہلو بہ پہلو رہنا کیسے ممکن تھا۔ کاش کہ حیدر آباد کی قیادت اور وزارت اس بات کو سمجھتی اور اپنے انداز نظر میں لوچ اور لچک پیدا کرتی تاکہ مصالحت اور مفاہمت کی کوئی صورت پیدا ہوتی۔

حیدر آباد کے قیام میں بعض دانشوروں سے ملاقات

پکتھال

میں حیدر آباد میں کم وبیش اٹھائیس سال رہا۔ اس عرصے میں مجھے بعض ایسی غیر حیدر آبادی شخصیتوں سے نیاز حاصل کرنے کا موقع ملا جن کی یاد اس وقت میرے حافظے میں ابھر رہی ہے۔ ان میں سے ہر ایک سے میں کسی نہ کسی لحاظ سے متاثر ہوا جب میں ۱۹۲۰ء میں حیدر آباد گیا تو مارماڈیوک پکتھال اس وقت چادر گھاٹ ہائی اسکول کے پرنسپل تھے۔ وہ بڑے پایے کے صحافی تھے۔ بامبے کرانیکل کے ایڈیٹر رہ چکے تھے۔ انھوں نے حیدر آباد سے سہ ماہی رسالہ "اسلامک کلچر" نکالنا شروع کیا جو اب تک نکل رہا ہے اور انھوں نے اس کا جو اعلیٰ معیار قائم کر دیا تھا وہ اس وقت تک برابر برقرار ہے۔ انھوں نے قرآن کا انگریزی ترجمہ بھی حیدر آباد ہی میں کیا۔ حکومت حیدر آباد نے اسے اپنے صرف سے چھپوایا اور اسے بڑی مقبولیت حاصل ہوئی۔ وہ انگریزی کے اعلیٰ درجے کے ادیب اور عربی زبان سے بخوبی واقف تھے اور عربوں میں عرصے تک رہ چکے تھے۔ پکتھال بڑے پکے اور راسباز مسلمان تھے۔ اسلام کے متعلق جب بھی ان سے گفتگو ہوئی تو انھوں نے ہمیشہ اس کی اخلاقی برتری کو نمایاں کیا۔ انھیں تصوف سے چڑ تھی۔ کہتے تھے کہ یہ غیر اسلامی چیز ہے، جسے مسلمانوں نے قبول کر لیا ہے۔ اسلامی تعلیم میں جس چیز نے انھیں سب سے زیادہ گرویدہ کیا وہ اس کا عملی اور اخلاقی پہلو ہے۔ ایک دفعہ کہتے تھے کہ انسانی مساوات اور عالمگیر اخوت کے اصول اسی کے مظاہر ہیں جو آج بھی اتنے ہی قابل قدر ہیں جتنے ساڑھے تیرہ سو برس

پہلے تھے۔ ان کی بدولت اسلام کا پیغام سدا بہار ہے۔ ابھی اس کی اثر آفرینی ختم نہیں ہوئی ہے۔ انھیں کے کہنے پر میں نے نظام الملک آصف جاہ اول کی زندگی کے حالات لکھے۔ انھوں نے انھیں اسلامک کلچر میں شائع کیا۔ بعد میں میں نے انھیں کتاب کی شکل دی۔ دو سال ہوئے ایشیا پبلشنگ ہاؤس بمبئی نے اس کتاب کا دوسرا اڈیشن "دی فرسٹ نظام" کے نام سے شائع کیا ہے۔

ڈاکٹر عبدالحق مدراس والے ڈاکٹر عبدالحق سے میں پہلی مرتبہ حیدرآباد میں ملا تھا۔ پھر متعدد مرتبہ مدراس میں ان کے یہاں مہمان رہا۔ ایک دفعہ وہ مجھے اپنے ساتھ کرنول لے گئے۔ انھوں نے وہاں جو کالج قائم کیا تھا اس کے سالانہ جلسے کے پروگرام میں میری تقریر رکھدی تھی۔ کئی روز وہاں ان کے ساتھ رہا۔ پھر جب وہ مسلم یونیورسٹی کے پرو وائس چانسلر ہوئے تو بھی ان سے ملنے کا موقع ملا۔ ان کے کہنے اور مدراس یونیورسٹی کی سنڈیکیٹ کی دعوت پر میں نے ہندوستان کی ازمنۂ وسطیٰ کی تہذیب پر پانچ لکچر دیئے۔ ڈاکٹر عبدالحق سے میری ملاقات پندرہ بیس سال رہی۔ جتنا میں نے انھیں قریب سے دیکھا اتنا ہی میں ان کے اخلاق اور نیکی سے متاثر ہوا۔ وہ پکے اور سچے مسلمان تھے اور اسلامی شعائر کا دل سے احترام کرتے تھے۔ اسی کے ساتھ ان کے دل میں انسان دوستی کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ کسی کو تکلیف میں دیکھ کر ان کا دل بھر آتا تھا۔ ان کی زندگی میں مذہبی انسان کا اعلیٰ نمونہ ملتا ہے۔ ان کی دین داری اور خدا ترسی کو لوگ اب تک یاد کرتے ہیں۔ ان کی عمر کا بڑا حصہ پڑھنے پڑھانے میں گذرا۔ عربی کے عالم ہونے کے ساتھ جدید علوم پر انکی گہری نظر تھی، وہ کچھ عرصے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے پرو وائس چانسلر رہے۔ وہ طلبہ اور اساتذہ میں ہر دلعزیز تھے۔ آخر میں مدراس میں

پبلک سروس کمیشن کے رکن ہو گئے تھے۔

اس ضمن میں مجھے ان کے متعلق ایک واقعہ یاد آرہا ہے جسے یہاں لکھ دوں۔ ایک دفعہ میں پانڈیچری سے واپسی پر مدراس اسٹیشن پہنچا تو میں چاہتا تھا کہ رات گذارنے کے لیے ریٹائرنگ روم مل جائے۔ ایک بابو صاحب سے اس کے متعلق بات ہی کر رہا تھا کہ ایک نہایت تیز اور ذہین غیر مسلم نوجوان مجھ سے کہنے لگا کہ آپ پریشان نہ ہوں، میں کوئی نہ کوئی انتظام کرائے دیتا ہوں۔ میں اس کے ساتھ ہو لیا۔ اس نے اوپر کی منزل پر جاکر ایک اور شخص سے کچھ گفتگو کی اور مجھے کمرہ مل گیا۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا۔ اس پر اس نے اپنے حالات بیان کرنا شروع کر دیئے۔ پہلے اس نے پوچھا کہ کیا آپ ڈاکٹر عبدالحق سے واقف ہیں۔ میں نے کہا ہاں، مجھے ان سے نیاز حاصل ہے۔ کہنے لگا کہ ڈاکٹر عبدالحق کی مہربانی سے میں اس لائق ہوا کہ اپنی تعلیم پوری کر کے یہاں ملازم ہوا۔ کہنے لگا ڈاکٹر عبدالحق کے اس احسان کا میں اس طرح بدلا اتارنے کی کوشش کرتا ہوں کہ جہاں تک ہو سکے مسلمانوں کی خدمت کرتا ہوں۔ میں جب بابو سے گفتگو کر رہا تھا تو اس نے سن لیا تھا کہ میں حیدرآباد جا رہا ہوں اس نے اپنی فراست سے یہ اندازہ لگا لیا کہ میں مسلمان ہوں۔ پھر تفصیل بیان کرنے لگا کہ ڈاکٹر عبدالحق نے اپنے پاس سے میری پوری تعلیم کے اخراجات برداشت کیے۔ میں انھیں اپنے باپ کی طرح سمجھتا ہوں۔ میں ڈاکٹر عبدالحق کے اخلاق اور ان کی نیکی کا پہلے سے مداح تھا۔ اس واقعہ سے میرے دل پر اور بھی اثر ہوا۔ اس کے کچھ دنوں بعد جب ان سے حیدرآباد میں ملاقات ہوئی تو میں نے پورا واقعہ بیان کر دیا۔ ہنسنے لگے۔ صرف اتنا کہا "وہ لڑکا غریب لیکن ذہین تھا۔ مجھے خوشی ہے کہ وہ نوکر ہو گیا"۔ اس کے متعلق انھوں نے ایک لفظ نہ کہا کہ انھوں نے اس کی کبھی کوئی مالی امداد کی تھی۔ یہ شرافت، یہ انکسار،

یہ نیکی اب عنقا ہے۔ ڈاکٹر عبد الحق اس خیال کے ماننے والے تھے کہ سیدھا ہاتھ اگر کسی کو کچھ دے تو الٹے ہاتھ کو خبر نہ ہو۔ یہ سچی انسان دوستی ہے۔ خالی خولی باتوں سے کیا ہوتا ہی۔

مولانا سلیمان ندوی مولانا سلیمان ندوی سے مجھے جامعہ میں نیاز حاصل ہوا تھا۔ پھر حیدر آباد میں کئی مرتبہ ملاقات ہوئی۔ وہ مولوی عبد الباری ندوی کے ساتھ قیام فرماتے تھے۔ جب حیدر آباد تشریف لاتے تو غریب خانے پر ضرور آتے۔ جب تک ان کا قیام رہتا میں برابر ان سے ملنے کے لئے جاتا تھا کہ جتنا استفادہ کر سکتا ہوں کروں، مولانا کا علم و فضل کا معیار بہت اونچا تھا۔ نظر میں گہرائی اور وسعت تھی۔ جدید زمانے کے تقاضوں کو خوب سمجھتے تھے۔ نہایت کم سخن، سنجیدہ اور متین تھے۔ ان کی ہر بات میں وزن تھا۔ میں نے ان سے وعدہ لے لیا تھا کہ جب کبھی حیدر آباد تشریف لائیں تو ایک وقت کھانا غریب خانہ پر تناول فرمائیں۔ کھانے پر میں عثمانیہ یونیورسٹی کے پروفیسروں اور شہر کے بعض معزز حضرات کو بھی مدعو کرتا تھا۔ مولانا کی گفتگو کا موضوع زیادہ تر تاریخ اور ادب ہوتا تھا اور بعد کے زمانے میں مولانا اشرف علی تھانویؒ کے زیر اثر روحانیت اور تصوف کے مسائل پر بھی گفتگو فرماتے تھے۔ وہ اور مولوی عبد الباری ندوی دونوں مولانا تھانویؒ کے خلیفہ ہو گئے تھے۔ مولانا سلیمان ندوی کا علم مستحضر تھا۔ حافظہ نہایت اچھا تھا جو ایک عالم کے لئے بڑی نعمت ہے۔ مولانا سلیمان ندوی نے علم اور ادب دونوں کی خدمت کی۔ ان کا سب سے بڑا کارنامہ "سیرت النبی" ہے انھوں نے خود اس کے ساڑھے تین ہزار صفحے لکھے اور سوائے قرآن اور حدیث کے کسی اور سہارے کو استعمال نہیں کیا۔ اس کے علاوہ "عرب و ہند کے تعلقات" "نقوش سلیمانی" اور "خیام" میں ان کی علمی تحقیقات کا معیار یورپ کے بڑے سے بڑے محقق کے معیار سے کم نہیں۔

ان کے تاریخی مقالات فکر انگیز اور نئی معلومات سے بھرے ہوئے ہیں۔ ان کی ہر تحریر میں اپچ اور اجتہاد نمایاں ہے۔ مولانا نے اپنی تحقیقات سے اردو زبان کے دامن کو مالا مال کیا اور اس کے وزن و وقار میں اضافہ کیا۔ وہ اپنے استاد مولانا شبلی کے سچے جانشین تھے۔

مولانا عبدالماجد دریابادی | مولانا عبدالماجد دریابادی سے جامعہ میں نیاز حاصل ہوا تھا۔ جب میں یورپ میں تھا تو ان سے خط و کتابت بھی رہی۔ حیدرآباد میں ناظر یار جنگ کے مکان پر تفصیلی ملاقات ہوئی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب انھوں نے قرآن کا انگریزی ترجمہ شروع کر دیا تھا۔ زیادہ تر اسی کے متعلق گفتگو فرماتے رہے۔ ان کا انہماک قابلِ رشک تھا۔ اس کے بغیر کوئی شخص دنیا میں کوئی بڑا کام انجام نہیں دے سکتا۔ میں نے مولانا عبدالماجد کی بیشتر اردو تصانیف پڑھی تھیں۔ "صدق" اور "سچ" بھی کبھی کبھی پڑھتا تھا۔ مولانا کی انشا پردازی اور ادبیت ایسی چیز نہیں جس کا کوئی انکار کر سکے۔ ان کا اپنا طرزِ اسلوب ہے جو انھیں کے لئے مخصوص ہے۔ ہر چند میں ان کے اسلوب انشا سے لطف اندوز ہوتا ہوں بایں ہمہ میں اسے علمی مطالب کے لئے موزوں نہیں سمجھتا۔ اس کے لئے سید احمد خاں، مولانا حالی اور مولوی عبدالحق کا اسلوب ہماری زبان کے لئے زیادہ موزوں ہے۔ جس میں تصنع اور تکلف اور خطابت نام کو نہیں، سیدھا، کھرا، قطعی، غیر مبہم، اصل مطلب کی طرف بغیر کسی ایچ پیچ کے رہنمائی کرنے والا۔ مولانا عبدالماجد دریابادی کی تحریر میں ادبی چاشنی ہے لیکن اس کے باوجود میں کسی نوجوان سے کبھی نہیں کہوں گا کہ اس کی تقلید کرو۔ واقعہ یہ ہے کہ کوئی دوسرا اس کی تقلید کر ہی نہیں سکتا۔ وہ مولانا کا طنز اور ان کی شوخی کہاں سے لائے گا۔

خواجہ غلام السیدین | مجھے سیدین صاحب سے دیرینہ نیاز حاصل ہے۔ میرے دکن کے دوران قیام

ہیں وہ متعدد مرتبہ حیدرآباد تشریف لائے۔ دو مرتبہ میرے غریب خانے پر قیام فرمایا جبکہ مجھے انھیں بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ وہ اس پیڑھی کے نہایت ذہین اور طباع لوگوں میں ہیں۔ انکی ہر بات بڑی سلجھی ہوئی ہوتی ہے۔ طبیعت میں جودت اور ذہن رسا پایا ہے۔ بہت جلد معاملے کی تہ کو پہنچ جاتے ہیں۔ انھوں نے اپنی زندگی مسلم یونیورسٹی میں استاد کی حیثیت سے شروع کی۔ پھر نظم ونسق سے وابستہ ہوگئے۔ کشمیر میں محکمۂ تعلیم کے ڈائرکٹر رہے اور بعد میں حکومت ہند کی منسٹری آف ایجوکیشن میں سکریٹری اور مشیر تعلیم کی حیثیت سے عرصے تک کارگذار رہے۔ اگرچہ سیدین صاحب علمی ذوق رکھتے ہیں لیکن انتظامی کاموں میں بھی سرخرو اور کامیاب رہے۔ ان میں اور مجھ میں یہ بات مشترک ہے کہ ہم دونوں اقبال کے شیدائیوں میں ہیں۔ اقبال کے فلسفۂ تعلیم پہ ان کی کتاب مستند مانی جاتی ہے۔

مشیر تعلیم کی حیثیت سے سیدین صاحب چاہتے تھے کہ حیدرآباد کا دفتر دیوانی (حیدرآباد آرکایوز) مرکزی حکومت کے تحت ہو جاتا لیکن سیاسی حالات میں تبدیلی کی وجہ سے ایسا نہ ہو سکا۔ اگر ہو جاتا تو بہت اچھا ہوتا۔ تاریخی دستاویزوں کے تحفظ کا بہتر انتظام ہو جاتا اور ان کی اشاعت کا سلسلہ بھی جاری رہتا۔ میں جب وہاں تھا تو میں نے ان کاغذات کی چھ جلدیں شائع کی تھیں اس کے بعد پھر کسی نے اس جانب توجہ نہیں کی۔

حیدرآباد میں جب سیدین صاحب کا ہمارے ہاں قیام تھا تو ان کی بیگم صاحبہ بھی ان کے ساتھ تشریف لائی تھیں۔ ہم سب لوگ ان کی سادگی اور اخلاق سے متأثر تھے۔ بڑی شریف اور ملنسار بی بی تھیں۔ چند سال ہوئے وہ سیدین صاحب کے ساتھ امریکہ

تشریف لے گئی تھیں، وہیں داعی اجل کو لبیک کہا۔ خدا ان کی مغفرت کرے۔ ان کی نیکی اور سادگی ہمیشہ یاد رہے گی۔ ان کی صاحبزادیوں میں ان کا پرتو نظر آتا ہے۔

حسرت اور جگر | مولانا حسرت موہانی اور جگر مرادآبادی سے میں طالبعلمی کے زمانے سے واقف تھا اور ان دونوں کے کلام کو میں پسند کرتا تھا۔ ان میں سے کسی کے حیدرآباد آنے کی مجھے اطلاع ہوتی تو ان سے جاکر ملتا اور انھیں اپنے یہاں مدعو کرتا۔ جگر کے ساتھ ایک دفعہ فانی اور جوش ملیح آبادی کو بھی دعوت میں بلایا تھا۔ کھانے کے بعد انھوں نے باری باری سے اپنا کلام سنایا۔ جوش کی فقرہ بازی سے دونوں تنگ تھے۔ فانی بیچارے تو صبر کرتے اور چپ رہتے تھے لیکن جگر ترکی بہ ترکی جواب دیتے تھے۔ جوش اور جگر کی نوک جھونک ہمیشہ چلتی رہی۔ بعد میں بھی جب جگر نے شراب پینا ترک کردیا تو جوش نے ان پر یہ بھونڈی اور سوقیانہ پھبتی کہی۔

یاد ہے جب جگر چڑھاتے تھے
کیا الف ہو کے ہن ہناتے تھے

جگر نے اس کا جواب شریفانہ انداز میں دیا اس لئے کہ جوش کی سطح پر وہ کبھی آہی نہیں سکتے تھے۔

تو جہاں پر تھا بہت پہلے وہیں آج بھی ہے
دیکھ رندانِ خوش انفاس کہاں تک پہنچے

ایک دفعہ حسرت اور جگر دونوں میرے یہاں مدعو تھے۔ پہلے جگر نے حسب معمول اپنی غزل ترنم سے پڑھی۔ جب حسرت کا نمبر آیا تو انھوں نے بھی ترنم کی ناکام کوشش کی۔ مجھے ان کی کوشش بڑی معصوم، قابلِ رحم اور رقت انگیز معلوم ہوئی۔ حسرت ہمیشہ

اپنا کلام تحت اللفظ پڑھتے تھے۔ ان کے لئے یہی مناسب تھا اس واسطے کہ ان کی آواز گلو گرفتہ، بیٹھی ہوئی اور چرچری تھی۔ وہ بڑے ہی غیر شاعرانہ انداز میں اپنے اعلیٰ درجے کے شعر پڑھا کرتے تھے۔ ان سے مل کر تعجب ہوتا تھا کہ ان کی باتیں کس قدر سپاٹ اور بے رنگ ہیں۔ ان سے گفتگو کرتے وقت اس کا اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ اس سپاٹ شخصیت میں کتنے رنگ و آہنگ چھپے ہوئے ہیں جن کا اظہار ان کے تغزل میں ہوتا ہے، اور اس بیٹھی ہوئی اور چرچری آواز سے بولنے والے کی روح میں کس قدر موسیقیت کا رس رچا ہوا ہے۔ جگر تو ہمیشہ اپنا کلام ترنم سے پڑھتے تھے۔ بہت سوں نے ان کے لہجے اور پڑھنے کے انداز کی نقل اڑانے کی کوشش کی لیکن اصل اور نقل میں جو فرق ہوتا ہے وہ سننے والوں پر مخفی نہ رہا۔ جگر کا ترنم ان کی اندرونی کیفیت کا عکس تھا۔ بغیر اس کے ان کی ذات کا تصور ہی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ ان کا یہ طرز اور لہجہ رندی اور پارسائی دونوں زمانوں میں قائم رہا۔

ایک دفعہ مسز سروجنی نائیڈو نے مجھے کہلا بھیجا کہ فلاں دن جگر کو میرے یہاں چائے پر مدعو کرلو۔ تب میں نے جگرؔ صاحب کو خود جاکر یہ پیغام پہنچایا۔ کہنے لگے "اچھا آپ کے ساتھ چلوں گا،" چنانچہ میں انھیں لے گیا۔ وہاں چند اور اصحاب موجود تھے جن میں پدمجا نائیڈو، قاضی عبدالغفار اور حسین علی خاں بھی تھے۔ یہ زمانہ وہ تھا جب جگرؔ تائب ہو چکے تھے لیکن ان کا کھویا کھویا انداز اب بھی موجود تھا۔ نہ جاننے والا اب بھی یہی سمجھتا تھا کہ وہ نشے کی حالت میں ہیں۔ لیکن طبیعت میں سکون تھا۔ شیروانی کے بٹن لگے تھے اور گرگابی کے ساتھ موزے بھی پہنے ہوئے تھے۔ حسب معمول پان منھ میں تھا۔ پہلے بھی ایک دفعہ کئی سال قبل وہ مسز سروجنی نائیڈو کے یہاں گئے تھے۔

یہ ان کی رندی کا زمانہ تھا۔ ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے ہی ایک اچٹتا ہوا سلام کیا۔ اچکن، جس کے پہلے سے تمام بٹن کھلے ہوئے تھے، اتار کر بازو والے سوفے پر رکھدی۔ اندر جو قمیص پہنے تھے اس کا گریبان چاک تھا، ایسا کہ سینے کے بال نظر آتے تھے۔ تھوڑی دیر بعد ٹوپی بھی اتار کے اچکن کے اوپر رکھدی۔ پھر اچکن سوفے پر سے اٹھا کر اس کی نیچے کی جیب میں سے پان کی ڈبیہ، بٹوا اور سگریٹ نکالی۔ پان کھا کر سگریٹ پینے لگے۔ جب سگریٹ پی چکے تو مسز سروجنی نائیڈو کی طرف متوجہ ہوئے۔ پھر اپنے خاص انداز میں انھوں نے اپنا کلام سنانا شروع کیا۔

اس دفعہ جب میرے ساتھ مسز سروجنی نائیڈو کے یہاں پہنچے تو نہایت ہی مقطع صورت نظر آرہے تھے۔ مسز سروجنی نائیڈو نے مجھ سے آہستہ سے کہا، "جگر تو بہت بدلے ہوئے نظر آتے ہیں۔ کہیں زندگی کی باقاعدگی ان کی شعریت کو تو نہیں لے ڈوبی" میں نے کہا "تو آپ ان کا کلام سن کر ہی فیصلہ کیجئے گا"۔ جگر صاحب نے جب اپنا کلام سنانا شروع کیا تو بس کیا تھا محفل میں سماں بندھ گیا۔ مسز سروجنی نائیڈو تھیں کہ لوٹ پوٹ ہوئی جا رہی تھیں۔ ہر شعر کو بار بار پڑھواتی تھیں۔ میں ان کے قریب بیٹھا تھا۔ کہتی جاتی تھیں "اس کے دل میں وہی آگ اب بھی ہے جو پہلے تھی"۔ ایک غزل اور سنائی۔ پھر قہوہ پیا۔ دو تین غزلیں سنانے کے بعد میری طرف متوجہ ہو کر کہنے لگے "اب چلیں"۔ میں نے سروجنی نائیڈو سے اجازت لی۔ وہاں سے اٹھ کر کچھ دیر کے لئے فانی کے یہاں ملاپلی گئے۔ پھر میں انھیں ترپ بازار میں اعجاز الدین صدیقی کے یہاں چھوڑ آیا۔ وہ ان کے اس زمانے کے دوست تھے جب جگر عینکوں کا کاروبار کرتے تھے۔ حیدرآباد آتے تھے تو ہمیشہ انھیں کے یہاں ٹھہرتے تھے، یہ وضع داری ان کی آخر تک قائم رہی۔

جگر کی یہ عجیب و غریب خصوصیت تھی کہ انھیں خواص اور عوام دونوں میں مقبولیت حاصل رہی۔ خواص ان کے اعلیٰ تغزل سے حظ اٹھاتے اور عوام اپنی سمجھ کے مطابق ان کے کلام سے لذت اندوز ہوتے تھے۔ جگرؔ فرخ آباد اور مین پوری میں برسوں رہے ۱۹۳۳ء میں جب محمود میاں کی شادی قائم گنج میں ہوئی تو وہ فرخ آباد میں محمود علی خاں (جامعی) کے یہاں مقیم تھے۔ اس سے پہلے مجھ سے ان کی فرخ آباد میں ملاقات ہو چکی تھی۔ میں نے دو صاحبوں کو جو ان کے جاننے والے تھے، انھیں قائم گنج لانے کے لیے متعین کیا۔ ان دو میں ایک حفیظ الرحمٰن مچھلی تھے۔ جگرؔ صاحب کا یہ رندی کا زمانہ تھا۔ نہ کھانے کا ہوش، نہ کپڑوں کا، نہ اس کا ہوش کہ میں کہاں ہوں اور کیوں ہوں۔ لیکن اس بے خودی اور مدہوشی کے عالم میں بھی ذاتی شرافت اور حفظ مراتب کو کبھی ترک نہیں کیا۔ شادی کے بعد محفلِ سخن منعقد ہوئی۔ چند مقامی شاعروں کے علاوہ جگرؔ نے اپنا کلام سنایا۔ قائم گنج کے پٹھان تھے کہ ٹوٹے پڑتے تھے۔ ان کے بیٹھنے کے لیے کئی فرشوں کا انتظام کیا گیا۔ میں نے اس قصباتی محفل میں بھی دیکھا کہ سیدھے سادے پٹھان جن کی تعلیم بس واجبی واجبی تھی، جگرؔ کی غزلوں پر سر دھنتے تھے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ وہ کہاں تک جگرؔ کے کلام کو سمجھ سکتے تھے۔ لیکن اس میں شبہہ نہیں کہ جگرؔ کی شاعرانہ شخصیت اور ان کا لب و لہجہ ان کے ذہن میں ایک اتھاہ کی آواز بازگشت پیدا کرتا ہوگا جس سے وہ مبہم طور پر لطف اندوز ہوتے تھے۔ سوال یہ ہے کہ اور دوسرے غزل گو شاعروں کے کلام نے ان کے تاثرات کو بیدار کیوں نہیں کیا؟ اس کا بہت کچھ انحصار شاعر کی شخصیت پر ہے۔ جگرؔ کی شاعرانہ شخصیت نے قائم گنج کے پٹھانوں کو مسحور کر لیا تھا۔ ان کی بے خودی اور لاابالی پن میں ایک طرح کی معصومیت تھی۔ رندی کے دور میں بھی جس کسی سے بات کرتے بڑے انکسار سے

کرتے تھے جس سے ان کی طبیعت کی خلقی نیکی کا اظہار ہوتا تھا۔ ان کی سادگی بھی جاذبِ قلب ونظر تھی جو ان کی مسکراہٹ میں حل ہو کر ان کی پوری شخصیت پر چھاجاتی تھی۔ آنکھوں کی نیم مدہوشی میں مروت اور محبت کی روشنی کھیلتی رہتی تھی۔ میں نے دیکھا کہ پٹھان بعد میں بھی ان کا بڑی محبت اور عقیدت سے ذکر کرتے تھے جیسے وہ اپنے زمانے کے پہنچے ہوئے ولی اللہ ہوں، ایسا ولی جو ملامتیہ انداز میں بادہ خواری کرتا ہو تاکہ لوگ اسے برا کہیں۔ غالب نے بھی اپنے کو اپنا غیر تصور کر کے جو خود کلامی کی ہے اس میں کہا ہے :۔ ع

"تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا"۔ جگر کی طبیعت کی نیکی نے بالآخر انھیں گناہ کی دلدل سے نکال کر تقویٰ اور پرہیزگاری کی پاک صاف زندگی میں داخل کیا۔ لوگوں کو انکی قوتِ ارادی پر تعجب تھا جب شراب چھوڑی تو ہمیشہ کیلئے چھوڑی۔ کسی پرانی عادت کا چھوڑنا بڑا مشکل ہوتا ہے ع عادت اور وہ بھی عمر بھر کی عادت۔ جگر کی بادہ خواری اور توبہ دونوں کا افسانہ یادگار رہے گا۔ پہلا رندی اور بیخودی کا دور تھا اور دوسرا دینداری اور ہوشمندی کا۔ دونوں میں اپنی اپنی جگہ شاعرانہ حسن اور حکمت ملتی ہے۔

ایک دفعہ بعض اصحاب کے اصرار پر میں جگر صاحب کو عثمانیہ یونیورسٹی کے اسٹاف کلب لے گیا۔ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم اور سید وہاج الدین خاص کر جگر صاحب سے ملنا اور ان کا کلام سننا چاہتے تھے۔ جگر صاحب اس طرح کہیں نہیں جاتے تھے لیکن میرے عرض کرنے پر آمادہ ہو گئے۔ ایک غزل سنائی۔ دوسری سنائی جس میں یہ شعر تھا :۔

کدھر سے برق چمکتی ہے دیکھیں، اے واعظ!

میں اپنا شیشہ اٹھاتا ہوں، تو کتاب اٹھا

یہ شعر پڑھتے جاتے تھے اور پروفیسر صاحبوں کی طرف اشارہ کرتے جاتے تھے۔ پروفیسر صاحبان بہت محظوظ ہوئے۔ لیکن ان میں سے بعض نے آدابِ مجلس کا پورا خیال نہیں رکھا۔

جب جگر اپنی غزل پڑھ رہے تھے تو وہ آہستہ آہستہ آپس میں باتیں کرنے لگے۔ جگر صاحب کو یہ بات ناگوار ہوئی۔ مجھے اشارے سے بلا کر کہا "یہاں کے ارتعاشات ٹھیک نہیں ہیں، اب چلئے۔" سید وہاج الدین نے ہر چند اصرار کیا کہ ایک غزل اور عنایت ہو جائے لیکن پھر وہ نہیں ٹھہرے۔ بائیں ہاتھ کی انگلیوں سے بالوں میں کنگھی کر، ٹوپی پہن اٹھ کھڑے ہوئے۔ میں اپنی موٹر میں انھیں ترپ بازار لے گیا جہاں ایک مجمع ان کے انتظار میں بیٹھا تھا۔

جب جگر صاحب اپنا کلام سناتے تھے تو بعض باتیں میں نے ایسی دیکھیں جن کا ہمیشہ اعادہ ہوتا تھا۔ جب کلام سنانا شروع کرتے تو اپنی بال دار ٹوپی اتار، بائیں ہاتھ کی انگلیوں سے سر کے بڑے بڑے بالوں میں بار بار کنگھی کرتے تھے۔ جب کلام سنانا ختم کرتے تو ٹوپی پہننے سے پہلے پھر اسی کا اعادہ کرتے غزل پڑھنے کے دوران میں جب ایک دم سے سر کو جھٹکا دیتے تو ان کے بال جو بہت باریک تھے پیشانی پر آجاتے اور کبھی ان کی لٹیں آنکھوں پر گر جاتی تھیں۔ ایسی صورت میں وہ بائیں ہاتھ کی انگلیوں سے بار بار کنگھی کرتے اور پھر دونوں ہاتھوں سے بکھرے ہوئے بالوں کو سمیٹنے کا شغل تھوڑی دیر تک جاری رہتا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے انھیں مومن خاں کی طرح اپنے بالوں سے الفت ہے۔ بال بڑے رکھتے تھے جو نہ تو پٹھے تھے اور نہ انگریزی وضع کے، بلکہ دونوں کے میل سے انھوں نے اپنی بالوں کی ایک الگ دھج نکالی تھی۔ جب ٹوپی پہنتے تھے تو کانوں کے اوپر دونوں طرف زلفیں باہر نکلی رہتی تھیں۔ میں نے انکا یہ انداز ہوشمندی کی حالت میں بھی دیکھا اور مدہوشی کے زمانے میں بھی دیکھا۔ اس میں کبھی کوئی تصنع یا اہتمام نہ تھا شروع ہی سے بالوں کا یہ انداز انکے مزاج کی کیفیت سے سازگار ہو گیا تھا۔ جگر صاحب کا ایک اور انداز میں نے یہ دیکھا کہ وہ باتیں کرتے کرتے

ایک دم سے چونک پڑتے تھے جیسے کوئی بھولی ہوئی بات یاد آگئی ہو۔ کبھی شعر پڑھتے وقت بھی ایسا کرتے۔ میں نے ان کے بعض پرانے دوستوں سے پوچھا کہ وہ کیوں ایسا کرتے ہیں تو کوئی تشفی بخش جواب نہ دے سکا۔ میں سمجھتا ہوں کہ ان کے تحت شعور میں ان کا شعری انہماک اس وقت بھی جاری رہتا تھا جب کہ بظاہر وہ دوسروں سے باتیں کرتے تھے، یا رمی کھیلتے تھے یا اپنا کلام سناتے تھے۔ وہ اپنی اندرونی گنگناہٹ پر چونکتے تھے جس کے نغمے ان کے دل کی وادیوں میں وقت بے وقت گونجتے رہتے تھے۔ جگر صاحب کا انہماک بھی ان کی شاعرانہ شخصیت کا جزو تھا۔ میں نے اقبال میں بھی یہ بات محسوس کی تھی۔ جب وہ دوسروں سے باتیں کرتے تو یہ محسوس ہوتا تھا کہ ان کی اندرونی ہم کلامی جاری ہے۔ اس پر خارجی حالات کا کوئی خاص اثر نہیں۔ ان کی اندرونی اور بیرونی دونوں گفتگوئیں بہ یک وقت جاری رہتی تھیں۔ اس سے ان کی انتہائی محویت کا پتہ چلتا تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ جگر صاحب کے چونک پڑنے کی بھی یہی توجیہ کی جاسکتی ہے۔

جگر صاحب کی رندی کے زمانے کا ایک واقعہ مجھے رہ رہ کر یاد آرہا ہے۔ حیدرآباد میں ایک پوئٹری سوسائٹی تھی جس کے جلسے ہر مہینے ہوا کرتے تھے۔ اس میں بلدہ کے امرا، اعلیٰ عہدہ دار، پروفیسر اور دوسرے اہل علم شریک ہوتے تھے۔ امرا اور عہدہ داروں میں سے کوئی نہ کوئی باری باری اپنے مکان پر سوسائٹی کے ارکان کو مدعو کرتا تھا۔ کبھی مضمون پڑھے جاتے تھے لیکن بیشتر سخن سے انگریزی نظمیں سنائی جاتی تھیں۔ انگریز عہدہ داروں کی بیویاں سوسائٹی کو چلانے میں بڑی دلچسپی لیتی تھیں۔ مسز بنی عرصہ تک اس کی سکریٹری رہیں۔ انکا بڑا اچھا ادبی ذوق تھا۔ فرانسیسی زبان بھی خوب بولتی تھیں۔ میں نے بھی اس سوسائٹی میں فرانسیسی شاعری پر ایک مضمون پڑھا تھا۔ ایک دفعہ

سر اکبر حیدری نے سوسائٹی کے ارکان کو اپنے یہاں مدعو کیا۔ یہ بھی طے ہوا کہ اس جلسے میں صرف اردو شاعری موضوع رہے گی۔ مولوی عبدالحق کو انھوں نے جلسے کا پروگرام بنانے کو کہا۔ مولوی صاحب نے اس میں میرا ایک مضمون غالب کی شاعری پر رکھ دیا۔ اس کے علاوہ غالب، مومن، نظیر اکبرآبادی اور حالی کی غزلوں اور نظموں کو پڑھ کر سنانے کے لئے مختلف اصحاب کو منتخب کیا۔ جب میں نے ان سے کہا کہ آج کل جگر صاحب آئے ہوئے ہیں، اگر وہ دو چار غزلیں جلسے میں پڑھ دیں تو کیا کہنا۔ فوراً انھوں نے فرمایا کہ بہت اچھا خیال ہے۔ تم اس کا انتظام کر دو۔

میں دوسرے روز اعجاز الدین صدیقی کے پاس ترپ بازار گیا جن کے یہاں جگر صاحب ٹھہرے ہوئے تھے۔ ان سے جگر صاحب کے متعلق دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ وہ کل ہی دو تین روز کے لئے ورنگل گئے ہیں۔ تین روز بعد میں پھر گیا تو معلوم ہوا کہ وہ ابھی واپس نہیں آئے۔ ایک ہفتہ اسی طرح گذر گیا۔ میں نے مولوی صاحب سے جا کر کہا کہ جگر صاحب بڑے لاابالی آدمی ہیں ان کا ٹھیک نہیں کب واپس آئیں۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ وہ پوئٹری سوسائٹی کے جلسے میں شریک ہوں تو انھیں ورنگل سے بلانے کے لئے کسی کو بھجوا دیجئے۔ انھوں نے فرمایا کہ آدمی کا تم انتظام کر دو آنے جانے کا کرایہ میں دونگا۔ چنانچہ میں نے اعجاز الدین صدیقی کے مشورے سے ان کے ایک دوست کو ورنگل بھجوایا۔ وہ دو تین روز بعد جگر صاحب کو پکڑ لائے۔ نامپلی اسٹیشن سے سیدھے مولوی صاحب کے مکان پہنچے۔ مولوی صاحب جگر کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ اس زمانے میں مولوی صاحب کا قیام خیرت آباد کے ایک بنگلے میں تھا۔ ان کے یہاں رفیق احمد خاں ایک نوجوان رہا کرتے تھے جو انجمن میں کام کرتے تھے۔ مولوی صاحب

نے میرے سامنے انھیں بلا کر کہا کہ اب جگر صاحب کی دیکھ بھال تمھارے ذمے ہے۔ ان کیلئے سکندرآباد سے وھسکی کی ایک بوتل منگا دینا تاکہ اپنا شغل کرتے رہیں۔ اب پوئٹری سوسائٹی کا جلسہ دوسرے دن سہ پہر میں ہونے والا تھا۔

رفیق سیدھے سادے نوجوان تھے۔ انھیں کیا معلوم تھا کہ وھسکی کیا بلا ہوتی ہے۔ انھوں نے وھسکی کی بوتل اور ایک گلاس جگر صاحب کے کمرہ میں لاکر رکھ دیا۔ شام کا وقت تھا۔ جگر صاحب ان کے سامنے ہی بوتل میں سے گلاس بھر کر وھسکی غٹ غٹ پی گئے۔ رفیق کو اب سمجھ لینا چاہیئے تھا کہ ایسے بلانوش کے پاس پوری ایک بوتل چھوڑنے کا نتیجہ اچھا نہیں ہوگا۔ لیکن انھیں اس کا خیال نہ آیا۔ رفیق رات کو اپنے کمرہ میں آکر سو رہے۔ صبح ناشتے کے وقت جگر صاحب کو بلانے گئے تو دیکھا کہ وہ بے خبر پڑے ہیں۔ انھوں نے صبح تک وھسکی کی پوری بوتل ختم کر دی تھی۔ خالص بے میل وھسکی کی ایک بوتل جگر صاحب مدہوش لیٹے تھے۔ نہ انھوں نے ناشتہ کیا اور نہ دوپہر کا کھانا کھایا۔ کوئی ملنے گیا تو اول جلول باتیں کرتے تھے۔ کوئی چار بجے کے قریب میں گیا تو جھٹ پلنگ پر سے اٹھ بیٹھے اور میرے گلے میں بانہیں ڈال کر ظفرؔ کا یہ شعر پڑھنے لگے۔

تھا جلانا ہی اگر دوریٔ ساقی سے مجھے
تو چراغِ درِ میخانہ نہ بنایا ہوتا

دوسرا مصرعہ بار بار دہراتے تھے۔ میں وہیں کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ بھی اپنے پلنگ پر بیٹھ کر بے تکی اور اناپ شناپ باتیں کرنے لگے جن کا نہ سر تھا نہ پیر۔ بیچ بیچ میں چونک اٹھتے اور ظفرؔ کا شعر پڑھنے لگتے اور اس انداز سے مسکراتے جیسے کسی کے سامنے التجا کر رہے ہوں۔ میں نے پوری کیفیت مولوی صاحب کو جا کر بیان کر دی۔ پوئٹری سوسائٹی

کا جلسہ ہوا اور جگر صاحب اس میں شریک نہ ہو سکے۔ دوسرے روز میں نے انھیں

اعجاز الدین صدیقی کے مکان پہنچا دیا۔

مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ میرے علاوہ اور دوسرے لوگ جو جگر صاحب سے اس روز

کی بے خودی اور مدہوشی کی حالت میں ملے۔ ان کے سامنے بھی انھوں نے ظفر کے اسی شعر

کو دہرایا جو میری موجودگی میں پڑھا تھا۔ میں غور کرتا رہا کہ ظفر کا شعر جگر کے دل و دماغ

پر اس قدر کیوں چھایا ہوا تھا۔ اس کی نفسیاتی توجیہ میری سمجھ میں نہیں آئی۔ لیکن اس میں

کلام نہیں کہ شعر بے مثل ہے "چراغِ درِ میخانہ" کا استعارہ اپنے اندر جہانِ معنی پنہاں

رکھتا ہے اور جگر کی رندی کے حسب حال ہے اس میں ساقی سے دوری کے باوجود اسے

تعلق برقرار رکھا ہے۔ میخانے کے دروازے کا چراغ چاہے میخانہ سے باہر ہو لیکن اس سے

ان رندوں کی رہنمائی ہوتی ہے جو درون خانہ آنے کے متمنی ہیں۔ میں سمجھتا ہوں یہ ظفر کا

بہترین شعر ہے۔ ایسا شعر جو بہت سوں کے کلیات پر بھاری ہے۔ یہ ایک شعر ظفر کو

زندہ جاوید بنانے کو کافی ہے۔

یہ واقعہ جگر صاحب کی رندی کے زمانے کا ہے۔ بعد میں ہوشمندی کے زمانے میں

بھی میں نے ان کی زبان سے ظفر کا یہ شعر سنا تھا، گنگناتے ہوئے، مسکراتے ہوئے :-

جیسی اب ہے تری محفل کبھی ایسی تو نہ تھی

بات کرنی مجھے مشکل کبھی ایسی تو نہیں

جگر صاحب دوسرے شاعروں کے شعر بہت کم پڑھتے تھے۔ میں نے ان سے کبھی

کبھی حافظ، غالب، مومن اور اصغر کے شعر بھی سنے۔ وہ جب موج میں ہوتے تھے تو ہمیشہ

آہستہ آہستہ گنگنا کر شعر پڑھا کرتے تھے۔ چونکہ وہ موسیقی کے اصول سے واقف تھے

اس لئے ان کی اسی گنگناہٹ میں بھی لے اور آہنگ محسوس ہوتا تھا۔ بعض دفعہ میں نے دیکھا کہ دوسرے لوگوں سے باتیں کرتے جاتے تھے یا رمی کھیلتے جاتے تھے اور ایک دم سے کوئی شعر گنگنانے لگتے تھے۔ ان کی یہ کیفیت رندی کے زمانے میں بھی تھی اور بعد میں ہوشمندی کے زمانے میں بھی۔

فانی بدایونی | غیر حیدرآبادی اصحاب میں مجھے فانی بدایونی سے نیازحاصل تھا۔ ان کی شاعری ان کی دردناک زندگی کی چلتی پھرتی تصویر تھی۔ حیدرآباد میں شہزادہ معظم جاہ اور مہاراجا سرکشن پرشاد ان کے قدردان اور سرپرست تھے پہلے حیدرآباد میں ایک اسکول کے ہڈ ماسٹر رہے۔ پھر ان کا تبادلہ ناندیڑ ہوگیا۔ وہ ملاپلی میں ایک چھوٹے سے مکان میں رہتے تھے لیکن چونکہ بڑے لوگوں کے یہاں جانا رہتا تھا اسلئے انھوں نے ایک سکنڈ ہینڈ موٹر خریدلی تھی جو پٹرول بہت کھاتی تھی۔ چونکہ خود موٹر چلانا نہیں جانتے تھے اس لئے ایک ڈرائیور بھی رکھنا پڑا۔ انھوں نے یہ فقرہ کئی مرتبہ میرے سامنے دہرایا کہ "دوسرے تو موٹر پر سواری کرتے ہیں لیکن موٹر مجھ پر سوار رہتی ہے" موٹر کے خرچ کی وجہ سے انھیں اکثر مقروض رہنا پڑتا تھا۔ معظم جاہ کے یہاں رات کو دو دو بجے تک محفل شعروسخن میں شرکت کے باعث ان کی صحت کچھ دنوں بعد جواب دے گئی۔ خانگی پریشانیاں اس پر مستزاد۔ میں نے کوشش کی تھی کہ مولوی عبدالحق کے سبکدوش ہونے کے بعد جو انتظام ہوا سکے سلسلہ میں فانی شعبۂ اردو میں ریڈر ہو جائیں تو اس طرح یونیورسٹی کو ایک اعلیٰ پائے کا شعرفہم مل جائے گا جو اونچی جماعتوں کو غالب اور میر وغیرہ پڑھا سکے گا۔ اس زمانے میں عثمانیہ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں جو اساتذہ تھے وہ شعرفہمی کے معاملے میں بالکل کورے تھے۔ لیکن میری کوشش کامیاب نہ ہوئی۔ سید وہاج الدین اس وقت قاضی

محمد حسین وائس چانسلر کے سکریٹری تھے۔ ان سے کہہ کر میں نے وائس چانسلر سے فانی کی ملاقات کا وقت مقرر کرا دیا۔ فانی سیدھے میرے پاس آئے۔ میں انھیں سید وہاج الدین کے کمرے میں لے گیا۔ جب ملاقات کا وقت آیا تو وہ قاضی محمد حسین سے ملنے کے لئے ان کے کمرے میں داخل ہوئے، کچھ گھبرائے ہوئے سے۔ سید وہاج الدین کو شعر و شاعری سے لگاؤ تھا اور وہ بھی فانی کے ہمدردوں میں تھے۔ جب وہ جا رہے تھے تو سید وہاج الدین نے کہا کہ "وائس چانسلر ذرا اونچا سنتے ہیں ان کے سوالوں کا جواب پاٹ دار آواز میں دیجئے گا۔" میں بیٹھا انتظار کرتا رہا اور سوچتا رہا کہ نہ معلوم بیچارے فانی پر کیا گذر رہی ہوگی۔ قاضی محمد حسین ریاضی کے عالم تھے لیکن ان میں تخیل اور فہم عامہ کی بڑی کمی تھی۔ دس بارہ منٹ بعد فانی واپس آئے۔ میں نے پوچھا کہئے فانی صاحب کیسی گذری؟" مسکرا کر کہنے لگے "میں جتنی دیر وہاں رہا میں نے محسوس کیا کہ ہر لمحہ میری عقل زائل ہو رہی ہے۔ مجھ سے پوچھتے تھے کہ تم نے کیا ریسرچ کی ہے۔ میں نے بتایا کہ میں شاعر ہوں، غزلیں لکھتا ہوں، ریسرچ تو کوئی نہیں کی۔ اس پر قاضی محمد حسین نے مجھ سے دریافت کیا "آپ نے فانی تخلص کیوں رکھا" میں اس کا جواب کیا دیتا۔ خاموش ہو رہا۔ غرضکہ یہ ملاقات بے نتیجہ رہی۔ آیندہ سلیکشن کمیٹی میں فانی کو اس لئے نہیں بلایا گیا کہ ان کے پاس اردو زبان و ادب کی کوئی ڈگری نہیں تھی۔ میرا خیال تھا کہ فانی اگر عثمانیہ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں آجاتے تو وہاں کی بڑی کمی پوری ہو جاتی اور انھیں بھی علمی فضا میں اطمینان حاصل ہوتا۔

فانی اپنی ذات سے بڑے شریف انسان تھے، با مروت، با اخلاق، دوست دار۔ جوش انھیں حسب عادت اکثر چھیڑتے تھے۔ ایک دفعہ اپنے مزاحیہ شعر میں ان پر تشاعر

کی بیوہ" ہونے کا فقرہ چست کیا تھا۔ فانی بیچارے سب کچھ سنتے اور خاموش ہو جاتے۔ کبھی کبھی مجھ سے دبی زبان میں شکایت کرتے تھے۔ لیکن وہ بھی اس انداز میں کہ شکایت نہ معلوم ہو۔ ان کی طبیعت میں صبر اور تحمل کا مادہ بدرجۂ اتم موجود تھا۔ ان کی شاعری کا سارا نظام تصورات غم کے محور پر قائم ہے۔ یہ ایک کسوٹی تھی جس پر وہ کھرے کھوٹے کو پرکھتے تھے۔ فانی نے غم کے تصور کو فلسفیانہ رنگ میں پیش کیا۔ وہ ہمیشہ لذتِ غم کے جویا رہے۔ انھیں ہر تبسم پردہ دارِ غم نظر آتا تھا۔

ہر تبسم پردہ دارِ غم نظر آیا مجھے　　　گل خزاں کے راز کا محرم نظر آیا مجھے

فانی اپنے فن میں باکمال تھے۔ افسوس ہے کہ ان کی جتنی قدر ہونی چاہیے تھی اتنی نہ ہوئی۔ ان کی زندگی ان کے کلام کی تفسیر اور ان کا کلام ان کی زندگی کا عکس تھا۔ اس وقت جب کہ میں ان کا خیال کر رہا ہوں تو مجھے ان کی غم آگیں مسکراہٹ یاد آرہی ہے، جس میں ان کی پوری شخصیت سمٹ آتی تھی۔ بڑے باوضع انسان تھے۔ مجھ پر بڑی شفقت فرماتے تھے۔ انھیں کے یہاں ایک دفعہ مرزا یگانہ سے بھی ملاقات ہوئی تھی۔ فانی، یگانہ کے تغزل کے مداح تھے اور ان کی اصول فن سے واقفیت کو سراہتے تھے۔ یگانہ کی غالب شکنی کو ان کی ذہنی بے توازنی پر محمول کرتے تھے۔ خود وہ میر اور غالب دونوں کی عظمت کے قائل تھے۔ ان کے کلام میں ان دونوں استادوں کے رنگ کی آمیزش ملتی ہے جس میں انھوں نے اپنے غم کے فلسفے کو سمویا ہے۔ ان کے ہاں غم جمالیاتی قدر ہے جس کی کسوٹی پر وہ زندگی کے حقائق کو پرکھتے ہیں۔ ان کی یاس غیر مخلوط یاس ہے جس میں کسی قسم کی امید اور دنیوی کامیابی کی آمیزش نہیں۔ اسکے باوجود انھوں نے تمدنی زندگی کے لوازم کو کبھی پس پشت نہیں ڈالا۔ اور نہ رندی اور لاابالی پن کو اپنی شاعری

سکے لئے ناگزیر خیال کیا۔ انھوں نے اپنا مسلک اس شعر میں بڑی خوبی سے بیان کیا ہے۔

وحشت بقیدِ چاکِ گریباں روا نہیں

دیوانہ تھا جو معتقدِ اہلِ ہوش تھا

اصغر گونڈوی | مجھے اصغر گونڈوی سے ۱۹۳۱ء میں حیدر آباد میں ملنے کا اتفاق ہوا جب وہ نستعلیق ٹائپ کی کمیٹی میں شرکت کے لئے آئے ہوئے تھے جسے حیدر آباد کی حکومت نے منعقد کیا تھا۔ عبدالرحمٰن صدیقی اور پنڈت برج موہن دتاتریا کیفی بھی اس میں شریک ہوئے تھے۔ اصغر گونڈوی مولوی عبدالحق کے ساتھ ٹھہرے تھے۔ کم و بیش ہر روز شام میں ان سے ملاقات رہتی تھی۔ میں نے ان کی شخصیت میں خاص کشش محسوس کی۔ وہ نہایت شریف، کم سخن اور منکسر مزاج آدمی تھے۔ ان کی شاعری میں بھی کسی قسم کی ادعا پسندی نہ تھی جیسے کہ عام طور پر شاعروں میں ہوتی ہے۔ بڑی میٹھی زبان تھی۔ سوائے اچھائی کے میں نے ان کی زبان سے کسی کی برائی نہیں سنی، ان کے متعلق بھی نہیں جو ان پر کھلم کھلا چوٹیں کرتے تھے۔ ایک تو ان کی فطری کشش کے باعث دوسرے اس وجہ سے کہ جگر انھیں اپنا مرشد کہتے تھے، میرے دل میں ان کی عزت پیدا ہو گئی۔ وہ جس طرح بات کرتے تھے، اسی طرح اپنے شعر بھی بڑے انکسار سے پڑھتے تھے۔ انھوں نے جو کلام سنایا اس سے میں ان کی شاعرانہ عظمت کا قائل ہو گیا۔ میں نے دل میں کہا کہ جگر ان کی تعریف بے وجہ نہیں کرتے تھے۔

قاضی عبدالغفار | قاضی عبدالغفار اردو کے پرانے صحافی تھے۔ ان کی تحریر بڑی جاندار ہوتی تھی۔ شروع میں مولانا محمد علی کے ساتھ "ہمدرد" میں کام کرتے رہے۔ "ہمدرد" کے بند ہونے پر "جمہور" کے نام سے اپنا اخبار کلکتہ سے نکالا جو کئی سال تک نکلتا رہا۔ جب گورنمنٹ

نے اسے بند کرا دیا تو وہ اپنے وطن مراد آباد چلے آئے۔ وہاں کی میونسپلٹی کے چیرمین منتخب ہوئے۔ ترک موالات کی تحریک میں بھی حصہ لیا۔ پھر دل میں ایک دم سے کیا سمائی کہ سیاست چھوڑ، تجارت کی طرف رجوع ہوئے۔ پیرس جاکر مرادآبادی برتنوں کا کاروبار شروع کیا جس میں کامیابی نہیں ہوئی۔ اس میں جو روپیہ لگایا تھا، وہ بھی ڈوب گیا۔ پیرس سے ہندوستان واپس آئے اور حکیم اجمل خاں کے سکریٹری ہو گئے۔ کئی سال اسی طرح گذارے پھر ۱۹۳۰ء میں حیدرآباد کا رخ کیا۔ یہاں اخبار "پیام" نکالا جس کے نکالنے میں مولوی عبدالحق نے بڑی مدد کی۔ اس اخبار کی پالیسی نیشنلسٹ اصولوں پر مبنی تھی اس لئے اتحاد مسلمین کی سیاست سے اس کی ٹکر ہونے لگی۔ سر مرزا اسمٰعیل کی وزارت کے زمانے میں قاضی صاحب پبلسٹی کے ڈائرکٹر مقرر ہو گئے۔ سر مرزا کے حیدرآباد سے جانے پر وہ اپنی خدمت سے سبکدوش ہو کر شمالی ہند چلے آئے۔

قاضی صاحب صحافی ہونے کے علاوہ اعلیٰ درجے کے ادیب اور انشا پرداز تھے۔ ان کی تصانیف "لیلیٰ کے خطوط"، "مجنوں کی ڈائری"، "آثار جمال الدین افغانی"، اور "حیات اجمل" قدر کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہیں۔ "لیلیٰ کے خطوط" کو غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی۔ اس کتاب میں قاضی صاحب نے زہد و اخلاق کے سوداگروں کو اپنے طنز کا نشانہ بنایا ہے۔

قاضی صاحب کے فانی بدایونی سے گہرے تعلقات تھے۔ میرے اور ان کے درمیان فانی کی دوستی قدر مشترک تھی۔ حیدرآباد میں پندرہ سولہ سال ان سے ملاقات رہی۔ آخر میں وہ انجمن ترقی اردو (ہند) کے سکریٹری ہو گئے تھے۔ علی گڈھ کی مٹی انھیں وہاں کھینچ کر لے گئی۔ مسلم یونیورسٹی کے قبرستان میں ان کی آخری آرام گاہ ہے۔

آسٹریلیا کا سفر | ۱۹۵۶ء میں حکومت ہند نے مجھے ایک ماہ کیلئے آسٹریلیا کی یونیورسٹیوں

میں "ہندوستانی تہذیب" پر لکچر دینے کے لئے بھیجا تھا، میں نے سڈنی، ملبورن، کن بکرا، اڈیلیڈ اور برسبین کی یونیورسٹیوں میں لکچر دیئے لکچروں کے بعد طالب علموں کے سوالات سے پتہ چلتا تھا کہ وہ ہندوستان کی تاریخ سے واقف ہیں اور انھیں اس سے دلچسپی ہے۔ ان مباحثوں میں یونیورسٹی کے اساتذہ نے بھی حصہ لیا۔ یونیورسٹیوں کے علاوہ بعض کلبوں اور خواتین کی انجمنوں میں بھی میں نے تقریریں کیں آن میں آسٹریلیا کے لوگوں نے ہندوستان کی موجودہ خارجی پالیسی کے متعلق زیادہ دلچسپی کا اظہار کیا۔ ان میں سے اکثر کے سوالوں سے یہ پتہ چلتا تھا کہ وہ ناوابستگی کی پالیسی کو صحیح نہیں سمجھتے۔ لیکن میں نے انھیں بتایا کہ ایسے ملک کے لئے جو اپنی معیشت کی نئی تعمیر میں مصروف ہے سوائے اس پالیسی کے کوئی دوسری پالیسی قرینِ مصلحت نہیں ہوگی۔ آسٹریلیا کے بعد میں تسمانیا گیا۔ یہ جزیرہ براعظم کے جنوب میں واقع ہے۔ اس کا صدر مقام ہوبرٹ ہے جہاں بڑی خوبصورت چھوٹی سی یونیورسٹی ہے۔ یہاں میں دو تین روز ٹھہرا۔ آسٹریلیا کے مقابلے میں میرا دل یہاں زیادہ لگا۔ تسمانیا کی آب وہوا اور یہاں کے قدرتی مناظر میں انگلستان کی جھلک نظر آتی ہے۔ یہاں کے سیب نہایت خوش ذائقہ ہوتے ہیں۔ مجھے یہ دیکھ کر بڑا تعجب ہوا کہ سیب کے باغوں میں ہر درخت کے نیچے سیکڑوں سیب پڑے سڑ رہے ہیں۔ میرے دریافت کرنے پر بتایا گیا کہ چونکہ جہاز کی گودی پر مزدوروں نے ہڑتال کر دی ہے اس لئے چند روز سے سیب باہر نہیں بھیجے جا سکے۔ جب یہ سڑ جائیں گے تو کھاد کے کام آئیں گے۔ ان کی کھاد بہت اچھی ہوتی ہے۔ اس سے درخت خوب پھل دیتے ہیں۔

آسٹریلیا کے پڑھے لکھے لوگوں کو میں نے دیکھا کہ وہ چین اور جنوب مشرقی ایشیا کی طرف سے خائف ہیں کہ کہیں ان کے ملک کے وسیع علاقوں کو غیر آباد دیکھ کر

ان کی طرف للچائی ہوئی نظریں نہ ڈالنے لگیں۔ انیسویں صدی کے وسط میں مغربی آسٹریلیا میں کچھ چینی مزدور آ گئے تھے۔ کچھ دنوں میں ان کی نسل اس تیزی سے بڑھی کہ آسٹریلیا کے لوگوں پر یہ خوف طاری ہو گیا کہ اگر ان مزدوروں کی زیادہ تعداد نقل وطن کر کے آسٹریلیا میں آ بسی تو ملک میں ایک صدی کے اندر ان کی اکثریت ہو جائے گی۔ چنانچہ اس کے بعد توطن پذیری کے سخت قوانین لاگو کر دیئے گئے تاکہ سوائے سفید فام اقوام کے ایشیائی لوگ آسٹریلیا میں آباد نہ ہو سکیں۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد آبادی کی کمی کو بڑی شدت سے محسوس کیا گیا۔ چنانچہ حکومت کی طرف سے انگلستان کے علاوہ یورپ کے دوسرے ملکوں میں ایسی ایجنسیاں قائم کی گئیں جن کا مقصد یہ تھا کہ نوجوان یورپینوں کو آسٹریلیا میں سکونت اختیار کرنے کی ترغیب دیں۔ انھیں سفر کی سہولتیں بہم پہنچائی جاتی تھیں اور آسٹریلیا پہنچنے پر مختلف اسٹیٹس کے محکمہ ہائے تعلیم یہ انتظام کرتے تھے کہ تارکین وطن کو جلد سے جلد اتنی انگریزی سکھا دی جائے کہ وہ بازار اور کارخانے میں کام کر سکیں۔ یہ انتظام خاص کر ان لوگوں کے لئے تھا جو پولینڈ، مغربی جرمنی اور اٹلی سے آسٹریلیا آتے تھے۔ آسٹریلیا کے پڑھے لکھے لوگوں کی یہ بھی خواہش ہے کہ وہ ایشیا کی مختلف اقوام سے اچھے تعلقات قائم کریں لیکن وہ یہ نہیں چاہتے کہ یہ لوگ ان کے ملک میں آ کر مستقل طور پر آباد ہوں، اس لئے کہ انھیں خوف ہے کہ اگر اس کی عام اجازت دی گئی تو کچھ عرصے بعد سیاہ فام اور زرد فام اقوام ان کے ملک پر قابض ہو جائیں گی۔

آسٹریلیا کے لوگوں کا معیار زندگی کافی اونچا ہے۔ ان کے ملک سے اون، مکھن اور پنیر ساری دنیا کو برآمد ہوتا ہے، خاص کر انگلستان کو۔ ان کی آبادی محدود اور

دولت وافر ہے۔ لیکن میں نے یہ محسوس کیا کہ علم اور فنونِ لطیفہ کے تخلیقی اظہار میں وہ ایشیا کے لوگوں سے بہت پیچھے ہیں۔

اڈی لیڈ کی مسجد میں میں جمعہ کی نماز پڑھنے گیا۔ انیسویں صدی کے آخر میں آسٹریلیا کی حکومت نے اڈی لیڈ میں سرحدی افغانوں کو لاکر آباد کیا تھا۔ یہ لوگ وسطی ریگستان میں اونٹوں پر چمڑے کی مشکوں میں پانی بھر کر ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانے پر مامور تھے۔ انھوں نے یہ مسجد بنوائی تھی جو اچھی حالت میں ہے، اعلیٰ درجے کے جھاڑ فانوس اور فرش فروش سے آراستہ۔ یہاں ایک بوڑھے افغان سے ملاقات ہوئی جو کچھ کچھ اردو بولتا تھا۔ اس نے کہا کہ میں نے آسٹریلیا کو اپنا وطن بنا لیا ہے اور یہیں شادی کر لی ہے۔ اس کی انگریزی بھی آسٹریلین انگلش تھی۔ میں نے پوچھا کہ پشتو بھولے تو نہیں۔ اس نے فوراً پشتو کی ایک غزل سنائی جس میں محبوب کی جدائی کا ذکر تھا۔ وہ آسٹریلیا ہی میں پیدا ہوا تھا لیکن کچھ کچھ وقفے سے اپنے وطن جاتا رہتا تھا۔ پختونوں کا ذکر بڑے فخر کے ساتھ کرتا تھا۔ جب میں نے کہا کہ ہمارے اجداد بھی پختون تھے تو اس نے مجھے گلے لگا لیا۔ بڑی خاطر مدارات کی۔ دوسرے روز مجھے دوپہر کے کھانے پر مدعو کیا اور کچھ لوگوں سے ملایا جن میں چند افغان نسل کے تھے اور دوسرے آسٹریلین تھے، انگریزی نسل کے۔ افغانی نسل کے لوگ کئی مرتبہ مجھ سے ملنے کے لئے میری رہائش گاہ پر آئے۔

آسٹریلیا میں میں نے رنگ برنگ کی چڑیاں دیکھیں جو کہیں اور نہیں پائی جاتیں۔ ان کے رنگ بڑے شوخ اور دمیں لمبی ہوتی ہیں۔ کنگرو تو وہاں کا خاص جانور ہے۔ یہ دودھ پلانے والا تھیلی دار جانور ہے۔ اپنے بچوں کو تھیلی میں ڈال کر خوب لمبی لمبی چھلانگیں بھرتا ہے۔ یہ آسٹریلیا کا قومی جانور ہے۔

واپسی پر میں چار روز کے لئے جکارتا میں ٹھہرا۔ وہاں مجھ سے کئی لوگوں نے شفیق صاحب کا ذکر کیا۔ بازار میں ہندوستانی تاجروں کی دکانیں نظر آئیں۔ شہر کے بیچوں بیچ گندہ نالہ بہتا ہے جس کا پانی دور سے گاڑھا اور بدرنگ نظر آتا ہے۔ اس میں میں نے عورتوں کو اپنے کپڑے دھوتے ہوئے دیکھا۔ اپنے چار روز کے قیام میں میں نے جکارتا یونیورسٹی کے پروفیسروں کے علاوہ عام لوگوں سے زیادہ سے زیادہ ملنے کی کوشش کی۔ زبان کی بڑی دشواری تھی۔ وہاں انگریزی جاننے والے بہت کم لوگ ہیں۔ سب پڑھے لکھے لوگ ڈچ بولتے ہیں۔ انڈونیشیا کے نوجوانوں کے متعلق میرا یہ اندازہ ہے کہ وہ بیحد جذباتی ہیں۔ انھوں نے آزادی تو حاصل کرلی اور ڈچ سامراج کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا لیکن وہ اپنی آزادی کو مستحکم بنیادوں پر قائم و استوار نہیں کر سکے۔ جکارتا کی آب وہوا مجھے اچھی نہیں لگی، ہوا میں اس قدر رطوبت تھی کہ ہر وقت جسم میں پسینے کا چپچپاپن محسوس ہوتا تھا جو شمالی ہند کی سخت گرمی میں بھی نہیں محسوس ہوتا۔ لوگ عام طور پر کاہل ہیں۔ ان کا تعلق جنوبی منگولی نسل سے ہے۔ آبادی بیشتر مسلمانوں پر مشتمل ہے جو شافعی مسلک کے ہیں۔ سوکارنو کی قیادت میں انڈونیشیا ۱۹۴۹ء میں آزاد ہوا۔ میں جب جکارتا میں تھا تو ملک میں معاشی حالت قابلِ اطمینان نہیں تھی۔ انڈونیشیا کے روپیے کی قیمت بہت گر گئی تھی۔ چینی آہستہ آہستہ سارے ملک کی تجارت پر حاوی ہو رہے تھے۔

میں دو روز سنگاپور میں بھی ٹھہرا۔ یہ انگریزوں کا مشرق میں سب سے بڑا بحری مرکز ہے۔ یہاں سڑکیں کشادہ ہیں۔ آبادی میں چینی بہت نظر آئے۔ مالے لوگوں کے علاوہ ہندوستانی بھی کافی تعداد میں یہاں توطن اختیار کر چکے ہیں۔ ان میں بیشتر جنوبی ہند کے تامل نسل کے لوگ ہیں جو کئی کئی پشتوں سے وہاں آباد ہیں اور اپنا کاروبار کرتے ہیں۔ یہاں فاحشہ

عورتوں کی بہت کثرت ہے جو راہ چلتے لوگوں کو اشارے کرتی اور کبھی انھیں ٹوکتی ہیں۔ میں نے مشرقی ملکوں میں ایسی بیحیائی کہیں نہیں دیکھی۔ میں نے یہاں کی یونیورسٹی اور بناتاتی باغ (بوٹینکل گارڈن) کی بھی سیر کی۔ بازاروں میں چینی ہر طرف دکھائی دیتے تھے۔ ایسا محسوس ہوا جیسے میں کسی چینی شہر میں ہوں۔ بازار میں بڑی دکانوں میں سب لوگ انگریزی سمجھتے ہیں۔

علمی کام | عثمانیہ یونیورسٹی کی پرسکون فضا میں مجھے تھوڑا بہت علمی کام کرنے کا موقع ملا جس کے لئے میں سب سے زیادہ خود عثمانیہ یونیورسٹی کا شکرگذار ہوں جس کی بدولت مجھے یہ مواقع فراہم ہوئے۔ دارالترجمہ کے لئے میں نے دو کتابیں تالیف کیں اور ایک کا فرانسیسی سے اردو میں ترجمہ کیا۔

(۱) تاریخ ہند (عہد حالیہ) (۲) تاریخ دکن (عہد حالیہ) (۳) مبادی عمرانیات اپنے ورم۔ ان کے علاوہ میں نے اپنے ذاتی شوق سے پانچ کتابیں لکھیں۔

(۱) نظام الملک آصفجاہ اول (بزبان انگریزی) اس کتاب میں نظام الملک کے حالات کے علاوہ مغلوں کے آخری زمانے کی سیاست پر بحث کی ہے جو محمد شاہ کے زمانے تک آتی ہے۔ ایشیا پبلشنگ ہاؤس بمبئی نے "دی فرسٹ نظام" کے نام سے گذشتہ سال اسکا دوسرا اڈیشن شائع کیا ہے۔

(۲) روح اقبال۔ اس کا پہلا اڈیشن ۱۹۴۵ء میں حیدرآباد میں چھپا تھا۔ ابتک اس کے چھ اڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ سوائے شروع کی دو اشاعتوں کے مکتبۂ جامعۂ ملیہ دہلی نے اسکے باقی چار اڈیشن شائع کئے۔

(۳) اردو غزل اس کا پہلا اڈیشن حیدرآباد میں چھپا تھا۔ دوسرا مکتبۂ جامعہ نے شائع کیا اور تیسرا انجمن ترقی اردو علی گڑھ نے۔

(۴) حسرت کی شاعری۔ اس کے دونوں اڈیشن مکتبۂ جامعہ نے شائع کئے۔

(۵) فرانسیسی ادب۔ اس کا پہلا اڈیشن انجمن ترقی اردو علی گڑھ نے

شائع کیا۔

مجھے تقریباً سات سال تک حیدرآباد آرکائیوز میں پہلے کیوریٹر اور پھر ایڈوائزر (مشیر) کی حیثیت سے کام کرنے کا موقع ملا۔ میں نے اس دوران میں تاریخی ریسرچ کے شعبے کی تنظیم کی اور چھ جلدیں تیار کیں جنھیں ریکارڈ آفس نے شائع کیا۔ ان میں اصل فارسی دستاویزوں کے متن کے ساتھ انگریزی خلاصہ اور تفصیلی حواشی دیئے ہیں تاکہ ان تاریخی ماخذوں کو دوسروں کے لئے قابل فہم بنایا جاسکے۔ ان کی فہرست یہ ہے:۔

(۱) سیلیکٹیڈ ڈاکومنٹس آف شاہجہانز ریِن۔ (۲) سیلیکٹیڈ ڈاکومنٹس آف اورنگ زیبز رین (۳) سیلیکٹیڈ وقائع آف دی ڈکن۔ (۱۶۶۰ تا ۱۶۷۱) (۴) فرمانس آف دی ڈکن سلطانز۔ (۵) نیوز لیٹرز (۱۷۶۷ تا ۱۷۹۹) (۶) ڈپلومیٹک کراسپانڈنس بٹوین میرنظام علی خاں اینڈ دی ایسٹ انڈیا کمپنی۔

مغلوں کا دفتر عرصے تک اورنگ آباد کے ایک مکان میں بند پڑا رہا۔ پھر جب اسے دفتر دیوانی و مالی و ملکی میں شامل کیا گیا تو کاغذات کی تہذیب و ترتیب ہوئی۔ میں نے شاہجہاں اور اورنگزیب کے عہد کے کاغذات ترتیب دیئے اور انھیں شائع کیا۔ ان کی بڑی تاریخی اہمیت ہے۔ خاص طور پر نظم و نسق اور ملک کے معاشی حالات کے متعلق ان سے بہت کچھ معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ پچھلے دنوں عہد مغلیہ پر جو تصانیف شائع ہوئی ہیں، ان میں ان جلدوں سے استفادہ کیا گیا ہے، یہ تاریخ کا خام مواد ہے جسے مورخ اپنے مخصوص مقاصد کے لئے استعمال کرسکتے ہیں۔

میں نے "فرامین و اسناد سلاطین دکن"، کی جو جلد شائع کی ہے اس میں بہمنی عادل شاہی، قطب شاہی اور بریدشاہی سلاطین کے فرامین اور اسناد شامل ہیں۔



فیروز بہمنی کا فرمان
(ہندستان میں فارسی کی قدیم ترین تحریر)

پشت کے فرمان کی نقل

الله اعلیٰ حمده اولی

(طغرا) الواثق بتائید الرحمن

ابوالمظفر فیروزشاه السلطان

مهر . . .

مهر . . .

این فرمان کامگاری محلی به طغراء جهاں داری نفاذ یافت (به عنایت)
پادشاهانه و فرط عاطفت خسروانه . . . نصبه هاے کلیان آباد
(مهر شنجرفی) بحکم فرمان اعلیٰ از ابتداے خمس وثلاثین وثمان مائة مقرر و مستقیم نمایند . . . .
. . . قاضی محمد . . . استقبال شهور سنه سبع وثمان مائة در وجه انعام مسلم باسم مولانا محمد قاضی و بعد
مقرر شد . . . خمس و او باولاد و احفاد معین گردانیده و فرموده آمد تا کارکنان حال و استقبال معامله
ثلاثین ثمان مائة مذکوره را من تائید هم زمین مذکور جنیح ذکر رفت به مولانا محمد قاضی مذکور و بعد او باولاد
احفاد محدود کنند بدهند والحال تصرفات ایشان وکسان ایشان بازگزارند
نسخ فی دیوان الوزاره بجحت مجدد و مثال موکد نه نموده بر حکم فرمان اعلیٰ روند ناپسندیده افتد۔
بمشیت الله تعالیٰ وعونه بالامر اعلاءً الله و نفذه شرقاً وغرباً مجلس عالی الحق
. . . ثبت شد والدین، لسان الملوک والسلاطین، معین المملکة بمبین (السلطنة) . . . . .
الله المنان الغ اعظم خاں خانان قتلغ معظم باربک دام عالیا و (مفخر الامراء)
. . . ثبت شد . . . مجمع العلم والآداب، افتخار الدولة والدین، مختار الملوک والسلاطین،
قتلغ نائب خاص حاجب مکنه الله تعالیٰ
الخامس عشرین ذی القعده سنه ثمان وثمان مائة ثبت شد

بہمنی اور بریدشاہی حکمرانوں کے فرامین نایاب ہیں۔ ان کاغذات میں ایک فرمان فیروز شاہ بہمنی کے عہد کا ہے جس پر ۲۵ ذی قعدہ ۸۰۰ ہجری (مطابق ۱۴۰۶ء) کی تاریخ درج ہے۔ یہ قصبہ کلیان کے مولانا محمد قاضی کے نام انعام وعطا کا فرمان ہے۔ اس پر شاہی مہریں ثبت ہیں۔ فیروز شاہ بہمنی کے علاوہ ایک مہر احمد شاہ بہمنی کی بھی ہے جو بعد میں تصدیق کی غرض سے ثبت کی گئی ہے۔

میرا خیال ہے کہ ہندوستان میں اس سے زیادہ قدیم کوئی دوسری فارسی زبان کی تحریر موجود نہیں۔ اس سے قبل گئے ایک فرمان کے متعلق ڈاکٹر مہدی حسن نے اپنی تصنیف "تغلق خاندان" (تغلق ڈائی نسٹی) میں نشاندہی کی ہے جس پر ۷۲۵ ہجری (مطابق ۱۳۲۵ء) درج ہے۔ اسی سال محمد بن تغلق کی تخت نشینی ہوئی تھی۔ حکومت ہند کے ماہرین کی کمیٹی نے اس فرمان کو مشتبہ قرار دیا اور انھوں نے اسے خریدنے سے انکار کردیا۔ حسب ذیل وجوہ کی بنا پر اسے جعلی قرار دیا گیا۔

(۱) اس کے طغریٰ میں محمد تغلق کے لئے ابو المجاہد کی کینت لکھی ہے۔ حالانکہ اسی سال کا سکہ موجود ہے جس میں اس کے لئے المجاہد فی سبیل اللہ لکھا ہے۔ چاہے دستاویز جھوٹ بول جائے لیکن سکہ جھوٹ نہیں بولتا۔

(۲) اس فرمان پر کوئی مہر موجود نہیں حالانکہ محمد تغلق کے زمانے میں سرکاری کاغذات پر مہریں ثبت کی جاتی تھیں جس کی نسبت ابن بطوطہ نے اپنے سفرنامہ میں ذکر کیا ہے اس نے لکھا ہے کہ اس کام کیلئے مہردار کا باقاعدہ عہدہ تھا پھر کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی کہ اس فرمان پر مہر کیوں نہیں لگائی گئی۔

(۳) اس میں بعض جگہ ش پر اوپر نقطے ہیں اور بعض جگہ بجائے نقطوں کے قوس بنا دیا ہے۔ نقطوں کے بجائے قوس بنانے کا طریقہ اس زمانے میں اور بعد میں بھی رائج

تھا لیکن یہ نہیں تھا کہ ایک ہی دستاویز میں ایک جگہ نقطے دیں اور دوسری جگہ قوس بنائیں۔ اگر نقطے ہوتے تھے تو ہر جگہ ہوتے تھے اور قوس بناتے تھے تو ہر جگہ بناتے تھے تاکہ یکسانیت برقرار رہے جو سرکاری دستاویزوں کے لئے بیحد ضروری ہے۔

(۴) یہ فرمان جینی عبادت گاہ کے عطیہ کے لئے ہے۔ جینی عبادت گاہ کے لئے لفظ تیرتھ استعمال کرتے ہیں حالانکہ اس میں شوالہ لکھا ہے جو ہندو مندر کے لئے استعمال ہوتا ہے۔

غرضکہ میرا خیال ہے کہ فیروز شاہ بہمنی کا فرمان جو شائع کیا گیا ہے ہندوستان میں فارسی زبان کی قدیم ترین دستاویز ہے۔ ابتک جو ہماری معلومات ہیں ان کی بنا پر میں نے یہ رائے قائم کی ہے۔ آئندہ کے متعلق کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا۔ ممکن ہو اس ضمن میں ہمارے محقق اور مورخ کوئی نہیں چیز دریافت کریں تو اس وقت اس مسئلے پر پھر غور کیا جا سکتا ہے۔

سنہ ۱۹۵۶ء میں مدراس یونیورسٹی کی سنڈیکیٹ نے مجھے ہندوستان کی ازمنۂ وسطیٰ کی تہذیب پر پانچ لکچر دینے کے لئے مدعو کیا۔ ان لکچروں کو "گلمسس آف میڈیویل انڈین کلچر" کے نام سے ایشیا پبلشنگ ہاؤس، بمبئی نے شائع کیا ہے۔ اس کتاب کے تین ایڈیشن نکل چکے ہیں۔ مولوی عبدالحق کی فرمائش پر میں نے انجمن ترقی اردو کے لئے "تاریخ تمدن ہند" مرتب کی تھی جس کے دو ایڈیشن انجمن نے شائع کئے۔

فرانسیسی زبان میں میری کتاب "لیننڈمستک ادمیان آز" ۱۹۲۹ء میں پیرس میں شائع ہوئی تھی۔ اس کتاب کے بعض مضامین میں نے اپنے مدراس والے لکچروں میں شامل کر لئے ہیں۔

میں نے حیدرآباد کے دوران قیام میں ایک سہ ماہی رسالہ "سیاست" کے نام

سے جاری کیا تھا جو پانچ سال تک شائع ہوتا رہا۔ دوسری جنگ عظیم کے زمانے میں جب کاغذ ملنے کی دشواری ہوئی تو اسے بند کرنا پڑا۔ اس میں زیادہ تر عمرانی علوم کے مضامین ہوتے تھے۔ میں سمجھتا ہوں اس کا معیار اردو کے رسالوں میں بہت غنیمت تھا۔ اس میں بیشتر مضامین عثمانیہ یونیورسٹی کے پروفیسروں کے اور ان کے علاوہ دوسروں کے بھی ہوتے تھے۔

میں نے عثمانیہ یونیورسٹی کی علم نواز اور علم پرور فضا میں دوسروں کو جتنا سکھایا اس سے زیادہ خود سیکھا۔ میں بی۔ اے اور ایم۔ اے کو تاریخ ہند اور تاریخ یورپ کے علاوہ فرانسیسی زبان کا بھی درس دیتا تھا۔ یہ سلسلہ برسوں جاری رہا۔ عثمانیہ یونیورسٹی کا کتب خانہ اعلیٰ درجے کا ہے۔ یہاں مجھے اپنے مطالعہ کے لئے وسیع میدان ہاتھ آیا۔ میرا بیشتر وقت مطالعہ یا تصنیف و تالیف کے کام میں صرف ہوتا تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر میں برطانوی ہند کی کسی یونیورسٹی میں ہوتا تو مجھے وہ مواقع غالباً نہ ملتے جو عثمانیہ یونیورسٹی میں فراہم ہوگئے۔ میرے حیدرآباد جانے کے شروع کے دس سالوں میں سکون و عافیت کا دور تھا۔ اس کے بعد سیاسی ہلچل اور گڑبڑ شروع ہوئی، مگر اس کا یونیورسٹی کی زندگی پر کوئی خاص اثر نہ تھا۔ میں نے اس پُرسکون ماحول سے پوری طرح فائدہ اٹھانے اور تھوڑا بہت علمی اور ادبی کام کرنے کی کوشش کی۔ مجھے اس بات کا پورا اطمینان ہے کہ میں نے عثمانیہ یونیورسٹی کی خدمت کے دوران میں اپنا وقت ضائع نہیں کیا اور جو کام بن پڑا وہ کیا۔ یہ کام بہت وقیع نہ سہی لیکن مجھے یہ اطمینان ہے کہ میں نے اپنی حد تک اردو زبان کی تھوڑی بہت خدمت کی۔ بحمداللہ اردو کی خدمت کا جذبہ آج بھی میرے دل میں موجود ہے۔ اب جو کچھ دماغی اور جسمانی قوت باقی ہے

وہ انشاء اللہ زبان اردو کی خدمت ہی میں صرف ہوگی۔

اردو کی ترویج و تحفظ کے لئے حیدرآباد میں دو ادارے قابلِ ذکر ہیں۔ ادارۂ ادبیات اردو اور انجمن ترقی اردو۔ اول الذکر کے بانی ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور مرحوم اور ان کے رفقا تھے۔ مطبوعات کے علاوہ اس ادارے کی طرف سے اردو کے مختلف امتحانوں کا جو سلسلہ جاری کیا گیا اس سے جنوبی ہند میں اردو زبان کی ترویج میں بڑی مدد ملی ہے۔ انجمن ترقی اردو پروفیسر حبیب الرحمٰن کی سربراہی میں گذشتہ پندرہ سال سے اردو کی خدمت انجام دے رہی ہے۔ انجمن کی طرف سے ایک اردو کالج بھی قائم کیا گیا ہے۔ ان دونوں اداروں کی خدمات کا اعتراف کرنا ضروری ہے۔ دکن میں ان سے آئندہ کی بہت کچھ توقعات وابستہ ہیں۔

خاندانی زندگی میں نے حیدرآباد میں جو تھوڑا بہت علمی کام کیا وہ بغیر دلی سکون اور اطمینان کے ممکن نہ تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ یہ مجھے اپنی خاندانی زندگی کی بدولت حاصل ہو گیا۔ عثمانیہ یونیورسٹی میں کام شروع کرنے کے چند ماہ بعد میری شادی ۱۴ دسمبر ۱۹۲۳ء کو ہوئی۔ میری اہلیہ راحت بیگم، قائم گنج کے رئیس جان عالم خاں مرحوم کی صاحبزادی ہیں۔ انھوں نے گذشتہ ۴۳ سال میں حقِ رفاقت ادا کیا، ایسا کہ میں اس کی تعریف نہیں کر سکتا۔ راحت مشرقی نسوانیت کا پیکر مجسم ہیں، نیک، وفاشعار، پاک باطن۔ اب ان کا زیادہ وقت ذکرِ الٰہی اور عبادت میں گذرتا ہے۔ میرے پانچ بچے ہوئے، ایک لڑکا چار لڑکیاں۔ دو بچیاں کم سنی میں فوت ہو گئیں۔ اجمل ماشاء اللہ اب جوان ہیں۔ ان کی شادی امتیاز مرحوم کی صاحبزادی عاصمہ سے ہوئی ہے۔ راشدہ کی شادی پہلے سے اور مہر کی انور حسین کے ساتھ ہوئی ہے جو میرے بھتیجے ہیں، محمود میاں کے بڑے صاحبزادے۔ خدا کا شکر ہے میری



ماہرو بیگم　　اجمل حسین خان　　راشدہ بیگم

راحت بیگم　　یوسف حسین خان

۱۹۵۶ء

دونوں لڑکیاں صاحب اولاد ہیں اور اپنے اپنے گھر خوش ہیں۔ دونوں میں اپنی والدہ کے کردار کی خوبیاں موجود ہیں۔ دونوں کا ادبی ذوق بھی ستھرا ہے۔ دونوں گریجویٹ ہیں۔

حیدرآباد مرحوم

میں نے اس باب میں جس حیدرآباد کا ذکر کیا وہ اب خواب وخیال یا ایک یاد ہوکر رہ گیا ہے۔ گذشتہ اٹھارہ سال میں یہاں کی دنیا ہی بدل گئی۔ حیدرآباد کی یاد بڑی قیمتی ہے اس لئے کہ اسی میں ہندوستانی تہذیب کی یگانگت اور یک جہتی کے منظر اپنی جھلکیاں دکھاتے ہیں۔ یہ محبت اور یگانگت صدیوں کے تاریخی عمل کا نتیجہ تھی افسوس ہے کہ نہ اس کی اہمیت کو محسوس کیا گیا اور نہ اس کی قدر ہوئی۔ حیدرآباد کے حصے بخرے ہونے کے بعد وہ سب قدریں درہم برہم ہوگئیں جن کی پرورش اور نشوونما اہل دکن کے صدیوں کے میل جول اور رہن سہن سے ہوئی تھی۔ یہ نشوونما تاریخ کی دین تھی۔ عجب بات ہے کہ ایک طرف تو یگانگت اور یک جہتی کے نشانوں کو ایک ایک کرکے مٹانے کی کوشش ہورہی ہے اور دوسری طرف نئے سرے سے یکجہتی کے قائم کرنے کا راگ الاپا جاتا ہے۔ کوئی فرد یا قوم اپنے حکم یا خواہش سے تاریخ کی تخلیق نہیں کرسکتی۔ تاریخ تخلیق نہیں ہوا کرتی بلکہ قدرتی طور پر نشوونما پاتی ہے۔ اس کے لئے افراد اور قوموں کو بڑے پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں۔ بقول حالی۔

اک عمر چاہئے کہ گوارا ہو نیشِ عشق
رکھی ہے آج لذتِ زخمِ جگر کہاں

آٹھواں باب (۸)

علی گڑھ

میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا اولڈ بوائے نہیں ہوں۔ میرے بڑے بھائیوں نے جب وہ ایم۔او۔کالج میں پڑھتے تھے۔ مجھے اور میرے چھوٹے بھائی محمود کو بجائے کالجیٹ اسکول کے گورنمنٹ ہائی اسکول علی گڑھ میں داخل کرایا جو اس زمانے میں یوپی کے بہترین اسکولوں میں سمجھا جاتا تھا۔ اس زمانے میں یہاں مسٹر کوپر ہڈ ماسٹر تھے جو انگریزی فوج کے پنشن یافتہ تھے۔ اس اسکول کی اپنے ڈسپلن اور اسکول لیونگ کے امتحان کے نتائج کے لحاظ سے سارے یوپی میں شہرت تھی۔ مسٹر کوپر کے بعد یہاں مسٹر ہملٹن ہڈ ماسٹر ہوئے جو اینگلو انڈین تھے۔ میں اور محمود میاں ہر تعطیل ذاکر میاں کے پاس کچی بارک میں گذارتے تھے۔ اس کے بعد جب وہ پکّی بارک میں آگئے، تو وہاں جانے لگے۔ ذاکر میاں کے دوستوں میں اقبال احمد خاں سہیل اور رشید احمد صدیقی کو ہم لوگ اپنا بزرگ سمجھتے تھے۔ رشید صاحب سے بعد میں بھی بزرگ و خورد کا تعلق برقرار رہا۔ چونکہ ہمارے چار بڑے بھائیوں نے ایم۔اے۔او کالج میں تعلیم پائی تھی اسی لئے میں یہاں کے حالات سے مانوس تھا۔

پرو وائس چانسلری پر تقرر | میں عثمانیہ یونیورسٹی سے ۱۹۵۰ء میں پنشن لے کر ملازمت سے سبکدوش ہوا۔ سات آٹھ مہینے بیکار رہا۔ میں نے اس دوران میں "فرانسیسی ادب" لکھی جو بعد میں انجمن ترقی اردو نے شایع کی۔ ۱۹۵۸ء میں انڈین نیشنل آرکاویز کی ڈائرکٹری کے لئے پبلک سروس کمیشن نے جب درخواستیں طلب کیں، تو میں نے بھی درخواست بھیج دی۔ کمیشن نے مجھے منتخب کرلیا۔ ممکن ہے انھوں نے مجھے اس لئے ترجیح دی ہو کہ میں کئی سال تک حیدرآباد کے دفتر دیوانی و ملکی (ریکارڈ آفس) میں کیوریٹر اور مشیر (ایڈوائزر) کی حیثیت سے کام کرچکا تھا اور میں نے اس عرصے میں مغلیہ عہد اور سلاطینِ دکن کے کاغذات کی چھ جلدیں شائع کی تھیں۔ اِسی زمانے میں کرنل بشیر حسین زیدی نے مجھے لکھا کہ سید نور اللہ کی پرو وائس چانسلری کی مدت ختم ہو رہی ہے، اگر میری خواہش ہو تو میرا نام مسلم یونیورسٹی کی اکزیکٹیو کونسل میں منظوری کے لئے پیش کیا جائے۔ مجھے کچھ تذبذب تھا کہ کیا کروں۔ مسلم یونیورسٹی کی پرو وائس چانسلری اور انڈین نیشنل آرکاویز کی ڈائرکٹری دونوں خدمتیں میرے مذاق کے موافق تھیں لیکن چونکہ عثمانیہ یونیورسٹی سے میرا ۲۸ سال تعلق رہ چکا تھا اس لئے قدرتی طور پر مجھے اعلیٰ تعلیم اور اس کے مشاغل سے زیادہ دلچسپی تھی۔ چنانچہ میں نے مسلم یونیورسٹی کی پرو وائس چانسلری قبول کرلی۔

مسلم یونیورسٹی کی انتظامی مشینری میں تعلیمی اور انتظامی کام ایک دوسرے کے ساتھ ملے ہوئے ہیں۔ دراصل کسی یونیورسٹی کے انتظام میں ان دونوں کو ایک دوسرے سے علٰحدہ نہیں کیا جاسکتا۔ چنانچہ پرو وائس چانسلر کے ذمے تعلیمی امور کے علاوہ انتظامی کام بھی ہوتے ہیں۔ وائس چانسلر اور پرو وائس چانسلر کے کاموں میں کوئی ایسی تقسیم نہیں کہ یہ کہا جاسکے کہ فلاں کام وائس چانسلر سے تعلق رکھتا ہے اور فلاں

کام پرو وائس چانسلر کے ذمے ہے بعض اہم امور کی نسبت پرو وائس چانسلر اپنی تجویز وائس چانسلر کے پاس پیش کر دیتا ہے اور بعض معاملات میں پرو وائس چانسلر کے احکام آخری اور قطعی تصور کیے جاتے ہیں جنھیں رجسٹرار روبہ عمل لاتا ہے۔ اصل میں ایکٹ کی رو سے یونیورسٹی کا نظم ونسق چلانے کی ذمہ داری وائس چانسلر پر ہے۔ پرو وائس چانسلر وائس چانسلر کی مدد اور مشورے کے لئے ہے، اگر وہ اس سے کسی معاملے میں مشورہ کرنا چاہے۔ اس لئے اس کی بڑی ضرورت ہے کہ وائس چانسلر اور پرو وائس چانسلر ایک دوسرے کے بہت قریب ہوں اور ان تمام معاملات کی نسبت مشورہ کرتے رہیں جو یونیورسٹی کے انتظام میں اہمیت رکھتے ہیں اور جو ایگزیکٹیو کونسل یا ایکیڈمک کونسل میں پیش ہونے والے ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ یونیورسٹی کے انتظام میں کوئی کارروائی ایسی نہیں جو خالص انتظامی کہی جاسکے، اس لئے کہ اس کی تہ میں بھی کوئی نہ کوئی تعلیمی مسئلہ مضمر ہوتا ہے۔ بایں ہمہ سہولت کے لئے ان کارروائیوں کو انتظامی کہا جاتا ہے جن میں نظم ونسق کا پہلو غالب ہو، اور انھیں تعلیمی کہا جاتا ہے جن میں علمی یا تعلیمی رنگ نمایاں ہو۔ مسلم یونیورسٹی کے انتظام میں بالعموم تعلیمی مسائل کا تعلق پرو وائس چانسلر سے رہتا ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ وائس چانسلر ان سے بالکل بے تعلق ہوتا ہے۔ وہ یونیورسٹی کے کسی معاملے سے بے تعلق رہ ہی نہیں سکتا۔ اس لئے کہ یونیورسٹی کو چلانے کی ذمہ داری اس کے سپرد کی گئی ہے۔ چنانچہ میری پرو وائس چانسلری کے زمانے میں بھی تمام اہم تعلیمی امور وائس چانسلر کی منظوری کے لئے پیش کیے جاتے تھے۔ اسی طرح بعض خالص انتظامی امور کا تعلق پرو وائس چانسلر سے تھا۔ وائس چانسلر اور پرو وائس چانسلر کے کاموں میں

کوئی ایسی بے لوچ حد فاصل نہیں تھی جس سے معلوم ہو کہ وائس چانسلر کے عمل کا دائرہ یہاں ختم ہوتا ہے اور پرو وائس چانسلر کے عمل کا دائرہ یہاں سے شروع ہوتا ہے۔ ان حالات میں وائس چانسلر اور پرو وائس چانسلر کے درمیان انتہائی تعاون ضروری تھا تاکہ معاملات سلجھے رہیں اور دونوں ایک دوسرے کے خیالات سے ہر وقت واقف رہیں۔ ان دونوں کے درمیان کسی درمیانی شخص کی ضرورت نہیں ورنہ لازمی طور پر غلط فہمیاں پیدا ہونے کا اندیشہ ہے۔ مسلم یونیورسٹی کی پرو وائس چانسلری قبول کرنے کے بعد مجھ سے جہاں تک ہو سکا، میں نے اُن مقاصد کو فروغ دینے کی کوشش کی جو اس یونیورسٹی کے بانی کے پیشِ نظر تھے۔ کرنل بشیر حسین زیدی اس معاملے میں میرے ہمخیال تھے۔ ہم دونوں کے پیشِ نظر یہ تھا کہ ہندوستانی قومیت کے چوکھٹے میں رہ کر ہندوستانی مسلمانوں کی تعلیم کو ترقی دیں اور مسلمان نوجوانوں کے لئے اعلیٰ تعلیم کے زیادہ سے زیادہ مواقع فراہم کریں۔

مسلم یونیورسٹی کے مقاصد مسلم یونیورسٹی کی اپنی تاریخ ہے۔ ۱۸۵۷ء کے انقلاب کے بعد شمالی ہند کے مسلمانوں کو انگریزی حکومت کے ظلم و تشدد کا نشانہ بننا پڑا۔ عرصے تک انگریزوں کے دلوں میں ان کے خلاف انتقام کی آگ بھڑکتی رہی۔ مغلیہ سلطنت کا ٹمٹماتا ہوا چراغ ہمیشہ کے لئے گُل ہو چکا تھا۔ مسلمان تعلیم میں پس ماندہ اور ذلت و خواری میں مبتلا تھے۔ ایک مردِ خدا اٹھا، اس نے زمانے کے تیوروں کو پہچانا اور مسلمانوں کی تعلیمی اور معاشی پستی کو دور کرنے کا بیڑا اٹھایا۔ اس کی نیت پاک تھی اس لئے خدا نے اس کے کام میں برکت دی۔ سید احمد خاں نے ۱۸۷۷ء میں ایم۔ اے۔ او کالج کی بنا ڈالی تاکہ مسلمان مغربی علوم و فنون سے آراستہ ہو کر قومی زندگی میں اپنا صحیح مقام

حاصل کر سکیں۔ انھوں نے اس موقع پر کہا تھا: "ہندوستان کے مسلمانوں کی تاریخ میں یہ پہلا موقع ہے جب کہ یہ کالج کسی ایک شخص یا حکمراں کی فیاضی یا علم دوستی کے باعث قائم نہیں ہوا، بلکہ پوری ملت کی متحدہ مساعی اور سرپرستی سے وہ وجود میں آیا ہے۔ ایسی مثال پہلے کہیں نہیں ملتی۔ اس کی بنا ترقی اور رواداری کے اصول پر قائم ہے جس کی مثال مشرقی ملکوں میں کہیں نہیں ہے۔ باوجود ان دشواریوں کے جو ہمارے راستے میں تھیں ہمیں نمایاں کامیابی حاصل ہوئی اور ہمیں توقع ہے کہ آیندہ انگریزی حکومت اور ہمارے اہل ملک اس کی ترقی میں مدد دیں گے۔۔۔۔۔۔۔۔ ہمیں پوری امید ہے کہ یہ کالج ایک دن یونیورسٹی بن جائے گا جس کے فرزند ملک کے طول و عرض میں جستجو، رواداری اور اخلاق حسنہ کے اصول کی اشاعت کریں گے۔"

اس سے پتہ چلتا ہے کہ سید احمد خاں کے پیش نظر شروع ہی سے یونیورسٹی قائم کرنا تھا۔ اگرچہ ایم۔اے۔او کالج کے قیام کا مقصد مسلمانوں میں مغربی علوم و فنون کی ترویج تھا لیکن سید احمد خاں کے زمانے ہی سے بلا اختلاف مذہب و ملت کالج کے طلبہ میں ہر مذہب و ملت کے نوجوانوں کی نمایندگی رہی۔

۱۹۲۰ء اور ۱۹۵۱ء کے ایکٹ میں بھی مسلم یونیورسٹی کے ان مقاصد کو تسلیم کیا گیا جو اس کے بانی کے پیش نظر تھے۔ یعنی یہ کہ یہ درسگاہ مغربی علوم و فنون کی تعلیم و اشاعت کے ساتھ اسلامی تہذیب و کردار کا سرچشمہ ہوگی جس کی نسبت راجا صاحب محمود آباد نے جو یونیورسٹی کے پہلے وائس چانسلر تھے ان الفاظ میں ذکر کیا:۔

"ہم علی گڑھ کو ایسی درسگاہ بنانا چاہتے ہیں جو آکسفورڈ اور پیرس کے ہم رتبہ ہو اور جس کو علم کے طالب وقعت کی نگاہ سے دیکھیں۔۔۔۔۔۔۔۔ اور سب سے بڑھ کر ہماری خواہش

یہ ہے کہ وہ ایک ایسا علمی اور اخلاقی مرکز ہو جہاں بلند اور پاکیزہ خیالات مجتمع ہوں جہاں سے روشنی اور تہذیب کی شعاعیں تمام ہندوستان بلکہ تمام دنیا پر پڑیں اور جو تمام عالم کے واسطے ہمارے دین کی سچائی اور پاکیزگی کا عمدہ معیار ہو۔"

اگرچہ مسلم یونیورسٹی ایک اقلیتی ادارہ ہے لیکن یہاں دوسرے مذاہب کے ماننے والوں کے ساتھ ہمیشہ رواداری کا برتاؤ کیا گیا۔ ۱۹۴۷ء میں جب سارے ملک میں بدامنی اور قتل و غارت کا بازار گرم تھا، مسلم یونیورسٹی کے ہوسٹلوں میں ہندو مسلمان نوجوان یگانگت اور یک جہتی کے ساتھ زندگی بسر کر رہے تھے جو پورے ملک کے لئے ایک نمونہ تھا۔ اس پر آشوب زمانے میں یونیورسٹی کو ایک دن کے لئے بھی بند کرنے کی نوبت نہیں آئی۔ آزادی کے بعد ڈاکٹر ذاکر حسین نے اس ادارہ میں قومی یک جہتی کو اور زیادہ مضبوط بنیادوں پر قائم کرنے کی کوشش کی اور ان کے جانشین کرنل بشیر حسین زیدی نے ان کے نقش قدم پر چل کر اپنے وسیع انتظامی تجربے سے یونیورسٹی کو مستفید کیا۔

تحقیقاتی کمیٹی کی رپورٹ میں نے ۱۹۵۸ء میں جب پرو وائس چانسلر کی حیثیت سے کام شروع کیا تو ڈاکٹر شریمالی وزیر تعلیم نے وائس چانسلر سے مختلف انتظامی امور کی نسبت استفسار کئے تھے۔ پھر کچھ دنوں بعد پارلیمنٹ میں مسلم یونیورسٹی کے مالی انتظام پر اعتراضوں کی بوچھار ہونے لگی۔ جب یہ معاملہ زیادہ بڑھا تو کرنل بشیر حسین زیدی نے حکومت ہند کے ایما پر ۱۹۶۰ء میں یونیورسٹی کی ایگزیکٹیو کونسل سے ایک تحقیقاتی کمیٹی مقرر کروائی جس کے صدر پروفیسر جی۔ سی چڑجی تھے، اور آر پی نائک آئی۔ سی۔ ایس جوائنٹ سکریٹری وزارت تعلیم اس کمیٹی کے سکریٹری مقرر ہوئے۔ ارکان میں پروفیسر واڈیا، شری کرتار سنگھ ملہوترا، شری پی۔ این سپرو اور شری ایم اے شاہ میری

شامل تھے۔ کمیٹی نے تفصیلی تحقیقات کے بعد ۱۹۶۱ء میں اپنی رپورٹ یونیورسٹی کی اکزیکیٹو کونسل کو پیش کی۔ اور پھر وہی رپورٹ پارلیمنٹ کے سامنے آئی۔ یہ رپورٹ ایک تاریخی دستاویز ہے جس کا تجزیہ ضروری ہے۔

تحقیقاتی کمیٹی نے پوری چھان بین کے بعد یہ رائے قائم کی کہ یونیورسٹی کے حسابات میں جو بدعنوانیاں ہیں وہ معمولی نوعیت کی ہیں۔ جہاں لاکھوں روپیوں کا خرچ ہو، وہاں تھوڑی بہت غلطیاں ہونا ناگزیر ہے۔ دنیا کا کوئی تعلیمی ادارہ بھی ان غلطیوں سے مبرا نہیں۔ کمیٹی نے ان الزاموں کو قطعاً بے بنیاد ٹھہرایا جو فرقہ پرستوں نے پارلیمنٹ میں لگائے تھے اور جنھیں فرقہ پرست اخباروں نے خوب اچھالا تھا۔ اس کے ساتھ کمیٹی نے یونیورسٹی کے مسلم کردار کو برقرار رکھنے کی سفارش کی اور بتایا کہ ۱۹۵۱ء کے ترمیمی قانون کے متعلق یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ اس کا مقصد یونیورسٹی ایکٹ کی دفعات کو دستورِ ہند کے مطابق کرنا تھا نہ کہ مسلم یونیورسٹی کے بنیادی کردار کو بدلنا۔ اس ترمیمی قانون کا مقصد ہندوستان کے مسلمانوں کی تعلیمی ترقی تھا۔ اگر مسلم یونیورسٹی مرکزی حکومت سے متعلق ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس اقلیتی ادارے کی حیثیت میں اس سے کوئی تبدیلی ہو گئی۔ پھر اگر ترمیمی قانون سے یونیورسٹی کے بنیادی کردار میں کوئی تبدیلی نہیں پیدا ہوئی تو حکومت کی بڑھتی ہوئی مالی امداد سے بھی اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ سپریم کورٹ نے کیرلا ایجوکیشن بل کے متعلق جو فیصلہ کیا ہے اس کا اطلاق مسلم یونیورسٹی پر بھی ہوتا ہے۔ فاضل ججوں نے کہا تھا: "کوئی تعلیمی ادارہ عملی طور پر حکومت کی امداد کے بغیر نہیں چل سکتا۔ اگر حکومت کی مالی امداد ملنے کی یہ شرط ہو کہ وہ ادارہ اپنے حقوق سے دست بردار ہو جائے تو مالی مجبوری کی وجہ سے وہ ادارہ اپنے ان حقوق سے استفادہ

نہیں کر سکے گا جو دستور کی دفعہ ۳۰ (۱) کی رو سے اسے حاصل ہوئے ہیں"۔ رپورٹ میں اس فیصلے پر تفصیلی نظر ڈالی گئی ہے اور اسے بہ نظرِ استحسان دیکھا ہے۔ اس فیصلے میں خاص کر یہ فقرہ بڑی اہمیت رکھتا ہے:۔

"دستور کی دفعہ ۳۰ (۱) سے جو بنیادی حق پیدا ہوا ہے وہ مطلق حیثیت رکھتا ہے۔ یہ آزادی کے بنیادی حقوق کے مثل نہیں جن کی ضمانت دفعہ ۱۹ میں کی گئی ہے جس میں معقول تحدیدات عائد کی جا سکتی ہیں۔ دفعہ ۳۰ (۱) میں اقلیتوں کو جو حق دیا گیا ہے اس سے دستور کا منشا یہ ہے کہ اس کی حیثیت حقیقی ہو تاکہ اس سے اقلیتوں کا تحفظ ہو سکے اور وہ اپنی مرضی کے مطابق تعلیمی ادارے قائم کر سکیں۔ یہ حق اس لئے دیا گیا ہے کہ اسے عملاً موثر بنایا جائے نہ کہ اس میں ایسے قواعد و ضوابط سے ضعف پیدا کر کے بے اثر کر دیا جائے جن کا مقصد اقلیتوں کے تعلیمی اداروں کے بجائے قومی یا مجموعی مفاد کی نگہداشت ہو...... اگر اس قسم کے قواعد و ضوابط کو قومی یا مجموعی مفاد کی لئے بنایا گیا تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اقلیتی ادارے کی ظاہری حالت چاہے برقرار رہے لیکن اس کا اصلی اقتدار سلب ہو جائیگا۔ ایسی صورت میں دفعہ ۳۰ (۱) نے اقلیتوں کو جو حق دیا ہے وہ فریبِ نظر بن جائے گا یا ایک ایسا وعدہ جو اصلیت سے عاری ہو"۔

رپورٹ میں ہندوستان کے دستور کی دفعہ ۳۰ (۱) کا حوالہ کیرلا ایجوکیشن بل کے سلسلے میں دیا ہے جس میں لسانی اور مذہبی اقلیتوں کو یہ حق دیا گیا ہے کہ وہ اپنی مرضی کے مطابق تعلیمی ادارے قائم کریں اور انھیں چلائیں۔ اس کے ساتھ یہ بھی ہے کہ حکومت اقلیت کے تعلیمی اداروں کو امداد دیتے وقت کسی کے ساتھ محض اس بنا پر امتیازی سلوک نہیں کر سکتی کہ اس کا انتظام کسی مخصوص لسانی یا مذہبی اقلیت کے ہاتھ میں ہے۔ دستور کی

اس دفعہ کی رو سے جب اقلیتوں کو اپنے تعلیمی ادارے کھولنے اور چلانے کا حق ہو تو انھیں یہ حق بھی حاصل ہے کہ وہ ان اداروں کے نام اپنی مرضی سے رکھیں۔

پارلیمنٹ میں یہ بھی اعتراض کیا گیا تھا کہ مسلم یونیورسٹی کے داخلوں میں فرقہ واری امتیاز برتا جاتا ہے۔ اس پر بعض ارکان نے کہا کہ ملک کی بعض دوسری یونیورسٹیوں میں مسلم طلبہ کے داخلے میں دشواریاں پیدا کی جاتی ہیں۔ اس پر ڈاکٹر شریمالی نے جواب دیا کہ اگر کسی یونیورسٹی کے متعلق یہ الزام ثابت کر دیا جائے تو اس کی گرانٹ بند کر دی جائے گی۔ حالانکہ یہ کوئی چھپی ڈھکی بات نہیں جس کے لئے ثبوت کی ضرورت ہوتی۔ مثال کے طور پر نہ صرف عوام بلکہ حکومت کو بھی اس بات کا بخوبی علم ہے کہ ضلع کی کچہریوں، پی۔ ڈبلیو ڈی اور ریلوے کے محکمے میں کھلم کھلا رشوت لی جاتی ہے اور بعض دفتروں میں چھوٹے ملازموں سے لے کر بڑے افسروں تک رشوت کی رقم تقسیم ہوتی ہے لیکن ان باتوں کا ثبوت فراہم کرنا بہت دشوار ہے۔ حکومت باوجود ان باتوں کے جاننے کے لوگوں پر مقدمہ چلانے سے قاصر ہے۔ ایسی صورت میں ڈاکٹر شریمالی کا کہنا بالکل ایسا ہی تھا جیسے کہ وزیر داخلہ رشوت کے الزاموں کے جواب میں کہیں کہ ملک بھر میں کہیں رشوت نہیں لی جاتی اور سب سرکاری ملازم انتہائی ایمانداری سے اپنے فرائض انجام دیتے ہیں۔ اگر کوئی شخص سرکاری ملازم کے خلاف رشوت کا الزام ثابت کر دے تو اسے سزا دی جائیگی۔ گویا کہ اس کی ذمہ داری حکومت پر نہیں بلکہ شہریوں پر ہے کہ وہ ان یونیورسٹیوں کی بدعنوانیوں کو معلوم کر کے جو داخلوں کے متعلق ہوں ان کے خلاف الزام کو ثابت کریں۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ دنیا کے ہر مہذب ملک میں قانون کو نافذ کرنے کی ذمہ داری حکومت پر عائد ہوتی ہے نہ کہ شہریوں پر جن کے معلومات حاصل کرنے کے وسائل ظاہر ہے کہ بہت محدود ہیں۔

اگر یہ ذمہ داری شہریوں کی ہے تو پھر حکومت کس مرض کی دوا ہے، اس کا ہونا نہ ہونا برابر ہے۔

داخلوں کے متعلق کمیٹی نے اس بات پر اتفاق کیا کہ یونیورسٹی میں انڈر گریجویٹ سطح پر جب کوئی طالبِ علم ایک دفعہ داخلے کے لئے چن لیا گیا تو پھر پوسٹ گریجویٹ سطح پر یا پروفیشنل کورس میں دوبارہ نئے سرے سے داخلے کے وقت اس کے متعلق چھان بین کی ضرورت نہیں، اس لئے کہ اب وہ یونیورسٹی کی برادری کا رکن بن چکا ہے۔ اب اسے ان سب رعایتوں سے فائدہ اٹھانے کا حق ہونا چاہیے جو یونیورسٹی کے طلبہ کے لئے مخصوص ہوں۔ کمیٹی نے یہ بھی واضح کیا کہ مسلم یونیورسٹی میں مسلم اور غیر مسلم طلبہ کے لئے کوئی تعداد کبھی مقرر نہیں کی گئی اور نہ غیر مسلموں کے داخلے پر کبھی کوئی پابندی لگائی گئی۔ کمیٹی نے اس پر اظہار طمانیت کیا کہ یونیورسٹی میں غیر مسلم طلبہ کا تناسب ۳۵ فیصدی کے لگ بھگ ہے اور یہ تسلیم کیا کہ تعلیمی آزادی کے اصول میں یہ مضمر ہے کہ یونیورسٹی میں داخلہ کس بنا پر کیا جائے۔ داخلوں کا تعلق ان مقاصد سے ہے جو کسی یونیورسٹی کے قیام کے محرک ہوئے ہیں۔ کمیٹی نے یہ بھی کہا کہ ہندو اور مسلم طلبہ کا موجودہ تناسب یعنی ۳۵ - ۶۵ مناسب ہے۔ اگر مسلم طلبہ کا تناسب زیادہ گھٹ گیا تو یونیورسٹی کا اسلامی کیریکٹر برقرار نہیں رہ سکے گا۔ یونیورسٹی در و دیوار کا نام نہیں بلکہ طلبہ اور اساتذہ ہی سے یونیورسٹی عبارت ہوتی ہے۔ برطانیہ اور امریکہ میں چاہے یونیورسٹیوں کو سرکاری امداد ملتی ہو لیکن داخلوں کے معاملے میں وہ بالکل آزاد ہیں۔ کمیٹی نے امریکی ماہر تعلیم جسٹس فرینک فرٹر کی اس رائے کو بہ نظرِ استحسان نقل کیا ہے کہ یونیورسٹی کا یہ کام ہے کہ طلبہ کے لئے ایسی فضا مہیا کرے جو تجربے اور تخلیق کے لئے سازگار ہو۔ یونیورسٹی کے لئے چار آزادیوں کی ضرورت ہے (۱) کون پڑھائے (۲) کیا پڑھائے،

(۳) کس طرح پڑھائے اور (۴) کسے پڑھائے، یعنی یہ کہ کس کو یونیورسٹی میں داخل کیا جائے۔ داخلوں کے متعلق یونیورسٹی کو پوری آزادی ہونی چاہیے جس کا احترام کرنا اسٹیٹ کا فرض ہے، ورنہ اس کی خود مختاری برائے نام رہ جائے گی۔

تحقیقاتی رپورٹ میں بتایا گیا کہ مسلم یونیورسٹی کے طلبہ کا نظم و ضبط ملک کی دوسری درسگاہوں کے مقابلے میں کہیں بہتر ہے۔ اسٹوڈنٹس یونین، اسپورٹس کلب، ہال کونسل اور یونیورسٹی کے دوسرے غیر درسی ادارے مِل جُل کر کام کرتے ہیں۔ مسلم یونیورسٹی کے طلبہ نے تحقیقاتی کمیٹی سے یہ مطالبہ نہیں کیا کہ ان کے نمائندوں کی بھی شہادت لی جائے۔ کمیٹی کے ارکان کو اس بات پر تعجب تھا اس لئے کہ دوسری یونیورسٹیوں کے متعلق انھیں اس کے خلاف تجربہ ہوا تھا۔ کمیٹی نے اس بات پر افسوس کا اظہار کیا کہ مسلم یونیورسٹی پر اخباروں میں حملے کئے گئے جن کی تردید ناممکن ہے، خاص کر ایسی صورت میں جب کہ زہریلے اثرات نے دماغوں کو پہلے سے متاثر کر دیا ہو۔ اس قسم کی غیر ذمہ دار تنقیدوں پر سیاسی مصلحت اور فرقہ پرستی کا دبیز پردہ پڑا ہوتا ہے جس سے یونیورسٹی کے خلاف لوگوں کے دلوں میں ہیجان شک و شبہہ پیدا ہوتا ہے اور قومی زندگی میں وہ جو حصہ ادا کرسکتی ہے وہ ادا نہیں کر پاتی۔

فرقہ واری اخباروں میں شور مچایا گیا کہ مسلم یونیورسٹی میں کمیونسٹوں اور جماعت اسلامی کا اثر بڑھتا جاتا ہے۔ نفسیاتی طور پر یونیورسٹی کو بدنام کرنے کا یہ زبردست حربہ تھا۔ ملک کی رائے عامہ کمیونسٹ چین کے خلاف تھی اور جماعتِ اسلامی حکومت کی نگاہوں میں کھٹکتی تھی۔ اس لئے جب دونوں پارٹیوں کا ذکر ایک ہی سانس میں کیا جائیگا تو لازمی طور پر حکومت اور عوام دونوں حلقوں میں اس یونیورسٹی کے وقار کو صدمہ پہنچے گا۔ دوسری یونیورسٹیوں میں سیاسی اکھاڑے جمتے ہیں، بلوے اور مار دھاڑ ہوتی ہے، استادوں کی

بے عزتی کی جاتی ہے، لیکن کسی کے کان پر جوں تک نہیں رینگتی۔ لیکن علی گڑھ میں کوئی چھوٹے سے چھوٹا واقعہ ہو جائے، تو اس کی نسبت فرقہ واری پریس میں موٹی موٹی سرخیاں قائم ہو جاتی ہیں۔ یہ جمہوری اصول کا بیجا استعمال ہے۔ اگر اہل ملک اپنے ہاں اجتماعی زندگی کے توازن کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں، جس کے بغیر جمہوری زندگی ٹھٹھر کر رہ جائے گی، تو اس رویے سے احتراز لازم ہے۔

لڑکوں میں مارپیٹ ہونے والی بات، یکم اکتوبر ۱۹۶۰ء کی رات کو یونین کے انتخاب میں طلبہ کی دو ٹولیوں میں مارپیٹ ہو گئی، جسے خواہ مخواہ فرقہ واری رنگ دیدیا گیا۔ وائس چانسلر اور یونیورسٹی کے دوسرے ذمہ داروں کے سان گمان میں بھی نہ تھا کہ اس معمولی واقعے کو اس طرح بڑھا چڑھا کے پیش کیا جائے گا۔ اس مارپیٹ میں کسی لڑکے کو ضرب شدید بھی نہیں آئی تھی لیکن مشہور کر دیا گیا کہ ۶ لڑکے مارے گئے۔ چنانچہ اسی افواہ کی وجہ سے علی گڑھ، ہاپوڑ، چندوسی، میرٹھ اور فیروزآباد میں بلوے ہوئے جن میں معصوم لوگوں کی متعدد جانیں ضائع ہوئیں۔ حکومت کا فرض تھا کہ ان واقعات کی عدالتی تحقیقات کراتی لیکن یہ کہہ کر ٹال دیا گیا کہ ایسا کرنے سے تلخی میں اور اضافہ ہوگا۔ وائس چانسلر نے فوراً اس واقعہ کی اطلاع ضلع حکام کو دیدی تھی۔ ان کا فرض تھا کہ وہ غلط افواہوں کی اشاعت کو روکتے تاکہ اشتعال پیدا نہ ہوتا۔ یہ اشتعال جس تیزی سے پھیلایا گیا اس کی تہ میں کسی تنظیم کی کارفرمائی معلوم ہوتی ہے۔ ۳ اکتوبر کی صبح کو دس ہزار کا مجمع شہر سے یونیورسٹی کی طرف بڑھا۔ اسے پولیس نے اس پل پر روکنے کی کوشش کی جو شہر کو یونیورسٹی سے جدا کرتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ مقامی حکام نے اس مجمع کو اسی وقت منتشر کیوں نہیں کر دیا جب کہ وہ جمع ہونا شروع ہوا تھا؟ اس سوال کا کوئی جواب نہیں ملتا۔ اگر عدالتی

تحقیقات ہوتی تو اس کا جواب بھی تلاش کیا جاتا۔ اس مجمع کا ایک حصہ پل کو پار کر کے تصویر محل کے پاس کی دکانوں کو جلاتا، لوٹتا مسلم یونیورسٹی کرکٹ پویلین کی طرف بڑھا اور اس کے ایک دروازے کو آگ لگا دی۔ یہ کرکٹ پویلین سپرنٹنڈنٹ پولیس کی کوٹھی کے بالکل سامنے واقع ہے۔ اس کے بعد یہ بلوائی شمشاد مارکیٹ پہنچے۔ دکانوں کو آگ لگائی اور بعض دکانوں کا سامان لوٹا۔ حیرت ہے کہ اتنا بڑا واقعہ ہوا لیکن مقامی حکام نے ایک شخص کو بھی گرفتار نہیں کیا۔ مسلم یونیورسٹی کے طلبہ نے اس موقع پر بڑے ضبط و تحمل سے کام لیا۔ وائس چانسلر، پرووائس چانسلر اور یونیورسٹی کے دوسرے لوگوں نے انھیں ہوسٹلوں میں روکے رکھا تاکہ تصادم کی صورت نہ پیدا ہو جائے۔ وائس چانسلر اور پرووائس چانسلر اس وقت تک ہوسٹلوں کے دروازوں اور سامنے کی سڑک پر موجود رہے جب تک کہ مجمع منتشر ہو کر واپس نہیں چلا گیا۔ اس فساد کے وقت یہ محسوس کیا گیا کہ اگر حکام اشتعال کو روکنے کی کوشش کرتے اور وقت پر ضروری کارروائی کرتے تو اس کی نوبت نہ آتی۔

اس واقعہ سے فائدہ اٹھا کر بعض لوگوں نے وائس چانسلر اور میرے درمیان غلط فہمی پیدا کرنے کی کوشش کی جس کی وجہ سے دونوں کو ۳۰ر اکتوبر ۱۹۶۱ء کو ایک مشترک بیان شائع کرنا پڑا جس میں اس بات کی صراحت تھی کہ ہم میں تھوڑا بہت جو اختلاف تھا وہ رفع ہو گیا۔ نیز اس بات پر افسوس ظاہر کیا گیا کہ اس معمولی اختلاف کو اچھالنے کی کوشش کی گئی۔ دوستوں میں بھی اختلاف ہو جاتا ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ مشترک مقاصد کے لئے مل جل کر کام نہ کیا جائے۔ ہم دونوں نے مسلم یونیورسٹی کے تمام بہی خواہوں کو یقین دلایا کہ اس ضمن میں اخباروں میں جو خبریں شائع ہوئی ہیں وہ انتہائی مبالغہ آمیز ہیں ہم نے اعلان کیا کہ ہم مسلم یونیورسٹی کو حقیقی معنوں میں قومی ادارہ بنانے کی سعی کریں گے جو مسلم تہذیب کا اہم مرکز اور ملک کی مشترک تہذیب کا گہوارہ ہے۔

کرنل بشیر حسین زیدی کی وائس چانسلری | کرنل بشیر حسین زیدی ریاست رام پور میں عرصے تک چیف منسٹر رہے تھے۔ ان کا انتظامی تجربہ وسیع تھا جس سے مسلم یونیورسٹی کو پورا فائدہ اٹھانے کا موقع ملا۔ ان کی وائس چانسلری کے زمانے میں سب سے اہم کام تو یہ ہوا کہ تحقیقاتی کمیٹی کے اعتراضوں کے تشفی بخش جواب دیئے گئے جس کی وجہ سے فرقہ پرستوں نے یونیورسٹی پر جو وار کیا تھا وہ خالی گیا۔ اس ضمن میں انھوں نے اپنے ذاتی اثر و رسوخ کو ادارے کے مفاد کے لئے بڑی خوش اسلوبی سے استعمال کیا جس کے لئے ہم سبھوں کو ان کا ممنون ہونا چاہیئے۔ ان کے زمانے میں آرٹس فیکلٹی اور کشمیر ہوسٹل کی عمارتیں بنیں آزاد لائبریری، پولی ٹیک نیک فزکس لبارٹری اور جیولوجی لبارٹری کے نقشے اگرچہ ڈاکٹر ذاکر حسین کے زمانے میں تیار ہو گئے تھے، لیکن ان کی تعمیر کرنل بشیر حسین زیدی نے کرائی۔ عمارتیں تعمیر کرانے کا انھیں ذاتی شوق ہے۔ اس باب میں بھی اُن کے تجربے اور سلیقے سے یونیورسٹی کو بہت فائدہ پہنچا۔

دوسری جنگِ عظیم کے دوران میں ڈاکٹر سر ضیاء الدین مرحوم نے مسلم یونیورسٹی میں ایک میڈیکل کالج قائم کرنے کی تجویز پیش کی تھی۔ ڈاکٹر سید ہادی حسن نے روپیہ جمع کرنے کے لئے ملک کا دورہ کیا۔ ان کی مساعی سے ساٹھ لاکھ روپیہ جمع ہو گئے۔ اب تک ہندوستان کی کسی یونیورسٹی نے اتنی بڑی رقم پبلک سے اپنے کسی کالج کے قیام کے لئے جمع نہیں کی تھی۔ مرکزی وزارتِ تعلیم نے یہ فیصلہ کیا کہ جو رقم جمع کی گئی ہے اس کے علاوہ میڈیکل کالج قائم کرنے اور چلانے میں جو خرچ ہوگا اس کی ذمہ داری مرکزی حکومت پر ہوگی لیکن اس کے اسپتال سے چونکہ یوپی کی پبلک استفادہ کرے گی اس لئے اس کو چلانے کا خرچ یوپی گورنمنٹ کے ذمہ ہوگا۔ یوپی گورنمنٹ اس معاملے میں عرصے تک

ٹال مٹول کرتی رہی۔ کرنل بشیر حسین زیدی کی کوشش سے یوپی گورنمنٹ سے ایک معاہدہ ہوگیا جس کی رو سے میڈیکل کالج کے داخلے میں اندرونی اور بیرونی طلبہ کا تناسب ۵۰۔۵۰ رہے گا اور اسپتال کے انتظام میں یوپی گورنمنٹ یونیورسٹی کے ساتھ شریک ہوگی۔ ان کی وائس چانسلری کے زمانے میں یہ نہایت مفید اور اہم کام انجام پایا۔

بدرالدین طیب جی کی وائس چانسلری

کرنل بشیر حسین زیدی کے جانشین بدرالدین طیب جی ہوئے جو حکومت ہند کے محکمۂ خارجہ میں اڈیشنل سکریٹری کے عہدے پر فائز تھے۔ وہ یونیورسٹی میں کم و بیش سوا دو سال رہے۔ انھوں نے یونیورسٹی کے وقار کو بلند کرنے کی کوشش کی۔ چونکہ وہ خود پرانے آئی سی ایس تھے اس لئے معمولی قسم کے ضلع کے حکام کو وہ خاطر میں نہیں لاتے تھے ان کی وائس چانسلری کی قلیل مدت میں دفتری نظام میں بہتری کی صورت پیدا ہوئی۔ اگر کسی فائل کے ان کے پاس پہنچنے میں دیر ہو جاتی تو وہ اسے ناپسند کرتے تھے، اس لئے دفتر والے بہت چوکس رہتے تھے۔ بدرالدین طیب جی کی سیرت میں جرأت اور صداقت کی خوبیاں ہیں، وہ سچے اور کھرے انسان ہیں۔ وہ نیشنلسٹ ہونے کے ساتھ مسلم اقلیت کے سچے بہی خواہ ہیں اس لئے کہ ان کا خیال ہے کہ اگر مسلمان تعلیم میں پیچھے رہیں گے تو اس سے پوری قوم کا نقصان ہوگا۔ ان کا نیشنلزم اس کے منافی نہیں تھا کہ وہ مسلمان نوجوانوں کو اس ملک کی اجتماعی زندگی میں باعزت مقام حاصل کرنے میں مدد دیں۔

تحقیقاتی کمیٹی نے داخلوں کے سوال پر بحث کرتے ہوئے اشارہ کیا تھا کہ جو طلبہ یونیورسٹی کی برادری سے تعلق رکھتے ہیں، وہ چاہے کسی مذہب وملت کے ہوں، انھیں باہر والوں کے مقابلے میں بعض رعایتیں حاصل ہو سکتی ہیں لیکن وہ حدود کے اندر ہونی چاہئیں۔ اس سفارش سے اشارہ پاکر بدرالدین طیب جی نے اکیڈمک کونسل سے انجینیرنگ فیکلٹی میں اندرونی اور

بیرونی طلبہ کے لئے ۷۵-۲۵ کا تناسب منظور کرالیا۔ جب انھوں نے یہ مسئلہ اکیڈمک کونسل میں پیش کیا تو یہ بھی کہا کہ میں نے یو جی سی کے چیرمین ڈاکٹر کوٹھاری سے اس کے متعلق گفتگو کرلی ہے اور وہ میری رائے سے متفق ہیں۔ دو سال اس نئے اصول پر انجینیرنگ کالج کے داخلے میں عمل کیا گیا۔ کسے معلوم تھا کہ یہی اصول آئندہ ایک ٹریجڈی کا سبب بن جائیگا۔

علی یاور جنگ کی وائس چانسلری

مارچ ۱۹۶۵ء میں بدرالدین طیب جی اپنے محکمے کو واپس چلے گئے۔ انھیں جاپان میں ہندوستان کا سفیر مقرر کیا گیا اور ان کی جگہ ایگزیکیٹیو کونسل کی سفارش پر پریسیڈنٹ آف انڈیا نے نواب علی یاور جنگ کو مسلم یونیورسٹی کا وائس چانسلر مقرر کیا۔ نواب علی یاور جنگ نے ملک کی آزادی کے بعد عرصے تک مختلف ملکوں میں ہندوستان کے سفیر کے فرائض انجام دئے تھے۔ نظام کی حکومت میں بھی وہ اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے تھے اور عثمانیہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر رہ چکے تھے۔ افسوس ہے کہ ان کے جائزہ لینے کے دو مہینے کے اندر ہی ایک ایسا حادثہ پیش آیا جس کی وجہ سے انھیں سخت کوفت میں مبتلا ہونا پڑا اور مسلم یونیورسٹی بھی سخت آزمائش میں سے گذری جس کا سلسلہ ابھی تک ختم نہیں ہوا۔ یہ عجیب بات ہے کہ تین سال پہلے یونیورسٹی کی تحقیقاتی کمیٹی نے مسلم یونیورسٹی کے جن طلبہ کے ڈسپلن کی بیحد تعریف کی تھی اور ان کا مقابلہ بنارس اور دوسری یونیورسٹیوں کے طلبہ سے کیا تھا، انھیں طالب علموں نے اپنی ناشائستہ حرکت سے اپنی گذشتہ روایات پر پانی پھیر دیا اور یونیورسٹی کو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا۔ انھوں نے وائس چانسلر کے ساتھ اس موقع پر جو کچھ کیا اس کی جتنی بھی مذمت کی جائے وہ کم ہے۔

۲۵ر اپریل ۱۹۶۵ء کا واقعہ

نواب علی یاور جنگ کے ایماپر اکیڈمک کونسل نے انجینیرنگ فیکلٹی کے داخلے میں اندرونی اور بیرونی طالب علموں کے ۷۵-۲۵ کے تناسب

کو بدل کر اسے یونیورسٹی کے اختیارِ تمیزی پر چھوڑ دیا۔ اس پر طلبہ نے احتجاج کیا۔ ۲۴ اپریل ۱۹۶۵ء کو ایگزیکٹیو کونسل میں اس مسئلے پر جو بحث ہونے والی تھی وہ ملتوی ہو گئی۔

دوسرے روز ۲۵ اپریل کو کورٹ کا جلسہ تھا۔ طلبہ چاہتے تھے کہ اس مسئلے کو کورٹ میں پیش کیا جائے۔ چنانچہ جس طرح انھوں نے ۲۴ اپریل کو پُر امن جلوس نکالا تھا ۲۵ اپریل کو بھی نکالا اور یونین کے قریب آکر بیٹھ گئے جہاں کورٹ کا جلسہ ہو رہا تھا۔ غالباً کورٹ کی طرف سے مایوس ہو کر انھوں نے شور و غل کر کے کورٹ کے ممبروں پر پتھراؤ شروع کر دیا۔ وائس چانسلر کے ایما پر پراکٹر نے یونین کے ٹیلیفون سے پولیس کو طلب کیا جو پندرہ منٹ کے اندر وہاں پہنچ گئی۔ لڑکوں نے جب پولیس کو دیکھا تو ان پر بھی پتھراؤ کیا جس کی وجہ سے پولیس نے گولی چلادی اور دو لڑکے زخمی ہو کر گر پڑے۔ ان کا گرنا تھا کہ شور ہو گیا کہ دو لڑکے مر گئے۔ پولیس تو اپنی جان بچا کر فیض گیٹ کے باہر کھڑی ہو گئی۔ لڑکوں نے اب اپنے پتھراؤ کا نشانہ وائس چانسلر کو بنایا۔ جب انھوں نے یونین پر ہجوم کیا تو کورٹ کے ممبر ایک ایک کر کے رفوچکر ہو گئے۔ پتھراؤ کی زور ا زوری بڑھتی گئی بالآخر یونین کے وسیع ہال میں اسٹاف کے صرف تین ممبر رہ گئے۔ پرنسپل ضیاء الدین انصاری، پروفیسر خلیق احمد نظامی اور میں۔ میں شروع ہی سے وائس چانسلر کے پاس رہا۔ جب ان کو نشانہ بنایا گیا تو میں نے نواب صاحب سے کہا کہ آپ یونین کے پیچھے کی اونچی بنچ کے نیچے بیٹھ جائیے۔ وہاں قریب ہی ایک لوہے کی کرسی مجھے مل گئی جس سے میں نے اپنے اور نواب صاحب کے لئے سپر کا کام لیا۔ دس بارہ منٹ تک میں نواب صاحب کو اور اپنے آپ کو پتھراؤ سے بچاتا رہا۔ اس وقت تک میرے دونوں ہاتھوں، گردن اور گھٹنے پر متعدد زخم لگ چکے تھے جن سے خون نکل رہا تھا۔ نواب صاحب کے بھی سر پر پتھر

کی چوٹ آئی تھی جس کی وجہ سے ان کی پیشانی سے خون بہہ رہا تھا۔ جب لڑکوں کا ہجوم بالکل قریب آگیا تو ہم دونوں یونین کے بازو والے کمرے میں چلے گئے۔ لڑکے وہاں بھی پہونچ گئے اور کچھ باہر سے دروازہ توڑ کر داخل ہو گئے۔ وہاں میں نے چوکیدار کی چارپائی کو سامنے رکھ کر نواب صاحب کو اور اپنے آپ کو پتھروں سے بچانے کی کوشش کی۔ اب لڑکے اتنی تعداد میں کمرے میں داخل ہو گئے تھے کہ ہم ان کے سامنے بے بس ہو گئے۔ وہ نواب علی یاور جنگ کو پکڑ کر ایس ایس ہال کی طرف لے گئے اور راستے میں انھیں زدوکوب کیا۔ ان کے جو شدید چوٹیں آئیں وہ اس وقت آئیں جب کہ لڑکے انھیں یونین سے ایس۔ ایس ہال لے جا رہے تھے۔ مجھے انھوں نے پکڑ کر یونین کی ایک بینچ پر بٹھا دیا۔ پانچ چھ منٹ کے بعد مجھ سے کہا کہ اب آپ جا سکتے ہیں۔ ان میں سے ایک لڑکے نے مجھ سے کہا کہ آپ نے خواہ مخواہ بیچ میں پڑ کر چوٹیں کھائیں۔ میں نے اسے جواب دیا کہ میں نے اپنا انسانی فرض انجام دیا۔ میں جب یونین کے برآمدے سے نیچے اترا تو مجھے کمزوری معلوم ہو رہی تھی۔ میری شیروانی کی آستینیں اور دامن لہو میں تر تھے۔ میڈیکل کالج کے پروفیسر ڈاکٹر کمار نے مجھے دور سے دیکھا تو وہ لپک کر میرے پاس آئے اور انھوں نے مجھے تھام لیا۔ پھر وہ مجھے اپنی موٹر میں بٹھا کر یونیورسٹی کے اسپتال لے گئے جو وہاں سے قریب ہی تھا۔ میرے ہمراہ پروفیسر خلیق احمد نظامی بھی موٹر میں اسپتال گئے۔ ان کے بھی پسلی میں چوٹ آئی تھی جس میں بعد میں بھی عرصے تک درد رہا۔ یونیورسٹی اسپتال میں میرے زخموں کی مرہم پٹی کی گئی جس سے خون بند ہو گیا۔ اب ڈاکٹر کمار نے مجھ سے کہا کہ چلیے میں آپ کو گھر چھوڑ آتا ہوں۔ میں نے کہا کہ نہیں جب تک وائس چانسلر ایس۔ ایس ہال میں ہیں میں گھر واپس نہیں جاؤں گا۔ مجھے اسپتال ہی میں یہ اطلاع ملی تھی کہ لڑکوں نے انھیں ایس۔ ایس ہال کے ایک کمرے میں

جو ڈائننگ ہال سے چند کمرے چھوڑ کر تھا، بند کر رکھا ہے اور ان سے کچھ لکھوانا چاہتے ہیں۔ بعد میں معلوم ہوا کہ لڑکے ان سے انجینیرنگ فیکلٹی میں داخلے کے متعلق اکیڈمک کونسل کے نئے ریزولیوشن کو منسوخ کرانے کی تحریر لکھوانا چاہتے تھے۔ جب انھوں نے یہ تحریر دیدی تو انھوں نے نواب صاحب کو پیچھے کھڑکی میں سے سلاخیں ہٹا کر باہر کر دیا۔ کمرے کے اندر لڑکوں نے ان کی حفاظت کی اور ان لوگوں کو اندر نہیں گھسنے دیا جن کی نیت ٹھیک نہیں تھی۔

ہم لوگوں کے اصرار پر ڈاکٹر کمار نے مجھے اور پروفیسر نظامی کو وکٹوریہ گیٹ پر چھوڑ دیا اور وہ چلے گئے۔ وکٹوریہ گیٹ اندر سے مقفل تھا۔ چنانچہ ہم دونوں ایس۔ ایس ہال کے ڈائننگ ہال کی طرف چلے تاکہ وہاں جو چھوٹا دروازہ ہے اس سے ایس ایس ہال میں داخل ہوں۔ ہم جب ڈائننگ ہال کی طرف جا رہے تھے تو چند قدم پر یونیورسٹی اسپتال کی ایمبولینس کار کھڑی دکھائی دی جسے ڈاکٹر عبدالبصیر خاں نے اسپتال سے منگوایا تھا۔ وہ خود اس کمرے کے دروازے پر لڑکوں کو روکنے کے لئے کھڑے تھے جس کے اندر نواب علی یاور جنگ بند تھے۔ اس بات کی تصدیق مجھ سے متعدد لوگوں نے بعد میں کی جو خود وہاں موجود تھے۔ جب ہم نے کھڑکی کی سلاخوں کے مڑوڑنے کی آواز سنی تو میں اور پروفیسر خلیق احمد نظامی وہیں ٹھہر گئے اور ایمبولینس کو بالکل کھڑکی کے سامنے کھڑا کروا دیا۔ چند منٹ بعد نواب صاحب کھڑکی میں سے باہر آئے تو ہم دونوں نے انھیں پکڑ کر ایمبولینس کی سیٹ پر لٹا دیا۔ اور ڈرائیور سے کہا کہ نواب صاحب کی کوٹھی چلو۔ فیض گیٹ پر پولیس نے ایمبولینس کو روک دیا۔ جب ڈرائیور نے آگے بڑھنے کی کوشش کی تو ایمبولینس پر لاٹھیاں برسا دیں جس کی وجہ سے ڈرائیور کو چوٹ آئی اور ایمبولینس کا سامنے کا شیشہ ٹوٹ گیا جب میں نے منھ باہر نکال کر دیکھا تو کلکٹر اور سپرنٹنڈنٹ پولیس نظر آئے۔ ان سے میں نے کہا

کہ پولیس یہ کیا کر رہی ہے؟ نواب صاحب سیٹ پر لیٹے ہوئے ہیں اور ان کے خون برابر نکل رہا ہے انھیں جلد سے جلد کوٹھی پہنچنا چاہیے تاکہ ان کے زخموں کی ڈریسنگ ہو جائے۔ کلکٹر نے معذرت کی اور کہا کہ اب بتایئے میں کیا کر سکتا ہوں۔ میں نے کہا کہ آپ ابھی موٹر بھیج کر سول سرجن کو نواب صاحب کی کوٹھی پے آیئے۔ ہم لوگ جب نواب صاحب کی کوٹھی پر پہنچے تو بیگم علی یاور جنگ اس ہولناک منظر کو دیکھ کر سخت پریشان ہوئیں۔ لیکن میں ان کے صبر و تحمل اور دلیری کی داد دیتا ہوں۔ انھوں نے فوراً نواب صاحب کو بستر پہ لٹا دیا اور ان کے زخموں کا خون صاف کرنا شروع کر دیا۔ پندرہ بیس منٹ میں یونیورسٹی کے ڈاکٹر اور سول سرجن بھی آ گئے۔ دوسرے روز نواب صاحب مین کے نرسنگ ہوم میں داخل ہونے کے لئے دہلی چلے آئے۔ میں اسی دوران میں ہر تیسرے چوتھے روز انھیں دیکھنے کی غرض سے دہلی آتا رہا۔ وہ مین کے نرسنگ ہوم میں کم و بیش دو مہینے رہے۔ وہاں سے اچھے ہو کر علی گڑھ واپس آئے اور اپنا کام شروع کر دیا۔ احتیاط کے طور پر یو پی گورنمنٹ نے یونیورسٹی میں پولیس متعین کر دی تھی، فیض گیٹ پر اور مولانا آزاد لائبریری کے پیچھے۔ اب ڈیڑھ سال سے زائد ہو چکا ہے اور یونیورسٹی اپنے معمول پر لوٹ آئی ہے، اس لئے اب وہاں پولیس رکھنے کی بظاہر کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی۔ ویسے تعلیمی لحاظ سے بھی پولیس کا زیادہ عرصے تک کسی تعلیم گاہ کے حدود میں رہنا مناسب نہیں ہے۔ یہ امر موجب طمانیت ہے کہ یو پی گورنمنٹ نے ان طلبہ کے مقدمات واپس لے لئے ہیں جو وائس چانسلر پر حملہ کرنے کے الزام میں ماخوذ ہوئے تھے۔

میں خدا کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اسی نے مجھے اتنی ہمت اور توفیق دی کہ میں نے نواب علی یاور جنگ کی جان بچانے میں تھوڑی بہت خدمت انجام دی۔ جب لڑکوں میں یہ خبر

مشہور ہوگئی کہ پولیس کی گولیوں سے دو لڑکے مرگئے تو ان کے اشتعال کی کوئی حد نہ تھی انھوں نے ہر طرف سے وائس چانسلر پر ہجوم کر دیا۔ اس وقت میں نے اپنی جان کو خطرے میں ڈال کر نواب علی یاور جنگ کو بچایا اور اپنے فرض کو پورا کیا۔ یونین ہال کے دس بارہ منٹ بڑی آزمایش کے تھے۔ ان چند منٹوں کے بعد لڑکوں کو یہ بھی معلوم ہوگیا کہ جن طلبہ کے گولیاں لگی تھیں وہ زندہ ہیں۔ اس سے ان کے رویہ میں تبدیلی آگئی۔ جب وہ یونین ہال سے وائس چانسلر کو ایس۔ ایس ہال لے گئے تو راستے میں انھیں زدوکوب کیا گیا لیکن اب انکی جان کا خطرہ نہ تھا جیسا کہ یونین ہال کے اندر دس بارہ منٹ تک رہا۔ اب طلبہ ان کی حفاظت کے لئے انھیں ایس ایس ہال کے ایک کمرہ میں بند کر رہے تھے، ورنہ اگر وہ ایسا نہ کرتے تو وہ لڑکے جن کی نیت بخیر نہ تھی، ان کے درپے آزار ہوتے۔ ایس۔ ایس ہال کے ایک کمرے میں جب انھیں بند کر دیا تو لڑکوں ہی نے دروازے پر کھڑے ہو کر ان لڑکوں کو اندر نہیں آنے دیا جن کے خیالات ٹھیک نہیں تھے۔ پھر انھیں لڑکوں نے کھڑکی کی سلاخیں موڑ کے نواب علی یاور جنگ کو کمرے سے باہر کر دیا جس کی اطلاع ان لوگوں کو نہیں ہوئی جو کمرے کے دروازہ کی طرف جمع تھے، بعد میں ان تمام واقعات کو اس طرح پیش کیا گیا کہ سچائی اور حقیقت پروپگنڈے کے طوفان میں چھپ گئی۔

۲۵ اپریل کے حادثے کے بعد یونیورسٹی کا ایکٹ معطل کر دیا گیا اور اس کی جگہ پریسیڈنٹ نے ایک آرڈیننس جاری کیا جس کے مطابق گذشتہ ڈیڑھ سال سے یونیورسٹی کا انتظام چلایا جا رہا ہے۔ امید ہے کہ پارلیمنٹ جلد ایکٹ میں ضروری ترمیم کر کے آرڈیننس کو ہٹا لیگی تاکہ یونیورسٹی کا نظم و نسق ایکٹ کے مطابق انجام پائے۔ ہندو یونیورسٹی ایکٹ کی بھی ترمیم ہو رہی ہے۔ اچھا ہے پارلیمنٹ دونوں یونیورسٹیوں کے ایکٹ ساتھ ساتھ منظور کرے۔

ظاہر ہے کہ حکومت اب یہ دونوں ایکٹ عام انتخاب کے بعد پارلیمنٹ کے سامنے پیش کر سکے گی۔

مسلم یونیورسٹی کا اصل مسئلہ

اب مسلم یونیورسٹی کا اصل مسئلہ یہ ہے کہ حکومت اس کے ایکٹ میں کیا تبدیلی کرتی ہے۔ اس سلسلے میں دو باتیں قابلِ غور ہیں۔ ایک یہ کہ مسلم یونیورسٹی ایک خود مختار تعلیمی ادارہ ہے جسے حکومت امداد دیتی ہے اور دوسرے یہ کہ اس کا مقصد اسلامی تہذیب کی روایات کے مطابق مسلمان طلبہ کی تربیت ہے جسے اسلامی کردار سے تعبیر کیا جاتا ہے اور جو لوگ اسلام کے نام سے گھبراتے ہیں وہ اقلیتی کردار سے تعبیر کرتے ہیں۔ یہ کردار مسلمانوں کا مسلمہ دستوری حق ہے۔ اس لئے حکومت کو یونیورسٹی میں کوئی ایسی تبدیلی نہیں کرنی چاہئے جس سے اس کی خود مختاری اور اس کے کردار میں فرق آئے۔ مجھے اس خیال سے اتفاق نہیں کہ اسلامی کردار سے مراد اسلامی تہذیب و ثقافت کی تحقیق ہے۔ یہ ریسرچ ہے جس کو یورپ اور امریکہ کی بہت سی یونیورسٹیاں انجام دے رہی ہیں اور انھوں نے اسلامیات سے متعلق اب تک جتنا کام کیا ہے وہاں تک پہنچنے کے لئے مسلم یونیورسٹی کو ایک مدت درکار ہوگی۔ اگر اسلامی کردار اس کا نام ہے تو پھر یورپ اور امریکہ کی یہ ساری یونیورسٹیاں اسلامی ہیں۔

اصل میں جو لوگ اسلامی کردار کے مفہوم سے ناآشنا ہیں یا جن کی نگاہ میں اس کی کوئی اہمیت نہیں ہے وہ اسے قومی وحدت کے تصور کے منافی سمجھتے ہیں۔ اسلامی کردار سے مراد یہ ہے کہ مسلمان طلبہ میں دینی احساس، اسلامی شعائر کا احترام، قومیت کے جذبے کے ساتھ ساتھ بیدار ہو۔ یونیورسٹی کے تمام شعبوں میں خواہ وہ تعلیمی ہوں یا انتظامی۔ مسلمانوں کی نمایاں اکثریت رہے۔ حکومت کے نامزد ارکان کی تعداد کم سے

کم رکھی جائے۔ غیر مسلم ارکان ایسے منتخب اور نامزد کئے جائیں جو مسلمانوں کی تہذیب اور روایات سے واقف ہوں اور یونیورسٹی کے سچے ہمدرد ہوں۔ یہ باتیں نہ رجعت پسندی ہیں اور نہ فرقہ واریت اور نہ قومی وحدت اور سیکولرازم کے خلاف بلکہ اقلیتوں کا تسلیم شدہ دستوری حق ہو جس کو حکومت سلب نہیں کر سکتی۔ سوائے ایسی صورت کے کہ وہ ناانصافی پر اتر آئے۔ بنارس ہندو یونیورسٹی اور عیسائیوں کے کرسچین کالج اس کے نمونے ہیں جنھیں ان کی حالت پر قائم رکھنا صحیح جمہوریت ہے۔ مسلم یونیورسٹی سیکولر اور قومی ہے اس لئے کہ اس کے دروازے بلاتفریق مذہب و ملت سب کے لئے آج سے نہیں ہمیشہ سے کھلے ہوئے ہیں اور یہاں مذہبی اختلاف کی بنا پر کسی کے ساتھ کوئی امتیازی سلوک نہیں کیا جاتا۔ اس ضمن میں یہ بات بھی یاد رہے کہ دستور ہند کی دفعہ ۳۰ میں اقلیتوں کو یہ قطعی حق دیا گیا ہے۔ کہ وہ اپنے ادارے قائم کریں اور انھیں چلائیں۔ یہ حق صرف مذہبی اقلیتوں کو دیا گیا ہے۔ مذہبی اکثریت والے طبقے کو نہیں دیا گیا۔ ہندوستان میں بہت سی یونیورسٹیاں ہیں۔ نام ان کے کچھ ہی ہوں عملاً وہ اکثریت والے طبقے ہی کے زیر انتظام ہوں گی۔ اگر بنارس ہندو یونیورسٹی کا نام یا اس کی حیثیت بدل بھی جائے تو بھی ہندو مذہب اور تہذیب کے لئے کوئی خطرہ نہیں۔ البتہ مسلمانوں کی صرف ایک یونیورسٹی ہے جس میں وہ اعلیٰ تعلیم کے ساتھ اپنی ملی خصوصیات کو فروغ دے سکتے ہیں جن سے پوری ہندوستانی قومیت کو فائدہ پہنچے گا۔ یہ بڑی ستم ظریفی ہے کہ دستور ہند نے جن چیزوں کو بنیادی حقوق قرار دیا ہے انھیں بعض فرقہ پرستی قرار دیتے ہیں، حالانکہ دستور ہند کی دفعہ ۱۳(۲) میں اس بات تک کی وضاحت کر دی گئی ہے کہ حکومت کوئی ایسا قانون نہیں بنائے گی جس سے اقلیتوں کے بنیادی حقوق کسی طرح بھی متاثر ہوں۔ ان حالات میں پوری

توقع ہے کہ ہمارا اسیکولر اور جمہوری نظام مسلم یونیورسٹی ایکٹ پر نظر ثانی کرتے وقت اقلیتوں کے بنیادی حقوق کا پورا احترام کریگا اور مسلمانوں کو اس کا موقع حاصل رہے گا کہ وہ اس ادارے کو اپنے منشا کے مطابق چلائیں اور اس طرح ہندوستانی قومیت کی بنیادوں کو مضبوط کریں۔ ہندوستان کے مسلمان اپنے وطن کے ساتھ اسی طرح وفادار رہیں جیسے کوئی اور رہے۔ واقعات اس حقیقت کی شہادت دے رہے ہیں۔

سات سال بحیثیت پرو وائس چانسلر

میں سات سال مسلم یونیورسٹی کا پرو وائس چانسلر رہا۔ ۶ر ستمبر ۱۹۶۵ء کو میں نے اس خیال سے اپنا استعفا پیش کیا تاکہ نئے وائس چانسلر نواب علی یاور جنگ اگر چاہیں تو اپنی مرضی کے مطابق کسی اور شخص کو اپنا پرو وائس چانسلر بنا سکیں۔ وائس چانسلر اور پرو وائس چانسلر کے کام کی نوعیت کچھ ایسی ہے کہ وائس چانسلر کو اپنا پرو وائس چانسلر خود مقرر کرنا چاہئے۔ استعفا دینے کے کچھ دنوں بعد میں دہلی چلا آیا۔ یہاں گذشتہ سال بھر سے میں اپنے علمی کاموں میں مصروف ہوں۔ صبح ساڑھے نو بجے سے ڈیڑھ بجے تک روزانہ انڈین نیشنل آرکائیوز یا آرکیالوجی ڈپارٹمنٹ کی لائبریری میں گذرتا ہے۔ کبھی کبھی دہلی یونیورسٹی اور دہلی کالج کی لائبریری جاتا ہوں۔ ان سب لائبریریوں سے مجھے کتابیں گھر پر پڑھنے کو مل جاتی ہیں جس کے لئے میں ان کے ارباب انتظام کا ممنون ہوں۔

پرو وائس چانسلر کی حیثیت سے میرا زیادہ وقت انتظامی امور میں صرف ہوتا تھا۔ چونکہ وائس چانسلر کو پالیسی کے مسائل کی جانب زیادہ توجہ دینی پڑتی ہے، جو کسی علمی ادارے کے لئے بنیادی حیثیت رکھتے ہیں، اس لئے پرو وائس چانسلر کو اس کے روزمرہ کے انتظامی کام میں بہت کچھ ہاتھ بٹانا پڑتا ہے۔ اکثر کارروائیوں پر پرو وائس چانسلر، وائس چانسلر کے نائب کی حیثیت سے احکام جاری کرتا ہے، سوائے ان معاملات کے جو خاص

اہمیت کے حامل ہوں جنھیں پرو وائس چانسلر اپنی رائے کے ساتھ وائس چانسلر کے پاس بھیج دیتا ہے۔ اس ضمن میں اختیارات کی کوئی حد بندی نہیں ہوتی بلکہ اس کو زیادہ تر ذمہ داری کے احساس پر چھوڑ دیا جاتا ہے۔ پرو وائس چانسلر کو بے شمار کمیٹیوں کی صدارت کرنی پڑتی ہے جن کا اوسط ہر مہینے چالیس پچاس کے لگ بھگ ہوتا ہے۔ باوجود ان انتظامی مصروفیات کے میں نے اپنے ذمے رسالہ "فکر و نظر" کی ادارت کا کام لیا۔ ادارہ "فکر و نظر" کے سکریٹری پروفیسر ڈاکٹر نذیر احمد صدر شعبۂ فارسی کی ذاتی دلچسپی اور محنت کی وجہ سے میں رسالے کی طباعت و اشاعت کی طرف سے بے فکر رہا۔ میں نے خود "فکر و نظر" کے لئے متعدد مضامین لکھے جنھیں مکتبۂ جامعہ دہلی نے "کاروانِ فکر" کے نام سے شائع کیا ہے۔ مجھے مسرت ہے کہ رسالے کا معیار کافی اونچا رہا۔ چنانچہ اس کے بعض مضامین کے حوالے روس، ایران اور ترکی کے رسائل میں دیئے گئے اور ان ملکوں میں اس کی قدر افزائی ہوئی۔ ہمارے ملک کے اہلِ نظر نے بھی رسالے کو سراہا۔ مولوی عبد الحق نے اس کی تعریف و تحسین کی جس سے ہم لوگوں کی ہمت افزائی ہوئی۔ میں ادارۂ "فکر و نظر" کے سب ارکان اور مسلم یونیورسٹی کے ان اساتذہ کا خاص کر ممنون ہوں جنھوں نے اس رسالے کا بلند معیار برقرار رکھنے میں میری مدد کی۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی نے شروع ہی سے اس علمی کام میں ہم سبھوں کا ہاتھ بٹایا اور بعض نہایت عمدہ مضامین اس میں اشاعت کے لئے عنایت فرمائے۔ رشید صاحب اردو زبان کے صاحب طرز انشا پردازوں میں ہیں۔ ان کا تاثراتی اسلوب تحریر منفرد ہے۔ ان کے لطیف طنز و مزاح میں جودتِ فکر و نشاط تصور کے دلآویز نمونے پہلو بہ پہلو ملتے ہیں جن کی معنویت جاذب نظر ہے یہ محض ہنسنے ہنسانے کے لئے نہیں ہوتے بلکہ اس کے ساتھ سوچنے پر بھی مجبور کرتے ہیں۔ رشید صاحب کے طنز میں

خوش طبعی اور لطیف کنائے کی آمیزش ہوتی ہے۔ چسٹرٹن کی طرح وہ قول متناقض (پیراڈاکس) کو بڑی خوبی سے برتتے ہیں۔ ان کا طنز مولوی، تجدد پسند نوجوان اور روشن خیال بیوی کسی کو نہیں چھوڑتا اور ہر ایک کو اپنی شگفتہ ظرافت کا حصہ دار بناتا ہے۔ اس طرح کہ تلخی کہیں نہیں پیدا ہوتی۔ رشید صاحب کا انسان کی حیثیت سے بھی اونچا مرتبہ ہے۔ وہ باوضع مخلص اور دردمند ہیں۔ رشید صاحب نے بہت کچھ لکھا ہے۔ مجھے ان کی کتابوں میں "گنج گراں مایہ" "مضامین رشید" اور "آشفتہ بیانی میری" سب سے زیادہ پسند ہیں۔

آزاد لائبریری | چونکہ مولانا آزاد لائبریری کے لئے لائبریرین کا تقرر نہیں ہوا تھا اس لئے وائس چانسلر کی خواہش کے بموجب لائبریرین کے فرائض میں نے دو سال کے قریب انجام دیئے۔ اس مدت میں لائبریری کی جدید تنظیم عمل میں آئی۔ انڈر گریجویٹ طلبہ کے لئے عام معلومات کا ایک شعبہ قائم کیا گیا جس میں سائنس اور ادب کی عام فہم کتابوں کے علاوہ ڈراما، کھیل، باغبانی، پھول اور تفریحی مشاغل (ہابیز) کے متعلق بہترین کتابیں حاصل کی گئیں تاکہ طلبہ کے جو گھنٹے خالی ہوتے ہیں ان میں وہ اپنا وقت اِدھر اُدھر گھومنے کے بجائے یہاں صرف کریں۔ یہ شعبہ بیحد مقبول ہوا۔ یونیورسٹی گرانٹس کمیشن نے اس کے لئے علحدہ رقم منظور کی۔ میں جب کبھی اس شعبے کی طرف جاتا تو مجھے یہ دیکھ کر بیحد خوشی ہوتی کہ وہاں کوئی کرسی خالی نہیں ہے۔ علمی رسائل اور اخباروں کے لئے بھی علحدہ شعبے قائم کئے گئے۔ لائبریری سے استفادہ کرنے والے طلبہ کی بڑھتی ہوئی تعداد کے مدِنظر مزید فرنیچر بنوایا گیا تاکہ زیادہ سے زیادہ طلبہ یہاں بیٹھ کر مطالعہ کر سکیں۔ فرنیچر اور لوہے کی الماریوں کے لئے یونیورسٹی گرانٹس کمیشن نے علحدہ رقم منظور کی۔ ان انتظامی اصلاحات کا یہ نتیجہ ہوا کہ آزاد لائبریری سے استفادہ کرنے والوں کی تعداد پہلے کے مقابلے میں دگنی سے بھی

زیادہ ہو گئی۔

ایک شعبہ تاریخی کاغذات اور قلمی کتابوں کی حفاظت اور جلد سازی کے لئے بھی قائم کیا گیا۔ عام جلد ساز بعض اوقات قلمی کتابوں کی جلد بندی کرتے وقت اس طرح تراش خراش کرتے ہیں کہ حواشی کا کچھ نہ کچھ حصہ ضائع ہو جاتا ہے۔ جلد سازی کے شعبے میں نہایت تجربہ کار کاریگر مقرر کئے گئے۔ میں نے آزاد لائبریری کے اسٹاف میں سے دو کو ٹریننگ کے لئے انڈین نیشنل آرکائیوز بھجوایا تاکہ وہ قدیم کاغذات اور قلمی کتابوں کے تحفظ کے سائنٹفک طریقوں سے واقفیت حاصل کریں۔ چنانچہ ان کی واپسی پر ان دونوں کا بھی اس شعبے میں تقرر کیا گیا۔ آزاد لائبریری میں متعدد ایسے فرامین اور دوسرے تاریخی کاغذات کا ذخیرہ ہے جن کے تحفظ کی ضرورت تھی اگر انھیں ان کے حال پر چھوڑ دیا جاتا تو ان کے برباد ہو جانے کا اندیشہ تھا۔

آزاد لائبریری میں ایک علٰحدہ شعبہ مسلم یونیورسٹی آرکائیوز کا بھی قائم کیا گیا اور مسلم یونیورسٹی کے دفتروں میں جو قدیم کاغذات تھے ان کی تہذیب و ترتیب کی گئی۔ یہ کاغذات سید احمد خاں اور محسن الملک کے زمانے سے لے کر حال کے زمانے تک کے ہیں جن کی تعداد لاکھوں تک پہنچتی ہے۔ میں نے ان کاغذات میں سے انتخاب کیا۔ اس طرح ان کی ایک جلد طباعت کے لئے تیار ہو گئی۔ یہ جلد سلیکٹیڈ ڈاکومنٹس آف علی گڑھ آرکائیوز کے نام سے ایشیا پبلشنگ ہاؤس، بمبئی نے شائع کی ہے۔ اس جلد میں سید احمد خاں کی قائم کی ہوئی سائنٹفک سوسائٹی کی روداد اور ایم۔ او کالج کے متعلق دستاویزیں ہیں اور سید احمد خاں کے خطوط مختلف اشخاص کے نام اور دوسروں کے خطوط خود ان کے نام شامل ہیں۔ اشاعت کے اس سلسلے کو اگر جاری رکھا جائے تو علی گڑھ تحریک کے متعلق

نہایت مفید معلومات یکجا ہو جائیں۔ یونیورسٹی کے شعبۂ تاریخ کو چاہئے کہ وہ چند ریسرچ اسکالروں کو اس کام میں لگا دے۔

حبیب گنج کا کتب خانہ ۱۹۶۲ء میں مولوی عبید الرحمٰن خاں شروانی نے جو اس زمانے میں مسلم یونیورسٹی کے ٹریزرر تھے، اپنا حبیب گنج کا خاندانی کتب خانہ عطیے کے طور پر مولانا آزاد لائبریری کو عنایت فرمایا جس کے لئے ہم ان کے بیحد ممنون ہیں۔ یہ کتب خانہ زیادہ تر ان کے والد ماجد مولوی حبیب الرحمٰن خاں شیروانی کے علمی ذوق کا رہینِ منت ہے۔ انھوں نے بڑی کوشش اور کاہش سے اردو اور فارسی کی قلمی کتابیں، جن کا زیادہ تر تعلق ادب اور تاریخ سے ہے جمع کی تھیں۔ اس کتب خانے کے ذخیرے کو ملا کر اب مولانا آزاد لائبریری میں بارہ ہزار کے لگ بھگ قلمی کتابیں موجود ہیں۔ مجموعی طور پر اردو، فارسی اور عربی تینوں زبانوں کی قلمی کتابوں کا اتنا بڑا ذخیرہ ملک میں کہیں اور نہیں۔ ادب اور تاریخ پر ریسرچ کرنے والے قلمی کتابوں کے اس بیش بہا ذخیرے سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں یونیورسٹی کی تحریک پر یو۔جی۔سی نے ان قلمی کتابوں کی فہرست جدید اصول کے مطابق تیار کرنے کیلئے ایک گرانٹ دی ہے۔ میں نے یہ کام ڈاکٹر مختار الدین احمد، ڈاکٹر نذیر احمد اور پروفیسر خلیق احمد نظامی کے سپرد کیا۔ مجھے علم نہیں کہ یہ کام اب کس منزل میں ہے۔

مجھ سے جہاں تک ممکن ہوا میں طلبہ کے علمی جلسوں میں شریک ہوتا اور مباحثوں میں حصہ لیتا تھا۔ بعض شعبوں کی سوسائیٹوں میں میں نے تحریری مقالے بھی پڑھے۔ میرے پاس ادب اور تاریخ کے طلبہ ذاتی مشورے کے لئے آتے تھے۔ باوجود دوسری مصروفیات کے میں نے اس معاملہ میں ہمیشہ کشادہ دلی سے کام لیا اور جو کچھ بھی مدد میں کرسکتا تھا وہ کی، اور طلبہ کی الجھنوں کو دور کیا۔ یونین میں بھی اکثر اوقات میری تقریریں ہوتی تھیں ہوسٹلوں

کی انجمنیں بھی مجھے تقریر کرنے کی دعوت دیتی تھیں۔ مجھے یاد نہیں کہ میں نے کبھی اس ضمن میں بخل یا بے توجہی سے کام لیا ہو۔ میرے سات سال کے قیام میں شاید ہی کبھی کوئی ایسا موقع آیا ہو جب کہ طلبہ کو مجھ سے کوئی شکایت پیدا ہوئی ہو۔ میں اسے اپنی خوش قسمتی سمجھتا ہوں کہ میں نے عثمانیہ یونیورسٹی میں پروفیسر کی حیثیت سے ۲۸ سال گذارے اور مسلم یونیورسٹی میں پرووائس چانسلر کی حیثیت سے سات سال رہا۔ اس طویل مدت میں مجھے طلبہ کا پورا اعتماد اور تعاون حاصل رہا۔ جس طرح میں ان پر اعتماد کرتا تھا اسی طرح وہ مجھ پر بھروسا کرتے تھے۔ جہاں تک میری یاد کام کرتی ہے میرے اور طلبہ کے درمیان کبھی کوئی ناخوشگوار صورت نہیں پیدا ہوئی۔ مجھے مسرت ہے کہ میرے پرانے طالب علم اب بھی مجھے یاد رکھتے ہیں اور ان میں سے بعض اپنے نجی معاملات میں بھی مجھ سے مشورہ کرتے ہیں۔ میرے پرانے طالب علموں میں اس وقت ایک آندھرا پردیش میں وزیر ہیں، ایک پبلک سروس کمیشن کے ممبر ہیں، ایک سکریٹری ہیں اور بعض دوسرے اعلیٰ عہدوں پر فائز ہیں۔ گذشتہ ایک سال میں علی گڑھ سے چلے آنے کے بعد غیر متوقع مقامات پر علی گڑھ کے طالب علموں سے ملاقات ہو جاتی ہے جنھیں بعض اوقات میں نہیں پہچانتا لیکن وہ مجھے پہچان کر میری طرف بڑے خلوص اور عقیدت سے بڑھتے ہیں۔ کبھی کسی جلسے یا ایٹ ہوم میں، کبھی چلتی ریل میں، کبھی ریلوے اسٹیشن پر، کبھی کسی لائبریری یا دفتر میں، جو بھی ملتا ہے وہ انتہائی خلوص اور عقیدت کا اظہار کرتا ہے۔ میں ان نوجوانوں کے اخلاص اور محبت کو قدر کی نظر سے دیکھتا ہوں اور اسے اپنی زندگی کا قیمتی سرمایہ خیال کرتا ہوں۔ محض یہ تصور کہ یہ نوجوان مجھ سے خلوص اور محبت سے ملتے ہیں میری زندگی کو بامعنی بنانے کے لئے کافی ہے۔

چند شخصیتیں | میری پرووائس چانسلری کے زمانے میں ہز ہولی نس ڈاکٹر سیدنا طاہر سیف الدین

صاحب مسلم یونیورسٹی کے چانسلر تھے۔ ان سے ایک مرتبہ علی گڑھ میں شرف نیاز حاصل ہوا۔
روحانی پیشوائی ان پر سجتی تھی۔ روحانیت کے ساتھ ان میں دنیاوی معاملوں کی فہم بھی
اعلیٰ درجے کی تھی۔ مجھ سے یونیورسٹی کے حالات دریافت کرتے رہے۔ موصوف نے دو لاکھ
روپیہ سیفی ایجوکیشن ٹرسٹ میں عنایت فرمائے تاکہ اس سے لائق لیکن غریب طالبعلموں
کی مالی امداد کی جائے۔ ایک لاکھ روپیہ میڈیکل کالج کو دیئے۔ ان کے جانشین ہز ہولینیس
سیدنا برہان الدین صاحب نے بھی جو حال ہی میں علی گڑھ تشریف لے گئے تھے دو لاکھ
روپیے مسلم یونیورسٹی اسکول کی حالت سدھارنے کے لئے عنایت فرمائے۔ توقع ہے کہ
موصوف کی داد و دہش کا سلسلہ اسی طرح تعلیمی مقاصد کو فروغ دینے کے لئے جاری رہیگا۔
اس سے بڑھ کر کوئی خیر جاریہ نہیں ہو سکتا۔

پہلے علی گڑھ میں پھر لکھنؤ میں مجھے متعدد بار مولانا سید ابوالحسن علی ندوی سے ملنے
کا شرف حاصل ہوا۔ مولانا علمائے سلف کا نمونہ ہیں، نہایت خلیق اور ملنسار۔ ان کی
ملنساری، خاکساری کی حدوں کو چھوتی ہے۔ اپنے علم و فضل کو سادگی کی ردا میں
چھپاتے ہیں۔ لیکن یہ ایسی چیز نہیں کہ کسی کے چھپائے چھپ جائے۔ جب ان کی تقریر
اسٹریچی ہال میں ہوئی تو ہال طلبا سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ تقریر میں کہیں زور بیان
اور ادعا پسندی کا شائبہ نہ تھا، جو عام طور پر علما کی تقریروں میں ہوتا ہے۔ نہ کہیں
علمیت کے اظہار کی کوشش تھی۔ ان کی ہر بات سے عقیدت اور خلوص ٹپکتا تھا۔
لکھنؤ میں کئی مرتبہ ندوہ حاضری کا موقع ملا۔ ہمیشہ شفقت سے ملے۔ ایک روز فرمانے
لگے کہ نوجوانی کے زمانے میں مجھے جن کتابوں نے متاثر کیا ان میں "روح اقبال" بھی ہے۔
جب انھوں نے اپنی نوجوانی کا ذکر کیا تو مجھے احساس ہوا کہ وہ عمر میں مجھ سے چھوٹے

ہیں۔ میں سمجھتا ہوں تقریباً بارہ سال لیکن میں نے ہمیشہ انھیں اپنا بزرگ سمجھا۔ ان کی خلقی بزرگی ان کے علم وفضل، اخلاص اور تقوے کا تحفہ ہے جو عمر کی کمی بیشی سے بے نیاز ہے۔ میں انھیں اس زمانے کے علما کی آبرو سمجھتا ہوں۔ ایک دفعہ آنکھ کے آپریشن کے لیے علی گڑھ تشریف لائے تھے۔ پھر سنا کہ دوبارہ آپریشن کی نوبت آئی۔ مولانا کا مشغلہ عمر بھر پڑھنا پڑھانا رہا ہے۔ ان کی بصیرت کی طرح ان کی بصارت بھی ملت کے لئے بڑی قیمتی ہے۔ دعا ہے کہ انھیں آنکھ کے موذی مرض سے نجات ملے۔

مسلم یونیورسٹی کی ایگزیکیٹو کونسل کے ارکان میں مرحوم صدیق حسن آئی۔سی۔ایس سے میرے تعلقات اخلاص ومحبت پر مبنی تھے۔ وہ یوپی گورنمنٹ میں بورڈ آف ریونیو کے رکن تھے۔ حکومت کے اعلیٰ عہدہ دار کی حیثیت سے اکثر لوگوں میں احتیاط ضرورت سے زیادہ پیدا ہو جاتی ہے۔ لیکن میں نے محسوس کیا کہ صدیق حسن جس بات کو درست سمجھتے تھے اس کی تائید میں کسی مصلحت کا لحاظ نہیں کرتے تھے۔ مجھے خوشی ہے کہ ہر اہم معاملے میں ان کی اور میری رائے میں موافقت رہی۔ صدیق حسن اسلام کی صداقت کو مانتے تھے اور اس کے بنیادی اصول کے تحفظ کو اپنا فرض خیال کرتے تھے۔ لکھنؤ میں ان کے مکان پر ہر ہفتے درسِ قرآن ہوتا تھا جس میں مولانا محمد اویس ندوی نگرامی قرآن کے مطالب بیان کرتے تھے۔ مجھے بھی دو مرتبہ ان درسوں میں شریک ہونے کا موقع ملا۔ درس کے دوران میں وہ جو سوال کرتے تھے ان سے ان کی گہری نظر کا پتہ چلتا تھا۔

صدیق حسن کو شعر وشاعری کا بھی شوق تھا اور خود غزل کہتے تھے۔ میں اپنی اہلیہ کے علاج کے سلسلے میں کئی دفعہ لکھنؤ گیا۔ میرا قیام سلطان عالم خاں کے یہاں تھا جو میرے برادر نسبتی ہیں اور جو اس زمانے میں یوپی گورنمنٹ میں ڈپٹی منسٹر تھے۔ ایک روز صدیق حسن نے

اور اصرار کیا کہ مشاعرے کی صدارت کے لئے میرے ساتھ چلو۔ میں چلا گیا۔ اس مشاعرے میں انھوں نے بھی اپنی غزل سنائی پھر کچھ مہینے بعد جب میں لکھنؤ میں تھا تو وہ پھر مجھے ایک مشاعرے میں شرکت کے لئے لے گئے جس کی صدارت وہ خود کر رہے تھے۔ اسی زمانے میں جوشؔ ملیح آبادی بھی پاکستان سے آئے ہوئے تھے۔ وہ بھی اس مشاعرے میں شریک ہوئے۔ انھوں نے چند نظمیں سنائیں جو انھوں نے پاکستان میں لکھی تھیں اور جن کے مضمون سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اپنے نئے وطن میں خوش نہیں ہیں۔ صدیق حسن نے بھی غزل پڑھی۔ ایک شعر میں انسان دوستی کے جذبات کا اظہار تھا۔ سب نے خوب تعریف کی۔ جوشؔ نے اپنے مخصوص انداز میں کہا بھئی اللہ والے ہو کر بھی انسانوں سے اتنی ہمدردی رکھتے ہو" اس پر میں نے کہا کہ "اللہ والے ہی کو انسانوں سے سچی ہمدردی ہوتی ہے" اس محفل کے خاتمے پر جوشؔ میرے پاس آئے اور کہنے لگے "ڈاکٹر صاحب! جب سے آپ نے آپ کی "روح اقبال" کے پورے حاشیے کو اپنی تنقید سے سیاہ کر دیا ہے۔ جب کبھی آپ کراچی آئیں گے، تو آپ کو دکھاؤں گا، آپ لوگ اقبالؔ کو کیوں اتنا بڑھاتے ہیں؟" میں نے سوچا کہ اس وقت جوشؔ سے بحث کا موقع نہیں ہے۔ میں نے یہ کہہ کر بات ختم کر دی کہ جب کبھی کراچی آؤں گا تو آپ کی تنقید سے استفادہ کرونگا۔ یہ گفتگو ہو ہی رہی تھی کہ صدیق حسن ادھر بڑھ کر آ گئے اور مجھ سے پوچھنے لگے کہ کیا باتیں ہو رہی ہیں۔ جوشؔ نے خود ہی پوری بات دہرا دی۔ اس پر صدیق حسن نے حسب عادت قہقہہ لگایا اور جوشؔ کو مخاطب کر کے کہنے لگے "آپ تو ہمیشہ سے اقبالؔ کے مخالف رہے ہیں" کچھ اور لوگ بھی آ گئے اور دوسری باتیں چھڑ گئیں۔

صدیق حسن سے توقع تھی کہ وہ ریٹائر ہو کر کوئی قومی کام کریں گے لیکن کارکنان قضا و قدر کو یہ منظور نہ تھا۔ انھیں ندوہ اور مسلم یونیورسٹی دونوں سے خاص دلچسپی تھی اور وہ

ان درس گاہوں کی خدمت کرنا چاہتے تھے۔

مسلم یونیورسٹی کی ایگزیکیٹیو کونسل کے ارکان میں عبدالمجید خواجہ کی شخصیت بھی یادگار رہے گی۔ وہاں ان کی موجودگی اس بات کی ضمانت تھی کہ کوئی ایسی بات نہیں ہونے پائے گی جو اس درس گاہ کے حقیقی مفاد کے خلاف ہو۔ خواجہ صاحب پرانے کانگریسی تھے۔ ہم لوگوں کی پیڑھی نے نوجوانی کے زمانے میں ان کا نام علی برادران اور مولانا ابوالکلام آزاد کے ناموں کے ساتھ سنا تھا۔ میں جب جامعہ میں شریک ہوا تو وہ اس زمانے میں پرنسپلی کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ انھوں نے جامعہ کا کام بڑی دلسوزی سے کیا۔ ترک موالات کی تحریک میں کئی مرتبہ قید و بند کی سختیاں بھی جھیلیں۔ وہ بڑے جری اور صاف گو انسان تھے۔ پنڈت جواہر لال نہرو کے ساتھ کیمبرج میں رہ چکے تھے۔ ان سے بڑی بے تکلفی کے دوستانہ تعلقات تھے۔ خواجہ صاحب کی زندگی کا یہ روشن پہلو ہے کہ انھوں نے کانگریس کی حکومت قائم ہونے کے بعد بھی اپنے لئے کچھ خواہش نہیں کی۔ نہ ججی مانگی، نہ وزارت طلب کی۔ حالانکہ وزارت کی کرسیوں پر ایسے ایسے لوگ بیٹھے جن کی خدمات ان کے مقابلے میں کچھ بھی نہ تھیں تو وہ جس حال میں تھے اسی میں رہے۔ مسلم یونیورسٹی سے انھیں ایک قلبی تعلق تھا اور وہ یہاں کی روایات کو برقرار رکھنے کے لئے بڑے بڑے لوگوں سے جھگڑا مول لینے میں بھی تامل نہ کرتے تھے۔ جامعہ میں وہ کبھی کبھی دستور انگلستان پر لکچر دیتے تھے جن میں شرکت کا مجھے بھی موقع ملا۔ اس لئے میں انھیں اپنا استاد سمجھتا تھا۔ وہ بھی میرے ساتھ بزرگانہ شفقت سے پیش آتے تھے۔ بڑے بامروت اور وضعدار تھے۔ اصول کے سامنے مصلحت کوشی کو خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ انھوں نے اور سید احمد خاں کے زمانے میں ان کے والد خواجہ محمد یوسف نے علی گڑھ کی جو خدمت کی ہے اسے کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔

خاتمۂ کتاب | اے یادو! اے زمانے کی بیٹیو! میں تمھارا احسان مند ہوں کہ میں نے جب تمھیں پکارا تو تم لبیک کہتی ہوئی میری طرف بڑھیں۔ میں نے دیکھا کہ شروع شروع میں تم اپنے رخِ زیبا پر نقاب ڈالے تھیں۔ تم جب میری طرف بڑھیں تو شرماتے، بچاتے، جھجکتے ہوئے، میں اس خیال میں تھا کہ چونکہ میری پکار نے تمھیں گہری نیند سے جگایا ہے اسلیے شاید تم جھنجھلاہٹ میں مجھ سے سیدھے منھ بات بھی نہیں کروگی لیکن مجھے یہ دیکھکر تعجب ہوا کہ تم بہت جلد بے تکلف ہوگئیں، جیسے مجھے مدتوں سے جانتی پہچانتی ہو۔ جھنجھلاہٹ تو رہی ایک طرف، تمھاری توجہ اور دل نوازی نے میری ہمت بڑھائی۔ پھر تم بے نقاب ہوکر مجھ سے دو بدو گفتگو کرنے لگیں۔ میری نگاہ شوق نے تمھارے رخِ زیبا کے نظارے سے اپنا دامن بھر لیا اور میرا دل اس کے جلوے سے معمور ہوگیا۔

نگاہ شوق ہی کچھ جانتی ہے رازِ مستوری　　　وہ خود جلوہ ہی ہیں اکثر جسے پردہ سمجھتے ہیں

اے میری عزیز یادو! میں تمھاری توجہ اور عنایتوں کا کس طرح سے شکریہ ادا کروں۔ تم سے جب ہم کلامی کی نوبت آئی تو تم نے اپنے سارے راز مجھ پر کھول دیئے یہ جانے بغیر کہ میں اس کرمِ بے حساب کا متحمل بھی ہوسکوں گا یا نہیں؟ میں جانتا ہوں تم نے مجھ پر اعتماد کیا۔ میں نے بھی اپنی سی پوری کوشش کی کہ اپنے کو اس اعتماد کا اہل ثابت کروں۔ تمھاری محفلِ ناز میں عجیب پر اسرار طلسمی کیفیت تھی۔ یہاں کی مدھم روشنی میں فکر اور تخیل، جذبہ اور تاثر، ماضی اور حال، خیر اور شر سب کے سب آنکھ مچولی کھیلنے میں مشغول نظر آئے۔ میں نے پوچھا یہ کیا ماجرا ہے؟ تم نے کہا یہ رمز و استعارے کا عالم ہے، یہاں ہر حقیقت دوسری حقیقت کے ساتھ جو بظاہر اس کی ضد معلوم ہوتی ہے، وابستہ و پیوستہ ہی جیسے ہم آغوش ہو۔ تصورات اور عمل کی دنیا میں ان حقائق کی پرچھائیاں اسی طرح چلتی

پھرتی رہتی ہیں۔ اگر ایسا نہ ہو تو ارتقا کی رفتار رک جائے اور انقلاب دم توڑ دے۔ میں نے کہا تمھارے بصیرت افروز اشارے میرے لئے بڑے سبق آموز ہیں۔

اے یادو! اگر میں کہوں کہ تم میری ہستی ہو تو یہ صحیح ہوگا اس لئے کہ تمھارے بغیر میرا تشخص اور تحقیق ممکن نہیں۔ تمھارے بغیر ہستی میں نہ کوئی معنی ہیں اور نہ ربط کہ یہی اصل زندگی ہے۔ تم ہو تو میں ہوں اور میں ہوں تو تم ہو۔ تمھاری خوشبو سے جو روحانی کیف پیدا ہوتا ہے اس سے تم نے مجھے نوازا جس کے لئے شکر گذار ہوں۔ یہ خوشبو صرف تخیل اور جذبے ہی کا جادو نہیں جگاتی بلکہ خود شناسی کی منزلیں طے کرانے میں مدد دیتی ہے۔

اچھا، اب پھر ملیں گے۔ خدا حافظ۔

انڈکس

"یادوں کی دنیا"

(بہ ترتیب حروفِ تہجی)

۱- اشخاص

انڈکس

۲-مقامات

غلط نامہ

صفحہ	سطر	غلط	صحیح	صفحہ	سطر	غلط	صحیح
٢	١	کے	×	١٥	١	ہوئی	ہوتی ہے
٢	١٢	اور	×	٢٥	١٤	ہوتی	ہوئی
٤	١٩	معاش	معاشی	٢٩	١١	فامڈک	نارڈک
٥	١	ذریعہ	ذریعے	٤٩	١٤	کس	کسی
٦	٧	راجہ	راجا	٥٠	٢	مہابیاں	مہابانہ
٧	١٠	خلوار	خاوار		٣	مہایاں	مہایانہ
٩	١١	جو	لوگ جو	٥٣	١٢	دھینی	چھینی
١٠	٣	خشک	خنشک	٧٢	٤	اسی	اس
	١٣	سے	×	٧٧	١٠	اس	اسی
	١٨	و	اور	٨٥	٦	طلبا	طلبہ
١١	١٣	اور	×		٧	طلبا	طلبہ
١٣	١	نسق	ضبط	٨٨	٤	طلبا	طلبہ
١٤	١٣	اس	اسی		١٩	طلبا	طلبہ
	١٩	گذرے	گذرتے ہیں	٩٠	٨، ٩	طلبا	طلبہ

صفحہ	سطر	غلط	صحیح	صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۹۲	۱۱	زومہارٹ	زومبارٹ	۲۱۷	۶	مونا پرناس	مون پرناس
۱۵۶	۱۵	لئے	لے	۲۱۹	۱۶	میں	×
	۱۶	طلبا	طلبہ	۲۳۱	۷	ڈیمارکیٹک	ڈیماکریٹک
۱۶۰	۳،۱۲،۹	طلبا	طلبہ	۲۳۸	۱۷	مولیو	مولیر
۱۶۱	۱۲	بمبئی میں	انھوں نے بمبئی میں	۲۳۹	۳	جوزفین پیکر	جوزفین بیکر
۱۶۴	۷	طلبا	طلبہ	۲۴۰	۱۵	آتی	ہوتی
۱۷۶	۲	خواجہ عبدالجید	خواجہ عبدالمجید	۲۴۴	۱۰	سلوان	سلواں
۱۸۱	۱	حافظ فیاض احمد خاں	حافظ فیاض احمد	۲۴۶	۳	مارسون	مارسوں
۱۸۸	۵	مسکرائے	مسکراتے		۷	ماسین یون	ماسین یوں
۱۹۳	۱۲	میرے	×	۲۴۸	۱۵	خیال	دعویٰ
	۱۳	پہلے	پہلے مجھے	۲۵۰	۱۱	ہے	تھی
۲۰۷	۱۴-۱۵	رستوران	رستوراں	۲۵۱	۵	امیرحسن	امیرسن
۲۱۱	۲	اوریان	اوریاں	۲۵۳	۱۱	رومینوں	رومنوں
۲۱۲	۱۴	ماسین یون	ماسین یوں	۲۵۶	۱۵	ژاردان	ژارداں
	۱۶	علاقوں	علاقے	۲۵۷	۱۰	گورے نوبل	گرے نوبل
۲۱۴	۱	زباں	زمانے	۲۶۱	۸	سالون	سالوں
۲۱۵	۳	جوبین	جوبیں	۲۸۶	۱	کس قدر	کسی قدر
۲۱۶	۱۵	والٹیو	والٹیر	۲۹۴	۱۹	پیرس	پیرس میں

صفحہ	سطر	غلط	صحیح	صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۲۹۵	۹	نے نہیں	سائنس				
۳۰۱	۵	سے	″	۳۶۹	۱۹	جدید	شدید
۳۱۰	۶	دوکان	دُکان	۳۷۸	۲	عقل	عمل
۳۱۶	۱۳-۱۴	طلبا	طلبہ	۳۸۳	۵	زورآوری	زورازوری
۳۲۶	۳	پھول	پھل	۳۹۱	۳	نظام	انتظام
۳۲۷	۱۵	مہاراجا صاحب	مہاراجا بہادر	۴۱۷	۱۴	الفت ہی	الفت تھی
۳۳۴	۱۵	تجرید	تجرّد	۴۲۰	۵	لاکھ	لاکر
۳۵۰	۷	مسئلہ	سلسلہ	۴۲۷	۴	ہے	ہو
۳۵۵	۸	غالب کو	غالبؔ کی	۴۳۴	۴	پینی	چینی
۳۶۰	۱۸	رنگ	راگ	۴۳۷	۵	اسی	اس
۳۶۶	۴	اسی	اس	۴۳۹	۳	شایع	شائع
				۴۷۲	۴	تحقیق	تحقق

مطبوعہ

معارف پریس

دار المصنفین اعظم گڈھ

۱۹۶۷ء